جدید اردو کلاسیک

سیریز ایڈیٹر: اجمل کمال

مجموعہ

محمد خالد اختر

جلد سوم: افسانے

PDF By : Meer Zaheer Abass Rustmani

Cell NO :+92 307 2128068 - +92 308 3502081

-----◈◈◈◈◈◈◈◈◈◈-----

جدید اردو کلاسیک

سیریز ایڈیٹر: اجمل کمال

مجموعہ

محمد خالد اختر

جلد سوم: افسانے

OXFORD
UNIVERSITY PRESS

اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس

مجموعہ

محمد خالد اختر

جلد سوم: افسانے

ترتیب

تعارف

اردو کے ایک منفرد اور صاحب اسلوب ادیب کے طور پر محمد خالد اختر (۱۹۲۰ء۔ ۲۰۰۲ء) نے ایک طویل تخلیقی عمر پائی اور افسانے، ناول، سفرنامے، مزاح، تنقید، تبصرے، ہجو، ذاتی خطوط، یادداشتوں اور ترجمے کے میدانوں میں اپنا بھرپور اظہار کیا۔ اوکسفرڈ یونیورسٹی پریس کے زیرِ اہتمام محمد خالد اختر کی تحریروں کو ان اصناف ادب کے لحاظ سے الگ الگ جلدوں میں پیش کیا جا رہا ہے۔ زیرِ نظر جلد میں ان کی ایسی کہانیاں پیش کی جا رہی ہیں جو اردو کے ممتاز جریدوں فنون، سویرا، ادبِ لطیف اور افکار وغیرہ میں شائع ہوئیں۔

محمد خالد اختر کے اسلوب کی ایک نمایاں خصوصیت ان کی نثر ہے جس میں اردو کی کلاسیکی تحریروں سے گہری آشنائی کے ساتھ ساتھ انگریزی فکشن، مزاح، سوانحی ادب، سفرنامے، انشائیے (essay) اور دیگر نثری اصناف کے عمر بھر کے مطالعے کا رچاؤ محسوس ہوتا ہے۔ انگریزی زبان کا یہ اثر بعض اوقات ان کے جملوں کی ساخت میں بھی صاف دکھائی دیتا ہے اور اپنا ایک مخصوص لطف رکھتا ہے۔ ہمارے عہد کے ایک بے مثل نثر نگار ابن انشا کے لفظوں میں: ''محمد خالد اختر کو پڑھنے والا اکثر یہ بھول جاتا ہے کہ وہ اردو پڑھ رہا ہے۔ اس میں انگریزی الفاظ کی بھرمار بھی نہیں ہے لیکن جملوں کی ساخت سراسر انگریزی ہے... شروع شروع میں یہ انداز غریب اور اکھڑا اکھڑا معلوم ہوتا ہے لیکن بعد میں اس میں بانکپن کا لطف آنے لگتا ہے۔'' محمد کاظم کہتے ہیں کہ اس ''اسلوب میں ضرور ایک اجنبی زبان کا اثر ہے لیکن اس کے طنز و مزاح کا ماحول، اس کے افراد اور ان کی گفتگو اور چال پھرت سب کچھ یہیں کا ہے اور دیسی ہے۔'' ریڈیو اور ٹی وی کی جانی پہچانی شخصیت اشفاق احمد کے نزدیک ''خالد کے فن کا سب سے بڑا کمال اس کے مغربی علوم کے مطالعے میں مشرقی زندگی کی پہچان ہے یہ پہچان ایسی انوکھی، ایسی سبک اور کچھ ایسی اچانک ہے کہ اگلے فقرے پر پہنچ جانے کے

بعد پچھلا راز کھل کر سامنے آ جاتا ہے۔۔۔ ایسا انداز مشق سے حاصل نہیں ہوتا، صرف فطرت کی طرف سے ملتا ہے۔۔۔''

اردو نثر کے تاریخی ارتقا کا مطالعہ کرنے والے کسی شخص کو محمد خالد اختر کے مخصوص اسلوب میں ایک گہری تہذیبی تبدیلی کارفرما محسوس ہو سکتی ہے جس کے تحت علم، اطلاع اور ثقافتی اقدار کے منبع کے طور پر فارسی اور دیگر مشرقی زبانوں کی جگہ رفتہ رفتہ انگریزی نے حاصل کر لی۔ اردو کی تقریباً تمام تر جدید نثر اسی تہذیبی تبدیلی سے پیدا ہوئی ہے۔ اردو کے جدید تخلیقی ادب میں اس کا اولین نمایاں اظہار قرۃ العین حیدر کی تحریروں میں دکھائی دیتا ہے۔ محمد خالد اختر کے ہاں انگریزی نثر کے رچاؤ کا یہ رنگ نسبتاً زیادہ گہرا ہے۔ اس سے نہ صرف ان کی تحریروں میں ایک خوشگوار طور پر نامانوس لہجہ جنم لیتا ہے بلکہ کسی بھی انسانی صورت حال کو ایک خارجی، نسبتاً زیادہ معروضی زاویے سے دیکھنے کا تخلیقی انداز بھی پیدا ہوتا ہے۔ محمد خالد اختر کی تحریروں میں متواتر محسوس ہونے والا خفیف طنز (irony) ان کے اسی مخصوص تخلیقی اسلوب کی دین ہے۔

اجمل کمال

ننھا مانجھی

میں نے اپنے ننھے مانجھی کو پہلی بار چھوٹی کھوکھے جیسی کشتی کے پاس جون ۱۹۳۶ء کی ایک سہ پہر کو
دیکھا۔ دریا اپنے پاٹ میں چار دریاؤں — ستلج، سندھ، جہلم اور راوی — کے پانی لیے، بل کھاتی
اور پھنکارتی ہوئی موجوں اور بھنوروں کا سمندر بنا ہوا تھا۔ جہاں تک نظر جاتی تھی، پانی ہی پانی، اور تم
پرلا کنارہ نہیں دیکھ سکتے تھے۔ چھوٹی دم کی سی ٹرین نے ایک گھنٹہ پہلے مجھے شہدوں اور کھجوروں
والے ٹرمینس ریلوے اسٹیشن پر اتارا تھا اور میں وہاں سے اپنا تھیلا کندھے پر رکھے اور ایک سوٹ
کیس اٹھائے ایک دیہاتی باتونی لڑکے کی رہنمائی میں ریلوے لائن کی پٹری پر چلتا ہوا (کیونکہ
ارد گرد طغیانی کی وجہ سے سب پانی تھا اور پٹری ہی سب سے اونچی جگہ تھی) پی ڈبلیو ڈی کی فیری لانچ
کو پکڑنے دریا کے کنارے پہنچا تھا۔ میری بدقسمتی کہ میں فیری لانچ کو نہ پکڑ سکا۔ ابھی ہم پتن سے دو
فرلانگ دور تھے کہ کنارے سے ایک بانگ سنائی دی اور ایک سبز اور سفید مکان نما چیز حرکت کرتی
ہوئی نظر آئی۔

"سائیں،" الجھے ہوئے بالوں والے دیہاتی لڑکے نے، جس کا نام گامن تھا، کہا، "بیڑی
ویندی پئی اے۔ تساں ہُن کل فجر ای ونج سکدے او۔"

میں نے خواہ مخواہ کے غصے میں سارا الزام اس پر دھرا کہ اس نے اپنی باتوں میں مجھے دیر کرا
دی ہے ورنہ میں فیری کو پکڑ لیتا۔ ہم کنارے پر پہنچے۔ فیری لانچ اب کافی دور جا چکی تھی۔ میں اس
کے انجنوں کی چگ چگ کو سن سکتا تھا۔ مچھیروں کی مستولوں والی دو تین کشتیاں سورج میں چمکتے
پانیوں پر اچھل رہی تھیں اور ٹوکریاں بننے والے خانہ بدوش اپنی سرکنڈوں کی جھونپڑیوں میں
کنارے پر پڑاؤ ڈالے بیٹھے تھے۔ موسم زدہ جھریوں والے بوڑھے، اور چمکیلے سیاہ جسموں والے
بے پروا نوجوان، اور رنگ دار چھپی ہوئی چھینٹ کے گھگھروں میں صحت مند جسموں اور کھرے چٹیل

کی سی رنگت والی عورتیں، جن کو دیکھنے سے دل میں گویا ایک پھانس سی اٹک جاتی تھی، اور لاتعداد الجھے ہوئے بالوں والے چھوٹے بچے جو اپنے بڑوں کی مصروفیات اور دھندوں سے بے خبر، شور مچاتے ہوئے، پانی میں کھیل رہے تھے۔

مجھے اس شام اپنے دریائی چچا احمد یار کے پاس پہنچنا تھا۔ اس گھر میں سب میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔ میں واپس اس سبز روضوں اور کھجور کے جھنڈوں والے گاؤں چاچڑاں میں رات بسر کرنے نہیں جانا چاہتا تھا۔ مگر فیری لانچ جا چکی تھی اور دریا کے پرلے کنارے پر جانے کی کوئی صورت نہ تھی۔

''سائیاں،'' گامن نے کہا، ''رات اساڈے گھر رہو۔ تساڈی خدمت کریساں تے محمد مروڑے دیساں۔ میرا بابا فرید سائیں دیاں کافیاں خوب لے نال گاندا اے۔ تے ساڈی ہک بکری اے۔ سائیں کوں اوداکھیر پویساں۔ ڈھاڈا مٹھا اے۔ فجر ہن نال میں سائیں کوں بیڑی تے چڑھادیساں۔''

میں نے مستولوں والی کشتی کے ایک بوڑھے لمبی مونچھوں اور پٹوں والے مچھیرے سے دریافت کیا کہ آیا وہ مجھے دوسرے کنارے پر مٹھن کوٹ لے جائے گا۔ اس نے اپنا سر ہلایا اور دریا کی سمت اشارہ کیا جو اپنی ناچتی ہوئی شوریدہ لہروں سے واقعی خطرناک اور جان لیوا نظر آ رہا تھا۔ اس نے کہا، ''پندھ بھی بہت زیادہ ہے اور ہوا الٹے رخ کی ہے۔ اس وقت کوئی تمھیں مٹھن کوٹ نہیں لے جائے گا۔''

میں مایوس ہو گیا۔ میرے چچا نے میرے آنے کی خوشی میں اپنی ضرب المثل دریادلی سے بڑا تکلف کر رکھا ہوگا اور اسے مایوسی ہوگی۔

تب میں نے اپنے ننھے مانجھی کو دیکھا۔

وہ اپنی اچھلتی ہوئی گھونگھے نما کشتی کے پاس ایک لمبا بانس لیے کھڑا تھا۔ بمشکل بارہ تیرہ برس کا لڑکا، ایک لنگوٹی میں؛ اس کے بال گھنے گھنگھریالے تھے اور اس کا بدن چمکیلا اور لچیلا اور سنہری تھا، اور وہ اپنے بانس کے ساتھ ایسی بے پروائی اور ایسے بانکپن سے کھڑا تھا جیسے وہ ایک چھوٹا سا دیوتا ہو۔ اس کی آنکھوں میں دلیری اور خود اعتمادی تھی اور اس کا چہرہ خوبصورت اور مسکراتا ہوا تھا — جنگلوں، دریاؤں اور کھلے خطوں کی ایک مخلوق!

ایک لحظے کے لیے میں نے تاسف سے اپنے غلط خوراک پر پلے ہوئے، پلپلے، توندیلے، آرام کے عادی جسم کے بارے میں سوچا۔ شہروں میں رہتے ہوئے، انسان نے خود کو غالباً خدا کی بدصورت ترین مخلوق بنالیا تھا۔ آہ! یہ تہذیب کی نت نئی بڑھتی ہوئی آسائشیں! شہری آدمی کو آخر کس

بات کا ناز تھا؟

ننھے مانجھی نے خود یہ مجھ سے پوچھا۔ ''سائیاں، پار جائیں؟''

''تمہاری کشتی کمزور ہے۔ یہ ڈوب جائے گی چھوٹے لڑکے!'' میں نے کہا۔

وہ ہنسا۔ اس کی ہنسی لوک گیتوں کا ایک سُر تھی۔ اس کے موتیوں کی لڑی جیسے سفید دانت چمکے۔ اپنے تمباکو سے میلے پیلے پیلے دانتوں کا سوچ کر حسرت کی چھری سی میرے سینے میں اتر گئی۔

''واہ سائیاں واہ!'' وہ بولا۔ ''میری بیڑی نہیں ہڑدی۔ ایہہ پانی دی مچھی اے۔ دریا دی چھل تے اتوں چڑھی وانگوں اڈ جاندی اے۔''

اس نے بتایا کہ وہ ہر روز پرلے ساحل سے مچھلیاں پکڑتے پکڑتے اس کشتی میں یہاں آتا ہے اور سر شام لوٹتا ہے۔

''دریا میرا گھر ہے!'' اس نے سادگی سے کہا۔ ''سائیاں میں دریا وچ پرسیا ہویا آں۔ دریا میرا عشق ہے۔ وہ میری اور میری کشتی کی حفاظت کرتا ہے۔''

ایک جنگلی وحشی لڑکے سے اتنی عقل کی باتیں سن کر میں حیران ہو گیا۔ کس نے اس کو یہ باتیں سکھائی تھیں؟

''تم اسکول میں پڑھتے ہو؟'' میں نے پوچھا — یہ سوچتے ہوئے کہ ایسی دانائی صرف اسکول میں سیکھی جا سکتی ہے۔ یہ بھولتے ہوئے کہ مادرِ فطرت خود بہترین استاد ہے۔

وہ پھر ہنسا اور اس کے جواب نے مجھے مزید حیران کر دیا۔ ''میرا اسکول، سائیاں، زمین ہے اور دریا ہے۔''

گامن مجھ سے چمٹا ہوا تھا۔ وہ کبھی میرے کوٹ کو اور کبھی میرے بازوؤں کو کھینچتا۔ وہ خلوص سے چاہتا تھا کہ میں اس کے ساتھ شہر میں اس کے کچے مکان میں رات گذاروں، اس کی بکری کا تازہ تازہ دودھ پیوں اور اس کے بابا سے فرید کی کافیاں سنوں۔

''سائیاں! دریا ایک دم خطرناک ہے۔ میرے ساتھ آؤ...'' گامن بولا۔

اس پر ننھا مانجھی زور سے ہنسا، ''خطرناک!'' اور چھلانگ لگا کر اپنی کشتی میں سوار ہو گیا۔

''میں اب جا رہا ہوں۔ تم آنا چاہتے ہو تو آ سکتے ہو۔''

میں نہیں جانتا کہ اس وقت میرے دل میں کیا آئی۔ نہ جانے یہ اپنے ہنس مکھ، شکرے کی آنکھ والے چچا کی میرے نہ پہنچنے پر مایوسی کی فکر تھی اور اس بھنے ہوئے مرغ کا خیال تھا جو وہ اپنی

خاص گہرائی میں پکوار رہا ہوگا، یا یہ دریا کا وسیع حسن و جمال تھا، یا پھر یہ اس جنگلی وحشی لڑکے کی خود اعتمادی سے بھری ہنسی تھی۔ میں نے یکلخت اس کے ساتھ جانے کا فیصلہ کرلیا۔ زندگی میں ایسے بہادر لمحے آتے ہیں، جب آدمی جان کی بازی لگا دیتا ہے۔

''ٹھہرو، میں تمہارے ساتھ آرہا ہوں۔''

''نہ نہ سائیاں! کملا نہ ہو۔ ایہہ چھوٹا چھوٹا ہے۔ کشتی بڑ ویسی'' مگر میں تو اب اپنے تھیلے اور سوٹ کیس کے ساتھ کشتی میں تھا اور کنارے پر خواں باختہ کامن کو احتجاج کرتے چھوڑ کر ننھا مانجھی اپنی مچھلی جیسی کشتی کو بھنور بیلے، پیتے پانیوں میں لے جا رہا تھا۔ وہ ایک یونانی دیوتا کی طرح حسین لگ رہا تھا۔ اس کے گھنگھریالے بال ہوا میں اڑ رہے تھے۔ کچھ دیر کے لیے میں اس کے اس دم بخود کر دینے والے انسانی حسن میں کھو گیا اور اس خطرے کو بھول گیا جس میں میں کود پڑا تھا۔

جب میں نے اچھی طرح اپنے گرد و پیش کا جائزہ لیا تو خوف نے مجھے جکڑ لیا۔ پانی کی لہریں غصیلے سانپوں کی طرح کشتی کے کناروں پر شوکتی ہوئی آتی تھیں۔ میں پانچ منٹ کے اندر سرتاپا بھیگ گیا۔ کشتی میں بھی پانی بھرنا شروع ہو گیا۔ مگر ننھا مانجھی صرف مسکراتا رہا۔ اس کے چہرے پر فکر یا خطرے کی کوئی علامت نہ تھی۔ کشتی ایک نازک کھلونے کی طرح کبھی ادھر لڑھکتی جاتی کبھی ادھر، اور کبھی سر کے بل اپنی دو سواریوں سمیت پانی کی گہرائیوں میں غوطہ لگاتی معلوم ہوتی۔ لیکن پھر یہ صحیح سلامت لہروں پر سوار نکل آتی۔ پہلے پندرہ بیس منٹ تک میرا سانس اوپر کا اوپر اور نیچے کا نیچے رہا اور میری ہڈیوں کا گودا تک ڈر اور سہم سے گویا جم گیا۔ پھر لڑکے کی خود اعتمادی اور مسکراہٹ اور اس عجیب و غریب کشتی کی خطرے کے مقابلے میں چستی کو دیکھ کر مجھے کچھ اطمینان ہونے لگا۔ میں نے اس عرصے میں ایک لفظ نہیں کہا تھا، اور نہ ہی لڑکا کچھ بولا۔ اپنے مطمئن انداز کے باوجود اس کی رگ رگ چوکنا تھی۔ آنے والے خطرے کی بو وہ ایک جنگلی جانور کی طرح پالیتا اور اپنے چھوٹی مناسب جنبش سے اس پر قابو حاصل کرلیتا۔ اپنے خوف سے کچھ خلاصی پاکر میں نے دریا کے منظر کو دیکھا۔ یہ ایک پرُجلال، ہولناک اور بے حد خوبصورت منظر تھا — سہ پہر کے سونے سے رنگے ہوئے، اچھلتے، بپھرتے اور شوکتے ہوئے پانی۔ ہم ایک دو 'جزیروں' کے پاس سے گذرے — سیلاب میں آدھی ڈوبی ہوئی بستیاں؛ لوگ ڈھکیوں پر چارپائیوں پر لیٹے ہوئے اور کھجوروں کی چوٹیاں پانی پر جھومتی ہوئی۔ میں نے سوہنے (یہ اس ننھے مانجھی کا نام تھا، اور کتنا مناسب!) سے پوچھا کہ یہ لوگ ڈرتے نہیں؟ اس نے کہا، ''نہیں، یہ لوگ دریائی ہیں اور دریا پر وہ اتنے ہی محفوظ ہیں جتنے زمین پر۔''

اس وقت دریا میں سوائے سوہنے کی چھوٹی کشتی کے اور کوئی کشتی نہیں تھی۔ ہم کبھی بانس اور

کبھی چھوٹی مدد سے پہلے ہوا اور بہاؤ کی مخالف سمت گئے۔ پھر تھکے ماجھی نے کشتی کے پیندے میں ایک سوراخ میں اپنا بانس گاڑ دیا اور سرکنڈوں سے بنا ہوا ایک بادبان، جو اس نے تختوں کے نیچے رکھا تھا، نکال کر اسے مہارت سے اس بانس پر باندھ دیا۔ اس نے یہ سب کچھ عمل اطمینان اور لاپروائی سے کیا جیسے یہ دنیا کی آسان ترین چیز ہو۔ محض بچے کا کھیل۔ اس کے لیے واقعی یہ کھیل تھا۔ اس کے بعد وہ چین سے بیٹھ گیا اور میں نے اسے ایک سگریٹ سلگا کر دیا۔ وہ بڑا خوش ہوا اور اسے ایک جوان کی طرح پینے لگا۔

”اب کوئی فکر کی بات نہیں۔ بیڑی ہمیں خود بخود دریا پار لے جائے گی سائیاں۔ دریا میں اچھی کشتی ہے اور میری بیڑی کا جی۔ سائیاں، تم اب تک تو تھک گئے ہو گے۔“

اس نے مجھ سے پوچھا کہ میں کس ملک سے آیا ہوں اور کھیو کس کے پاس جا رہا ہوں۔ میں نے اسے اپنے چچا کا نام بتایا تو اس کے چہرے پر ایک سایہ سا آیا، لیکن پھر اس پر خوشی کی چمک عود کر آئی۔ ”اساں سوہنے سائیں دی رعیت ہاں۔ میں تہانوں اتھے لے جاساں۔“

شام پڑنے لگی تھی اور پرلا کنارہ، جس کی طرف ہم جا رہے تھے، کھجوروں اور درختوں کی ایک دھندلا سا بن رہا تھا — دریا کے بہاؤ کی سمت ایک دو میل دور۔ ہو بنا کشتی کی اپنے کھوکھے، سیدھی سمت پر رکھنے کے لیے چپو چلا رہا تھا اور بس۔

وہ گانے لگا۔ اس کی آواز میں ایک وحشیانہ ترنم تھا، ایک آزاد الاپ تھی — اپنے دریا سے مستعار لی ہوئی الاپ۔ یہ اس کے وطن کا نغمہ تھا جہاں آدمی قدرت کے ساتھ ہم آہنگی سے رہتا تھا اور تومند اور دلیر اور جیالا ہو کر پروان چڑھتا تھا:

میری بیڑی ویندی پئی اے
تیری کھلدی ویندی پئی اے
دریاواں دی مچھی اے
سوہنی اے تے سچی اے
میری بیڑی ویندی پئی اے
بھلن تے منجدھار دریا دے
ترکندے سنگھاڑ دریا دے
بیڑی دے ہن یار سجانے

”یہ بڑا اچھا گیت ہے سوہنا۔ یہ گیت کس کا ہے؟“

میرے یہ کہنے سے وہ بڑا خوش ہوا۔ ''یہ گیت میں نے خود بنایا ہے۔ میں نے اور کئی گیت بنائے ہیں۔ جب میں مچھلی کے شکار پر آتا ہوں تو گیت خود بخود میری زبان پر آجاتے ہیں۔ بہت سے تو مجھے بھول بھی گئے ہیں۔ مگر کیا ہوا، نئے گیت میں آسانی سے بنالیتا ہوں۔''

سوہنے میں ایک شاعر کی روح تھی، اور جب شام گہری ہوئی تو میں نے اپنے خوف کو بالکل بھلا کر اس سے مختلف سوال پوچھنے شروع کیے۔ اس سے زیادہ پرکشش اور حیران کن لڑکا میں نے پہلے کبھی نہ دیکھا تھا۔

اس نے مجھے بتایا کہ وہ ایک چوہڑے کا بیٹا ہے اور اس کا باپ مرچکا ہے۔ اس کی ماں نوکریاں بن کر پیٹ پالتی ہے اور وہ اپنی چھوٹی کشتی میں مچھلیاں پکڑتا ہے۔ وہ بہت غریب ہیں اور دنوں تک ان کی خوراک میں ابلی ہوئی مچھلی اور بھنے ہوئے باجرے کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ انھیں ہفتوں تک کھانا نصیب نہیں ہوتا۔

یہ کشتی جس میں ہم اس نیلے پانی پر سفر کررہے تھے، سوہنے نے خود اپنے ہاتھ سے ایک کھجور کے تنے کو کھوکھلا کرکے اور کچھ تختے جوڑ کر بنائی تھی۔ اس میں بیٹھ کر وہ اکیلا مچھلی پکڑنے جاتا — کانٹے اور ڈور کے بغیر۔ اس کے پاس ایک پھٹا پرانا جال تھا جو ایک شناسا مچھیرے نے اسے دیا تھا۔ اسے ایسی آوازیں نکالنی آتی تھیں، خاص قسم کی سیٹیاں اور کلکاریاں اور لوریاں، کہ جن کو سن کر مچھلیاں خود بخود کشتی کی طرف کھنچی چلی آتی تھیں۔

''سائیاں، میکوں مچھی آون دا آپے آپ پتا چل ویندا اے۔'' اس نے کہا۔

سوہنے میں وہ چھٹی حس تھی جو قدرت کے سب جنگلی جانوروں میں پیدا ہوجاتی ہے۔ اسی حس سے ہوا کے پرندے طوفان کے آنے سے گھنٹوں پہلے خبردار ہوجاتے ہیں اور شکاری کتے خرگوش کے قدموں سے اس کی بو پاکر اپنے کان کھڑے کرلیتے ہیں اور چمگادڑ اپنی آنکھوں کے بغیر سب رکاوٹوں سے بچتی بچاتی اڑتی ہے۔ اب بھی زمین میں ایسے لوگ ہیں جو زمین کے نیچے پانی کو سونگھ لیتے ہیں، اور کبھی ایسے ریڈ انڈین بھی ہوتے تھے جو ایک ٹہنی کی ہلکی سی چیخ سے یہ بتا سکتے تھے کہ ان کی کھوج میں کون دشمن آرہا ہے۔ سب مخلوقات جو قدرت کے ساتھ یکجان ہوکر رہتی ہیں، اس چھٹی حس کی مالک ہوتی ہیں، اور یہ باعث حیرت نہیں کہ ننھے مانجھی کو یہ پتا چل جاتا تھا کہ مچھلی آرہی ہے۔

جب مچھلی نزدیک آجاتی تو وہ اپنے منھ میں چاقو اور ہاتھ میں جال لیے دریا میں چھلانگ لگا دیتا۔ وہ کبھی کشتی میں سے جال نہیں پھینکتا تھا کیونکہ جال پھٹا پرانا تھا اور اس میں سے مچھلی کے نکل جانے کا خطرہ تھا۔ پانی میں وہ مچھلیوں کو جال میں پکڑنے کی کوشش کرتا۔ یہ کوشش اکثر بارآور ہوتی،

لیکن اگر مچھلی جال میں کسی وجہ سے نہ آتی تو وہ اپنے ہاتھ استعمال کرتا۔

اس نے مجھے بتایا کہ وہ مچھلی کے شکار کے وقت منہ میں چاقو کیوں داب رکھتا ہے؟ اس نے کہا، دریا میں ایک بڑی مچھلی بھلن ہوتی ہے۔ جب مچھلیاں اس کی کشتی کی طرف آتی ہیں تو بعض دفعہ یہ بھلن ان کے پیچھے پیچھے آ پہنچتی ہے۔ یہ گدھے جتنی بڑی ہوتی ہے اور بہت طاقتور ہوتی ہے۔

"یہ چاقو، سائیاں، بھلن کو مارنے کے لیے ہے۔ میں بھلن کے پیٹ کے نیچے تیر کر جاتا ہوں اور دو تین بار اس کے پیٹ میں چاقو گھونپتا ہوں۔ اپنے قد و قامت کے باوجود یہ آسانی سے مر جاتی ہے۔"

سونبے نے مجھے اپنی بائیں ٹانگ دکھائی۔ یہاں گھٹنے سے ذرا نیچی تک ایک گہرا نشان تھا۔ "سائیاں، بوجھو یہ کیسے ہوا۔"

"مجھے معلوم نہیں۔" میں نے کہا۔

"تم کو یقین نہ آئے گا سونبے سائیاں، ایک دفعہ میں پورے ماتے میں بیڑی میں مچھلی پکڑنے گیا۔ بڑی دیر تک کوئی مچھلی نہ آئی اور میں سمجھا کہ اس حصے کی سب مچھلیاں کہیں چلی گئی ہیں۔ پھر جب میں گھر کا رخ کرنے لگا تو مچھلیوں کا لشکر بیڑی کی طرف تیرتا ہوا آیا۔ لیکن اس کے پیچھے گدھے جتنی بڑی بھلن تھی۔ میں چاقو منہ میں داب پانی میں اتر گیا۔ اب بھلن مچھلیوں کو کھاتی ہے اور سنسار بھلن کا شکار کرتا ہے۔ اس وقت بھلن کے پیچھے پیچھے ایک سنسار بھی بھلن کو کھانے چلا آیا تھا۔ یہ مجھے پتا نہ تھا۔ میں بھلن کے پیٹ میں چاقو گھونپنے لگا تھا کہ پیچھے سے سنسار نے اپنے جبڑے میں میری ٹانگ کو پکڑ لیا۔ سائیاں، تم یقین نہیں کرو گے۔ میں نے اپنے ہوش و حواس بجا رکھے۔ میرے باپ نے مجھے ایک بار بتایا تھا کہ سنسار کی آنکھیں اگر اندھی کر دو تو وہ بے بس ہو جاتا ہے۔ بس سائیاں، میں تیر کر سنسار کے دہانے کے سامنے آیا اور اس کی آنکھوں میں چاقو سے دو گھونپے دیے۔ بڑا لہو بہا۔ سنسار تکلیف سے تڑپنے لگا اور اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ میں بچ کر اپنی کشتی میں چڑھ آیا مگر میری ٹانگ بالکل لوتھڑا ہو گئی۔ ہسپتال میں وہ اسے کاٹنے لگے تھے، پر بڑے ڈاکٹر نے کاٹنے نہ دیا۔ مجھے ہسپتال میں چار پانچ مہینے رہنا پڑا اور میری ٹانگ اب سوائے اس نشان کے بالکل ٹھیک ہے۔"

ننھا ماجھی جھوٹ نہیں بول رہا تھا۔ اس کے چمکیلے چہرے پر صاف لکھا تھا: میں سچ بول رہا ہوں!

پھر اس نے کہا، "سائیاں، میں مچھیاں کوں سڈاں؟ اس ڈار وچ مچھلیاں ہیں۔" وہ سیٹیاں

بجانے لگا اور اپنے ہاتھوں کو ایک خاص انداز میں بجانے لگا۔ تھوڑی دیر میں پانی میں مچھلیوں کے اچھلنے کی حرکت پیدا ہونے لگی۔ ننھے مانجھی کو پانی میں نہ اترنا پڑا کیونکہ ایک مچھلی چھلانگ لگا کر کشتی میں آ کر گری، تڑپتی ہوئی۔

میں یہ کہنا بھول گیا کہ ہم اب پرسکون پانی میں تھے — دریا کی چھل کے بنائے ہوئے تالاب میں۔ ہم اس پتن سے گذر آئے تھے جہاں فیری لنگر ڈالے تھی اور اب کھجوروں کے جھنڈ اس میں سے اندھیرے سبز راستوں میں شپ شپاتے گذر رہے تھے۔ کشتی میں سے کھجوروں کے گچھے توڑتے ہوئے ہم آخر خشکی پر آئے۔ مغرب کی سمت ایک سفیدی نے ہمیں بتایا کہ چاند ابھر آیا ہے۔

ننھے مانجھی نے میرا سوٹ کیس اٹھایا اور ہم سوئی سڑک پر چل پڑے۔ میرا دریائی چچا شہر کی ایک دومنزلہ حویلی میں رہتا تھا۔ میں وہاں پہلی دفعہ آیا تھا لیکن سوہنے کو اس جگہ کا پتا تھا۔ وہ مجھے وہاں لے گیا۔

میرے چچا نے مجھے خندہ پیشانی سے خوش آمدید کہی۔ اس کا چہرہ مسکراہٹوں سے شگفتہ آلود ہو گیا کیونکہ اب تک وہ میرے آنے سے مایوس ہو چکا تھا۔

جب میں اس سے مل رہا تھا تو سوہنا دروازے میں کھڑا تھا۔ میں سوہنے کو دو روپے دینے لگا تو میرے چچا کا مسکراہٹوں میں لپٹا چہرہ درشت اور سخت ہو گیا۔ وہ سوہنے پر برسا "او چوہڑ سے وے بچے، تینکوں ساڈے خاندان توں پیسے لیندیاں شرم نہیں آندی؟"

سوہنا چلا گیا۔ میرا چچا ان علاقوں میں ایک سخت اور جابر آدمی کی حیثیت سے مشہور تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ اس کا نام لینے سے سوہنے کے چہرے کی رنگت کیوں بدلی تھی۔

۲

میں مٹھن کوٹ میں دو ہفتے رہا۔ مجھے اپنے چچا سے آبائی زمین کے معاملات طے کرنا تھے مگر اس کے زرخیز دماغ میں دوسرے ارادے تھے۔ البتہ یہ میرے ذاتی معاملات ہیں اور یہاں مجھے ان کا ذکر نہیں کرنا چاہیے۔

ایک دفعہ میں نے خواجہ غلام فرید کے روضے کی عقبی گلی میں سوہنے کو پھر دیکھا۔ سوہنا مجھے اپنے گھر لے گیا۔ دریائی ناپوؤں کے کنارے پر سرکنڈوں کی ایک چھوٹی سی جھونپڑی تھی۔ اس میں مٹی کے دو تین برتنوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ یا پھر سیپیوں کا ایک ہار اور ایک بنسری دیوار سے لٹک رہی

تھی۔ سوہنا یہاں اکیلا رہتا تھا۔ اس نے کچھ افسوس سے کہا کہ اس کی ماں نے شادی کر لی ہے اور وہ اور اس کا خاوند علی پور چلے گئے ہیں جہاں اس کے سوتیلے باپ کی لوہارے کی ایک دوکان ہے۔

"سوہنا!" میں نے پوچھا، "تمہارے پاس چارپائی نہیں؟"

"میں زمین پر سوتا ہوں، سوندھی بھربھری زمین پر۔" اس نے سرکنڈوں کی ایک چٹائی مجھے دکھائی۔ "میں اس پر سوتا ہوں۔ یہ میرا بچھاون ہے۔"

"تم سانپوں سے نہیں ڈرتے؟" میں نے پوچھا۔ میں خود سانپوں سے بے حد ڈرتا تھا اور ان کے ڈراؤنے خواب دیکھا کرتا تھا۔

"سانپ مجھے کچھ نہیں کہتے۔ میں تو ان کے ساتھ کھیلتا ہوں۔"

"اور تم سردیوں میں کیا کرتے ہو؟ تمہارے پاس لحاف نہیں اور تم ٹھٹھر جاتے ہو گے۔"

"مجھے سردی نہیں لگتی۔ جب سردی سخت پڑتی ہے تو سائیاں، پتا ہے میں کیا کرتا ہوں؟ میں بہت سا گڑ کھا لیتا ہوں اور اپنے بچھاون پر لیٹ جاتا ہوں۔ یہ بڑا لمبا ہے اس لیے اس کے آدھے حصے کو الٹا کر اپنے اوپر اوڑھ لیتا ہوں۔ میں اتنا گرم ہو جاتا ہوں جتنا کہ (خرگوش) اپنے بھٹ میں۔"

میں نے اسے کہا کہ وہ میرے ساتھ شہر چلے۔ میں اسے وہاں کسی فیکٹری میں نوکر کرا دوں گا۔ مگر وہ سوچ میں کھو گیا۔ اس نے اپنا سر ہلایا، "میں اپنی بیڑی اور دریا کو نہیں چھوڑ سکتا سائیاں۔ میں فیکٹری میں کام کرنا نہیں چاہتا۔"

پھر اس نے کہا، "سائیاں، میں تیری کیا خدمت کروں؟ میرے پاس کچھ مکھانے ہیں۔" وہ ایک پیالے میں مکھانے لے آیا اور ہم کھانے لگے۔ یہ غریبانہ مہمان نوازی ایک بادشاہ کی ضیافت سے کہیں اچھی تھی۔ پھر اس نے بنسری دیوار سے اتار لی اور اسے بجانے لگا۔

"سوہنا! تم نے کوئی نئے گیت بنائے ہیں؟"

"بہت سے۔ ہر روز جب میں اپنی بیڑی میں مچھلیاں پکڑنے جاتا ہوں، نئے گیت بناتا ہوں۔ کبھی میرے ساتھ شکار پر چلو۔ میں تمھیں بہت سے گیت سناؤں گا۔"

میں نے اسے تین روپے دینے کی کوشش کی لیکن اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ سوہنا ایک خوددار لڑکا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ وہ مجھے اپنی کشتی میں مٹھن کوٹ لے کر آیا تھا اور میں نے اسے کوئی اجرت نہ دی تھی۔ اس نے کچھ نہ کہا۔ پھر میں اسے اپنے ساتھ بازار میں لے آیا۔ اور اسے اس کی پسند کی چیزیں خرید دیں — ایک نیا چاقو، ایک سیر نمک، آدھ سیر گڑ، چائے کا ڈبا، بھی، تھوڑا سا رنگدار تھا۔

وہ بڑا خوش ہوا اور اس نے کہا کہ اب وہ بادشاہ زادے کی طرح رہے گا۔
وہ اس وقت تک مجھے چھوڑنے پر تیار نہ ہوا جب تک میں نے اس سے وعدہ نہ کر لیا کہ میں کسی دن اس کے ساتھ شکار پر جاؤں گا۔

۳

میں اس کے ساتھ مچھلی کے شکار پر نہ جا سکا اور، اگرچہ میری رخصت کے چند دن باقی تھے مگر مجھے دوسرے ہی دن اپنے دریائی چچا سے ایک جھگڑے کی وجہ سے مٹھن کوٹ چھوڑنا پڑا۔ دریا کے پتن پر جاتے ہوئے میں نے سوبنے کی جھونپڑی میں جھانکا، مگر ننھا مانجھی وہاں نہ تھا۔ ساتھ کی جھونپڑی میں ٹوکریاں بننے والی ایک بوڑھی عورت نے مجھے بتایا کہ لڑکا شکار پر گیا ہے۔ "اللہ اس کو حیاتی دے۔ بڑا نیک لڑکا ہے۔ مچھلی لاتا ہے تو بچوں کو تقسیم کرتا پھرتا ہے۔ میں اس کے لیے دعا مانگتی رہتی ہوں کہ رب اسے نظرِ بد سے محفوظ رکھے۔"

مجھے اس سے نہ ملنے کا افسوس ہوا۔ میں فیری لانچ کے پتن پر پہنچا اور ٹکٹ لے کر اس میں سوار ہو گیا۔ ریل کے ڈبے کے سے کمرے میں بڑا حبس تھا اس لیے میں سامنے عرشے پر پتوار کے پاس ایک چارپائی پر جا بیٹھا جو دراصل ایک ترکی ٹوپی والے تھل تھل کرتے مخدوم کے لیے بچھائی گئی تھی۔ میں نے پتلون کوٹ پہن رکھا تھا اس لیے کسی نے اعتراض نہ کیا۔ مخدوم کے پاؤں دبانے کے لیے چار نوکر تھے اور ایک اس کا حقہ بھرنے پر مامور تھا۔ میں نے مخدوم کے ساتھ حقہ پیا اور ہم نے بہت سی باتیں کیں — اوقاف کی چیرہ دستی کی، روحانیت کی کمی کی، اور شکار کی۔ ایسے موقعوں پر آدمی خود کو بڑھا کر ظاہر کرے تو ٹھیک رہتا ہے، اس لیے میں نے مخدوم پر یہ ظاہر کیا کہ میں شکارپور میں فارسٹ آفیسر تھا۔ پھر میں نے اسے اگلی سردیوں میں وہاں شکار پر آنے کی دعوت دی۔ فیری لانچ ابھی منجدھار میں تھی کہ مجھے ننھے مانجھی کی بیڑی دکھائی دی — بالکل ننھی سی ڈونگی! ننھا مانجھی پانی میں تھا — مچھلیاں پکڑتا ہوا، دھوپ میں ایک یونانی دیوتا کی طرح حسین اور جیالا۔

اس نے ایک دفعہ بھی فیری لانچ کی طرف نہ دیکھا۔ وہ مچھلیاں پکڑنے میں بہت مصروف تھا۔
"اب دیکھو،" مخدوم نے کہا۔ "اب ہماری یہ حالت ہو گئی ہے کہ میں نے اپنے پرانے وفادار مدار المہام کو بھی چھٹی دے دی ہے۔ گورنمنٹ کہتی ہے کہ ان کی املاک چھین لو۔ کل کو کہے گی کہ ان کے شکاری کتے بھی چھین لو۔ آخر کتے بھی تو املاک میں شامل ہیں۔"
میں نے اتفاق کیا۔ اس گئے گذرے زمانے میں روحانیت کی اقدار واقعی مٹ رہی تھیں۔

۴

چار پانچ سال بعد میں علی پور میں سینئر کمپاؤنڈر مقرر ہوا۔ ہماری بیشتر آبائی جائیداد محسن کوٹ کے پاس تھی اور میں نے کوشش کر کے اپنی تبدیلی علی پور میں کرائی تا کہ جائیداد کی دیکھ بھال کر سکوں۔ میں محسن کوٹ اپنے چچا سے ملنے نہ گیا۔ ہمارے تعلقات بعض خاندانی معاملات کی وجہ سے کشیدہ اور تلخ ہو چکے تھے۔ چار سال پہلے سکھر میں میں نے ایک سندھی تاجر کے گھرانے میں شادی کر لی تھی اور اب ہمارے دو بچے تھے: ایک لڑکا اور ایک لڑکی۔ شادی ایک عجیب تجربہ ہے۔ یہ ساری کی ساری کتابوں کی تیج نہیں جتنی کہ پہلے پہل نظر آتی ہے۔ آزاد منش آدمی کو تو یہ بالکل راس نہیں آتی اور وہ کئی بار مضطرب ہو کر ان بندھنوں کو توڑ کر جنگلوں میں بھاگ جانا چاہتا ہے۔ ہمارے درمیان اخراجات پر اکثر جو تم بیزار ہوتے رہتی تھی۔ عورتیں عموماً تنگ دل اور ارضی ہوتی ہیں اور جب ان کے بچے ہو جاتے ہیں تو ان کی ساری محبت اور دلچسپی بچوں کی طرف منتقل ہو جاتی ہے اور ان کے خاوند ان کے لیے صرف ضروریات مہیا کرنے کے آلے بن کر رہ جاتے ہیں۔ ان تلخ جھگڑوں کے بعد ہم بعض دفعہ دنوں ایک دوسرے سے نہ بولتے اور ان دنوں ستا ہوا اور بجھا ہوا میں دریا پر مچھلیاں پکڑتے ہوئے ننھے ماجھی کے بارے میں سوچتا — ہواؤں کی طرح آزاد اور گیت گاتا ہوا سوہنا کتنے مزے کی زندگی گزار رہا ہوگا!

ایک دن سوہنا آ گیا۔ مجھ پر اس تیج تاریک موڈ طاری تھا اور میں ہسپتال کے دواخانے میں بیٹھا ہسپتال کے اردلی بخشو کو نمبر ایک سے لے کر نمبر دس تک مکسچر بنانے کی ہدایات بے پروایانہ انداز میں دے رہا تھا۔ تب میں نے کھڑکی میں سے سوہنے کو دیکھا — دبلا اور پیلا سوہنا، بالکل ایک مختلف سوہنا۔ اس کے ساتھ رنگدار چھینٹ کے کرتے اور گھگھرے میں ایک دیہاتی عورت تھی، پینتیس چھتیس سال کی مگر ابھی تک جوانی کی سج دھج لیے ہوئے اور نخریلی۔ سوہنا اس کے کندھے کا سہارا لیے ہوئے تھا اور گھسٹتا ہوا چل رہا تھا۔ وہ بیمار تھا۔

میں نے اسے کھڑکی میں سے آواز دی، ''سوہنے!'' اور میں باہر برآمدے میں آ گیا۔ سوہنے کے چہرے پر مجھے دیکھ کر پہلی سی مسکراہٹ آ گئی، ''سائیاں!'' مجھ سے ہاتھ ملا کر اس نے کہا، ''سائیاں، تم یہاں کہاں؟''

میں اسے اپنے دواخانے میں لے آیا اور سہارا دے کر اسٹول پر بٹھا دیا۔ عورت اطمینان سے چسکڑا لگا کر ایک دلربا حیوان کی طرح فرش پر بیٹھ گئی۔ میں تعجب کر رہا تھا کہ آیا سوہنے نے شادی کر لی ہے۔ ان علاقوں میں وٹے کے رواج کی وجہ سے سولہ سال کے لڑکے کے ساتھ اپنے سے کافی

زیادہ عمر کی عورت کا بیاہ ہو جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ سوہنے نے مجھے اس شش و پنج میں سے خود ہی نکالا۔ ''سائیاں، ایہہ میری اماں بی بی اے۔''

دریائی علاقے کی عورتیں اپنی جوانی کے رنگ روپ کو دیر تک قائم رکھتی ہیں۔

''سوہنا، تم بیمار ہو؟ تمھیں کیا ہو گیا ہے؟''

سوہنا نے مجھے بتایا کہ وہ پچھلے چار پانچ ماہ سے ایک عجیب پیچیدہ بیماری میں مبتلا ہے۔ پہلے پہل اس نے توجہ نہ دی اور مچھلیاں پکڑنے کے کام کو جاری رکھا۔ لیکن اب وہ کافی بیمار ہو گیا تھا۔ اچانک اس کے ہاتھ پاؤں بالکل سن ہو جاتے تھے۔ اسے ہلکا ہلکا بخار رہنے لگا تھا اور ایک دو دن پہلے اسے خون کی قے ہوئی تھی۔

''ڈاک دار صاحب!'' سوہنے کی ماں نے کہا، ''میرا سوہنا پتر کجھ ہو گیا ہے۔ ایہدے چہرے ول ویکھو ڈاک دار صاحب۔ میرے سوہنے نوں ٹھیک کر دوے۔''

مجھے سوہنے کی بیماری کا سن کر بڑا دکھ ہوا۔ کسی طرح میرے دل میں یہ بات نہ آتی تھی کہ سوہنا بھی سب کی طرح بیمار پڑ سکتا ہے۔

سوہنے نے کہا، ''جب میں بیمار پڑ گیا تو میں اپنے ماما کے ساتھ بس میں بیٹھ کر اپنی اماں بی بی کے پاس علی پور آ گیا۔ میری اماں بی بی یہاں یار و لوہار سے بیاہی ہوئی ہے۔ میرا متریا باپ بڑا اچھا آدمی ہے۔ پنج وقت دا نمازی۔''

سوہنا اپنی اماں بی بی کی دوسری شادی کر لینے کو بالکل قدرتی بات سمجھتا تھا اور ایک طرح اسے غرور تھا کہ اس کی ماں ایک خاوند کو پھانسنے اور اپنا گھر بسانے میں کامیاب ہو گئی ہے۔ اس کے دل میں اس کا ذرا ملال نہ تھا — یہ کوئی عجیب بات نہیں، تہذیب کے مجھو ہی ہر بات کو عجیب بنا ڈالتے ہیں۔

میں نے ڈاکٹر سے کہہ کر سوہنے اور اس کی ماں کو ہسپتال میں ایک چھوٹی سی الگ کوٹھڑی لے دی۔ ڈاکٹر مریضوں کو ہسپتال میں رکھنے کے حق میں نہ تھا۔ اس سے اس کا کام بڑھ جاتا تھا اور بعض قیمتی دوائیں جو بازار میں فروخت ہو سکتی تھیں، ضائع ہو جاتی تھیں۔ مگر میں نے اس سے کہا کہ سوہنا میرا قریبی عزیز ہے۔ یوں وہ مان گیا۔

سوہنے کو دق کی قسم کی کوئی بیماری تھی، اگرچہ پوری طرح اس کی تشخیص نہ ہو سکی۔ میں اس کا بھائی کی طرح خیال رکھتا۔ اسے وقت پر دوا ملنے اور ٹیکے بہم پہنچانے کی فکر کرتا، اور شام کو کام سے فارغ ہو کر اس کے پاس گھڑی دو گھڑی بیٹھ کر اس کی باتیں سنتا۔ جب بھی میں جاتا اس کا چہرہ کھل

اٹھتا اور ایک پگلی سی مسکراہٹ اس پر آجاتی۔ اس کی ماں سب دیہاتی عورتوں کی طرح حوصلہ مند اور محنتی تھی۔ وہ شام کو کوٹھری کے باہر ریت پر بیٹھ کر اپنے بیٹے کے لیے روٹی پکاتی۔ بعض وقت یارو لوہار آتا — بھاری بھرکم، چوڑا چکلا چہرہ، مہندی سے رنگی ہوئی داڑھی، آنکھوں میں سرمہ۔ وہ ہمیشہ سوہنے کے لیے کچھ نہ کچھ چیز لے کر آتا۔ سوہنے میں کوئی ایسی بات تھی، اس کی گفتگو کا ایسا سلجھاؤ تھا کہ ہر کوئی اس سے محبت کرنے لگتا تھا۔

لیکن ہماری تمام تر توجہ کے باوجود سوہنے کی حالت ابتر ہوتی گئی اور وہ ماضی کے سوہنے کا ایک ہیولا سا رہ گیا۔ اس کے بازو اور ٹانگیں اب پتلی سوکھی لکڑیاں نظر آتی تھیں۔ اب مجھے احساس ہونے لگا کہ ہواؤں اور دریاؤں کا پالا سوہنا ہمارے پاس سے چلا جائے گا۔ لیکن وہ کیسے مر سکتا تھا؟ وہ جو قدرت کے عناصر میں سے ایک تھا، دریا جس کا بھائی تھا اور بیڑی جس کی بیوی اور محبوبہ تھی! وہ جو لہروں پر بادشاہ کی طرح سوار ہوتا تھا اور دیوتاؤں کی طرح گیت گاتا تھا! مچھلیوں کو کلکاریوں سے بلا لینے والا سوہنا! بھٹکن اور مگرمچھ سے کشتی کرنے والا سوہنا! وہ بھلا کیسے مر سکتا تھا؟

ایک شام میں اس کی کوٹھری میں گیا۔ اتنی کمزوری کے باوجود اس کی آنکھوں میں وہی روشنی تھی۔ اس نے کہا، ”سائیاں، میں اچھا ہو جاؤں گا تو ہم چھل پر مچھلیاں پکڑنے جائیں گے۔“

”ہاں ہاں سوہنا، تم اچھے ہو جاؤ گے۔“

پھر وہ اداس ہو گیا۔ ”میری بیڑی میرے واسطے موجھی ہوی۔ سائیاں، میں مر گیا تے میری بیڑی دا کیا ہوی؟“

”تم جلد اچھے ہو جاؤ گے سوہنے۔“

”نہیں، اب نہیں سائیاں!“ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ”حیاتی کتنی سوہنی شے ہے سائیاں۔ میں مرویساں تے تاں دریا میکوں یاد کریسی کہ کوئی حوصلے والا نکا میڈی چھاتی دے چڑھ کے گمدا ہا (گاتا تھا)۔ میری مچھلیاں پچھیسن (پوچھیں گی) کہ چھوٹا جیا ماجھی کتھاں اے جیہڑا کلکاریاں نال انہاں کو سڈ ویندا ہا۔ میں بن شکار تے کدے نہیں جاساں سائیں۔ میں کدھے ہور دریا ول ویندا پیا ہاں...“

اس کی آنکھیں کہیں دور دیکھ رہی تھیں، کسی دور کے دیس کی طرف۔ پھر اس پر کھانسی کا ایک سخت دورہ پڑا۔ کھانستے کھانستے اس کا دم گھٹنے لگا اور وہ جھٹ لیٹ گیا۔ اس کی ماں بھاگتی بھاگتی اندر آئی اور اپنے بیٹے سے روتی ہوئی لپٹ گئی، ”او میرے سوہنے لعل! او میرے سوہنے پتر!“

میں بھاگا بھاگا کورامین لانے گیا۔ لیکن جب میں لوٹا تو سوہنا بہت دور جا چکا تھا۔

اس کی ماں چھاتی پیٹ کر بین کر رہی تھی، مگر سوہنا جیسے چپ چاپ سو رہا تھا، ہونٹوں پر مسکراہٹ لیے، جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ وہ زندگی اور موت کے بڑے پر شور دریا پر تن تنہا مچھلی اور بھلن کا شکار کرنے چلا گیا تھا، میرا ننھا ماجھی!

جوڈی اور میں

جوڈی السیشین نسل کا ایک کتا ہے جو میری زندگی میں اُس وقت داخل ہوا جب میں پنشن ملنے پر بہاول پور میں اپنے آبائی گھر میں آ آباد ہوا۔ میرے بھائی کے بچے بھی لاہور جانے کے بجائے، جہاں میرے بھائی کی نہر کے محکمے میں پوسٹنگ تھی، اسی گھر میں منتقل ہو گئے۔ آبائی مکان کی تقسیم یوں ہوئی تھی کہ آدھا مکان میرے حصے میں آیا تھا اور دکھنی طرف کا آدھا مکان بھائی کے حصے میں۔ جوڈی میرے بھائی کا کتا تھا۔ ایک صبح وہ رحیم یار خاں سے گھر کے سامان اور دو بکروں کے ساتھ ٹرک میں بہاول پور آیا۔ میرے بھائی کو پالتو جانور رکھنے کا شوق ہے۔ اس کے پاس دو گھوڑے بھی تھے۔ (دراصل وہ گھوڑوں کا عاشق ہے اور ایک گھوڑے کو میں نے کھانے کی میز پر ایک بڑی پلیٹ میں کھاتے بھی دیکھا ہے۔) اس نے یہ دونوں گھوڑے چک عبداللہ میں اپنے فارم پر بھجوا دیے تھے، کیونکہ آبائی مکان میں ان کی دیکھ بھال ممکن نہ تھی۔

میں نے کتا کبھی نہیں رکھا۔ (حقیقت میں میں سب جانوروں سے بیزار ہوں، خواہ وہ کتے ہوں یا بلے یا گھوڑے یا کوئی اور چوپائے۔ مجھ میں اور جانوروں میں کبھی اتفاق رائے نہیں ہو سکا اور ہم اپنی مختلف راہوں پر چلتے رہے ہیں۔) پہلے پہل میں نے کتے اور بکروں کو محفوظ فاصلے پر رکھا اور ان کے معمولات اور افعال پر مطلقاً کوئی توجہ نہ دی، مگر رفتہ رفتہ میں نے دیکھا کہ ہم ایک دوسرے کی زندگیوں پر چند لطیف اور پراسرار طریقوں سے اثر انداز ہو رہے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ میرے بیوی بچے ابھی کراچی میں تھے، اور بھائی کے بچے بھی اکثر ایک ایک دو دو مہینوں کے لیے لاہور آتے جاتے رہتے تھے، اس لیے کئی بار اس مکان میں یہ جانور ہی میرے ہمجولی اور ہم صحبت ہوتے، سوائے اس چھوٹے بچے شادی خاں کے جس کا ذکر میں پھر کبھی کروں گا۔ اس طرح جب بھائی کے بیوی بچے لاہور چلے جاتے تو جوڈی اور بکروں کی دیکھ بھال کی ذمے داری مجھ پر آن پڑتی

اور میں ایک طرح ان کا گارڈین بن جاتا۔

جوڈی ایک اونچا، جوان سال السیشین تھا — آنکھیں زرد کرنجی، معصوم تھوتھنی اور نوکیلے مضمحل کان۔ اس کی پوستین گہری گرے تھی جس میں کہیں کہیں تھوڑی سی سفیدی جھلکتی تھی۔ جوڈی کا اگلا بایاں گٹا رحیم یار خاں میں ایک اسکوٹر کو سامنے سے لینے کی کوشش میں کچلا گیا تھا اور وہ یہ پنجہ کچھ اوپر اٹھائے تین ٹانگوں پر چلتا تھا۔ تم اسے لنگڑا کہہ سکتے ہو، مگر وہ اس معذوری کو زیادہ خاطر میں نہیں لاتا تھا۔ جب وہ آیا تو اچھا خاصا چاق و چوبند، ٹھیک ٹھاک کتا تھا اور اس کی پوستین صاف، ستھری دار تھی۔ پھر خدا جانے اس کو نئی جگہ کی آب و ہوا راس نہ آئی یا کسی پراسرار بیماری نے اس کے بدن میں گھر کرلیا کہ وہ سست اور نڈھال رہنے لگا اور اتنا دبلا ہوگیا کہ اس کی پسلیاں نکل آئیں۔ ناتوانی کی وجہ سے اس کا دایاں کان، جو لوپر سے کچھ کترا ہوا تھا، سیدھا کھڑا رہنے کے بجائے نیچے ڈھلک آیا۔ اسے دیکھ کر ترس آتا تھا۔ بھائی کے بچے، کتوں کے عاشق نہ ہونے کی وجہ سے، اسے زیادہ منھ نہیں لگاتے تھے۔ کوئی اسے سلوتری کے پاس لے کر نہ گیا۔ بھابی البتہ اس کا خیال کرتیں اور دو وقت کی روٹی اور دودھ اسے دیتیں۔ جب بھائی کا کنبہ پہلی بار ایک دو مہینے کے لیے لاہور گیا تو میرے علاوہ گھر میں جوڈی، میانوالی کے دو بکرے، دو سالہ بچے شادی خاں اور اس کی نیم باؤلی ماں رہ گئے۔ زمانے کی ستائی ہوئی منظوراں مائی میری روٹی پکا دیتی اور میں اپنے کمرے میں لکھنے پڑھنے میں مصروف رہتا۔ بکرے جوڈی کے چارج میں تھے، یعنی جوڈی سے یہ ڈیوٹی متوقع تھی کہ وہ بکروں پر نظر رکھے اور ان کو کوٹھی کے احاطے سے باہر سڑک پر نہ بھٹکنے دے۔ جوڈی اپنی اس ڈیوٹی کو خوبی سے انجام نہ دیتا۔ ویسے بکرے تھے بھی بڑے نٹ کھٹ اور سیلانی۔ وہ جوڈی کی بخ بخ اور گھیرے کی پروا نہ کرتے اور کوٹھی کے احاطے میں جہاں چاہتے گھومتے پھرتے اور مینگنیاں کرتے۔ انھیں چارپائیوں پر چڑھنے اور وہاں ضروریات سے فارغ ہونے کا بہت شوق تھا۔ آہستہ آہستہ انھوں نے جوڈی کو نظر انداز کرنا شروع کردیا اور جوڈی بھی انھیں ناقابلِ اصلاح جان کر ان کی بداعمالیوں سے درگزر کرنے لگا۔ اپنی ڈیوٹی سے جوڈی کی اس غفلت نے، جو میرے نزدیک اس کی انتہائی سستی تھی، مجھے تین چار موقعوں پر طیش سے پاگل کردیا اور میں نے بید سے اس کی بری طرح ٹھکائی کی۔ جوڈی نے اسے کبھی معاف نہیں کیا، مگر یہ بعد کی بات ہے — پہلے پہلی باتیں۔

بھائی کے بچوں کے جانے کے بعد میں نے جانوروں کی دیکھ بھال کی ذمے داری اپنے سر لیتے ہوئے جوڈی کے قریب آنے اور اسے دوست بنانے کا ارادہ باندھا۔ وہ ان دنوں بڑی افسوسناک اور تباہ حالت میں تھا اور میں نے محسوس کیا کہ جوڈی کو پیار محبت اور دیکھ بھال کی ضرورت

ہے۔ اس دوستی میں بھی پہل جوڈی کی طرف سے ہوئی۔ جوڈی کی عادت تھی کہ جب بھی میں کسی کام یا سیر کی غرض سے کوٹھی کے باہر جاتا تو وہ لنگڑا کر بھاگتا ہوا پھاٹک تک پہنچ جاتا اور اپنے گھٹنوں پر بیٹھ کر رحم طلب نگاہوں سے مجھے دیکھتا کہ میں اسے اپنے ساتھ آنے دوں۔ میں پھاٹک بھیڑ کر اسے پیچھے جانے اور بکروں کی رکھوالی کرنے کا آرڈر دیتا اور وہ دبک کر مایوسی کے عالم میں لوٹ جاتا۔ پھر مارچ کے شروع میں، جب ہوا میں بہار کی خوشبوئیں رچی تھیں، میں نے ڈاکٹر کی ہدایت پر صبح کے وقت کی لمبی سیر کا آغاز کیا۔ سپیدۂ صبح نمودار ہونے سے پہلے میں چائے اور سگریٹ پی کر اور بوٹ پہن کر اپنے کمرے سے نکل کھڑا ہوتا۔ جوڈی پہلے ہی جاگا ہوا اور ہوشیار، پھاٹک پر میرا منتظر ہوتا۔ ایک دو دن تو میں نے اسے "گیٹ بیک، جوڈی!" کہہ کر واپس بھیج دیا، پھر سیر کے لیے اس کا شدید اضطراب اور اشتیاق دیکھ کر اسے اپنے ساتھ سیر پر لے جانے لگا۔ اور پھر وہ آدمی اور کتے کی لمبی سیریں!

جوڈی کی یہ اضطرابی کیفیت اور مسرت مجھے حیران کر دیتی۔ وہ سینٹرل لائبریری کے پارک میں سے گزرتے ہوئے ہر جھاڑی کو سونگھتا، کھڑے ہوئے پانی میں سے چھپ چھپ کرتا، چھینٹے اڑاتا گزرتا، چڑیوں اور کوؤں کو تاکتا اور ان کے تعاقب میں بھاگتا۔ ایک دفعہ میں نے اسے ایک شریر تیتری کو پکڑنے کے لیے دیوانہ وار ایک ہی جگہ گھومتے اور چکر کاٹتے دیکھا۔ وہ اٹکھیلیاں کرتا، کھیلتا اور مچل مستیاں کرتا — کتنے انسان ہیں، میں سوچتا ہوں، جو قدرت کی جمال آرائیوں، رنگینیوں اور حیرتوں کو اس طرح اپنے رگ و پے میں محسوس کرتے ہوں گے جیسے جوڈی ان سیروں میں کرتا تھا۔ وہ اکثر مجھ سے آگے دوڑتا اور راستے پر کھڑا ہو کر میرے آنے کا انتظار کرتا۔ سینٹرل لائبریری کے باغوں کو پار کر کے جب ہم کچہریوں کے پاس سے گزرتے تو وہ وکیلوں کے بنچوں کا تفصیلی جائزہ لیتا اور پھر اچانک مڑ کر کسی غیر متوقع گوشے سے اپنی مضحک صورت دکھاتا۔ (اگر کتے ہنس سکتے ہیں تو جوڈی اس وقت ہنس رہا ہوتا تھا۔) دو ڈھائی میل کی اس سیر کے بعد کتا اور آدمی گھر لوٹ آتے۔ جوڈی بھوکا ہوتا اور اپنے ناشتے کے لیے بیتاب۔ میں اسے برآمدے میں چھوڑ کر اس کے لیے ڈبے کا دودھ بناتا اور اسے ایک برتن میں انڈیل کر باہر برآمدے میں رکھ دیتا۔ میرے برتن نیچے رکھنے سے پہلے ہی جوڈی بے صبری سے اس پر پل پڑتا اور ایک منٹ میں دودھ کو چاٹ کر مجھ سے مزید دودھ کا طلبگار رہتا۔ یہ ہمارا روز کا معمول ہو گیا اور ہم بڑے اچھے دوست بن گئے۔ کئی بار جب مجھے صبح تیاری میں دیر ہو جاتی، جوڈی اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو کر برآمدے میں کھلنے والی میرے کمرے کی بند کھڑکی پر پنجے مارتا اور چیاؤں چیاؤں کی آواز نکالتا۔ میں اس کی نوکیلے کانوں اور

معصوم تھوتھنی کو کھڑکی کے شیشے میں سے دیکھتا اور اسے تقریباً یہ کہتے ہوئے سنتا، ''میاں جی، کیا بات ہے؟ کیا تم باہر نہیں آؤ گے؟ سیر میں چوک نہیں ہونی چاہیے۔'' دو تین بار جب کسی وجہ سے میں سیر کے لیے نہیں جا سکا، جوڈی کو میرا نہ جانا سمجھ میں نہ آیا اور اسے بڑی مایوسی ہوئی۔ ان سیروں میں، جن میں چھوٹا شادی خاں بھی بعض دفعہ ہمارے ساتھ ہوتا تھا (اپنی آڑی ٹانگوں سے لپکتا ہوا)، ایک خرابی تھی جو بعد میں جوڈی کی عادات اور نفسیات کو بدلنے کا موجب بنی۔ (میرے بھائی نے مجھ سے کہا کہ مجھے جوڈی کو سیر پر نہیں لے جانا چاہیے تھا۔) وہ خرابی یہ تھی:

جوڈی کی موجودگی پڑوس کے کتوں میں مشہور ہوگئی ہوگی۔ ان میں سے چند ایک نے پھاٹک کی درزوں میں جھانک کر چمکدار پوستین اور برتر وضع کے اس کتے کو، جو کسی جج کی طرح سنجیدہ معلوم ہوتا تھا، ضرور دیکھا ہوگا اور اپنے ساتھیوں کو اس کی اطلاع پہنچادی ہوگی۔ چنانچہ جس صبح جوڈی اور میں پہلی بار سیر کو نکلے، لائبریری کے پارک کے وکٹ گیٹ سے اندر جاتے ہوئے مختلف قد و قامت اور وضع قطع کے کتوں کی فوج جوڈی کی آؤ بھگت کے لیے موجود تھی۔ جوڈی کو دیکھتے ہی وہ بخ بخ کرتے، غراتے اور کھکھیاتے ہوئے اس کی پیشوائی کو آگے لپکے۔ ان کے ارادے اچھے نہیں تھے۔ جوڈی ہف ہف کر کے دو تین کی طرف لپکا مگر پھر یہ دیکھ کر کہ وہ بہت سے ہیں، میرے ساتھ ساتھ لگ گیا۔ میرے پاس چھڑی نہ تھی جس سے انھیں ذرا بھگاتا۔ میں نے ایک سفید کتیا کو، جو دوسروں سے بڑھ کر کھکھیا رہی تھی اور غالباً اس ٹولی کی سرغنہ تھی، ہاتھ سے ذرا کر دور رکھنے کی کوشش کی مگر وہ اپنے سفاک دانتوں کو مسوڑھوں تک ننگا کیے مجھ پر لپکنے کو ہوئی۔ میں اس سے کچھ ڈر سا گیا، اگرچہ میں بالعموم کتوں سے نہیں ڈرتا۔ اس کتیا نے پھر اپنا ارادہ بدل دیا، مگر اس نے اور اس کے ساتھیوں نے بھونکتے ہوئے ہمارا محاصرہ جاری رکھا۔ انھوں نے لائبریری کے پرلے پھاٹک پر رسم مشایعت عمل میں لاکر ہم کو رخصت کیا۔

سیر سے لوٹنے کے بعد، میں نے اپنے آپ کو مسلح کرنے کا فیصلہ کیا اور دوسرے روز شاہی بازار میں سوٹیوں کی واحد دکان سے پیتل کی ٹوپی والی ایک پتلی چھڑی چھانٹ چھونٹ کر خرید لایا — اس قسم کی چھڑی جو گھڑ سوار اپنی رانوں کو تھپتھپانے کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ (یہ چھڑی کئی بار غائب ہونے کے بعد اب بھی میرے پاس موجود ہے، اگرچہ جوڈی اور میں نے اپنی سیریں ایک عرصے سے موقوف کر دی ہیں۔) یہ چھڑی بہت مفید ثابت ہوئی۔ اس سے میں بڑی آسانی اور اعتماد کے ساتھ جوڈی کے مخالفین کی روک کر سکتا تھا۔ اس کے بیری مجھے ہتھیار بند دیکھ کر ذرا فاصلے سے غراتے۔ جوڈی خود کو محفوظ محسوس کرنے لگا بلکہ شیر ہوگیا۔ اب میرے ساتھ دبکنے کے بجائے وہ

اپنے مخالفوں کو جواب آں غزل دیتا، موثر طور پر بھونکتے ہوئے ان کا تعاقب کرتا۔ دو تین بار اس نے چند کتوں کی گردن ناپی اور انھیں پچھاڑ دیا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ مجادلہ کرنے والے کتے حقیقت میں اس نو وارد کے متعلق محض متجسس تھے اور اس کا دم خم آزما کر اس سے راہ و رسم پیدا کرنے کے خواہاں تھے۔ چند بار مجھے شک سا گذرا کہ جوڈی کھڑا ہو کر ان واویلا مچاتے ہوئے پلوں کو حسرت سے دیکھ رہا ہے، جیسے وہ بھی ان کے ساتھ شامل ہو کر کھیلنا کودنا اور دھینگا مشتی کرنا چاہتا ہو۔ ان کی طرف جوڈی کا انداز شدید معاندانہ نہ رہا۔ آہستہ آہستہ اس میں ایک قسم کی نرمی اور بردباری سی آگئی۔ کیا وہ اپنی بدیسی نسل کا ہونے کی غیرت کھو رہا ہے؟ مثل ہے کہ آدمی ایک سوشل یا معاشرتی حیوان ہے۔ میرے خیال میں کتا آدمی سے بھی کہیں زیادہ سوشل حیوان ہے۔ تم نے کتے تو مرد والے اکیلے جاتے کم ہی دیکھے ہوں گے۔ بیشتر وہ ٹولی بنا کر گھومتے پھرتے ہیں، جیسے کسی پارٹی میں جا رہے ہوں یا کسی پارٹی سے آ رہے ہوں۔ اس کے باوجود وہ بعض دفعہ ناپسندیدگی کا اظہار کر کے ایک دوسرے کو گھرکتے اور کاٹتے ہیں۔ جلد ہی بغیر کسی جھجک کے ان میں صاحب سلامت ہو جاتی ہے۔ نسل، پوسٹین کی رنگت، شکل وشباہت اور سائز کی کوئی قید نہیں ہوتی۔ ممکن ہے اس فوری دوستی میں جنس کا بھی کچھ دخل ہو، مگر قیاس لگاتا ہوں کہ ان کی سوسائٹی پرمسو (permissive) یا جنسی طور پر آزاد سوسائٹی ہے اور ان کی جنسی عادتیں اور رسمیں جدید امریکیوں سے ملتی جلتی ہیں۔ انھیں کی طرح وہ اجتماعی یا گروہی سیکس، بیوی کے باہمی تبادلے اور برسر عام اختلاط وغیرہ کے قائل ہیں (گو جہاں تک میں جانتا ہوں، وہ ہوموئیں ہوتے، جیسا کہ بعض انسان ہوتے ہیں)۔ البتہ ان کی ان حرکتوں اور جولانیوں کا ایک موسم ہوتا ہے، جس کے گذرنے کے بعد وہ جنس میں دلچسپی کھو دیتے ہیں۔

اب جوڈی کی طرف واپس آتے ہوئے — ایک شام میں اور شادی خاں جوڈی کو لائبریری کے میدانوں میں پھرا کر واپس آ رہے تھے کہ اسکوٹر پر سوار، مقطع ڈاڑھی والے ایک موٹے آدمی نے اسکوٹر میرے پاس روکا۔ اس نے ایک نظر جوڈی پر ڈالی اور پھر مجھ سے کہا کہ وہ میری تلاش میں آیا ہے۔ اس کی ایک السیشین کتیا تھی اور وہ جاننا چاہتا تھا کہ آیا میں جوڈی کا اس سے میل کرانے پر رضامند ہوں گا۔ میں نے کھرے لہجے میں جواب دیا کہ ہم جوڈی کا السیشین کتیا یا کسی اور کتیا سے میل کرانے پر تیار نہیں۔ مقطع ڈاڑھی والا شخص ایسی بے ہودہ، مخرب اخلاق بات کیونکر کہہ سکتا ہے — میرا خون ابلا۔ اس نے پھر میری طرف اس امید سے دیکھا کہ شاید میں اس کی درخواست مان جاؤں گا۔ جوڈی نے غالباً تاڑ لیا کہ ہم اس کی باتیں کر رہے ہیں، اور وہ ہمارے پاس آگیا۔ اس کی پسلیاں نکلی ہوئی تھیں اور حالت اتنی خستہ اور ماتم خیز تھی کہ مجھے اس کی جنسی اہلیت

کے بارے میں شک تھا۔ اگر وہ یہ کرتب انجام نہ دے سکا تو جوڈی کا مالک ہونے کی حیثیت سے میری کرکری ہوگی۔ میں نے حتمی طور پر ''نہیں'' کہا اور وہ آدمی اپنا سا منھ لے کر چلا گیا۔ ہوسکتا ہے میرے اس انکار میں میرے اپنے جنسی ٹیبوز (taboos) اور خوف بھی کارفرما ہوں۔ سیکس ایک ذرتی فعل تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ جوڈی کو اس مضحکہ خیز، نامعقول آزمائش میں ڈالا جائے جس سے اس کا عہدہ برآ ہونا بھی یقینی نہ تھا۔

اب میں سوچتا ہوں کہ میرا فیصلہ درست تھا۔ جوڈی کو سیکس میں زیادہ دلچسپی نہیں رہی تھی، اور میرا خیال ہے اب بھی نہیں۔ جہاں تک میں جانتا ہوں، اس نے کوئی شدید جوشیلی قسم کی 'ڈیٹنگ' (dating) اپنی اس وقت تک کی زندگی میں نہیں کی۔ غالباً وہ جتی ستی ہوئی ہے، اب تک ایک ورجن۔ جوڈی کے ساتھ ان سیروں میں میں کتوں کی دنیا سے آگاہ ہوگیا اور سڑک پر ان آوارہ کتوں کو جو مجھے راہ میں ملتے، ان کی نسل اور قبیلے کے مطابق شناخت کرنا میرا آخر یکی مشغلہ بن گیا۔ بے شک یہ غیرملکی پالتو بورژوا کتے نہ تھے، گلیوں میں پلے بڑھے اور نازونعم میں پلے؛ یہ پرول (prole) کتے تھے، اور میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ وہ اپنے حلیے اور قدکاٹھ میں اپنے بدیسی بھائیوں سے کافی ملتے جلتے ہیں اور آسانی سے کلاسیفائی کیے جاسکتے ہیں۔

جوڈی کے ساتھ میری یہ صبح کی سیریں جاری رہیں مگر ان سے اس کی صحت بہتر نہ ہوئی۔ وہ دبلا اور کمزور ہوتا گیا اور اس کی پسلیاں اور نمایاں ہوتی گئیں۔ وہ کسی پوشیدہ عارضے میں گھلتا نظر آتا تھا جس کی وجہ سمجھ میں نہیں آتی تھی۔

پھر اس کے ساتھ میری سیروں میں ناغے آنے لگے اور رفتہ رفتہ وہ بالکل بند ہوگئیں۔ اس کی کئی ایک وجوہات تھیں، مگر میں سمجھتا ہوں ایک خاص واقعہ جو ہمیں پیش آیا، سیر کے خاتمے کا سبب بنا۔ ایک صبح میں اور جوڈی جا رہے تھے۔ جب ہم پولیس اسٹیشن سے آگے نالے کے پل پر آئے تو اس کے کنگورے پر تین چار نوجوان لونڈے بیٹھے تھے۔ انھوں نے ہمیں گستاخانہ تمسخر سے دیکھا اور ہمارے نالے کے کنارے پر مڑتے ہی ایک نے دوسرے سے کہا، ''جیسا آدمی ہے ویسا ہی کتا ہے۔'' ان کا اشارہ ہماری خستہ حالی کی طرف تھا۔ اس پھبتی پر میں جل بھن کر رہ گیا۔ میں نے پلٹ کر ان سے کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔ ہم اپنی راہ چلتے گئے۔ اگلے دن میں سیر کے لیے تیار ہوکر نہ نکلا، اور اس سے اگلے دن بھی نہیں۔ جوڈی ان سیروں کے بند ہونے پر حیران اور مایوس ہوا ہوگا۔ جب میں کمرے سے باہر برآمدے میں نکلتا تو وہ امید کی نظروں سے دیکھتا کہ شاید میں سیر کے لیے جارہا ہوں اور اسے بھی ساتھ لے جاؤں گا۔ مجھے ایسا محسوس ہونے لگا کہ جوڈی مجھ سے کچھ روٹھا

روشنی اور کھنچا کھنچا رہنے لگا ہے۔ ہماری دوستی اور رفاقت میں ان ہیروں کے بند ہونے سے رخنہ پڑ گیا جو بعد میں بھی پوری طرح پاٹا نہ جا سکا۔

انھی دنوں جوڈی میں ایک تبدیلی رونما ہونے لگی۔ شاید اس کا تعلق کچھ کچھ اس پراسرار دکھ سے تھا جو اسے کھائے جا رہا تھا۔ وہ تیزی سے ایک قسم کی بے حسی اور زبوں حالی کی طرف سفر کرنے لگا۔ اس نے ہر چیز میں دلچسپی کھو دی اور بے پروا اور لاتعلق سا ہو گیا۔ اب اس نے میانوالی کے بکروں کی رکھوالی کی ذمے داری بھی تج دی۔ پہلے وہ ان کی حرکات پر آنکھ رکھتا تھا۔ جب وہ پھاٹک سے باہر سڑک پر نکلنے کی کوشش کرتے، جوڈی ان سے دور، کچھ فاصلے سے بھونکتا (وہ بکروں کے سینگوں سے ڈرتا تھا) اور پھر گھیر کر ان کو اس ارادے سے باز رکھتا تھا۔ اب وہ بکروں پر بالکل توجہ نہ دیتا۔ وہ جہاں چاہتے آتے جاتے، گھومتے پھرتے۔ جوڈی کی بلا سے۔ وہ اگلی ٹانگوں پر سر رکھے، پژمردہ آنکھوں سے انھیں پھاٹک سے باہر جاتا دیکھتا رہتا، اور جھڑک کر انھیں تنبیہ کرنے والی بھونک بھی نہ کرتا۔ یہ بکرے بھی ایک مصیبت تھے۔ ہر دوسرے تیسرے دن منظوراں مائی مجھے اطلاع دیتی کہ ایک یا دونوں بکرے غائب ہیں۔ پھر وہ بیچاری برقع اوڑھ، ہاتھ میں درخت کی ایک شاخ لیے، شادی خاں کے ساتھ انھیں ڈھونڈنے نکلتی اور دور دراز کے کھیتوں یا ہاکی کے میدان سے انھیں ہنکا کر لے آتی۔ اس کام میں شادی خاں اس کی مدد کرتا۔

ایک دن ایک بکرا کچ گم ہو گیا۔ منظوراں مائی نے اور میں نے اس کو سڑک پر اور محلے میں ہر جگہ ڈھونڈا مگر وہ نہ ملا۔ ہمیں یقین ہو گیا کہ اس کو کسی نے پکڑ کر باندھ لیا ہو گا (کیونکہ یہ بکرے اسپیشل اور اعلیٰ تھے) اور اب اس کے لوٹ آنے کی کوئی صورت نہیں۔ مجھے اس کے کھو جانے پر بہت فکر تھی۔ جب بھائی اور بچے لاہور سے آئیں گے تو میں ان کو کیا منھ دکھاؤں گا کہ ہم بکروں کی رکھوالی نہ کر سکے۔ میں نے بکرے کے کھوئے جانے کا قصور وار جوڈی کو ٹھہرایا۔ یہ سب اس کی غفلت اور فرض ناشناسی کی وجہ سے ہوا۔ میں نے غصے میں آ کر اپنی چھڑی لی جس سے میں جوڈی کا دوسرے کتوں سے بچاؤ کیا کرتا تھا، اور اس سے اسے خوب پیٹا۔ میں بہت غصے میں تھا۔ بیچارے جوڈی کو کیا پتا کہ اسے کیوں پیٹا جا رہا ہے۔ اسے غالباً یہ علم نہ تھا کہ اسے بکرے کی محافظت کے فرض میں کوتاہی کی سزا دی جا رہی ہے۔ پہلے وہ حیران ہوا اور اس کی آنکھیں یہ کہتی ہوئی معلوم ہوتی تھیں، ''دیکھو، تم کیا کر رہے ہو!'' وہ مار کھاتا رہا۔ میرے سر پر بھی بھوت سوار تھا۔ اب میں سوچتا ہوں کہ شاید میں اپنی مایوسیوں اور شکستوں کا غصہ بیچارے کتے پر اتار رہا تھا۔ اس کہاوت میں بڑی صداقت ہے کہ کمزور آدمی کا پارہ بہت جلدی چڑھتا ہے، اور شاید ہم میں سے بہت سوں کے اندر

ایک مارکی ڈساد (Marquis de Sade) چھپا ہوتا ہے جسے ایذا رسانی سے ایک گونہ راحت نصیب ہوتی ہے۔ بیدردی اور اذیت رسانی کے اس بدنما جذبے سے میں ایک مدت سے آگاہ ہوں۔

جوڈی مار کھا کر ٹیاؤں ٹیاؤں کرتا پھاٹک سے باہر نکل گیا۔ میں نے باہر جا کر دیکھا مگر اس کا دور دور تک پتا نہ تھا۔ ''یہ بدبخت کہاں چلا گیا!'' میں نے اپنے آپ سے کہا۔ اس کے خلاف میرا غصہ اب ٹھنڈا پڑنے لگا تھا۔ مجھے احساس ہوا کہ بکرے کے گم ہونے میں جوڈی کا اتنا قصور نہ تھا۔ گھنٹہ گذر گیا، دو گھنٹے گذر گئے، جوڈی نہ لوٹا، اور میں سوچنے لگا شاید وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گا۔ کچھ اور وقت گذرنے پر میں فی الواقع اس کے بارے میں فکرمند ہو گیا۔ آخر اس کو ہوا کیا؟ میں نے منظوراں مائی سے کہا کہ جوڈی ناراض ہو کر چلا گیا ہے اور اب کہیں بھی نہیں ہے۔ اس نے کہا، ''پتا نہیں جی، کہاں گیا ہے۔ میں جوڈی کو ٹول لاؤں (تلاش کر لاؤں)؟'' وہ برقع اوڑھ کر شادی خاں کو گود میں لیے جوڈی کی کھوج میں گئی۔ جب آدھ گھنٹے بعد واپس آئی تو اس نے بتایا کہ جوڈی سینٹرل لائبریری کے میدان میں کتوں کے ساتھ کھیل رہا ہے۔ منظوراں نے جوڈی کو ساتھ لے آنے کی کوشش کی تھی مگر جوڈی نے اس کی بات نہ سنی اور اسے دیکھ کر پرے بھاگ گیا۔ ''وہ نہیں آتا جی۔ اب کیا کریے جی؟'' میں سوچنے لگا کہ جوڈی کو کیا ہوا، کیا اس کا دماغ چل گیا ہے؟ اس نے اپنی خاندانی شرافت کو بھلا کر پر دل کتوں کی صحبت میں پناہ ڈھونڈی تھی اور ان سے دوستی استوار کر کے ان کے ساتھ گھوم پھر رہا تھا۔ میں ہکا بکا رہ گیا اور چھڑی ہاتھ میں لے کر میدان میں پہنچا۔ میں نے اسے آواز دی، ''جوڈی! جوڈی، کم آن!'' اس نے مجھے دیکھا، میرے ہاتھ میں چھڑی دیکھی اور آنے سے قطعی انکار کر دیا۔ میں سمجھ گیا کہ اسے منا کر ساتھ لے جانے کی کوشش فضول ہے۔ میں واپس آ گیا۔ منظوراں مائی کے مطابق جوڈی شام کو سورج ڈوبنے سے پہلے گھر واپس آ گیا تھا مگر اس نے اپنے آپ کو میری نظروں سے اوجھل رکھا ہوگا کیونکہ میں نے اسے دوسرے دن دوپہر کو دیکھا۔ وہ چھلا سا بنا ہوا، سر اگلی ٹانگوں پر دھرے، بے حد ملول، برآمدے میں لیٹا تھا۔ خوف اب تک اس کی آنکھوں میں تھا اور اس نے مجھے اس طرح دیکھا جیسے ہم اجنبی ہوں۔ میں نے اسے سر پر تھپکا۔ ایک ہلکی سی سرسراہٹ ہوئی، مگر اس نے جواب میں میرے ہاتھ کو چاٹنے کے لیے گردن جنبش نہ کی۔ جوڈی کا چہرہ پتھر تھا۔ ہم اب بیگانے تھے۔ بھروسا اور رفاقت اب گذری بات تھی۔ اس کی جگہ عدم اعتماد اور غیریت نے لے لی تھی۔ میں نے جان لیا کہ میرے اور جوڈی کے تعلقات اب پہلے کے سے کبھی نہیں ہوں گے۔

اب جوڈی کی زندگی میں ایک نیا دور آیا۔ وہ مجھے ڈر اور نفرت اور انتہائی بدگمانی کے ساتھ

دیکھنے لگا۔ اب نہ تو وہ مجھے پھاٹک تک چھوڑنے آتا اور نہ ہی کوٹھی کے احاطے میں داخل ہونے والے کتوں سے غرض رکھتا۔

انھی دنوں میرے بھائی کے بچے آ گئے، اور مجھے دو تین مہینوں کے لیے کراچی جانا پڑا۔ جب میں لوٹا تو جوڈی بدستور بیمار اور کمزور تھا۔ اس نے مجھے بے تعلقی اور شاید خوف سے دیکھا! اس کی آنکھوں میں میرے لیے کوئی خوش آمدید نہ تھی۔ ہمارے تعلقات پھر پہلی ڈگر پر کبھی نہ آ سکے۔ میں نے بھی اسے تھپکنا اور بلانا چھوڑ دیا اور وہ بھی مجھ سے لاتعلق ہو گیا۔

پھر میں کچھ مدت کے لیے لاہور اپنے ایک ذہین بدحست دوست کے پاس ٹھہرنے چلا گیا اور جب لوٹا تو جوڈی میں ایک خوشگوار تبدیلی دیکھی۔ اس کا بدن بھر چکا تھا اور پسلیاں نظر نہیں آتی تھیں — شاید پراسرار عارضے نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ میرے پیٹھ تھپتھپانے پر نہ تو اس نے دوستی کا اظہار کیا اور نہ ہی خوف سے سمٹا۔ وہ ہماری پرانی لاگ کو بھولا نہ تھا۔ گل شیر نے مجھے بتایا کہ اس کی حالت خود بخود ہی 'نروئی' ہوتی گئی اور اب وہ بھلا چنگا ہے۔

میں نے نوٹ کیا کہ کتوں کے اندر آنے پر وہ واویلا نہ کرتا مگر ان سے زیادہ دوستی بھی نہ کرتا۔ بہت کم کتے البتہ اب کوٹھی کے اندر آتے۔ ساری مدت میں میں نے دو ہی دیکھے۔ ایک تو لال تھوتھنی والی مفلوک الحال جھبری کتیا تھی۔ اس کی پوستین کا رنگ گدلا سفید تھا۔ میں اسے اکثر بھگاتا رہتا تھا کیونکہ وہ مجھے ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ وہ کوٹھی کو بچہ بچہ اپنا گھر سمجھتی تھی۔ کھیت میں سونگھتی پھرتی یا راستے پر پڑی رہتی۔ میں نے جوڈی کو کبھی اس کے پاس جا کر لاڈ کرتے نہیں دیکھا۔ ممکن ہے اس کے دل میں جوڈی کے لیے چاہت ہو اور وہ وقتاً فوقتاً اسے دیکھنے کے لیے آ جاتی ہو۔ دوسرا ملاقاتی ایک چھوٹے قد کا سفید کتا تھا، مگر وہ بھی کبھار ہی آتا تھا۔ ظاہرا جوڈی کے پہلے دوستوں نے اسے چھوڑ دیا تھا۔ وہ بھی ان سے دوبارہ آشنائی پیدا کرنے کی خواہش نہیں رکھتا تھا۔ وہ اب پھاٹک سے باہر کبھی نہ جاتا، اور اگر جاتا بھی تو حوائج ضروری سے فارغ ہونے کی خاطر۔ وہ یہ کام گھر کے اندر کبھی نہیں کرتا تھا، جوڈی میں اتنی سمجھ تھی۔ خدا جانے یہ خوش سلیقگی اس نے کس سے سیکھی تھی۔

جوڈی اب پرانا عناد بھول کر مجھ سے مانوس سا ہونے لگا ہے اور میرا خیال ہے کہ اس نے مجھے تقریباً معاف کر دیا ہے۔ ہو سکتا ہے میرے متعلق اس کے چند وسوسے اور شکوک ابھی پوری طرح اس کے شعور سے نہ نکلے ہوں۔ میں لان میں بیٹھا سرما کی دھوپ میں ایک ناول پڑھ رہا تھا۔ جوڈی مجھ سے کچھ فاصلے پر پہلو کے بل لیٹا تھا۔ پھر وہ اٹھ بیٹھا اور پچھلے بائیں پاؤں سے اپنا پیٹ اور سر زور زور سے کھجانے لگا جیسا کہ وہ ان دنوں اکثر کرتا رہتا تھا۔ (وہ نہانے کا زیادہ قائل نہیں اور پانی

سے الرجک ہے۔) اس حالت میں وہ مجھے بڑا تماشا سا لگا اور میرا دل اسے پیار کرنے کو چاہا۔ میں نے اسے بلایا، "کم آن، جوڈی!" (جوڈی انگریزی زبان بخوبی سمجھتا ہے مگر اردو کا ایک لفظ بھی نہیں جانتا۔) وہ کھجانا بند کر کے اصالت سے میرے پاس آ گیا، مگر پُراشتیاق مستعدی سے نہیں۔ میں نے اس کی پیٹھ پر ہاتھ پھیرا اور سر کو سہلایا۔ وہ اپنا سر میرے بوٹوں میں گھسیڑ کر ان کو چبانے کی کوشش کرنے لگا۔ میرے دل میں دھک دھک سی ہوئی — اب پہلی محبت میں سے کچھ حصہ لوٹ آیا تھا اور ہم کس قدر دوست ہو گئے تھے۔ اتنے میں میلی بوسیدہ وردی والی کتیا پھاٹک کے نیچے سے سدر کر اندر آئی۔ میں نے اس کی طرف اشارہ کر کے جوڈی سے کہا، "جوڈی، گیٹ ہر!" (جوڈی، اسے بھگاؤ!) جوڈی نے میری بات پوری طرح سمجھی مگر نہ تو کتیا کی طرف جنبش کی اور نہ بھونکنا مناسب سمجھا۔ میں نے اسے کان سے پکڑ کر ذرا کرخت دار آواز میں پھر کہا، "جوڈی، آئی سے، گیٹ ہر!" اور میں نے دیکھا کہ خوف پھر اس کی آنکھوں میں لہرایا اور وہ سہم سا گیا۔ اس نے خیال کیا ہوگا کہ میں اسے اس نافرمانی کی پہلے کی طرح سزا دوں گا۔ میں نے اس کا خوف دور کرنے کے لیے اس کی پیٹھ ٹھونکی۔

چند دن ہوئے مجھے بھابی اور بھتیجی سے جوڈی کی اصل عمر کا پتا چلا اور میں یہ جان کر متعجب ہوا کہ اپنے قد کاٹھ کے باوجود جوڈی نے ابھی اپنے بچپن کو پار نہیں کیا تھا۔ میں نے جوڈی کو دیکھتے ہوئے بھابی سے پوچھا، "جوڈی کی عمر کیا ہوگی؟" وہ سوچ کر اور حساب لگا کر کہنے لگیں، "ہمارے پاس جب آیا تو نومولود تھا۔ ایک سال تو ہمارے پاس رحیم یار خاں میں رہا، اور پھر دو سال ہمیں یہاں بہاول پور میں ہو گئے ہیں۔ اس طرح جوڈی تین سال سے زیادہ عمر کا نہیں ہوسکتا۔" حالانکہ میں نے ہمیشہ جوڈی کو ایک سیانا بالغ کتا سمجھا تھا اور اسی طور پر اس سے برتاؤ کیا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا کہ کتے کی نارمل عمر کیا ہوتی ہوگی، کتنے برس میں وہ جوان ہوتا ہے۔ میں نے کئی لوگوں سے پوچھا۔ ایک نے کہا کہ کتے کی اوسط عمر اٹھارہ سال ہوتی ہے، دوسرے نے کہا تیس سال۔ کسی کو پورے طور پر یقین نہ تھا۔ پھر میں نے بک آف نالج میں ڈھونڈ کر پتا لگایا کہ کتے کی اوسط عمر چالیس سال ہوتی ہے۔ آدمی کی طبعی عمر اگر اسی برس پر رکھیں تو اس حساب سے ایک 'کتا سال' کے دو 'آدمی سال' بنتے ہیں۔ آدمی اگر سولہ برس کی عمر میں بلوغت کو پہنچتا ہے تو کتا آٹھ سال کا ہونے پر عنفوان شباب میں ہوگا۔ اور جوڈی کی عمر تو ابھی بمشکل تین 'کتا سال' یا چھ 'آدمی سال' ہے، یعنی مکتب میں داخل ہونے کی عمر۔ جوڈی کے جوان ہونے میں ابھی پانچ برس اور پڑے ہیں۔ جوڈی کی قدوقامت اور وقار دیکھ کر میں بک آف نالج کی معلومات اور اپنے حساب کے بارے میں الجھن میں

پڑھ جاتا ہوں (مجھے وہ بالکل بالغ لگتا ہے)، اور ہندی کی چندی کرنے کے لیے میں اپنے زین بدھسٹ دوست کو خط لکھنے کا ارادہ رکھتا ہوں، جس نے ایک السیشین کتا بارہ سال اپنے ساتھ رکھا اور جس کا اب السیشین یا کسی دوسری نسل کے کتوں سے کوئی واسطہ نہیں۔ ہاں چغتائی کے پاس بھی تو ایک السیشین کتیا ہے، اس سے پوچھوں گا۔ بعدازاں، پچھلے دنوں میرا زین بدھسٹ دوست لاہور سے آیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ السیشین کتے کی نارمل زندگی کتنی ہوتی ہے۔ اس نے اپنے تجربے کی روشنی میں بتایا کہ ہماری آب و ہوا میں دس بارہ سال سے زیادہ نہیں۔ اس نے مجھے یقین دلایا کہ کتے سترہ اٹھارہ سال سے زیادہ زندگی نہیں پاتے، اور یہ کہ میری کتاب میں درج کتے کی عمر صحیح نہیں ہو سکتی۔ میرے دوست کے کہنے کے مطابق انسانی زندگی کے چھ برس کتے کی زندگی کے ایک برس کے برابر ہیں۔ جوڈی اب تین 'کتا سال' کی عمر کا ہے، گویا اٹھارہ 'آدمی سال' کا، یعنی عین عنفوانِ شباب میں۔ اس کے کھیلنے کھانے کے دن ہیں مگر وہ مزاجاً افسردہ اور خاموش طبع کتا ہے۔ اس کی طبیعت میں ہنگامہ خیزی نہیں لیکن چند روز ہوئے جب میں رات کے بارہ بجے کی کھانے سے لوٹا تو میں نے اس کے ساتھ دو کتیاں دیکھیں۔ ایک تو وہی بوسیدہ پوستین والی تھی اور دوسرے کھڑے بادامی کانوں والی چست سی کتیا۔ جوڈی جھومتا، اچھلتا کودتا، مجھ پر سو جان سے نثار ہوتا، مجھے پھاٹک سے میرے کمرے تک چھوڑ گیا۔ مجھے اندر سلامت اور محفوظ چھوڑ کر وہ پھر اپنی دوست کتیوں کے پاس پہنچا۔ میں نے سوچا کہ جوڈی محض زاہد خشک نہیں، اسے جنس لطیف میں دلچسپی پیدا ہو رہی ہے، اور اس عمر میں ہونی بھی چاہیے۔ میں ان معاملات میں اتنا پروڈ (prude) نہیں رہا جتنا کہ کبھی تھا۔

*

جوڈی کا یہ مرقع مکمل کیے مجھے چار ہی روز ہوئے تھے کہ جوڈی مر گیا۔ وہ بڑے پراسرار حالات میں مرا اور میں سمجھتا ہوں کہ اسے زہر دیا گیا تھا۔ دو دن صبح کے وقت باہر جاتے ہوئے میں نے اسے برآمدے میں دیوار کے ساتھ اپنی مقررہ جگہ پر لیٹے ہوئے نہ دیکھا مگر اس کے نہ ہونے پر کوئی دھیان نہ دیا۔ اگلے دن دوپہر کے وقت میں اپنے کمرے میں بیٹھا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ گیلری میں میرے بھتیجے بلی کی آواز آئی کہ جوڈی سخت بیمار ہو گیا ہے۔ اتنے میں مائی منظوراں بھی خبر سنانے میرے کمرے میں آئی۔ "صاحب جی، وہ ساڈا جوڈی ہے نا، وہ شہدا بڑا بیمار ہے۔ کوئی بلا اسے چمٹ گئی ہے۔ اسے خون کی الٹیاں اور دست لگے ہیں۔ فیر جی، ہن کیا کریے؟" اس نے میری طرف توقع سے دیکھا جیسے میں جوڈی کو بچانے کے لیے کچھ کروں گا۔ میرے دل کو ایک دھچکا سا لگا، مگر میں فوراً جوڈی کو دیکھنے نہ گیا کیونکہ میرا خیال تھا کہ جوڈی اپنی بیماری پر غالب آ جائے گا۔ بھلا جوڈی

کیسے مر سکتا ہے؟ لڑکے خواہ مخواہ فکر مند ہو رہے ہیں۔ پھر چھوٹا شادی خاں آیا، بے حد مضطرب اور چھوٹی آنکھیں چمکیلی ہوئی، ”صاب!“ اس نے کہا، ”تکوں پتا اے، ساڈا جوڈی مرن ڈیا ہے۔ بچارے تے مکھیاں باندیاں پیاں نیں۔ چل جوڈی کوں ڈیکھ!“ میں اٹھا اور شادی خاں کی انگلی پکڑ کر جوڈی کو دیکھنے چل پڑا۔ گیلری میں لڑکوں کے ٹیپ کی آواز آ رہی تھی۔ وہ جوڈی کے مرنے کا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے اپنے بھتیجے جل سے کہا کہ وہ جوڈی کو گاڑی میں ڈال کر ویٹرنری ڈاکٹر کے پاس لے جائے۔ اس نے کہا کہ جوڈی کو منہ سے خون آنے اور دستوں کی تکلیف ہے، اسے اسپتال نہیں لے جایا جا سکتا۔ اندر کے برآمدے میں جوڈی چق کی دیوار کے پاس لیٹا تھا — بے سدھ، تھوتھنی پر خون جما ہوا اور نچلا دھڑ ایک پرانے کمبل میں لپٹا ہوا۔ بے شمار مکھیاں اس کے اوپر بھنبھنا رہی تھیں۔ اس کی کرنجی نیلی آنکھیں موت دیکھ رہی تھیں۔

میں اس کے پاس گیا اور اس کا سر سہلایا۔ اس کے جسم میں کوئی حرکت پیدا نہ ہوئی۔ اس کی آنکھیں بے حد نیلی پڑ گئی تھیں اور ان میں بے بسی اور بے پروائی تھی۔ دودھ کا پیالہ اس کے پاس جوں کا توں پڑا تھا۔ وہ بہت خستہ حالت میں تھا۔ شادی اور میں اسے کچھ دیر دیکھتے رہے۔ پھر میں نے جل سے کہا، ”ہمیں اس کو بچانے کے لیے کچھ تو کرنا چاہیے۔ تم موٹر سائکل پر جا کر ویٹ کو یہاں لے آؤ۔“ جل نے کہا، ”انکل، اب بہت دیر ہو چکی ہے۔ ویٹ کچھ نہیں کر سکے گا۔“ پھر بھی وہ میرے اصرار پر گیا اور تھوڑی دیر بعد ویٹ کے اسسٹنٹ کو لے آیا۔ یہ شلوار قمیص میں ملبوس، افسرانہ برتری جتانے والا ایک نوجوان تھا جو اسسٹنٹ کا بھی اسسٹنٹ لگتا تھا۔ اس نے جوڈی کو دیکھا، اسے ٹٹولا، اور بولا، ”اسے بہت تیز بخار ہے۔“ پھر اس نے پوچھا، ”یہ کوٹھی سے باہر تو نہیں چلا جاتا تھا؟“ میں نے جواب دیا، ”بس کبھی کبھی پھاٹک کے باہر چلا جاتا تھا۔“ کچھ دیر اور جوڈی کو دیکھنے کے بعد اس نے کہا، ”یہ زندہ نہیں بچے گا۔ اس کی زندگی بس دو تین گھنٹے باقی ہے۔“ یہ ایک ایسی خبر تھی جسے شاید ہم پہلے ہی جانتے تھے۔ جل اسے اپنی موٹر سائکل پر اسپتال چھوڑنے اور وہاں سے کوئی دوا لینے چلا گیا۔ میں نے جوڈی کو، یہ جانتے ہوئے کہ اب موت اس سے زیادہ دور نہیں، آخری بار دیکھا اور مائی منظوراں کو وہاں بیٹھا چھوڑ کر چلا آیا۔ وہ چارپائی پر اکڑوں چڑھی بیٹھی، ہاتھ ٹھوڑی پر رکھے، جوڈی کو مرتا دیکھتی ہوئی کوئی جادوگرنی لگتی تھی۔ دس منٹ بعد جل کی موٹر سائکل کے لوٹنے کی پھٹ پھٹ سنائی دی اور پھر ایک لڑکے نے دوسرے سے کہا کہ کسی گیراج میں سے لے آؤ۔ کسی کی آخر کیا ضرورت پیش آ گئی؟ ہوگا، لڑکے ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں۔ ویٹ کے اسسٹنٹ نے جوڈی کو تین گھنٹے کا وقت دیا تھا، اس لیے مجھے یہ خیال نہ آیا کہ جوڈی ختم ہو چکا ہے

اور کتنی اس کی قبر کھودنے کے لیے درکار ہے۔ آدھ گھنٹے بعد جب میں نے ہل سے ویٹ کی دوا کے بارے میں پوچھا تو مجھے بتایا گیا کہ انھوں نے سبزی کے کھیت سے پرے گڑھا کھود کر جوڈی کو دفن بھی کر دیا ہے۔ اداسی سی میرے اوپر چھا گئی۔ سو جوڈی دیکھتے ہی دیکھتے ہم سے دور چلا گیا تھا، اور اب ہم اس سنجیدہ اور پروقار کتے کو کبھی نہ دیکھ سکیں گے۔ پھر میں نے اس کی موت کو قبول کر لیا جس طرح ہم کسی دیرینہ رفیق کی ابدی جدائی کو قبول کر لیتے ہیں۔ سوچا جائے تو کتے اور آدمی کی زندگی میں کوئی فرق نہیں۔ موت ہر زندگی کا انجام ہے۔

٭

جوڈی کو مرے دو دن ہوئے تھے۔ چھوٹا شادی خاں اور میں ناشتہ کر رہے تھے کہ شادی نے کہا، ''صاب! ہمارا کتا مر گیا ہے۔ ہمارا اچھا دوست تھا۔ پہلے مجھے چک مارتا تھا، پھر دوست ہو گیا۔ تیرا نہیں، میرا دوست! میں اسے بلاتا تھا تو آ جاتا تھا، پھر مجھ کو پیار کرتا تھا۔''

''ہاں، جوڈی اچھا کتا تھا۔'' میں نے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد شادی چمچ سے چائے میں بھگوئی ہوئی ڈبل روٹی کھاتے ہوئے بولا، ''صاب! تو بڈھا تھیندا او ندیں۔ میں بڈھا نہیں ہو رہا!''

''ہاں شادی، میں بڈھا ہو رہا ہوں اور پھر مر جاؤں گا، جیسے ہمارا جوڈی مر گیا۔''

''وہ کوئی بات نہیں۔'' شادی نے مجھے تسلی دی۔ ''پھر ہم تم کو جوڈی کی طرح پور دیں گے (دفن کر دیں گے)۔''

''تم مجھے یاد نہیں کرو گے شادی؟''

''پھر تو مر جائے گا تو میں تیرے دراز سے سب پیسے بھی لے جاؤں گا۔'' شادی نے معاملے کے مثبت پہلو پر غور کرتے ہوئے کہا۔ ''پھر صاب! تو مجھے منع بھی نہیں کر سکے گا!''

زندگی کی کہانی

Lie down, lie down, young yoeman,
The sun goes down to the West,
The road one treads to labour,
Will bring one home to rest,
And that will be the best.

— *A. E. Houseman*

یہ خزاں کی ایک پیلی اداس شام تھی۔ ہم تین دوست — احسان، ثناء الحق اور میں — مقامی میونسپل پارک میں ایک بنچ پر بیٹھے زرد پتوں کو ہوا میں کھڑکھڑاتے اور اڑتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔ وہ باغ کے قطعے میں سونے کے سکوں کی طرح ہر سو بکھرے پڑے تھے۔ سورج ڈوب رہا تھا اور اس کی آخری الگتی ہوئی کرنیں لمبے درختوں سے چھنتی ہوئی ہمارے بنچ پر اپنی مرتی ہوئی دمک پھینک رہی تھیں۔

شام کی اداسی ہمیں چھونے لگی۔ احسان اور میں ہم عمر اور ہم جماعت تھے، مقامی کالج میں سیکنڈ ایئر کے طالب علم۔ ثناء الحق ہم سے دو تین سال بڑا تھا اور بی اے فائنل میں پڑھ رہا تھا۔ ایک سینئر ہونے کی حیثیت میں ہم اسے قدر اور عزت سے دیکھتے۔ وہ ایک چھریرا، دراز قامت، خوبصورت نوجوان تھا — صحیح معنوں میں جوانِ رعنا، رنگ سرخی کی لہک لیے، آنکھیں نشیلی اور بڑی، ستواں ناک، قلمیں نیچے وکٹورین وضع میں کانوں کی لووں تک آتی ہوئی۔ ہم کالج میں آکر پتلون کوٹ پہننے لگے تھے مگر ثناء الحق ہمیشہ اپنی اچکن، اونچے شملے کی پگڑی اور اپنے گاؤں کے موچی کی سلی ہوئی تلے کی جوتی میں چلتا نظر آتا۔ وہ سچ سچ ایک شاہزادے کے وقار سے چلتا اور فی الواقع

کہانیوں کا شہزادہ لگتا، ان البیلے جوانوں میں سے ایک جن کے لیے لڑکیاں آہیں بھرتی ہیں اور غم محبت میں جلتی ہیں۔ ثناء الحق ایک مضبوط کردار کا نوجوان تھا۔ اسے اپنے آپ سے کچھ محبت تھی — اور اٹھتے ہوئے شباب کے کس لڑکے کو نہیں ہوتی؟ اس کی باتوں میں واقعی پھولوں کی سی باس تھی اور ایک موہنے والا سجاؤ اور زندگی کا سوز و ساز! اور جب وہ موج میں ہوتا تو اپنے ہوسٹل کے بستر پہ لیٹا، پہروں ایسی باتیں کرتا رہتا جو سننے والے کے دل کو مسحور اور بے چین کر دیتیں۔ وہ ہر طبقے اور ہر عمر کے شخص سے آسانی سے گھل مل جاتا اور اسے اپنا دوست بنا لیتا۔ احسان اور میں ابھی معصوم الفہر گدھے تھے۔ ثناء الحق زمانے کا سرد و گرم چشیدہ تھا اور وہ ہمیں اپنے انسانی نفسیات کے وسیع علم سے ششدر کر دیتا۔

اس شام وہ بالکل خاموش تھا اور ہوسٹل سے یہاں تک چلتے ہوئے اس نے ایک بھی بات نہ کی تھی۔ اس خاموشی پر ہم نے کوئی توجہ نہ دی۔ اس کی بہترین گفتگو کے فوارے ہوسٹل کے کمرے میں اس کے بستر پر سے چھوٹتے تھے اور باہر چلتے ہوئے وہ اکثر چپ ہو جاتا اور کسی گہرے خیال میں کھو جاتا۔ پھر اس کی زبان کی بجائے اس کی بڑی بڑی آنکھیں کام کرتیں اور وہ ایک پیدائشی جاسوس کی طرح زندگی کی رنگا رنگی کو چپکے سے دیکھتا رہتا۔

احسان ان دنوں اس منزل میں تھا جب کسی کی محبت میں گرفتار ہونے کے لیے جی بیقرار ہونے لگتا ہے۔ دراصل اس عمر میں ہماری امنگیں سچی اور بے باک نہیں ہوتیں اور ہمارے جذبات خود ہماری اپنی ہی ذات میں مرتکز ہوتے ہیں۔ ہم اپنے آپ کو بے مثل سمجھتے ہوئے ایک اونچی خود رحمی سے خدا کی دھرتی پر پھرتے ہیں۔ احسان نے کالج کی لائبریری سے آسکر وائلڈ کی کہانیوں کی ایک کتاب لے کر پڑھی تھی اور یہ متلا دینے والی میٹھی جذباتی کہانیاں اس کے دماغ میں تیز شراب کی طرح چڑھ گئی تھیں۔

''آسکر وائلڈ سب انگریز لکھنے والوں میں میرا محبوب ہے۔ اوہ! اس کی ڈی پروفنڈس اور وہ گلاب اور بلبل کی کہانی،'' احسان بولا۔

وائلڈ مجھے ان دنوں بھی اچھا نہیں لگتا تھا — جھوٹے جذبات اور ذہین خلع جگت کی ظرافت جو جلد باسی ہو جاتی تھی۔ وہ میری قسم کا مصنف نہ تھا، اور میں احسان سے اس معاملے پر جھگڑنے لگا۔ احسان نے کہا کہ تم محبت کے جذبات سے کبھی آشنا نہیں ہوئے اور اس لیے آسکر وائلڈ کی خوبصورتی کو محسوس نہیں کر سکتے۔ اس پر ہم میں چخ ہو گئی اور ہمارے مزاج برہم ہو گئے۔

ثناء الحق اس دوران میں اپنے پراسرار طریق پر مسکراتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ اس کا دماغ

آسکر وائلڈ اور ہماری بحث سے ہزار میل دور ہے اور وہ کچھ اور سوچ رہا ہے۔ اس نے وائلڈ کو نہیں پڑھا تھا، اور اگر طوعاً و کرہاً پڑھتا بھی تو بھی اس سے کچھ حاصل نہ کرتا۔ وہ کتابوں کے زیادہ پڑھنے پر یقین نہ رکھتا تھا، اگرچہ ٹیگور کی گیتانجلی کے انگریزی ترجمے کو اس نے بیسیوں بار پڑھا تھا اور اس کے کئی بند اسے ازبر تھے۔

جب احسان اور میں خوب لڑ چکے تو ہم برہمی کے انداز میں ایک دوسرے کو بے وقوف سمجھتے ہوئے خاموش ہو گئے۔ ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف شدید نفرت تھی اور آنسو ہماری آنکھوں میں تقریباً آرکے ہوئے تھے۔ شام اب گہری ہونے لگی تھی اور نیلا جھٹپٹا درختوں کی چھدری ویران ٹہنیوں میں پھیلنے لگا تھا۔ ایک پپیہا باغ کے کونے میں سے بولنے لگی، ''تو وت تو وُو۔''

ثناء الحق نے کہا، ''کیا تم ایک سچ مچ کی کہانی سنو گے؟''

''ہاں، ہاں!'' میں نے کہا، ''سناؤ۔''

احسان کا چہرہ بھی چمک اٹھا، ''ثناء الحق، ضرور سناؤ کہانی۔''

ثناء الحق نے اپنی بڑی آنکھوں سے دور درختوں کے دھندلکوں میں دیکھتے ہوئے کہا، ''اچھا سنو۔ یہ کسی کتاب کی کہانی نہیں۔ یہ وہ کہانی نہیں جسے آسکر وائلڈ یا کسی اور نے گھڑا یا لکھا ہو۔ یہ ایک عام انسان کی کہانی ہے جسے قدرت نے خود اپنے قلم سے اڑتی ہواؤں میں لکھا۔ اس میں ایک سادگی اور ہمہ گیری ہے اور یہ ہر ایک کی کہانی ہو سکتی ہے — تمہاری یا میری۔ تم کہو گے کہ ہمارے مزاج اور طبیعتیں اور ستارے مختلف ہیں، مگر حقیقتاً ایک ہی نوع کے حادثات ہم سب کو پیش آتے ہیں اور وہ ایک ہی سڑک ہے جس پر ہم اپنی منزل کی جانب سفر کرتے ہیں...''

ثناء الحق کچھ رکا۔ گہرے استغراق میں احسان اور میں ہمہ تن گوش ہو گئے۔ باغ میں اب مکمل سناٹا تھا۔ گاہے گاہے پتوں کی کھڑکھڑاہٹ کی آواز آتی اور جھینگر اور رات کے رفیق کیڑے اپنی مدھم مستقل الاپ سے سناٹے کو معمور کیے ہوئے تھے۔

''غالباً ۱۹۲۵ء کی بات ہے،'' ثناء الحق بولا، ''میری عمر اس وقت کوئی ساڑھے چار پانچ برس کی ہو گی۔ میرے والد ان دنوں شجاع آباد میں نائب تحصیل دار تھے۔ وہ ہر سال ایک ماہ کی رخصت ضرور لیتے اور اسے اپنے آبائی گاؤں کھوہار میں گذارتے۔ زمینوں کی دیکھ بھال کرتے اور ایک دہقانی سفید پوش کی طرح سر پر صافہ لپیٹے اور لٹھے کی چادر باندھے گاؤں کی گلیوں میں چلتے اور اپنے چوبارے کی بیٹھک میں دیہاتیوں کے مسئلے مسائل سلجھاتے۔ شجاع آباد میں تو وہ بالکل رعب داب والے سرکاری افسر ہوتے — ہمیشہ جامہ زیب، چست اور کوڑے کی طرح کڑک دار۔ یہاں گاؤں

میں آ کر اپنے قرابت داروں اور عزیزوں کے ساتھ وہ بالکل بدل جاتے: ان کا ہی جیسا سادہ لباس
پہنتے اور ویسی ہی پرسکون دیہاتی زندگی گزارتے۔ نائب تحصیل دار کی فوں فاں اور ٹیپ ٹاپ
شجاع آباد میں ہی رہ جاتی۔ میرے دادا تب بقید حیات تھے۔ ان کو ہمارے آنے کی اطلاع ہوتی
اور جوڑا گریانہ کے چھوٹے برانچ لائن ریلوے اسٹیشن پر سواری کے لیے گھوڑیاں پہنچ جاتیں۔ مجھے
یاد ہے کہ گھوڑیاں سواریوں سے کہیں زیادہ ہوتیں۔ تب سائیکل ابھی دیہات میں نامعلوم تھی، ایک
عجوبہ۔ کوئی کام کی سڑکیں بھی نہ تھیں۔ ہر ایک گھر میں ایک دو گھوڑیاں ضرور ہوتی تھیں اور بیشتر لوگ
ان پر ہی اپنے کاموں پر آتے جاتے۔ ریل پلیٹ فارم پر کھڑی ہوتی تو میرے ابا اور امی ڈبے کے
پاس دوڑے آتے، ہم بچوں اور سامان کو اتارتے۔ گھوڑیاں ہنہناتی ہوئی مسافر خانے کے باہر بندھی
ہوتیں اور سامان کے لیے ایک دو خچر جتنے بڑے لدے ہوتے۔ میرے دادا کی ایک گھوڑی تھی،
برف کی طرح سپید، امیرانہ خو بو والی، بڑی نخریلی اور آتشیں مزاج۔ وہ اس کی لاڈلی تھی۔ اس کا نام
سادی تھا۔ میرے والد اس پر بیٹھتے۔ آدھ گھنٹہ گاؤں میں بحث ہوتی کہ کون سی گھوڑی اصیل ہے اور
کون سی کچری۔ اور جب ہم سب اصیل گھوڑیوں پر کسی ہوئی زین کاٹھیوں میں بٹھا دیے جاتے تو
گاؤں کی سمت لمبے اور آہستہ سفر کا آغاز ہوتا۔ سوائے سادی کے ہر ایک گھوڑی کی باگ آگے آگے
چلتے ہوئے کسی کے ہاتھ میں ہوتی۔ کہوار جوڑے سے چار پانچ کوس ہے مگر اس سفر میں کوس ختم
ہونے میں نہ آتے تھے۔ دوپہر کے پیچھے ہم کہوار میں گہری شام پڑے پہنچتے۔ جب تنگ کاٹھیوں
میں بیٹھے بیٹھے ہماری کمریں درد کرنے لگتیں اور کولہے چھلنی ہونے لگتے تو یہ چھوٹا قافلہ ستانے اور
ٹانگیں سیدھی کرنے کے لیے سڑک کے کنارے رک جاتا۔ اس کافی خوفناک سفر کی کچھ تلافیاں بھی
تھیں۔ ڈلھیانی سے آگے گزرتے ہوئے ہمیں چٹی کی نیلی پہاڑیاں نظر آنے لگتیں اور ہمارے دل
اچھلنے لگتے۔ ان کی طرف بڑھتے ہوئے ایک عجیب مسرت میرے دل کو گرفت میں لے لیتی۔
دوستو! تم کیا جانو، میرے دیس کی پہاڑیاں کتنی خوبصورت ہیں۔ دنیا میں ایسی پہاڑیاں اور کہیں نہیں
جیسی یہ چٹی کی پہاڑیاں۔ بعض دفعہ اس سفر میں حادثے بھی ہو جاتے۔ کسی گدھے کی تنگ ڈھیلی
ہو جاتی اور اس پر دھرے ہوئے بکس اور ٹوکرے نیچے سڑک پر لڑھک گرتے۔ تنگ کو کسنے اور اس پر
پھر سے سامان جمانے میں آدھ گھنٹہ لگ جاتا۔ اور ایک بار تو وہ گھوڑی جس پر میرا بھائی اور میں
دونوں سوار تھے، بڑی کچری نکلی۔ میرا بھائی آگے لگام پکڑے بیٹھا تھا۔ (کن خوشامدوں سے ہم
نے نور علی میراثی کو تیار کیا تھا کہ وہ لگام ہمیں پکڑا دے۔) میں اس کے پیچھے ہاتھ میں ایک چابی
سے چلنے والے انجن کو پکڑے بیٹھا تھا۔ یکلخت گھوڑی بدکی اور بگٹٹ بھاگ کھڑی ہوئی۔ میں تو دھکا

لگنے سے نیچے زمین پر آرہا— اسی طرح چابی والے انجن کو ہاتھ میں پکڑے پکڑے۔ مجھے تھوڑی دیر کے بعد ہی پتا چلا کہ میں گھوڑی سے گر گیا ہوں، اور پھر میں رونے لگا حالانکہ مجھے ذرہ بھر بھی چوٹ نہیں لگی تھی۔ میرے بھائی کو گھوڑی کودتی پھلانگتی دور کھیتوں میں لے گئی اور اسے ایک کنویں کی منڈیر پر جا گرایا۔ اس کی پیشانی پھٹ گئی اور اس میں سے خون بہنے لگا۔

''مگر اتنی صعوبتوں کے بعد جب ہم کھوہار میں اپنے آبائی مکان میں پہنچتے تو کیسی آؤ بھگت ہماری منتظر ہوتی۔ گھر کے سب دیے روشن ہوتے۔ اونچے وہیڑے میں ہماری دادی، خالائیں اور پھوپھیاں چمکتے چہروں سے ہماری بلائیں لیتیں۔ ڈیوڑھی سے گذرتے ہی دیوار کے پاس اپلوں کی آگ پر دودھ کی پیتل کی مٹکی میں دودھ ہمیشہ کڑھتا رہتا تھا۔ ہماری دادی ہمارے پہنچتے ہی ہمیں کڑھے میٹھے دودھ کے گلاس پلاتی۔ ہمارے باپ کی گردن میں ہاتھ ڈال کر وہ اس کی پیشانی کو چومتی اور خوشی اور محبت سے رونے لگ جاتی۔ وہ بوڑھی اور کبڑی تھی مگر اس کے خدوخال چنے اور تیکھے تھے، اور میں نے اپنے بڑوں سے سنا ہے کہ وہ اپنی جوانی میں بڑی خوبصورت عورت تھی...''

''ہا!'' ثناء الحق نے ایک ٹھنڈا سانس بھرا۔ ''میں کھوہار پچھلی گرمیوں میں گیا تھا اور وہ گھر وہ گھر نہیں رہا جسے میں اپنے بچپن میں جانتا تھا۔ اب کے دیے میرے جانے پر نہیں جلے اور آبائی حویلی تباہ اور شکستہ حالت میں تھی۔ صرف ہمارا پرانا میراثی نور علی وہاں طویلے میں اپنی کوٹھڑی میں رہتا ہے— خمیدہ پشت اور بگلے جیسے سفید بالوں کے ساتھ۔ اس کی جھگڑیں اور ٹھول بھی اب وہ نہیں رہے۔ میں بعض دفعہ سوچنے لگتا ہوں کہ وہ سب اچھے، مہربان، چمکتے ہوئے، محبت کرنے والے چہرے کہاں غائب ہوگئے— سب چلے گئے، وقت کے دھندلکے میں...''

ثناء الحق اب خاموش ہوگیا، شاید گئی گذری چیزوں اور ہستیوں کو یادوں کے پردے پر دیکھتا ہوا۔ ایک بڑا زرد سا چاند درختوں کی اوٹ میں سے طلوع ہو رہا تھا اور اپنی آہنی دمکاہٹ سے ٹہنیوں اور پتوں میں ضیا پاشی کر رہا تھا۔ ہوا کا ایک ہلکا سا جھونکا آیا اور زردیائے ہوئے خزاں کے پتے ہماری طرف تیرتے ہوئے آئے۔ ''میرا دماغ غیر حاضر ہو جاتا ہے اور میں کہیں کا کہیں نکل جاتا ہوں،'' ثناء الحق بولا۔ ''میں کیا کہہ رہا تھا؟''

احسان اور میں مسکرائے۔ یہ ہمارے دوست ثناء الحق کی پرانی عادت تھی۔ وہ ہمیشہ ایک واقعہ بیان کرنا شروع کرتا اور پھر بات سے بات نکل آتی اور وہ دور بھٹک جاتا۔ یوں اصل واقعے کا سرا کھویا جاتا اور ہم اس کی ان طولانی ڈائی گریشنز (digressions) ہی کی وجہ سے اس سے محبت کرتے تھے۔ اگرچہ ہم بھی کبھی کبھی غیر حاضر دماغ اور نیم خوابیدہ سے ہو جاتے اور قطعاً بھول جاتے

کہ وہ ہمیں اصل میں کون سا واقعہ بتانے چلا تھا۔

''بولتے جاؤ میک ڈف!'' میں نے کہا۔ ''رات ابھی جوان ہے۔ ویسے تم ہمیں اپنی اور ایک انسان کی کہانی سنانے کا ارادہ رکھتے تھے۔''

''ہاں دوستو! اس بھٹک جانے کے لیے مجھے معاف کرو۔'' ثناء الحق ہنسا۔ ''میں اب اپنی کہانی سے نہیں بھٹکوں گا — اگر میں بھٹکوں تو تم میرے کان کھینچ سکتے ہو۔ اس طرح میں پھر سیدھی ڈگر پر آجاؤں گا۔ ہاں تو اس ۱۹۲۵ء کے سال میں ہم اپنے والد کے ہمراہ کھوبار میں آئے ہوئے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں ڈیوڑھی میں کھڑا بشن چند کھتری کی دکان سے خریدی ہوئی چاند تارے والی رنگ دار کھٹ مٹھی ٹکیاں کھا رہا تھا۔ میرا بڑا بھائی میری منت کر رہا تھا۔ میں جانتا تھا کہ وہ ابھی یہ ٹکیاں مجھ سے چھیننے کی کوشش کرے گا اور میں اتنا زور زور سے رونے لگوں گا کہ میری دادی اور اماں بھاگی آئیں گی اور مجھے چپ کرانے کے لیے بشن چند کھتری سے دو آنے کی اور ٹکیاں مجھے لے دیں گی۔ ویہڑے میں ہماری چھوٹی پھوپھی سنگر مشین پر کھٹ کھٹ سلائی کا کام بڑے ٹھسّے سے کر رہی تھی۔ وہ سارے گاؤں میں واحد سلائی کی مشین تھی اور میری چھوٹی پھوپھی اپنے سنگر کی مالک ہونے کے امتیاز کی وجہ سے کسی کو خاطر میں نہ لاتی۔ اتنے میں بھاگ بھری مصلن تیزی سے آئی اور دروازے میں کھڑی کھڑی کہنے لگی، 'اے جیناں بی بی! اشرف چھوٹے گھر جاتک ہویا ای۔'

''میری چھوٹی پھوپھی نے مشین پر اپنا ہاتھ روک کر پوچھا، 'ہیں؟ جان دے نی بھاگو!'

'''بی بی جیناں! رب میرے دی سوں! بالکل سچ ہے۔ میں ابھی ابھی وہاں سے ہوکر آ رہی ہوں۔ آدھی رات کو شیر کی بچی نے جاتک جنا ہے اور نور ظہور کے وقت کرمے موچی نے خود مسیت جاتے ہوئے اسے مجیس کو دوہتے دیکھا۔'

''میری پھوپھی بولی، ''دشمن اے ایس آفت دا! پر میں کچھ اور سوچ رہی ہوں۔ اس کا مرد اللہ داد پچھلے سال چھٹی پر کب آیا تھا؟''

''بھاگ بھری مصلن نے کچھ سوچ کر حساب لگایا۔ 'چدھرانی، مجھے جن پڑتا ہے کتے پوہ میں۔ وہی مہینہ تھا جب باڑ آئے تھے اور یاد ہے مصلی کا کوٹھا رڑھ گیا تھا۔ اس مہینے تو چدھرانی رانی ہماری گائے کالے سانپ کے ڈسنے سے مرگئی تھی۔ یہ منحوس بجو جب بھی گاؤں میں قدم دھرتا ہے، کوئی نہ کوئی آفت ضرور آتی ہے۔'

'''کتیں۔ تو کتنے مہینے ہوگئے؟' میری پھوپھی انگلیوں پر گننے لگی۔ 'بن پچا کن چڑھیا اے۔ چار او پر دس مہینے ہوتے ہیں اور بجو یہاں کوئی پندرہ دیں دہاڑے رہا۔ ہائے نی بھاگو! یہ جاتک ہو

کیسے ہوگیا؟ پہلی وار بچے کو چار اوپر دس مہینے پیدا ہوتے سنا ہے۔ مرد کے بغیر جاتک! چاچی شرپھو تو دوسری حضرت مریم ہوگئی — توبہ توبہ!' میری پھوپھی نے کانوں کو ہاتھ لگائے۔

'''ہائے نی چدھرانی،' مصلن نے ناک پر انگلی دھری۔ 'میں نے تو یہ سوچا ہی نہ تھا۔ مگر چدھرانی، شرپھو کے پاس اور کون مرد گیا ہوگا؟ مردوں کا تو اس سے بول اٹکتا ہے۔'

'''چپ کر رہو!' میری پھوپھی مشین سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ 'چل، شرپھو دے جاتک نوں دیکھ آئیے۔'

''وہ جانے لگیں تو میں بھی ضد کرکے ان کے ساتھ ہولیا۔ ایک بچے کی پیدائش گاؤں میں ایک اہم واقعہ ہوتا ہے۔ راستے بھر میں سوچتا رہا کہ پھوپھی کا دنوں کا حساب لگانے سے کیا مطلب تھا اور مرد کے عورت کے پاس جانے سے بچہ کیسے پیدا ہوتا ہے۔ ان دنوں مجھے پورا یقین تھا کہ بچے آسمان سے گرتے ہیں۔ جب بھی میں اپنی ماں سے پوچھتا کہ میں کیسے پیدا ہوا تو وہ پراسرار طریقے پر مسکراتی اور کہتی: 'لال! میں تمھیں ہزار بار بتا چکی ہوں کہ تمھاری بورھی دائی مائی پھتاں تمھیں اپنی گود میں لائی۔ آسمان پر سے ہمارے گھر میں وہ گری تھی۔' ہمارے بعض بڑے مجھ سے اکثر سنجیدگی سے کہتے کہ مجھے میرے باپ نے مصلیوں سے پانچ دس روپے میں خریدا ہوا ہے۔ ان بیانات میں تضاد مجھے حیران سا کردیتا۔ پیدائش کا مسئلہ مجھ پر تب کھلا جب میں کافی بڑا لڑکا تھا، تم یقین کرو یا نہ کرو۔

''ہم چھیبر کے پاس شرپھو کے کوٹھے میں گئے۔ وہاں کالے رنگ کے تہبند اور کالے کرتوں میں گاؤں کی بہت سی عورتیں شرپھو کے جاتک ہونے کی خبر سن کر آئی ہوئی تھیں۔ ایک لمبے کچے کمرے میں، جس میں سب دیہاتی کوٹھوں کی طرح ایک طاق پر تانبے اور المونیم کے چمکتے دمکتے برتن ایک دوسرے کے اوپر جمے تھے، شرپھو ایک کھاٹ پر بیٹھی میلے ہوئے کپڑے میں لپیٹے اپنے بچے کو چھاتی سے دودھ پلا رہی تھی۔ شرپھو ایک چوڑے ہڈ کاٹھ کی خوفناک عورت تھی، توے کی طرح کالی بھجوت؛ موٹے اور بھدے خدوخال اور بال کھلے اور پریشان۔ وہ زیادہ لفظوں کی عورت نہ تھی اور جب وہ بولتی تو اس کی آواز کی کرختگی ایک کوڑے کی طرح لگتی اور اس کی ہمسائیاں کانوں پر ہاتھ دھرنے لگتیں۔ سب اسے اس کی کڑوی کسیلی زبان درازی سے ڈرتے ہوئے اسے اس کے حال پر رہنے دیتے اور اس طور اس سے بچتے جیسے وہ طاعون ہو۔ اس کے خاوند بجو اللہ داد نے اس کی بدکلامی اور درشت مزاجی سے تنگ آکر لاہور میں چپکے سے ایک اور شادی کرلی تھی اور ہر کوئی کہتا تھا کہ اس نے ٹھیک ہی کیا ہے — کون سا مرد ایسی عورت کے ساتھ زندگی بھر نباہ کرسکتا ہے!

''شرپھو نے کوری پچھی آنکھوں سے ہمیں دیکھا اور بچے کو دودھ پلانے میں مشغول رہی۔

''میری پھوپھی نے کہا، ' شرپھو! آج تک کی مبارک ہو۔ چاند جیسا ہے، ماشاءاللہ۔ اس کے باپ کو اطلاع دے دی تھی۔'

''شرپھو نے جل کٹ کر اپنے خاوند بجو اللہ داد کو ایک موٹی سی گالی دی۔ 'اوہ دے داڑھی جلیا! وہ اس جھوں حرامزادی لاہوراں کے ساتھ جھک مار رہا ہے اور اس کی جوتیاں اٹھاتا ہے۔ چٹی داڑھی اور آیا شراب۔ اس جھوں کے کھٹے چھوڑ کر وہ کیوں آئے گا۔ یہاں آئے تو سہی وہ کنجر! میں اس کے منہ پہ چھتر نہ ماروں تو شرپھو نام نہیں۔'

'''لیکن شرپھو، آخر وہ اس کا باپ ہے۔ اسے چٹھی تو لکھوا دو۔' میری پھوپھی نے کنکھیوں سے مصلی بھاگ بھری کو دیکھا۔

'''چٹھی لکھوائے میری جوتی!' شرپھو بولی اور گالیوں اور چھتروں کی ایک ندی اس کے موٹے ہونٹوں سے نکلی۔ وہ تینوں عورتیں توبہ توبہ کرنے لگیں۔

''پھر بھاگ بھری مصلن سے نہ رہا گیا۔ وہ کہنے لگی۔ اس نے پوچھا، 'نی مرزا بیگم! اللہ داد پچھلے کتے میں آیا آیا تھا؟'

''شرپھو تلملا کر اٹھی اور چیخنے لگی، 'تجھ نے! تیرے داوے داڑھی جلیا۔ تیرے خصم کو چور لے جائیں۔ میں تیرا مطلب سمجھتی ہوں۔ تو میرے بچے کو حرامی بتاتی ہے؟ تو حرامی، تیری ب ب حرامی، تیری سات پیڑھیاں حرامی۔ وے اسماعیل، اس چڑیل کو بتا۔ تیرا باپ کتنی کے بعد پوہ میں رات کی رات مجھ سے معافی منگنے آیا تھا یا نہیں، اور جاتے ہوئے میں نے اس کی کیسی گت بنائی تھی۔ تو مجھے نہ پکڑتا اور بیچ میں نہ پڑتا تو میں اس کی داڑھی کا بال بال نوچ لیتی اور وہ اس جھوں لاہوراں کے پاس کھوا کھسرا بن کر جاتا۔ وے اسماعیل، تو نے اپنی بے بے کو اس دن پکڑ کر بڑا ظلم کیا۔'

''اسماعیل بجو اللہ داد کا بڑا کوئی سترہ سال کا ایک اکھڑ، ہونق سا لڑکا تھا: کچھ کچھ باؤلا، اور بالکل اپنی ماں پہ گیا تھا۔

''اسماعیل نے کہا، ''چاچا پوہ میں آیا تھا اور بے بے کو میں نہ روکتا تو وہ اس کی جھن بچہ کہانی کر دیتی...''

''شرپھو نے پھر مصلن اور سب عورتوں پر ایک نفرت بھری، زہریلی، جھلسا دینے والی نگاہ ڈالی۔ اتنے میں کسی نے کہا کہ مولبی ہوریں آئے ہیں۔ بروٹیوں والی مسجد کا امام مسجد میاں غوث محمد اندر آیا۔ وہ ایک امام مسجد کی بجائے ایک گرِیل دیہاتی چھیڑو لگتا تھا اور اس وقت بھی ہاتھ میں ایک گڈریے کی لاٹھی لیے ہوئے تھا۔ میاں غوث محمد کی علمیت کی سارے گاؤں میں بڑی دھاک تھی۔

اسے پکی روٹی کے سارے شعر از بر تھے۔

غوث محمد نے لاٹھی کھنکھناتے ہوئے اپنے کرخت دیہاتی لہجے میں عورتوں کو ہٹنے کے لیے کہا، ''کڑیو، ایک طرف ہو جاؤ۔ شرپھو، اللہ کی تم پر رحمت ہوئی ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں...' اور اس نے پنجابی کے کچھ اشعار بچوں کی برکت کے بارے میں پڑھے۔ 'ابھی اس کے کان میں کسی نے اذان تو نہیں دی؟'

''شرپھو نے کہا، 'مولوی جی، آپ کے سوا اذان کون دیتا؟'

''' بیٹے!' مولوی غوث محمد رینکا۔ 'حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کے کان میں پہلی آواز کلمے کی جانی چاہیے۔'

''مولوی غوث محمد نے نومولود کے کان میں اذان دی اور اذان سے فارغ ہونے پر شرپھو اٹھی اور بھڑولی میں سے ایک رومال میں دو روپے مولوی کو گذرانے اور مولوی غوث محمد کچھ مزید مسئلے مسائل سمجھا کر اور دو تین لڑکیوں کے سروں پر ہاتھ پھیرنے کے بعد چلا گیا۔ اس کے بعد ہم بھی زیادہ دیر نہ ٹھہرے اور میری پھوپھی کے ایک روپیہ شرپھو کی ہتھیلی پر رکھنے کے بعد ہم گھر کو لوٹے۔ مجھے واپسی پر اپنی پھوپھی سے یہ پوچھنا یاد ہے کہ اگر بچہ آدھی رات کو آسمان سے گرا تھا تو وہ چھت میں سے کیسے شرپھو کی گود میں آ گیا۔

''' ثناؤل، کیا الٹ پلٹ سوال تم پوچھتے رہتے ہو!' میری پھوپھی نے کہا۔ 'جب تم بڑے ہو گے تو تمھیں خود بخود معلوم ہو جائے گا۔' اور اس نے بھاگ بھری مصلّن کو کہنی ماری، آنکھ میں شرارت لیے ہوئے۔

''میری چھوٹی پھوپھی ایک ہنس مکھ لا ابالی طبیعت کی عورت تھی، زندگی کی رنگینی اور کھیل کود سے معمور۔''

ثناء الحق پھر کچھ دیر کے لیے گم صم ہو گیا اور کچھ توقف کے بعد بولا، ''شرپھو کے اس بچے کا نام عبداللہ رکھا گیا۔ پیچھے یہ خبر بھی بھاگ بھری مصلّن نے آ کر دی۔ یہ نام بچے کے نانا بوڑھے اور درشت کلام رحمی اکبر نے تجویز کیا تھا جو ایک پنشن یافتہ معلّم تھا اور اب کھوہار کے دیہاتی ڈاک خانے میں ٹکٹوں کی فروخت اور ڈاک کی ترسیل کی ذمے داری اسے سونپی گئی تھی۔ سب پوسٹ ماسٹر اس کے عہدے کے لیے کچھ زیادہ ہی اونچا نام ہے۔ اسے اس کام کے لیے ڈاک کے محکمے سے صرف پندرہ روپے تنخواہ ملتی تھی۔ کچھ وہ گاؤں والوں کی چٹھیاں لکھ کر کما لیتا۔ خوب کیریکٹر تھا۔ کڑوا اور زہریلا، اپنی بیٹی شرپھو کی مانند۔ اس کا ایک بیٹا، جس کا نام عبداللہ تھا، اوائل شباب میں فوت ہو گیا

تھا، اس لیے اس نے اپنے بیٹے کی یاد میں اپنے نواسے کا نام بھی عبداللہ رکھا۔

''بجو اللہ داد بچے کی پیدائش کے کوئی تین چار دن بعد گاؤں آیا۔ غالباً اس کے خسر نے اسے پوسٹ کارڈ سے اطلاع دے دی ہوگی۔ اسے دیکھ کر اس شخص کو داد دینی پڑتی تھی جس نے پہلے پہل اسے بجو کا لقب دیا تھا؛ یہ نام اس پر ٹوپی کی طرح فٹ بیٹھتا تھا۔ میں نے اسے گاؤں میں کئی بار دیکھا ہے اور ایک بار اس کے ہاں کسی کام سے لاہور جانے کا اتفاق بھی ہوا۔ ہو بہو بجو کی شکل، موٹے خدوخال کا ماتمی چہرہ، مہندی سے رنگی بوسیدہ داڑھی۔ سر پر کھڈی دار میلے چکٹ کلاہ پر بندھی پگڑی اور بدن پر ایک پرانی دقیانوسی اچکن پہنے، جسے اس نے کئی برسوں میں نہ بدلا تھا۔ اس کی ساری ذات کرم خوردہ تھی۔ جب میں لاہور میں دل محمد روڈ پر اس کے بالکنی والے خستہ مکان پر اس سے ملا تو اپنی دوسری بیوی سے اس کا ایک بچہ ہو چکا تھا اور گھر میں اس کی حیثیت بچے کو کھلانے والی ایک دائی کی تھی۔ مجھے بیچارے بجو پر رحم آیا اور اسے بچے کو ہاتھوں میں لوری دیتے ہوئے دیکھ کر ہنسی بھی آئی۔ آسمان سے گرا، کھجور میں اٹکا!''

''میں تمھارے کان کھینچنے لگا ہوں، شاہ اسحٰق!'' میں نے کہا۔

شاہ اسحٰق ہنسا۔ ''ہاں، بجو اللہ داد کے گاؤں میں آنے اور شرچھو سے استقبال کا منظر ایسا تھا جسے گاؤں والے برسوں میں نہیں بھولے۔ مصلّی بھاگ بھری خود وہاں موجود تھی۔ بجو ایک جھوری مریل گھوڑی پر سوار، پکی سڑک پر پہنچ آیا تھا۔ گاؤں سے تھوڑے فاصلے پر شرچھو اسے ملی۔ وہ اپنے گدھے پر بیٹھی، ہاتھ میں کلہاڑی اٹھائے، بروٹیوں میں سے لکڑیاں کاٹنے جارہی تھی۔ ذرا اس سین کا تصور کرو۔ بجو کا چہرہ اپنی خوفناک بیوی کو آتے دیکھ کر فق ہوگیا اور اس نے باگ موڑ کر درختوں کی اوٹ میں سے نکل جانے کی کوشش کی۔ لیکن شرچھو اس کے سر پر آ پہنچی۔ کلہاڑی ہاتھ میں لیے، روکھے بال پھیلائے، وہ گدھے پر سے چھلانگ کر اتری اور سڑک کے بیچ گھوڑی کے رستے میں اپنی ٹانگیں پھیلا کر کھڑی ہوگئی۔ بجو کے لیے بچنا مشکل تھا۔ اس نے موت اپنے سامنے دیکھی۔ شرچھو نے کلہاڑی کو بڑے وحشیانہ طریقے سے ہلایا اور موٹی گالیوں اور لعن طعن کی ایک نہ ختم ہونے والی بوچھاڑ اس کے موٹے ہونٹوں سے چھوٹی۔ اس منظر کو دیکھنے والے اس عورت کی زرخیز دماغی پر حیران ہوگئے اور کانوں کو ہاتھ لگانے لگے۔ یہ عورت کوئی انسان کی بچی نہیں تھی، یہ تو کوئی چڑیل تھی۔

'''وادے ڈاڑھی بگیا! بجویا کھوہ دیا! خدا تیری بیڑیوں میں وٹے ڈالے۔ تو نے مجھ پر سوکن ڈالی ہے؟ میرے گھر کی چوکھٹ کے اندر قدم تو دھر۔ تیری بوٹی بوٹی نہ کردوں تو میں رضی اکبر کی دھی سرفراز نہیں...'

''بیچارے بجّو نے کچھ دیر تو یہ صلواتیں سنیں، پھر اپنی جان کو خطرے میں دیکھ کر اس نے گھوڑی کو ایڑ لگا کر بھگا لیا اور اور شرچھو اپنے گدھے پر سوار ہو کر اپنے ننگے پاؤں نیچے لٹکائے اپنے فرار ہوتے ہوئے خاوند کے پیچھے گئی — گالیاں اور منہ بکتی اور اپنے چوڑے، مردوں کے سے سینے پر دو ہتڑ مارتی اور اپنے بال نوچتی۔ اس طرح بجّو اور اس کی بیوی گاؤں کی گلیوں میں سے گذرے، اور جس کسی نے بھی دیکھا، بعد میں کہا کہ سوار میں خاوند کی ایسی خاطر پہلے کسی جنانی نے نہیں کی تھی۔ بجّو رات کو اپنے ایک شریک کے گھر رہا۔ میں نہیں جانتا تھا کہ اس نے نومولود کو دیکھا یا نہیں، مگر دوسرے دن منہ اندھیرے اس نے گاؤں کو چھوڑ دیا۔ جب تک شرچھو جیتی رہی اس نے گاؤں میں قدم رکھنے کی جرأت نہیں کی۔''

چاند اب درختوں کی چوٹیوں کے اوپر اٹھ آیا تھا اور اس کی سفید نقرئی روشنی ہم بنچ پر بیٹھے ہوئے دو تین دوستوں کو نہلا رہی تھی۔

میں نے پوچھا، ''کیا شرچھو کا بچہ حرامی تھا؟''

''میں نہیں کہہ سکتا۔'' ثناء الحق نے کہا، ''وہ حرامی تھا یا نہیں۔ میری پھوپھی جینا اور بعض دوسری عورتوں کو اس کے حرامی ہونے کا یقین تھا۔ مگر بعد میں میں نے اس بات کی کافی کھوج کی۔ بجّو اللہ داد پور میں رات کی رات آیا ضرور تھا۔ وہ اپنی بیوی کے پاس گیا یا نہیں، کوئی نہیں جانتا۔ مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ وہ حرامی تھا یا نہیں؟ وہ خدا کی اس دنیا میں بعینہ اس طریقے سے آیا جس طریقے سے ہم سب آئے ہیں — ایک عورت کے بطن سے۔ اور شادی کیا ہے؟ مصطفیٰ کمال کہا کرتا تھا کہ ایک کٹر گدا ملا کے چند فقرے پڑھنے سے ایک عورت اور مرد کو اکٹھے ہونے کا لائسنس مل جاتا ہے اور اس اتحاد کو برکت اور پاکی مل جاتی ہے۔ جب ان فقروں کے بغیر ایک عورت مرد کے پاس جاتی ہے تو لوگ شور مچاتے ہیں کہ یہ بدکاری ہے، یہ گناہ کبیرہ ہے۔ اور دیکھو تو بات ایک ہی ہے۔ کتنے ہی بچے بے محبت شادیوں کے ذریعے پیدا ہوتے ہیں مگر کوئی انھیں برا نہیں جانتا۔ میں نے باپوں کو دوسری عورت کے ساتھ گھر بسانے کے بعد اپنی پہلی بیوی کی اولاد سے قطعاً لاتعلق ہوتے دیکھا ہے...''

احسان اور میں ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرائے۔ ثناء الحق اپنے خاص قدرتی عقیدوں کو ہوا دے رہا تھا اور ہم جانتے تھے کہ اگر ہم نے اسے ٹوکا تو مروجہ اخلاق کے خلاف اس کی لتاڑ گھنٹے بھر تک جاری رہے گی۔

''تم کہانی سے بھٹک رہے ہو میک ڈف!'' میں نے کہا۔

"معاف کرنا — میں کہاں تھی؟" اس نے پوچھا۔

"شرچھو کے بچے حرامی ہونے یا نہ ہونے پر تم ہمیں فطری اخلاقیات کا درس دیتے گئے تھے" میں نے کہا۔

"ہاں، ہاں" شمشاد اسحاق نے یاد کیا۔ "اس طرح عورت شرچھو کے پیٹ سے عبداللہ اس رات پیدا ہوا۔ ایک پھول کی مانند کھلتا ہوا وہ اس چمکتے دن اور اندھیری رات کی دنیا میں آیا۔"

٭

"سال گزرتے گئے۔ والد صاحب کی تبدیلی وہاڑی ہو گئی اور میں چوتھی جماعت میں پڑھ گیا۔ ہر سال مئی یا جون میں ہم اپنے وطن والی دادی کے پاس آتے۔ اپنی پھوپھیوں اور خالاؤں سے ملتے، گاؤں کے بچوں کے ساتھ دیسی کھیل کھیلتے، گھوڑیوں کی سواری کرتے، اپنے بھینس نما داڑھی والے ماموں جلال کے ساتھ ٹبی کے دامن میں دھانوں سے چپے ہوئے میدان میں خرگوش کے شکار پر جاتے۔ میرا ماموں جلال اب فوت ہو چکا ہے کیا عجیب آدمی وہ تھا! اس کی حویلی کی ڈیوڑھی میں ہمیشہ دو اونچے کانوں والی، پتلی اور پانی کی سی رنگت کی کتیاں بندھی رہتی تھیں۔ ان کی وہ دونی خاطرداری ہوتی تھی کہ الامان والحفیظ۔ تین چار میراثی ان کی خدمت کے لیے وقف تھے۔ کوئی انھیں نہلا رہا ہے اور رگڑ رہا ہے۔ کوئی چمٹے سے ان کے کانوں کے اندر سے چچڑ نکال رہا ہے۔ ان کے لیے خاص دیگوں سے مرغن طاقت کے کھانے پکتے تھے اور دن میں ایک بار یہ کتیاں گھی اور شکر کی چوری کھاتی تھیں۔ میں نہیں جانتا کہ میرے ماموں کے دوسرے شوق کیا تھے۔ وہ مسئلے مسائل بتانے میں کافی شہرت رکھتا تھا اور گاؤں والے اس سے مسئلے پوچھنے آتے تھے۔ "مولوی جی، وضو کے بعد تمباکو پینے سے وضو ٹوٹتا ہے یا نہیں؟" "مولوی جی، آج میں نے غصے میں اس نیک بخت شیدو کو تین دفعہ طلاق کہہ دی۔ ہمارا نکاح ٹوٹا یا نہیں؟" ہم جب بھی جاتے اسے کتیوں کی دیکھ بھال، علاج معالجے میں مصروف پاتے۔ اپنی بیوی اور اپنے لمبے خمار سے اکلوتے لڑکے ربو سے وہ قطعاً لاتعلق تھا۔ میری چھوٹی پھوپھی زینب بی بی اس کے گھر تھی۔ وہ سارا دن بیٹھی سنگر مشین پر کھٹ کھٹ کرتی رہتی اور گاؤں کے لیے ایک ٹیلرنگ شاپ کا مقصد پورا کرتی۔ وہ ایک ہنس مکھ، لا ابالی اور باتونی عورت تھی، ورنہ ماموں جلال کو نانی یاد آ جاتی۔

"ہم اس ماموں کو کتیاں والا ماموں کہا کرتے تھے۔ اور ابر کے دنوں میں گاؤں کی آدھی آبادی، پیدل اور گھوڑیوں پر سوار، سب ادھر اُدھر کے کتوں کو لیے ماموں جلال کی سرکردگی میں

خرگوش کے شکار پر نکل آتی تھی۔ وہ شکار کے منظر مجھے نہیں بھولتے — کتیوں کا خرگوش کی بو پا کر رک جانا اور کان کھڑے کر لینا۔ سرائیوں کا بھربھری ریت پر جانور کے پنجوں کو دیکھ دیکھ کر اس کی چھپنے والی جگہ دریافت کرنا اور اس میں گھس کر زور زور سے 'ہو ہو سیئو ہو ہو!' چلانا۔ سہمے ہوئے خرگوش کا جھاڑی میں سے تیر کی طرح بھاگ پڑنا اور کتوں کی فوج کا دھاگوں کی بھول بھلیوں میں سے اس کا تعاقب کرنا۔ اکثر ماموں جلال کی کتیاں جو پاؤں کی تیز تھیں اور خاص اس کام کے لیے سدھائی ہوئی تھیں، خرگوش کو دبوچنے میں دوسروں سے بازی لے جاتیں۔ اور وہ دھاگوں اور جتی کی پہاڑیوں میں پھرنے کا لطف اور تعاقب کی دھڑکن اور گرماہٹ! دوستو، وہ کیا مسرت اور بے فکری کے دن تھے! وہ اچھے لوگ، وہ ان کی باتیں اور اشغال اب وقت کی اوٹ میں چھپ گئے ہیں اور فنا کی حدود میں ہمارا — اپنے بیٹوں اور پوتوں کا — انتظار کر رہے ہیں۔ میں پچھلے ایک سال سے وطن نہیں گیا۔ اب وہاں کون ہے جس کے پاس آدمی جائے! اگر کسی وقت یوں ہی بیٹھے بیٹھے میرے دل میں ہوک اٹھتی ہے اور میری جتی کی نیلی رنگین پہاڑیاں مجھے ایک طاقتور مقناطیس کی طرح اپنی طرف کھینچتی ہیں۔ میں اکثر سوچتا ہوں کہ یہ قوم کی یا ملک کی محبت، جسے حب الوطنی کا بلند بانگ نام دیتے ہیں، کہیں بے معنی تو نہیں؟ آدمی دراصل اپنے مولد و مسکن، اپنے خطے سے محبت کرتا ہے جس کی مٹی کی بو اس نے سونگھی، جس کی ہواؤں میں اس نے سانس لیا، جہاں سے اس کا خمیر اٹھا۔ کوئی حقیقت میں ایک ملک سے محبت نہیں کرتا۔ اسکاٹ لینڈ والے اپنے قبیلے اور اپنی ہیدر سے سرخ ہوتی ہوئی پہاڑیوں کے گیت گاتے ہیں، دولت برطانیہ کے نہیں جس پر سے سورج غروب نہیں ہوتا تھا۔ ایک صحرائی بدو صرف اپنے صحرا کی ریتوں، کھجوروں اور خیموں سے محبت کرتا ہے۔ قوموں اور ملکوں کی باتیں کرتے ہوئے کہیں ہم اپنے آپ کو دھوکا تو نہیں دیتے؟"

"یار، کہانی سناؤ جو تم نے شروع کی تھی،" احسان نے کہا، "اگر ثناء الحق، تم ایسے ہی بھٹکتے رہے تو یہ کبھی ختم نہ ہوگی۔ گیارہ بجے کے بعد ہوسٹل کا پھاٹک بند ہو جائے گا اور ہمیں دیواریں پھاندنی پڑیں گی۔"

"ہاں میک ڈف،" میں بولا، "مجھے تمھارا یہ بھٹک جانا اچھا لگتا ہے مگر اب کافی دیر ہو چلی ہے اور مجھے کچھ سردی سی لگ رہی ہے۔"

"ہاہا!" ثناء الحق نے ہوکا بھرا، "میں کہاں تھا؟"

ہم نے اسے بتایا اور وہ پھر اپنی کہانی کی طرف لوٹا۔

"ہاں۔ میری عمر تب نو سال کی ہوگی۔ میں چوتھی میں تھا اور ہم گاؤں میں آئے ہوئے

تھے۔ ایک دن میری چھوٹی پھوپھی، جس کے ہم بڑے دوست تھے، مجھے پچھرے سے پرے ایک شادی کے گھر لے گئی۔ جب ہم واپس آ رہے تھے تو ہم شرچھو کے باپ بوڑھے شگی رضی اکبر کے پوسٹ آفس کے پاس سے گزرے۔ پوسٹ آفس کیا تھا، مکان کے باہر ایک سرخ لیٹر بکس لگا تھا۔ نیچے ایک چٹائی پر ایک صندوقچی اور قلمدان سامنے رکھے پوسٹ ماسٹر صاحب بیٹھے تھے۔ جلے بھنے اور دنیا جہاں سے بیزار۔ گٹھیلا میانہ جسم، سر پر پگڑ، مہندی کی جھڑ والی داڑھی مونچھ سے سجا درشت بدہیئت چہرہ۔ کتنی لمبی ناک تھی رضی اکبر کی! وہ صندوقچی میں سے ایک عورت کو دینے کے لیے کارڈ نکال رہا تھا مگر بڑی بددلی سے۔ چٹائی کے سرے پر، جو بے رنگ کے کرتے میں ایک ادھ ننگا چار سال کا بچہ لیٹا تختی پر الف بے تے گھسیٹ رہا تھا۔ اس کے بال کٹے ہوئے تھے۔ چہرہ گول اور دلچسپ اور اس کی آنکھوں میں قدرتی شرارت اور ذہانت تھی۔

''وے شاواں، تمھیں پتا ہے یہ جاتک کون ہے؟'' میری پھوپھی نے پوچھا۔

''نہیں، مجھے پتا نہیں پھوپھی جی!' میں نے کہا، 'اس کا کیا نام ہے؟'

''یہ شرچھو بابا کا لڑکا ہے، عبداللہ،' میری پھوپھی نے کہا، 'تمھیں یاد ہے چار روز پہلے کی بات ہے، تم یہاں تھے اور میں شرچھو کے گھر تمھیں لے کر آئی تھی۔'

''مجھے اچھی طرح یاد ہے،' اور پھر میں نے عبداللہ کو دیکھتے ہوئے زور سے کہا، 'پھوپھی جی، پھوپھی جی، یہ تو ہیچو ہے!'

''عبداللہ کانے کا قلم اپنے بائیں ہاتھ میں پکڑے اپنی طرف سے خوش خطی کی کوشش کر رہا تھا۔

''عبداللہ نے 'ہیچو' کے لفظ پر اپنی آنکھیں تختی پر سے اٹھائیں اور منہ کھول کر مجھے ایک چمکیلی مسکراہٹ دی۔ مگر رضی اکبر، جس نے اپنے نواسے کے متعلق یہ لفظ سن لیا تھا، بھلا اس ہتک کو کیسے جانے دیتا۔

''اس نے ایک ریگتی آواز میں کہا، 'تے تسیں ملوانیا، سجو ہووو گے!'

''میری پھوپھی نے وار کو بڑی مضبوطی سے سنبھالا اور پھر بظاہر بڑی خوش طبعی سے چیں چیں کر بولی، 'یہ میرا بھتیجا سچا ہے اور ہمارے داد کے سب سچے ہیں۔ صراطِ مستقیم پر چلنے والے اور سیدھے کام کرنے والے۔ حلال کے سب سچے ہوتے ہیں میاں رضی اکبر۔'

''کڑے، جا جا، راہ لے!' رضی اکبر نے نفرت اور حسد کی آنکھیں اٹھائیں اور گھس گھس لفظ اس کے موٹے ہونٹوں سے جلتے ہوئے انگاروں کی طرح نکلے، 'میں تجھے بھی جانتا ہوں اور تیرے داد کوں کو بھی۔ یہیں گھاس مارا کرتے تھے۔ میری زبان نہ کھلوا۔'

''ایک اور عورت کو کارڈ دیتے ہوئے رضی اکبر کہنے لگا، 'راجو مصلّن! تو روز آ کر ایک تین پیسے کا کارڈ لے جاتی ہے۔ تو کارڈ نہ لکھے تو تیرے مصلّی کے وٹ نہیں پڑنے لگیں گے۔ تو سمجھتی ہے سرکار نے ڈاک خانہ تیرے لیے کھولا ہوا ہے؟'

''عبداللہ نے اپنے نانا کے خفگی بھرے الفاظ کو بڑے لطف اور مزے سے سنا۔ یہ اس کے لیے باقاعدہ تفریح تھی۔ اس نے میری طرف مسکرا کر مجھے اپنا ہمراز بنایا جیسے کہہ رہا ہو، 'دیکھو راجو مصلّن کی کیا گت بن رہی ہے۔'

''جب میری پھوپھی اور میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے اس خشک شکل بوڑھے آدمی سے رخصت ہوئے تو میری پھوپھی نے کہا، 'عبداللہ خدا جانے ان خشکی چوڑوں کے گھر کیسے پیدا ہو گیا۔ وہ ان میں سے نہیں لگتا۔ مزاج یا شکل کوئی بھی چیز تو اس کی مایا پر نہیں۔ پتا نہیں بھولن شرینو اس کو کہاں سے لے آئی۔'

''میں بعد میں اکثر وہاں سے گذرا کرتا۔ میری دو بیوہ خالائیں اس طرف رہتی تھیں اور وہ مجھ سے بے حد پیار کرتیں۔ سیاہ گاڑھے کے لمبے چولے اور سیاہ تہبند میں یہ خالائیں، جب بھی میں جاتا، گھی اور شکر کا شیرہ گھول کر مجھے کھلاتیں۔ کتنا مزے دار وہ ہوتا تھا! ان دنوں میں کافی پیٹو تھا۔ ان کا البتہ پوپلے مونہوں سے میری بلائیں لینا مجھے ناپسند تھا۔ میرے وہاں سے بار بار گذرنے کی ایک وجہ ایسی تھی کہ تم ہنسو گے۔ میں لیٹر بکس کو دیکھنا چاہتا تھا۔ سرخ اور چمکیلا لیٹر بکس جو ایک آدمی کی طرح گول مٹول تھا اور جس کا ایک چھجے دار منھ تھا جس میں سے وہ کارڈ اور لفافے ہڑپ کر جاتا تھا۔ لیٹر بکس گاؤں کے مٹیالے پھیکے رنگوں میں ایک بھڑکتی ہوئی آگ کی مانند تھا۔ تم پھر ہنسو گے۔ شاید بچپن میں میری اس سرخ گول ڈبے سے شیفتگی کا اثر ہے کہ میں اب بھی جب کسی لیٹر بکس کے پاس سے گذرتا ہوں، میرا دل تھوڑا سا اچھلتا ہے اور زندگی چمکیلی اور پُر مسرت لگنے لگتی ہے — اور پھر یہ خیال کہ تم اس لیٹر بکس میں خط ڈالو تو وہ کئی سو میل سفر کرتا جاتا ہے! لیٹر بکس، ہا! کتنے بچھڑے، دور دراز پڑے ساتھی اس کی بدولت ملتے ہیں...''

''یہ لیٹر بکس پر بڑا اچھا ایسے ہے میک ڈف۔ اس کے متعلق تمھاری شاعری ہم پھر کبھی سنیں گے۔ اب کہانی سناؤ۔''

باغ کے پاس ہی پولیس اسٹیشن میں گھنٹے پر ضربوں کی آواز آئی: ایک... دو... تین... دس۔ ابھی سے دس! اور ہوا میں خنکی تھی۔

''اچھا، میں مختصر ہونے کی کوشش کروں گا۔ مجھے لیٹر بکس کے نیچے بیٹھے ہوئے خشک شکل خمیدہ

پوسٹ ماسٹر اور ننھے منے تختی لکھتے ہوئے یا پاس ہی کھیلتے ہوئے لڑکے میں کچھ کشش سی لگتی تھی۔ میں دور سے انھیں دیکھتا گذر جاتا۔ عبداللہ سے دوستی کرنے کو میرا دل چاہتا تھا مگر میں بوڑھے کی بدمزاجی سے ڈرتا تھا۔ دوسرے میری دادی کو شمس اکبر اور اس کے خاندان کے خلاف کچھ پرانے گلے تھے اور اس نے مجھے ہدایت کی تھی کہ میں ان کے گھر نہ جایا کروں۔ ہمیں کوئی لفافہ یا پوسٹ کارڈ منگوانا ہوتا تو میری دادی ہمیشہ نورے میراثی یا کسی اور سے منگواتی۔ اسی طرح جو خط آتے، ان کو لینے کے لیے بھی کوئی کسی کو بھیجا جاتا۔ اسے دو تین پھیرے کاٹنے پڑتے کیونکہ میری دادی سے بدلہ لینے کے لیے بوڑھا شمس اکبر پہلے پھیرے پر کسی دیہ کہہ کر جھڑک دیتا کہ میں نے ابھی چھانٹی نہیں کی، یا میرے کام میں حرج ہوتا ہے، میں اپنے وقت پر چھانٹی کروں گا۔ حالانکہ گاؤں میں بہت کم چٹھیاں آتی تھیں اور وہ بھی ہفتے میں دو بار۔

"ایک دفعہ میں نے عبداللہ کو نیم کے نیچے اکیلے بیٹھے ہوئے پایا — اپنے نانا کی نقالی میں پوسٹ ماسٹر بنے ہوئے۔ بوڑھا آدمی غالباً باہر بروئیوں میں گھاس چھیلنے گیا ہوا تھا یا کسی شریک کے ہاں جائیداد کا کوئی جھگڑا نمٹانے گئے۔ عبداللہ تختی پر آڑے ترچھے حروف میں قلم پر زور دے دے کر ابجد کی مشق کر رہا تھا۔ مجھے شرارت سوجھی۔

"میں اس کے پاس گیا۔ 'پوسٹ ماسٹر! مجھے دو پیسے کا کارڈ دو دینا۔'

"عبداللہ نے اوپر مسکراتے ہوئے دیکھا۔

"'تمھارا نانا کہاں ہے؟'

"'واندے...'

"میں اس کے پاس بیٹھ گیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا، 'تمھیں الف ب لکھنی آتی ہے؟'

"'کیوں نہیں،' میں نے فخر سے کہا۔ 'یہ تو میں نے پہلی جماعت میں سیکھی تھی۔ مجھے سو تک گنتی اور پہاڑے بھی آتے ہیں اور انگریزی میں اے بی سی لکھ سکتا ہوں۔ سی اے ٹی کیٹ، آر اے ٹی ریٹ — اور میں تمھاری طرف کھسچو نہیں ہوں۔'

"وہ یک لخت زور زور سے پکارنے لگا: 'بے بے، بے بے، میانوں کا لڑکا مجھے کھسچو کہتا ہے۔'

"میں نے اسے منت کرکے چپ کرایا اور پھر اس کی تختی پر خوش خط الف ب لکھنے لگا۔ پھر میں نے اسے بتایا کہ اے بی سی کیسے لکھتے ہیں اور کیٹ کیسے۔

"'میرا نام لکھو۔'

"میں نے اس کا نام لکھا۔ وہ بڑی خوشی اور تعجب سے دیکھتے ہوئے بولا، 'میں بے بے کو جا کر

دکھا آؤں۔'

'''ٹھہرو، بے بے کو پھر دکھا دینا۔ یہ میرا نام ہے — ثناء الحق — دیکھو کتنا شاندار!' اور میں نے اس کے نام کے ساتھ اپنا نام لکھ دیا۔ پھر خیال آنے پر میں نے آگے یہ الفاظ لکھے: 'دوست بیلی۔'

''میں نے اسے آدمی اور خرگوش اور گھوڑے کی بھدی الٹ سلٹ تصویریں تختی پر بنا دیں۔

'''یہ گناہ ہوتا ہے،' اس نے کہا۔ 'میاں جی کہتے ہیں کہ آدمی کی تصویر بنانا گناہ ہوتا ہے اور اللہ میاں اس پر بڑے خفا ہوتے ہیں۔ تم نے اللہ میاں دیکھے ہیں؟'

'''ابھی تک تو نہیں دیکھا۔ بڑے نیک لوگ ہی اللہ میاں کو دیکھ سکتے ہیں۔'

'''بے بے کہتی ہے اللہ میاں ہر جگہ ہوتے ہیں۔ میں انھیں درختوں اور چھپرے کے پاس ڈھونڈتا ہوں۔ مجھے تو نظر نہیں آتے — ان کی ڈاڑھی ہوتی ہے؟'

'''اللہ میاں کی شکل نہیں ہوتی...'

'''شکل نہیں ہوتی؟' یہ بات عبداللہ کو بڑی عجیب لگی۔ پھر اس نے کہا، 'ہماری مینھں نے کٹی دی ہے، چلو تمھیں دکھاؤں۔ نہیں، پر میاں جی نے کہا تھا تم یہیں بیٹھے رہنا۔ کوئی لفافے لے جائے اور پیسے نہ دے۔ اور مودے پانڈی کا لڑکا ہے نا، نامان کل شام کو وہ اس لال بکس میں روڑے ڈالتا رہا۔ میاں جی نے اسے خوب مارا۔'

''اس طرح ہم باتیں کرتے رہے جواب مجھے یاد نہیں۔ وہاں صندوقچی کے پاس ایک کاغذ میں سوراخ کرنے والی مشین تھی۔ عبداللہ نے اس سے مجھے سوراخ کر کے بتایا۔ یہ مجھے بڑی عجیب و غریب بات لگی اور ہم پوسٹ ماسٹر کے ایک نئے نویلے سفید کاغذ کو مشین چلا چلا کر سوراخوں سے چھلنی کرتے رہے۔ سوراخوں کی جو گول گول کترنیں نکلتی تھیں وہ ہمارے لیے سونے سے زیادہ قیمتی تھیں۔ ہم ان کو بعد میں بانٹنے کے لیے سنبھال سنبھال کر رکھتے جاتے۔ وقت اڑتا گیا۔ اتنے میں میں نے نظر اٹھائی تو سامنے سے ہاتھ میں ٹیک والا عصا لیے کھوہار کا پوسٹ ماسٹر اپنی گھسٹتی چال سے چلتا آ رہا تھا۔ میری تو جان نکل گئی۔ وہ وہیں سے رینکا: 'یہ میانوں کا لڑکا آج کیا لینے آیا ہے؟' ممکن ہے اس نے اسے اپنی طرف سے خوش طبعی ہی سے کہا ہو اور خوش آمدید کے طور پر، مگر میں اتنا ڈرا کہ وہاں سے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگا — اپنی قیمتی کترنوں کو بھول کر۔ بعد میں مجھے یقین ہے کہ عبداللہ نے اسے بتایا ہوگا کہ مشین سے اس کے کاغذ میں سوراخ بھی میں نے کیے ہیں اور تختی پر جاندار چیزوں کی تصویریں بھی میں نے بنائی ہیں۔ بوڑھا ضرور بڑبڑایا ہوگا مگر میرا خیال ہے اس نے عبداللہ کو معمولی سرزنش کی ہوگی۔ وہ دوسروں کے لیے بڑا کڑوا اور کھردرا تھا، اپنے خون پوست کے

لیے نہیں، اور اپنے چھوٹے خوبصورت نواسے کے لیے تو اس کا دل خاص طور پر نرم تھا۔

''لیکن ایک بار میں بوڑھے رحمی اکبر کی سخت خفگی کا سبب بنا، اور وہ بھی مفت میں۔ عبداللہ چند دوسرے بچوں کے ساتھ چھجرے پر شیدن کھیل رہا تھا۔ میں وہاں سے گزرا تو ان کے ساتھ کھیل میں شامل ہو گیا۔ شیدن تم نے کھیلی ہوگی — زمین پر ایک لکیر سے ایک مستطیل کھینچ لیتے ہیں جسے خانوں میں تقسیم کیا جاتا ہے، کوئی چھوٹا کوئی بڑا۔ خانوں کے نام بھی عجیب و غریب ہوتے تھے۔ ایک خانہ نانی ہوتا تھا، ایک ناپو، ایک گھڑا گھڑاپو، اور چھوٹا سمندر اور اس سے آگے بڑا سمندر۔ کھیلنے والا پہلے پہلے خانے میں گٹی پھینکتا ہے اور وہ ایک ٹانگ پر پھدکتا ہوا پاؤں سے گٹی کو باہر سرکاتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ گٹی لکیر کے اوپر نہ آئے اور نہ ہی پاؤں لکیر پر پڑے، ورنہ کھلاڑی آؤٹ ہو جاتا ہے اور دوسرے کی باری آجاتی ہے۔ نانی کے اوپر سے پھلانگ کر گذرنا پڑتا ہے اور اس میں گٹی چلی جائے تو پھر پہلے خانے سے شروع ہونا پڑتا ہے۔ میں نے اپنی باری پر پہلے خانے کلیر کر لیے، نانی میں پھینکی اور خانوں میں سے پھدکتا ہوا چلا تو عبداللہ نے شور مچایا کہ میرے پاؤں کی ایڑی لکیر پر آ گئی ہے۔ میں نے اس سے انکار کیا اور عبداللہ کہنے لگا کہ تم روند مارتے ہو، ہم تم سے نہیں کھیلتے۔ اس نے گٹی اٹھائی اور گھر کی طرف چل دیا۔ میں نے اس کی بڑی منت کی اور اسے یقین دلاتا چلا کہ میرا پاؤں لکیر پر نہیں لگا تھا۔ مجھے کھیل میں مزہ آ رہا تھا، اور میں جیت رہا تھا۔ عبداللہ بھی ضدی بلا تھا۔ نہیں مانا۔ آخر میں نے غصے میں چڑ کر کہا، 'نہیں کھیلتا تو چڑھ...' سب گاؤں کے بچے، لڑکے اور بڑے ایسے لفظ بغیر سوچے سمجھے استعمال کرتے ہیں مگر عبداللہ نے تو بات کا بتنگڑ بنا لیا اور گھر اپنے نانا اور سب سے جا کر میری شکایت کی کہ ثناء الحق نے اسے گندی گالی دی ہے۔ میں تو وہاں سے چلا آیا مگر بوڑھے رحمی اکبر اور شرچھو نے بڑا طوفان مچایا۔ 'کون جمیا اے ساڈے دُتے نوں گالیاں دینے والا! اب یہاں آئے تو سہی۔' پوسٹ ماسٹر نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ شام کو اپنے نواسے کے ہمراہ چوبارے پر میرے دادا کے پاس آیا — برسوں میں شاید پہلی بار۔ اس نے میرے دادا کو کہا کہ ثناء الحق نے عبداللہ کو یوں یوں کہا ہے۔ جب دادا نے مجھ سے پوچھا تو بات سچ تھی اس لیے میں انکار نہ کر سکا۔ میرے دادا نے مجھے خوب جھڑکا کہ تو نے یہ گندی باتیں کہاں سے سیکھیں، اور یہ کہ اسے علم نہیں تھا کہ مجھے بری عادتیں پڑ گئی ہیں۔ میں بڑا شرمندہ ہوا اور اس شرارت کی ساری جڑ عبداللہ نے میری اس سرزنش پر خوب بغلیں بجائیں۔

''میں اس گرما میں پھر اس کے ساتھ کھیلنے نہیں گیا — چغل خور۔ شکایتی رقعہ کہیں کا!''

میں نے کیٹس کو کوٹ کیا، ''میرا دل دکھتا ہے اور ایک سلا دینے والی سکتے کی کیفیت مجھ پر

طاری ہوتی ہے — میک ڈف۔"

احسان نے کہا، "یار، ہمیں دیوار پھاندنی پڑے گی۔ اگر پھر پکڑے گئے تو رپورٹ ہو جائے گی۔"

ثناء الحق نے اپنی کہانی جاری رکھی، اپنی گذری ہوئی یادوں کے حزن میں ڈوبی ہوئی، جس کا ایک ایک لمحہ وہ دوبارہ جی رہا تھا۔ وہ ایک طاقتور شراب کے نشے میں سرشار انسان تھا۔ "اور ہر سال ہم اپنے وطن میں تقریباً ساون بھادوں کے مہینوں میں آتے تھے جب ہمیں چھٹیاں ہوتی تھیں۔ میں اکثر عبداللہ کو دیکھتا۔ کبھی گاؤں کے بچوں کے ساتھ گولیاں اور شیدن اور گلی ڈنڈا کھیلتے، کبھی چھپڑ میں اپنی بھینس کو نہلاتے، کبھی دریا کے اس پار واڑے میں اپنے جانوروں کو چراتے، کبھی درانتی لیے گھاس چھیلنے کے لیے بروٹیوں کی طرف جاتے، یعنی وہ مختلف کام کرتے جو سب غریب دیہاتی لڑکے کرتے ہیں اور جو میری رائے میں خشک الفاظ رٹنے یا سود مرکب کے سوال حل کرنے سے کہیں زیادہ صحت مند اور مفید کام ہیں۔ ورڈز ورتھ کی لوسی کی طرح وہ سورج اور بارش کے چھینٹوں میں بڑا ہوتا رہا۔ جب کبھی ہم ملتے، ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکراتے اور ادھر ادھر کی باتیں کرتے جو اب مجھے یاد نہیں۔ ہم دونوں اس کی چغل خوری کو بھول گئے تھے اور وہ اب ہمارے درمیان ایک ہنسی کی بات تھی۔ اس نے قرآن حفظ کرنا شروع کیا اور گاؤں کے اسکول میں بھی جانے لگا۔ ایک دفعہ اس نے اپنے منشی کے بولنے کی ہوبہو نقالی کرکے ہمیں بڑا ہنسایا۔ اس کا نام غلام رسول تھا مگر وہ مشہور منشی چچڑ کے نام سے تھا، اگرچہ اس کی کوئی خاص وجہ نہ تھی۔ عبداللہ نے بڑی ہنستی ہوئی آنکھوں سے مجھے بتایا، 'ثناول، یہ چچڑ لڑکوں کو بڑی سزا دیتا تھا۔ جب کسی لڑکے کو سبق نہ آتا تو اس کے پاس آکر پیٹ، بغل یا ٹانگوں پر زور زور سے چٹکیاں لیتا۔ لڑکے ناچتے، درد سے چلاتے اور چچڑ بڑا خوش ہوتا۔ سب اس سے ڈرتے تھے۔ ایک دن اس نے میرے ساتھ بھی ایسا کیا۔ میں نے ثناول، بدلے میں چچڑ کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی انگلی پر زور سے چک مارا۔ پھر تو چچڑ صاحب کو نانی یاد آ گئی۔ زور سے ہاؤ کیا۔ وہاں چچڑ نے مجھے دھمکی دی کہ بے وقوف بدتمیز نالائق، میں تیرے نانا رضی اکبر سے تجھے پٹواتا ہوں۔ وہاں سے بھاگا اور ڈاک خانے میں میاں صاحب کے سامنے میری شکایت کی کہ آپ کے نواسے نے گستاخی کی ہے اور میری انگلی کاٹ لی ہے۔ میاں صاحب کی عادت تم جانتے ہو۔ انھوں نے کہا: چچڑ، تیرے کرتوت ہی ایسے ہیں۔ اس کی سزا تجھے ملی۔ ورنہ عبداللہ بڑا نیک ہے۔ میری بے بے چچڑ کی ہاں ہاں سن کر بدھانی لیے آ گئی، اور پھر تو آگے آگے مسٹر چچڑ اور پیچھے میری بے بے، بدھانی اٹھائے اور چچڑ کی ایسی تیسی کرتی ہوئی۔ وہ چچڑ کو راجے کے کھوہ تک

چھوڑ آئی۔ وہ دن اور آج کا دن، بچھڑ نے پھر کبھی لڑکے کے چٹکیاں نہیں لیں۔ مجھے آج تک دیکھتا ہے تو کترا کر نکل جاتا ہے۔ بچھڑ کی ایک اور عادت یہ تھی کہ اچھے کھاتے پیتے لڑکوں کو ٹھوں تالی بجا کر بلاتا: 'اوئے مظفرا، (تالی) جا اپنی بے بے سے تازہ مکھن لے آ' — یا 'اوئے تافی، شیطان دی نانی، (تالی) آج منشی جی کو منجی روٹی کھلا' — جس طریقے سے عبداللہ یہ باتیں سناتا تھا اور جس مسخرے انداز میں، ہنسی سے پیٹ میں بل پڑ جاتے تھے۔ ایک دفعہ میں نے گاؤں کے بچوں کو گیڑی پر کھیلتے ہوئے دیکھا۔ انھوں نے عبداللہ کی سرکردگی میں تافی کو گھیر رکھا تھا اور تالیاں بجا بجا کر ایک ساتھ کورس میں گا رہے تھے: 'تافی کتے دی نانی، جا پھڑ جا پانی!'

''تافی بیچارا رونے لگا اور پھر حلقے میں کوئی سوراخ دیکھ کر نکل بھاگا۔ سب چھوٹے شیطانوں کا غول 'تافی کتے دی نانی' چلاتا ہوا اس کے پیچھے پیچھے تھا۔ آگے آگے عبداللہ۔ میں نے جا کر تافی بیچارے کو ان شرارتی لڑکوں سے نجات دلائی۔ تب میری بارہ تیرہ سال عمر تھی اور میں خاصا بڑا اور تگڑا تھا۔

''غالباً ۱۹۳۶ء کی بات ہے۔ میں نے اسلامیہ کالج لاہور میں فرسٹ ایئر میں داخلہ لیا۔ داخلے کے بعد ہی گرمیوں کی چھٹیاں شروع ہو گئیں اور میں وطن چلا گیا۔ دادا جی تب علیل تھے اور میرے جانے کے کوئی ایک ماہ بعد وفات پا گئے۔ آخری دم تک ہوش میں رہے اور اپنے بستر سے ایک بادشاہ کی طرح ہدایتیں دیتے۔ میں گھوڑی پر اسی طرح تین دن ڈھلے وہاں پہنچا۔ دادا سے مل کر نیچے آیا تو پھوپھی جینا نے باتوں باتوں میں بتایا کہ مہینہ پہلے شرچھو مر گئی ہے۔ شرچھو کی موت بھی بالکل اس کی ڈھنگ جفاکش اور وحشیانہ زندگی کے عین مطابق تھی۔ وہ آدھی رات کو اپنے گدھے پر چٹی سے لکڑیاں کاٹ کر لا رہی تھی کیونکہ دن کو وہاں محکمہ جنگلات کے بیلداروں کی پہرے داری رہتی تھی۔ اندھیری کالی سیاہ رات تھی اور یہ دو جنوں جتنی دلیر عورت اکیلے دم پہاڑی سے اتر رہی تھی کہ ایک مریادھے (جنگلی سور) نے اس پر حملہ کیا۔ شرچھو کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی اور اس شیر کی بچی نے اس سے مریادھے کا جی دار مقابلہ کیا۔ جنگلات والوں نے بعد میں پتا چلایا کہ انھوں نے اس رات چٹی میں یا علی مدد کا نعرہ سنا تھا اور اس کے ایک بعد عورت کی عجیب ہولناک چیخیں اور بد دعائیں۔ اس مقابلے کو کسی نے نہیں دیکھا اور کوئی نہیں جانتا کہ کیا ہوا اور شرچھو خونخوار جنگلی سور سے کیسے لڑی، مگر دوسرے دن صبح گاؤں کے باہر شرچھو کا گدھا لکڑیوں کے گٹھے سے لدا ہوا دیکھا گیا — اپنی ہنکانے والی کے بغیر۔ اس سے ہر ایک کو تعجب ہوا اور جب شرچھو دیر تک نہ آئی تو بوڑھا رحمی اکبر، اس کے بیٹے اور دو پورے گاؤں کی ایک جماعت کے ساتھ تلاش میں چٹی میں گئے۔ ایک

پہاڑی پر چند میٹھے اور اچھلتے ہوئے کدموں سے سراغ پا کر وہ اُدھر گئے اور وہاں ایک جھاڑی کے پاس انھوں نے شر پھو کا زخمی مسخ شدہ اکڑا ہوا جسم پایا۔ آنکھیں ہنا کانہ انداز میں کھلی اور پھیلے ہوئے ہاتھ کی مٹھی کے ساتھ کلہاڑی جس پر خون جما ہوا تھا۔ پاس ہی دو قدم پر جنگلی سور سر میں کلہاڑی کے پھل کا قاتل زخم لیے مردہ پڑا تھا۔

''میری پھوپھی جینا نے کہا،'جو کچھ ہو، تھی شر پھو کوئی جن کی بچّی۔ جو عورت ایک مریادے کو کلہاڑے سے مار سکتی ہے، اس کے جگرے اور زور کو دھن ہے!'

''لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ساتھ جوڑا لے جایا گیا اور جب اسے دفنایا گیا تو نہ صرف کھوہار بلکہ آس پاس کے گاؤں کے لوگ بھی آئے تھے۔ میری پھوپھی نے ڈرامائی انداز میں یہ واقعہ سنایا تو میں نے محسوس کیا کہ شر پھو جاتے جاتے گاؤں کی تاریخ میں ایک اور لیجنڈ چھوڑ گئی ہے جو پشتوں میں نہیں بھلائی جائے گی۔

''دوسری صبح میں شر پھو کے گھر اس کے بیٹوں سے تعزیت کرنے اور فاتحہ پڑھنے گیا۔ رضی اکبر اپنے لیٹر بکس کے نیچے چٹائی پر بیٹھا تھا — خمیدہ اور شکست۔ وہ اپنی بیٹی کی موت کے صدمے سے دنوں میں بہت بوڑھا ہو گیا تھا اور پہلے سے بھی زیادہ روکھا اور قبر یلا۔ اس کی آنکھیں خالی اور کوری نظر آتی تھیں جیسے وہ پتھر کی ہوں۔

''میں نے جا کر کہا،'السلام علیکم چاچا جی۔'

''اس نے پہلے مجھے اس طرح دیکھا جیسے نہ پہچانا ہو۔ پھر اس نے کہا،'وعلیکم السلام۔ آؤ جی، جی آیاں نوں۔ لفافے کارڈ لینے آئے ہو؟' وہ اچھی طرح میرے آنے کا مقصد جانتا تھا۔

'''نہیں چاچا جی، اجازت دیں تو بیٹھ جاؤں۔ ماسی سرفراز کے انتقال کا سن کر بڑا افسوس ہوا۔ بڑی شیر دل عورت تھی۔ مشیت ایزدی کے سامنے کوئی چارہ نہیں۔'

'''مشیت ایزدی رضی اکبر دے خاندان واسطے ای رہ گئی ہے!' وہ بڑبڑایا اور پھر ایک زہر خند کے ساتھ اوپر آسمان کی طرف دیکھا۔

''میں نے کہا کہ ہر ایک کی زندگی لکھی ہوئی ہے، اور سب کو باری باری جانا ہے۔

'''لیکن کئی تو یہاں دھرنا مار کر بیٹھے ہیں۔ ایہہ بڈھے نیاز احمد ہوریں حالی جیند ے نے، مردے نہیں۔'

''میرے دادا کے بارے میں اس کا یہ حوالہ ایک جلتا ہوا انگارہ تھا مگر میں اسے پچا گیا۔ رضی اکبر کا غالباً بڑھاپے کے صدمے سے دماغ چل گیا تھا۔

''میں نے کہا، 'چاچا جی، آپ کی اس بات کے بعد مجھے فاتحہ نہیں کہنی چاہیے۔ مگر سرفراز بیگم آپ کی بیٹی تھی۔ میں مرحومہ کی فاتحہ کہنے آیا ہوں۔'

''میں نے ہاتھ اٹھائے۔ اس نے سرسری انداز میں اور بے دلی سے ہاتھ اٹھائے اور ہم نے فاتحہ پڑھی۔ فوراً بعد رحمی اکبر نے کہا، 'نیاز احمد کے پاس میرے نواسوں کی کچھ زمین گروی رکھی ہوئی تھی جس پر وہ قبضہ کر بیٹھا ہے۔ اس کو کہو کہ میرے نواسوں کا حق نہ مارے اور اس سے پہلے کہ فرشتۂ اجل اس کی روح کو واگذار کرے، اس ظلم سے توبہ کر لے۔'

''بوڑھے کی باتوں نے میرا دل بڑا میلا کیا۔ میں نے تحمل سے کام لیا اور اٹھتے ہوئے اس سے پوچھا، 'عبداللہ کہاں ہے؟'

'''عبداللہ — حافظ عبداللہ۔ وہ واڑے پیچھے کاٹنے گیا ہوگا۔'

''میں وہاں سے نہر کے پار واڑے میں گیا۔ سورج چمک رہا تھا اور اناج کے ادھ پکے کھیت سنہری دھوپ میں نہا رہے تھے۔ ایک باڑ کے پاس میں نے عبداللہ کو ایک پگڈنڈی پر دیکھا۔ وہ ایک درانتی سے کچھ گھاس کاٹ رہا تھا — ایک دیہاتی لڑکے کی طرح تازہ رو اور صحت مند۔ اس کے چہرے پر طمانیت اور سکون تھا اور ہونٹوں پر ہاہیے کی گنگناہٹ۔

'''آؤ بھائی شاہ ول، کدھر آئے ہو؟'

''ہم نے ہاتھ ملائے۔ وہ مجھ سے چار پانچ سال چھوٹا تھا۔

'''میں تمھارے نانا کے پاس فاتحہ پڑھنے گیا تھا۔ اس نے بتایا کہ تم واڑے میں گئے ہو۔'

'''بے بے نے مرید حسے کو مار ڈالا!'

'''ہاں مجھے پتا لگ گیا تھا۔ تمھاری بے بے بڑی بہادر تھی۔'

'''جنیا والا ول تھا بے بے کا!' وہ پھر درانتی چلانے لگا۔ 'شاہ ول، میں نے قرآن حفظ کرلیا ہے۔'

'''حافظ عبداللہ بن گئے ہو گویا۔'

'''اور میں اب منجسن کے اسکول میں جاتا ہوں۔ کھوبار میں تو صرف پانچ جماعتیں ہیں۔ منجسن میں ہائی اسکول ہے۔ مجھے بھی اے بی سی آ گئی ہے۔ وٹ از یور نیم۔ ہاؤ ڈو یو ڈو۔ ون ٹو، بکل مائی شو...' اور وہ فخر سے مسکرایا۔

''پھر وہ بولا، 'شاہ ول، یہ جو ہوائی جہاز اڑاتے ہیں، کیسے بنتے ہیں؟'

'''کیسے کیا مطلب؟'

'''مطلب یہ کہ میرا دل کرتا ہے میں ہوائی جہاز اڑایا کروں۔ ہوائی جہاز مجھے بڑا پسند ہے۔

پر میاں جی کہتے ہیں، وہ گر پڑتے ہیں۔'

'''ہاں گر تو پڑتے ہیں،' میں نے اسے دو تین ہوائی جہازوں کے گرنے کے حادثات سنائے۔ جرمن زیپلن کا قصہ بھی جسے ہوا میں آگ لگ گئی تھی۔

''ہم گھاس کی کتر کتر اور پرندوں کی چہچہاہٹوں میں بہت سی باتیں کرتے رہے۔ وہ سوال پوچھتا تھکتا نہ تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ بائسکوپ کیا ہوتا ہے۔ اس نے زینت بی بی کے گھر جھنڈیو والے گراموفون کے ریکارڈ سنے تھے اور مجھ سے پوچھا کہ اس میں کوئی گانے والی روح چھپی ہوتی ہے؟ اتنی باتیں ہم نے کیں۔

''میں نے کہا، 'تم درانتی سے گھاس بڑی تیزی سے کاٹتے ہو۔'

'''تم کاٹو۔ بڑا آسان ہے!' اور اس نے درانتی میرے ہاتھ میں دے دی۔

''میں نے گھاس کاٹنے کی کوشش کی مگر اسے اتنا آسان نہ پایا۔ وہ ہنسنے لگا اور پھر اس نے مجھے اس کا گر سمجھایا کہ درانتی کو اس طرح پکڑتے ہیں اور اس رخ چلاتے ہیں اور یہ کہ درانتی کا پھل پہلے ٹھیک کر لینا چاہیے اور پھر کسی پتھر پر تیز۔ میں نے پھر کوشش کی تو اپنا ہاتھ تھوڑا سا کاٹ لیا۔ خون بہنے لگا اور عبداللہ نہر کے کنارے سے مٹھی بھر ریت لے آیا جسے اس نے زخم پر بکھیر دیا۔ 'پہلی دفعہ ہاتھ ہر کسی کا کٹتا ہے،' اس نے میری حوصلہ افزائی کی۔ 'تم میرے ساتھ آیا کرو۔ میں تمھیں فلافٹ سکھادوں گا۔ میں اب گھر کے بہت سے کام خود کرتا ہوں۔ پہلے تو میری بے بے تھی۔ میں اٹیرن سوت بھی کات لیتا ہوں اور موہے بھی گانٹھ لیتا ہوں، مگر ہوائی جہاز اڑانا مجھے نہیں آیا۔'

'''ہوائی جہاز تمھارے پاس ہے کہاں؟'

'''تمھارے پاس ہے؟'

'''ہاں۔ اگلے سال میں آؤں گا اور ہم دونوں اسے اڑایا کریں گے۔ گاؤں کے اوپر اور پہی کے اوپر۔'

'''ہاہا، ہاہا!' وہ درانتی پھینک کر خوشی سے ناچنے لگا۔ اور پھر اس نے شکایت کی کہ میرے پاس تھا تو میں اس پر کیوں نہیں آیا، ریل گاڑی میں کیوں؟ میں نے کوئی مناسب عذر کیا۔

''ہم واپس ایک بڑا سا گٹھا لے کر آئے اور چھپر کے پاس پھر ملنے کا وعدہ کر کے لوٹ گئے۔

''ایک بار میں پھر اسے ملا۔ میں ساوی گھوڑی پر اپنے ایک رشتے دار کو ملنے پنجسن جا رہا تھا۔ راستے میں سڑک پر عبداللہ اور اس کے پانچ چھ ساتھی بستے بغل میں دابے پیدل اسکول کو رواں تھے۔ میں نے اس کو گھوڑی پر اپنے پیچھے بٹھالیا۔ 'ساوی گھوڑی،' میں نے کہا، 'یہ ہے!' امیرانہ خو بو

کی وضع دار گھوڑی تھی اور بعض وقت وہ اتنی پرکینہ ہو جاتی تھی جتنی کوئی گھوڑی ہو سکتی ہے۔ مجھے اپنی پیٹھ پر سوار کرانے سے وہ خوش نہیں ہوتی تھی اور گویا اخلاقاً اور مجبوراً ایسا کرتی تھی۔ اب جب میں نے عبداللہ کو زین کے پیچھے نمدے کے تبر پر بٹھایا تو ساوی نے اسے ناپسند کیا۔ وہ بپھر گئی۔ اس کے نتھنے غصے سے پھڑکنے لگے۔ وہ اگلی ٹانگیں اٹھا کر ہمیں گرانے کی نیت سے کودی۔ مگر میں نے اسے لگام سے قابو رکھا اور رکابوں میں پاؤں مضبوطی سے جمائے، جیسا کہ نورے میراثی نے مجھے سکھایا تھا۔

''دیکھو، دیکھو!' عبداللہ نے کہا، 'ساوی نخشاں کرنے لگی ہے۔'

''میں ابھی اچھا سوار نہیں تھا اور ساوی کی متلون مزاجی سے ڈرتا تھا۔ میں دل میں ڈر گیا لیکن ظاہراً بڑی بہادری سے کہا، 'اس حرامن کو کبھی کبھی جن چڑھتا ہے۔ میں ابھی اس کو سیدھا کرتا ہوں۔'

''جب ساوی ہمیں گرا نہ سکی تو وہ بپھری ہوئی اپنی خودسری سے پویا میں ہوگئی۔ میں اس کی ایک آنکھ میں غصے اور کینے کی دمک دیکھ سکتا تھا، اور اگرچہ میں نے عبداللہ پر رعب ڈالنے کے لیے بڑے مشاق شاہسوار کا طور اختیار کیا جو گھوڑوں کی رمزوں اور چالوں سے واقف ہو، مگر دل میں بے حد خائف تھا۔ میرا پسینہ چھوٹ گیا۔ عبداللہ نے کہا، 'بھائی شاول، تمھیں گھوڑے کی سواری نہیں آتی۔ اسے کھڑا کرو، کھڑا کرو — ڈر... ڈرا ساوی ہے، کی پٹے کرنی اے! ڈر... ڈر!'

''ہم ایک رستے پر جا رہے تھے جس کے ایک طرف کیکر کے کانٹوں کی باڑ تھی۔ ساوی نے کیا کیا کہ اپنے بدن کو باڑ کے ساتھ ساتھ رگڑ کر بھاگنے لگی تاکہ ہمیں کانٹے چبھیں۔ وہاں سے وہ پل کے پاس نہر کی پٹڑی پر آئی۔ اس طرح کوئی ہوئی شرارت پر آمادہ۔ اور میں اپنی سٹی بھول گیا تھا کیونکہ میرا خیال تھا کہ اس کا ارادہ ہمیں نہر میں اچھال پھینکنے کا ہے۔ اس کا ارادہ یہ نہ تھا؛ وہ صرف بُرے نومشق سواروں کو بھانپ لیتی تھی۔

''وہ پٹڑی پر بھاگی۔ ہم اس کی پیٹھ پر جمے رہے۔ عبداللہ نے کہا، 'اس کی باگیں مجھے پکڑاؤ، شاول!' مگر اتنے میں زین کا تنگ کسی طرح ڈھیلا ہونے سے زین الٹ گئی اور اس کے ساتھ میں زمین پر آ رہا۔ گھوڑی کی رفتار ابھی ہلکی تھی۔ عبداللہ بھی کود کر نیچے اتر آیا۔ ساوی فوراً وہیں کی وہیں کھڑی ہوگئی۔ اس کی ٹانگوں کی نسیں کانپ رہی تھیں۔

''عبداللہ خوب ہنسا۔ اس نے گھوڑی کو تھپکیاں دیں اور پھر نمدے کے تبر کو بچھا کر اس پر زین کے تنگ کو مناسب طریق پر کسا، نہ کم اور نہ زیادہ۔

''اس نے کہا، 'تمھیں سواری نہیں آتی۔ اب شاول، میں آگے بیٹھتا ہوں اور تم پیچھے۔ اب ساوی نخشاں نہیں کرے گی۔'

''اس نے مجھے چڑھایا اور پھر خود رکاب میں پاؤں رکھ کر بڑی پھرتی اور صفائی سے اوپر زین پر کود گیا۔ باگیں ہاتھ میں سنبھالیں۔ پہلے تو ساوی نے اپنی پہلی سی اڑی کرنے کی کوشش کی، کبھی گھومتی، کبھی اچھلتی، مگر عبداللہ نے تھپکیوں، بولیوں اور باگ کے اشاروں سے اسے رام کرلیا۔ وہ بھانپ گئی کہ اب اس کی پشت پر ایک سوار ہے اور اس کی کچھ نہ چلے گی۔ وہ اب عبداللہ کی مرضی پر کبھی دُلکی چلتی، کبھی پویا اور کبھی آہستہ آہستہ۔ راستے بھر عبداللہ مجھے گھوڑے کے گر سکھاتا رہا، جس طرح اس نے ایک دفعہ مجھے درانتی سے گھاس کاٹنا سکھایا تھا۔ پھر وہ پیچھے تبر پر آ گیا اور میں زین پر۔ اب کے میں کافی سدھا ہوا سوار تھا اور ساوی نے راستے بھر کوئی حجت نہ کی۔ ٹبر جسن آنے پر میں نے عبداللہ کو سڑک کے دوشاخے پر اتارا، اور خود آگے موج پور کی سمت چل پڑا۔ وہ کچھ دیر وہاں کھڑا مجھے دیکھتا رہا، مسکراتا ہوا اور اپنا ہاتھ ہلاتا ہوا — بایاں ہاتھ — عبداللہ اب بھی کھبّو تھا۔

''اس کے بعد میں ایک دو دفعہ گھر گیا اور پھر حالات کے تحت تین چار سال تک نہ جا سکا۔ میرے دادا کی وفات کے بعد گھر بار وہ پہلا سا گھر بار نہ رہا۔ وقت کے ساتھ کتنے ہی انقلابات آجاتے ہیں، چیزوں میں اور انسانوں میں — ہم خود بدل جاتے ہیں اور ایک طرح سوچو تو نہیں بھی بدلتے۔ میں اپنے بچپن اور لڑکپن سے اپنے آپ میں بڑی تبدیلی پاتا ہوں۔ لیکن شاید اسی زمانے کے تاثرات، عادات، خوشبوؤں اور نظاروں ہی نے مجھے وہ آدمی بنایا ہے جو میں اب ہوں۔ ممکن ہے اپنی اصل میں میں وہی معصوم، کھویا ہوا، شرارتی بچہ ہوں، مگر یہ میں جانتا ہوں کہ چیزوں میں وہ پہلی سی تازگی اور جھلک اب مجھے دکھائی نہیں دیتی۔ زمین پر پھیلی ہوئی ایک سنہری دھند اب اٹھ گئی ہے۔ دادا کے تین ماہ بعد میری دادی بھی سیڑھیوں سے گر کر اللہ کو پیاری ہوگئی۔ اگلے سال میری دونوں بیوہ خالائیں بھی یکے بعد دیگرے رخصت ہوگئیں۔ پہلے بڑی خالہ نذیراں تپ محرقہ میں مرگئی۔ میری چھوٹی خالہ کو اپنی بہن سے بڑی محبت تھی۔ اگرچہ بڑی اسے اکثر جھڑکتی اور ٹوکتی رہتی تھی۔ وہ گھلنے لگی اور آخر ایک مہینے کے بعد اپنی بڑی بہن سے جا ملی۔ میری چھوٹی پھوپھی جیناں اپنے خاوند کتیوں والے ماما غلام رسول کے ساتھ گاؤں چھوڑ کر خانیوال کے پاس چلی گئی، جہاں انھیں آب کاری کی شرائط پر کچھ مربعے زمین مل گئی تھی....

''۱۹۳۸ء میں میں گاؤں چند روز کے لیے گیا۔ وہاں ہنّی کی زمینوں پر ہمارے چند شریکوں نے قبضہ کرلیا تھا اور میرے والد نے مجھے لکھا کہ وہاں جا کر اس جھگڑے کو چکاؤں۔ میں رات کو اپنے چوبارے پر جا رہا۔ میرے دادا کے پرانے میراثی نورے کی گھر والی نے مجھے روٹی کھلائی۔ دوسرے دن شام کو میں پٹواری سے مل کر گھوڑی پر واڑے سے آ رہا تھا کہ راستے میں خاندان کے

قبرستان کے پاس فاتحہ پڑھنے کے لیے رکا۔ جب میں بچپن میں اپنے دادا کے ہمراہ یہاں آیا کرتا تو سیلی، پختہ اینٹوں کی، کائی سے سبز، قدِ آدم چاردیواری تقریباً محفوظ تھی اور ایک چھوٹا سا چوکھٹ والا آہنی دروازہ تھا تاکہ گائیں بھینسیں اندر نہ جا سکیں۔ میں اس دروازے پر جھولے لیا کرتا تھا۔ اندر لمبی گھاس میں ہمارے مرے ہوئے بڑوں کی پختہ قبریں تھیں۔ ہر قبر کے اوپر ایک کتبہ تھا جس پر مرنے والے یا مرنے والی کی تاریخ پیدائش درج تھی اور اس کے نیچے ایک تعریفی شعر جس سے مرحوم کی تاریخ وفات نکلتی تھی۔ میرا دادا ایک عالم اور شاعر تھا اور یہ کتبوں پر لکھے اشعار اس کے تھے۔ اب میں نے دیکھا کہ چاردیواری بالکل ٹوٹ پھوٹ چکی ہے اور لوگ اس کی اینٹیں اکھاڑ کر لے گئے ہیں۔ چوکھٹ والا آہنی پھاٹک بھی غائب تھا۔ قبریں سب شکستہ حالت میں تھیں اور اونچی گھاس اور جھاڑیوں سے ڈھکی ہوئی۔ میں شام کے دھندلکے میں کتبوں کی عبارت پڑھنے کی کوشش کرنے لگا جو اب مٹ چکی تھیں۔ تب میں نے ایک دیہاتی لڑکے کو منھ پر ڈھاٹا باندھے اور ہاتھ میں کوئی چیز لیے سامنے سے برونیوں کی طرف جاتے دیکھا۔ اس کی چال اور وضع میں مجھے کوئی چیز آشنا لگی اور پھر میں پکارا، 'عبداللہ! او عبداللہ!' وہ ٹھٹکا، اور پھر اس نے پیچھے مڑ کر نظر ڈالی کیونکہ یہ وہی تھا — اب سترہ اٹھارہ برس کا لمبا تڑنگا لڑکا، جوانی کی سرحد پر، داڑھی کا سبزہ نمودار۔

'''شاہ اسحٰق! بھائی شاہ اسحٰق!' اس کی آواز میں بلوغت اور مردانگی کا بھاری پن تھا۔ 'السلام علیکم۔ کب آئے ہو؟ خیریت ہے؟'

'''اس کی آنکھوں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں آئی اور مجھے عجیب سا لگا۔ شاید، میں نے سوچا، اس کے ابا کے خون میں رچی ہوئی جدی رکھائی اور درشتی، اب جبکہ وہ جوان ہو گیا ہے، اپنا اثر دکھانے لگی ہے۔ اس کے انداز میں کچھ رازداری، کچھ بھید کا شائبہ میں نے محسوس کیا۔ اس کی آنکھیں میری آنکھوں سے ملنے سے کتراتی رہیں۔ خدا جانے کیا بات ہے؟

'''کہاں جا رہے ہو عبداللہ؟'

'''برونیاں۔ پٹھے کاٹنے۔'

'''اس وقت؟ اور یہ منھ پر ڈھاٹا کیوں باندھا ہے؟'

'''منھ سوج گیا ہے، اس لیے رومال باندھ لیا ہے۔'

'''آج کل کیا کر رہے ہو؟ چاچا رضی اکبر کا کیا حال ہے؟'

'''چاچا ٹھیک ہے۔ میں نے مڈل پاس کر کے اسکول چھوڑ دیا ہے۔ اچھا، تو تم اب کچھ دن رہو گے؟ میں کل ملنے آؤں گا۔ اچھا خدا حافظ۔'

''وہ جلدی میں تھا۔ میں اسے اس گہرے ہوتے جھٹپٹے میں لمبے لمبے ڈگ بھرتے دیکھتا رہا — یہ تعجب کرتے ہوئے کہ وہ کس طرح بدل گیا ہے اور کیسے اتنا بے رفا اور روکھا ہو گیا ہے۔ پھر قبرستان میں کچھ وقت گذار کر اور فاتحہ پڑھنے کے بعد میں آگے گاؤں کی طرف چل دیا۔

''میں گاؤں کی آوازوں میں جب دیے سے روشن کمرے میں کھانا کھانے بیٹھا تو نورا میراثی نیچے اکڑوں بیٹھ کر اور حقہ پیتا ہوا مجھے گاؤں کی خبریں دینے لگا۔ وہ ایک چھوٹا مجہول سا آدمی تھا، ایک بکرے جیسی چھدری داڑھی کے ساتھ جواب سفید ہو چکی تھی۔ اس میں اپنی نسل کی ساری لطیفہ گوئی اور نقل کرنے کی صلاحیت تھی اور اس کے چٹکلوں اور باتوں نے مجھے خوب لطف دیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ مولوی غوث محمد نے دوسرا نکاح پڑھوا لیا ہے — چٹی داڑھی اور آیا شراب۔ لالو ماچھی کی بیوی پنجسن کے علیا کمہار کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔ بابا فضلے کے دونوں لڑکے فوج میں چلے گئے ہیں۔ میں نے اس سے قبرستان میں حافظ عبداللہ سے ملاقات کا اور اس کے عجیب بے پروائی کے رویے کا ذکر کیا۔ اس کی باتوں سے مجھے معلوم ہوا کہ عبداللہ اب گاؤں کی گلیوں میں بے لگام گھوڑے کی طرح مستایا پھرتا ہے، ہر وقت ریشمی لاچے میں چھیل چھبیلا بنا ہوا۔ بات بات پر ہنستا ہے اور گاؤں کی کنواریوں کو دیکھ کر اس پر ہیر وارث شاہ یا ماہیے کے بول آ جاتے ہیں۔ وہ رانجھا اور مہینوال بننے کی کوشش کر رہا ہے۔

'''نورے،' میں نے کہا، 'جوانی دیوانی ہوتی ہے۔ ہم سب اس منزل میں سے گذرتے ہیں۔'

'''سچ ہے میاں شاؤل۔ کتنوں پر اس آندھی کو چڑھتے دیکھا ہے۔ یہ جنانیوں کا بھوت بڑا برا ہے۔ حافظ مجنوں کو دیکھو۔ نہ صورت نہ شکل؛ اس عمر میں بھی عورتوں کی مجلس میں جا بیٹھتا ہے اور جب لڑکیاں اس سے ٹھٹھا مخول کر کے اٹھا دیتی ہیں تو کہتا ہے: دل کریندا مجلس کریئے، پاہن نہ دیندیاں کڑیاں۔ اگلے دن مجھے اسکول کے پاس ملا اور کہنے لگا: ساٹھ ورھے کا ہو گیا یہ حافظ مجنوں مگر اب بھی جنانی کو دیکھ کر دل مچل جاتا ہے۔ گناہ کمانے کی بات ہے۔ جنانی شے ہی خدا نے عجیب بنائی ہے۔ اور ہر ایک جنانی کا الگ الگ سواد۔ تو میاں شاؤل، حافظ عبداللہ پر تو مست جوانی گھر کر آئی ہے۔'

''پھر اس نے مجھے حافظ مجنوں کی نقل کر کے خوب ہنسایا اور میں سو گیا۔ صبح کاذب کے وقت مسجد میں اذان سے میری آنکھ کھلی۔ تم جانتے ہو میں نماز کم ہی پڑھتا ہوں مگر گاؤں میں خدا جانے کیوں مسجد میں جا کر جماعت میں نماز پڑھنے کو دل چاہتا ہے۔ مجھے سادہ دیہاتی لوگوں کے ساتھ نماز پڑھ کر عجیب لطف حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے مسجد میں جا کر مولوی غلام غوث کی امامت میں

نماز پڑھی۔ اس کا لہجہ اسی طرح دہقانی اور اکھڑ سا تھا مگر وہ میرے کانوں پر گراں نہ گذرا۔ وہ مجھے اس ماحول میں کچھ اچھا ہی لگا۔ دعا پڑھنے اور حاضرین سے علیک سلیک کرنے کے بعد میں اٹھا تو میں نے حافظ عبداللہ کو وہاں دیکھا۔ ہم اکٹھے جوتیاں پہن کر باہر نکلے۔ گلی میں مویشی اپنے گلے کی گھنٹیاں ٹنٹناتے گھاس چرنے بروٹیوں میں جا رہے تھے۔ گاؤں جاگ اٹھا تھا۔

”عبداللہ،“ میں نے کہا، ”مجھے پتا لگا ہے کہ اس گاؤں میں رانجھے کی روایت اب تمھارے دم قدم سے قائم ہے۔“

”تمھیں کس نے بتایا بھائی شناؤل؟“ اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔ میں نے سمجھا کہ اس نے اس کا برا مانا ہے۔ پھر وہ کھکھلا کر ہنسا اور اس نے میرے ہاتھ پہ ہاتھ مارا — بالکل ایک جوان کی طرح۔

”بھائی شناؤل، مجھے معاف کرو۔ میں کل شام تم سے اوپرا ملا۔ میں ایک ضروری کام سے جلدی میں تھا۔ تم نے پتا نہیں اس سے کیا سمجھا ہوگا۔ اب میں فارغ ہوں اور میں تم سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں۔“

ہم اوپر چوبارے میں آئے اور بیٹھ گئے۔

”بھلا بوجھو بھائی شناؤل، میں کل شام کو کہاں جا رہا تھا؟“

”میں کیا کہہ سکتا ہوں! تم نے ہی مجھے بتایا تھا کہ تم مویشیوں کے لیے چارا کاٹنے جا رہے ہو۔ میں دل میں حیران تھا کہ اس کام کے لیے یہ کون سا وقت ہے۔“

”میں تمھیں بتا دوں تو تمھیں یقین نہیں آئے گا۔ لیکن تم میرے پرانے بیلی اور بڑے بھائی ہو۔ تم سے کیسے چھپاؤں۔ میں ایک آدمی کو ٹوکے سے قتل کرنے جا رہا تھا۔“

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالیں۔ ”کیوں؟ تم نے اسے قتل کر دیا پھر؟“

”نہیں،“ عبداللہ نے کہا۔ ”اس کی قسمت اچھی تھی۔ وہ مجھے مل جاتا تو میں اس کو کبھی نہ چھوڑتا، اس کی تکا بوٹی کر دیتا۔ وہاں جا کر مجھے پتا چلا کہ وہ فوج میں بھرتی ہو گیا ہے۔“

”تمھاری قسمت اچھی تھی،“ میں نے تلخی سے کہا۔ ”تم خون کر دیتے تو پولیس تمھیں پکڑ کر لے جاتی اور تم پھانسی چڑھ جاتے۔ تم اتنے اچھے لڑکے تھے۔ میں نہیں سمجھتا تھا کہ تم بڑے ہو کر قاتل بن سکتے ہو۔“

”بھائی شناؤل، تم تو غصے ہو گئے۔ وہ حرام زادہ بڑا بھیڑا آدمی تھا۔ اس نے میری شناداں کے ساتھ فحش مذاق کیا تھا اور اس پر دست درازی کرنے کی بھی کوشش کی تھی۔ میں بڑا بے غیرت ہوتا

جو اس کو پی جاتا۔ میں مرد ہوں۔'

''پھر اس نے مجھے ساری کہانی سنائی۔ گاؤں کے ایک سفید پوش برکت کی لڑکی، جس سے وہ دیوانہ وار محبت کرتا تھا، اپنے چھوٹے دس سالہ بھائی کے ہمراہ اپنے ماموں کے ہاں رسول پور گئی تھی۔ جب وہ گھوڑی پر واپس آ رہے تھے تو ایک شخص غلام محمد گامے اور اس کے ایک لفنگے ساتھی نے انھیں راستے میں کیکروں کی ایک ڈھکی کے پاس روک لیا اور شاداں کو چھیڑنے لگے۔ شاداں ایک دلیر اور پرحوصلہ لڑکی تھی۔ اس نے ان کو خوب خوب سنائیں، مگر آخر وہ اکیلی عورت تھی اور اس کے مدمقابل دو گھرے نوجوان! اور وہ دل میں بڑی ڈری۔ جگہ بڑی بیابان تھی۔ گامے نے بڑھ کر لڑکی کو بازو سے پکڑ کر نیچے کھینچنے کی کوشش کی۔ شاداں کا چھوٹا بھائی رونے لگا۔ خدا نے اس کی آبرو کی حفاظت کی کیونکہ اس وقت سڑک پر لسوڑی شریف کے پیر صاحب اور ان کی جماعت کے کچھ لوگ اچانک گھوڑیوں پر آتے نظر آئے۔ گامے کی ان کو دیکھ کر سٹی گم ہوگئی اور شاداں کو دھمکی دے کر کہ وہ اس کے ہاتھ سے نہیں بچے گی، گاما اور اس کے ساتھی کیکروں میں گم ہوگئے۔ شاداں نے اپنی گھوڑی کو تیز کیا اور اسے دوڑاتی ہوئی پیر صاحب کی جماعت کے پاس سے گذری۔ وہ ایک لڑکی کو اس طرح تیز گھوڑی دوڑاتے دیکھ کر بڑے حیران ہوئے، اور پیر صاحب نے پوچھا بھی، 'دھیے، خیر ہے؟' مگر شاداں نے جانور کی رفتار کم نہ کی اور اس طرح اپنے گاؤں میں ہانپتی کانپتی پہنچی۔

'''شاداں نے، تین چار روز ہوئے، واڑے میں اس کا ذکر روتے ہوئے کیا اور میں نے قسم کھائی کہ میں گامے کو نہیں چھوڑوں گا اور وہ زندہ نہیں رہے گا۔ ایک دن رسول پور جا کر اس کے متعلق مجھے پتا لگا کہ اس کا باپ اب جہلم میں رہتا ہے، جہاں وہ کسی وکیل کا منشی ہے۔ گاما پیچھے کہنے کو تو زمین کی دیکھ بھال کرتا ہے مگر اس کا اور اس کی لفنگوں کی ٹولی کا کام سوائے کھیلی کھیلی کرنے اور گاؤں کی لڑکیوں سے چھیڑ خوانی کرنے کے اور کچھ نہیں۔ میں نے اس کا گھر دیکھا اور اس جگہ کا پتا لگایا جہاں وہ سوتا تھا۔ کل شام کو میں اسے ختم کرنے کے ارادے سے گھر سے نکلا۔ اسی لیے میں تمھارے پاس زیادہ دیر نہ ٹھہر سکا کیونکہ رسول پور آٹھ کوس ہے اور مجھے کافی دور جانا تھا۔ مگر افسوس اس کی حیاتی کچھ دن اور لکھی ہوئی ہے۔ ایک دن پہلے وہ اپنے باپ کی سرزنش سے بگڑ کر جہلم جا کر بھرتی ہوگیا۔'

'''تمھارا مطلب ہے، تم کل شام رسول پور گئے بھی اور لوٹے بھی؟ سولہ کوس؟'

'''یہ کوئی بات نہیں۔ میں کوئی تین بجے مسجد میں آیا۔ گھر بھی نہیں گیا۔ میاں جی فکر کر رہے ہوں گے۔ دیکھو شاؤل، تم کسی سے اس کا ذکر نہ کرنا۔' پھر بولا، 'شاؤل، تم نے میری شاداں کو دیکھا ہے؟'

'''نہیں۔'

'''میں تمھیں دکھاؤں گا۔ سارے گاؤں میں اس جیسی سوہنی اور جاندار کڑی اور کوئی نہیں۔ اور تم مان جاؤ گے کہ عبداللہ یوں ہی اس کے لیے ہوکے نہیں بھرتا۔ تم ورگا اس کا بوٹا قد ہے اور اس کی آنکھیں نشے کے کٹورے ہیں۔ پھول گلاب کا ہے شاداں۔'

''میں ہنسا۔'عبداللہ، تم تو شاعر ہو گئے ہو۔'

'''شاؤل، چیز ہی ایسی ہے — چپ شاؤل، وہ دیکھو... وہ آرہی ہے۔ چال دیکھو۔'

''میں نے کھڑکی کی نیچی باگنی میں سے دیکھا۔ گلی کے موڑ پر سے ننگے پاؤں، نیلے تہبند اور سبز چھینٹ کی لمبی قمیص میں ایک لڑکی سر پہ گھڑا رکھے آرہی تھی — دوسری دیہاتی لڑکیوں کی طرح کنوئیں پر سے پانی بھرنے جاتی ہوئی۔ وہ واقعی خوبصورت تھی، بانکی اور چھیل چھبیلی۔ رنگ میں صباحت تھی اور اس کے چہرے کے خدوخال تیکھے تھے۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں اور وہ اتنی شرمیلی اور معصوم لگ رہی تھی جیسے اس نے کبھی کسی نوجوان دیہاتی لڑکے کی خواہش سے جلتی ہوئی نظروں کو اپنے جسم میں کھبتے ہوئے محسوس نہ کیا ہو، جیسے کبھی اس کے ارمان نہ جاگے ہوں۔ سب دیہاتی نوخیز لڑکیاں ایسی ہی لگتی ہیں اور ان کے سینوں میں جذبات کا کتنا متلاطم طوفان اور کتنے رنگین سپنے ہوتے ہیں، یہ خدا ہی جانتا ہے۔

''پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ اس کی نگاہ اوپر اٹھی اور اس نے ہمیں باگنی پر کھڑے اور اسے دیکھتے ہوئے پایا۔ اس کے چہرے میں آگ سی دوڑ گئی اور اس کی چال میں آپ ہی آپ لڑکھڑاہٹ آ گئی — اور اس کے سر پر کپڑے کے چھلے پر رکھے ہوئے گھڑے کا توازن قائم نہ رہ سکا۔ بیشتر اس کے کہ وہ اپنے لانبے نازک ہاتھوں سے گھڑے کو سنبھالتی، وہ الٹا اور تڑاخ سے گلی کے فرش پر گر کر ٹوٹ پھوٹ گیا۔

''عبداللہ نے اوپر سے کہا، 'کڑیے، گھڑا توڑ دتا وی! تینوں بے بے مارے گی۔'

''گھڑے کے ٹوٹنے سے وہ بڑی پریشان ہوئی اور کچھ دیر وہاں گم صم کھڑی رہی اور پھر چہرے پر ایک مسکراہٹ لیے وہ الٹے پاؤں بھاگی۔ سامنے سے بابا شاہو اپنی لاٹھی لیے آتا تھا۔ شاداں اس سے ٹکرائی اور شاہو کی لاٹھی گر پڑی۔ شاہو نے گری ہوئی لاٹھی کو اٹھایا اور بھاگتی ہوئی لڑکی کو دیکھتے ہوئے اس نے گلی کو سنایا: 'اے برکتے دی کڑیے! تو مجھے جھلی ہوئی معلوم ہوتی ہے۔'

'''اس کا گھڑا تم نے تڑوایا ہے،' میں نے عبداللہ سے کہا۔

''وہ زور سے ہنسا اور پھر سنجیدہ ہو گیا۔ 'تم میرے بھائی ہو۔ میری مدد کرو۔ قول دو کہ تم میری

مدد کرو گے۔'

''اس نے مجھے بتایا کہ شاداں کی بے بے تو اسے پسند کرتی ہے لیکن برکت شاداں کا رشتہ اپنی بہن کے لڑکے سے کرنا چاہتا ہے۔ دونوں میاں بیوی میں اس بات پر ناچاقی رہتی ہے۔ 'تم برکت سے بات کرو' عبداللہ نے کہا، 'تمھاری بات کا بڑا اثر ہوگا۔ آخر مجھ میں کوئی نقص تو ہے نہیں۔ میں خدا کے فضل سے جوان اور تندرست ہوں، اور میں اپنے چاچے کے ساتھ مل کے آٹے کی مشین کا کام شروع کر رہا ہوں۔ خدا اس میں برکت دے گا۔ تم برکتے کو کہنا کہ شاداں کو کوئی تکلیف نہ ہوگی۔ سچ مچ شاؤل، میں اس کو بڑا خوش رکھوں گا — میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔'

''وہ ایک محبت میں مخمور نوجوان کی طرح باتیں کرتا رہا۔ میں مسکرایا اور اس سے وعدہ کیا کہ میں برکت سے ضرور بات کروں گا۔ وہ چلا گیا تو میں تھوڑی دیر کے بعد برکت کے ہاں گیا۔ وہ میرے دادا کے پرانے دوستوں میں سے تھا۔ وہ اٹھ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ ادھر اُدھر کی باتوں کے بعد میں نے طریقے سے لڑکیوں کے لیے اچھے رشتے ملنے کی مشکلات کا ذکر کیا۔ تم میری لوگوں کو اکسانے کی صلاحیت تو جانتے ہو۔ اپنی ساری صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر میں نے کوئی دو گھنٹے کی تقریر کے بعد اسے اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ شاداں کا رشتہ عبداللہ سے کر دے گا۔

''' پتر شاہ الحق' اس نے کہا، 'تم مجھے نہ کہتے تو میں کبھی نہ مانتا۔ تم بڑے سیانے ہو اور تمھاری بات کو میں موڑ نہیں سکتا۔ لیکن مجھے شک ہے کہ بڈھا سڑی رضی اکبر میرے پاس عبداللہ کا رشتہ مانگنے آئے گا۔'

''' وہ آئے گا' میں نے کہا، 'اور اگر وہ نہ بھی آئے تو کوئی بات نہیں۔ عبداللہ ہجو اور شرپچھو کا لڑکا ہے۔ ہجو خود لاہور سے آ کر تمھارے پاؤں پڑے گا۔'

''' میں تمھیں یقین دلاتا ہوں کہ برکت کو میں نے بڑی تدبیر سے شیشے میں اتارا ہے؛ عبداللہ شام کو آیا تو میں نے اسے یہ خوش خبری دی۔

''وہ بے حد خوش ہوا۔ 'میں جانتا ہوں میرے بخت اچھے ہیں شاؤل۔ تم نے مجھ پر اتنا احسان کیا ہے کہ میں اس کا بدلہ نہیں چکا سکتا — تمھارے پاؤں دباؤں؟'

''' مگر عبداللہ' میں نے کہا، 'کیا رضی اکبر برکت کے پاس شاداں کا رشتہ مانگنے آئے گا؟'

''' یہ میرا کام ہے' وہ بولا، 'میاں جی دوسروں کے لیے کتنے ہی درشت ہوں، میرے ساتھ ان کا بڑا لاڈ ہے — وہ جائیں گے۔'

''میں گاؤں میں تین چار دن اور رہا۔ میرے جانے سے پہلے معاملات طے ہو گئے تھے اور

اس کی شادی کی بات چیت پکی ہو چکی تھی۔

''عبداللہ مجھے اسٹیشن پر چھوڑنے کے لیے آیا۔ سارا راستہ وہ ہنسی مذاق کی باتیں کرتا رہا اور ماہیا گاتا رہا۔ اس نے مجھ سے شادی میں آنے کا وعدہ لیا اور کہا کہ وہ مجھے کارڈ لکھے گا۔ وہ اس وقت کتنا خوش اور بے فکرا تھا، ایک ایسے شخص کی طرح جس کی عزیز ترین خواہش پوری ہوگئی ہو۔''

پولیس اسٹیشن کے گھنٹے نے بارہ بجائے۔ چاند اب برف کی طرح سفید، اپنا آدھا سفر طے کر چکا تھا اور تارے نیلے سیاہ غبار میں چاروں طرف چھٹکے ہوئے مدھم ٹمٹمارہے تھے۔ کبھی کبھی پتے ہوا کے ایک ہلکے جھونکے سے کھڑکھڑاتے۔

''ہمیں اب دیوار پھاند کر ہی جانا پڑے گا۔ بارہ ہوگئے ہیں۔'' میں نے کہا۔

''فکر مت کرو،'' شفاعت نے کہا۔ ''رات جوان ہے اور رات ہماری ہے۔ اور کتنا کچھ میں تمھیں بتانا چاہتا ہوں، کتنی یادیں میرے دماغ میں ہجوم بن کر ابھر رہی ہیں — مگر کسی اور وقت۔ تم تھک گئے ہوگے اور تمھیں نیند آرہی ہوگی۔ میں اب زیادہ دیر نہیں لوں گا — ہاں، حافظ عبداللہ کی شادی۔ میرا خیال ہے، مارچ ۱۹۴۰ء میں مجھے لاہور اپنے کالج کے پتے پر اس کا کارڈ ملا کہ اس کی شادی فلاں تاریخ کو طے پائی ہے اور میں ضرور آؤں۔ میں ان دنوں امتحان کی تیاری میں مصروف تھا لیکن میں نے ایک دن کے لیے گاؤں جانے اور شادی میں شریک ہونے کا فیصلہ کیا۔ جوڑے اسٹیشن پہ ہمارا میراثی نورا گھوڑی لے کر پہنچا ہوا تھا۔ یہ سادی نہیں تھی، جو میرے دادا کی وفات کے دو دن بعد ہی مرگئی تھی؛ یہ اس کی جوان بچھیری تھی، اپنی ماں کی طرح سفید نہیں بلکہ خاکستری رنگت کی، کنوتیاں کھڑی کیے اور جوانوں کی طرح چمکدار، پھرتیلی اور چاق و چوبند۔ اس پر وہی پرانی اپنی ماں کی انگریزی زین کسی تھی — گاؤں کی واحد انگریزی زین۔ سب جاندار ہستیاں گذر جاتی ہیں مگر ان کی استعمال کی چیزیں ان کے پیچھے رہ جاتی ہیں۔ ہماری گاؤں کی حویلی میں ابھی تک ایک صندوقچی پڑی ہے، جس میں میرے دادا کی عینک، ربڑ کی ٹوپی والی کالی دوات اور کچھ پرانے خطوط اور مسودات رکھے ہیں — ماضی سے ملانے والی ایک زنجیر کی مانند۔ نورے نے مجھے بتایا کہ بجو اللہ داد اپنی دوسری بیوی کے ساتھ اپنے بیٹے کی شادی پر آیا ہوا ہے۔ میں نہیں جانتا کہ اس خبر نے مجھے کیوں حیران کیا۔

''شام کو میں اپنی حویلی میں پہنچا۔ دوسرے دن عبداللہ کا نکاح تھا۔ عبداللہ اپنی شادی کے انتظامات میں لگا تھا، مگر میرے آنے کا سن کر وہ وقت نکال کر میرا شکریہ ادا کرنے کے لیے آیا۔ وہ ایک بانکا گبھرو لگتا تھا، بادشاہ کی طرح خوش۔ وہ چاہتا تھا میں اس کا شہ بالا بنوں۔ میں نے کہا کہ

ایک تو میں وہ کپڑے نہیں لایا جو اس موقعے کے لیے ضروری ہیں۔ دوسرے شہ بالا ایک چھوٹے لڑکے کو ہونا چاہیے جو اس کے پیچھے گھوڑی پر بیٹھ سکے۔ وہ ہنسا اور کہنے لگا: 'شاؤل، تمھیں وہ دن یاد ہے، جب ساوی نے اڑی کی تھی اور تم میرے پیچھے میری کمر میں ہاتھ ڈال کر بیٹھے تھے؟ اور کپڑوں کا کیا ہے، میں تمھیں اپنا لاچا دے دوں گا۔ تم بڑے اچھے شہ بالے بنو گے...'

''میری عادت ہے کہ مجھے تماشا بننے سے ہول آتا ہے اور آخر میں نے اسے اکسایا کہ وہ اپنے چھوٹے سوتیلے بھائی رحمت کو شہ بالہ بنائے۔

''رات کو میں اس کے گھر گیا اور اس کے اعزا و اقربا سے ملا۔ بوڑھے سڑی رضی اکبر کے چہرے پر میں نے پہلی بار مسکراہٹ سے ملتی جلتی کوئی چیز دیکھی۔ اس کے 'جی آیاں نوں، شناء اللہ!' میں حقیقی محبت کی گرمی تھی۔ وہ اس حد تک پر تواضع تھا کہ اندر سے دلہن کا جوڑا بھی دکھانے کے لیے لے آیا — گوٹے کناری کا سرخ باناتی جوڑا جو اس نے خود جہلم میں ایک درزی سے سلوایا تھا اور جس پر ڈیڑھ سو روپے لاگت آئی تھی۔ میں نے جوڑے کے کپڑے اور اس پر کام کو بہت سراہا اور اس سے رضی اکبر بہت گنگنے لگا۔ رات بھر گاؤں کی لڑکیاں گھڑوں پر ماہیے اور شادی کے گیت گاتی رہیں اور دیہاتی مہمان، نئے تہبندوں اور صافوں میں ملبوس، حقے پیتے اور ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ دوسری صبح حافظ عبداللہ سر پر لنگی باندھے، اجلا ریشمی لاچا اور اچکن پہنے، چھیل چھبیلا بنا، براتیوں کے ہمراہ دلہن کے گھر 'ڈھکا'۔ وہ ہماری ساوی کی بچھیری پر انگریزی زین میں سوار تھا، اس کا چہرہ سہرے سے ڈھنپا ہوا، اور چھوٹا رحمتا اپنے نئے کپڑوں اور سلمے ستارے والی گول ٹوپی میں مغرور اور خوش اس کے پیچھے اس کی کمر میں اپنے بازو حمائل کیے۔ دلہن کے گھر تک زیادہ فاصلہ نہ تھا اس لیے ہم سب پیدل چلے۔ مولوی غلام غوث نے نکاح پڑھایا۔ چھوہارے بانٹے گئے۔ اس کے بعد شاداں کا داج، جو اس کے باپ برکت نے اسے دیا تھا، باہر لایا گیا۔ رنگین چیل پایوں کے پلنگ اور پلنگڑیاں، چمکتے ہوئے پیتل اور المونیم کے بھانڈے، ایک بڑا صندوق، ایک لال چھپا چرخہ، دو لالٹینیں، ایک دودھ بلونے کی 'مٹی' مدھانی کے ساتھ رنگ دار لکڑی کے چمچے اور ڈوئیاں، چار پانچ اچھے مکمل بستر اور ایک سنگر مشین۔ داج میں ایک بھینس بھی تھی۔ جب براتی داج کو دیکھ چکے تو مصلی شاداں کے داج کو پلنگوں پر رکھے سارے گاؤں میں پھرانے لے گئے تاکہ سب لوگ دیکھ سکیں کہ شاداں کے باپ نے اپنی بیٹی کو کیا کچھ دیا ہے۔

''دوپہر کی روٹی میں نے دلہن کے گھر کھائی۔ مٹی کے برتنوں میں بکرے کے گوشت کا سالن اور گھی میں تر بتر آٹے کی میٹھی کڑھائی۔ ہر کوئی ہنسی مذاق کی ترنگ میں تھا۔ خود سڑی رضی اکبر نے

ایک دو مذاق کیے۔ اس نے ایک مولوی کے پانڈی کا ذکر کیا جو کہا کرتا تھا کہ کڑھائی سلونے سے پہلے کھانی چاہیے تاکہ آدمی اچھی چیز سے شکم سیر ہو جائے تو پھر سلونے کو ہاتھ لگائے۔ اس نے حافظ مجنوں کا بتایا جس نے ایک دفعہ کڑھائی کی پوری دو تین پراتیں کھالی تھیں اور جب وہ گونگ ہو گیا تو دو آدمیوں کو اسے جھولے کی طرح اٹھا کر اس کے گھر پہنچانا پڑا۔ حافظ مجنوں نے، جو موجود تھا اور کڑھائی کو دونوں ہاتھوں سے شپڑ شپڑ کھا رہا تھا، اس قصے کی صداقت سے انکار کیا لیکن سب اس پر ہنسے۔ جب اسے زیادہ چھیڑا گیا تو وہ اپنے اذیت دینے والوں کو دور کرنے کے لیے اپنی لاٹھی ہوا میں گھماتا ہوا وہاں سے بھاگا... اوہ، یہ دیہاتی شادیاں! یہ تمھارے شہروں کی شادیوں کی طرح پھیکی اور بے روح نہیں ہوتیں۔ چار بجے ہم رخصتی کے گیتوں کے درمیان شاداں کی ڈولی عبداللہ کے مکان پر لائے۔ میں نے عبداللہ کو بات بات پر ہنستے ہوئے دیکھا۔ اس کے سنگی ساتھی اس سے مردانہ، براہِ راست ننگے مخول کرتے تھے اور وہ جواب میں ہنس دیتا تھا۔ مجھے شام کو گاڑی پکڑنی تھی اور جب میں وہاں سے چلا تو حافظ عبداللہ ایک رنگین پایوں کی پیڑھی پر کھڑا تھا اور اپنی خالاؤں اور پھوپھیوں اور دوسری عورتوں سے ہنستا ہوا سلام کرائی وصول کر رہا تھا۔ وہ اب شادی شدہ تھا — گھر بار والا، ایک پورا مرد۔

''جب اگلے سال میں گاؤں گیا تو عبداللہ کا ایک بچہ ہو چکا تھا۔ وہ اپنے پہلے گھر سے، جہاں اس کا بڑا بھائی اور اس کے بیوی بچے رہتے تھے، اٹھ آیا تھا اور چھپر کے پار اپنی گلتی (آٹے کی مشین) کے احاطے میں ایک کچے، گارے سے لپے کوٹھے میں رہتا تھا۔ ایک دوپہر کو، ایک گاؤں سے لوٹتے ہوئے جہاں میری بڑی پھوپھی ایک ٹھیکیدار سے بیاہی تھی، میں گلتی میں اس سے ملنے کے لیے رکا۔ گلتی کی کوہ کوہ اور ٹوپی دار لمبی چمنی سے نکلتے ہوئے دھوئیں سے میں نے اندازہ لگایا کہ آٹا پس رہا ہے اور حافظ عبداللہ کا کام چل پڑا ہے۔ اس سے مجھے اطمینان ہوا۔ بڑی چوکھٹ کے کھلے دروازے کے باہر تین چار گدھے اناج کی بوریوں سے لدے کھڑے تھے۔

''میں گھوڑی پر سر نیچا کیے اندر داخل ہوا تو میں نے عبداللہ کو مشین کے کوٹھے کے باہر ایک بڑی تکڑی میں کچھ بورے تولتے ہوئے پایا۔ اس نے مجھے دیکھا اور ایک ہنستے ہوئے، خوش آمدید بھرے چہرے کے ساتھ کام چھوڑ کر بھاگتا ہوا آیا۔ میں گھوڑی سے اترا، جسے ایک کوزہ پشت کی نے سنبھال لیا، اور ہم ایک دوسرے کے بازوؤں میں دوڑے۔ اس نے مجھے محبت سے زور آزمائی کے سے انداز میں خوب بھینچا اور ہم ہنسنے لگے۔ وہ اب مونچھ رکھے ہوئے تھا۔ اس کے بال کنگھی چوٹی سے جمے ہوئے تھے اور تیل سے چمکدار۔ اس کی کلائی پر ایک گھڑی بندھی تھی۔

'''' شناؤل، تمھارے آنے کا پتا ملا تھا اور اس کے بعد میں دو دفعہ تمھارے مکان پر ہو آیا ہوں،' اس نے کہا۔ 'تمھیں میرے پاس ٹھہرنا چاہیے تھا۔ خدا کے فضل سے میری اتنی حیثیت ہے کہ تمھارے جیسے مہمان کو بستر اور روٹی دے سکوں۔'

''وہ مجھے اپنے کوٹھے کے اندر لے گیا۔ صحن میں ایک بھینس اور کئی کھرلی کے پاس بندھی تھیں اور اس کی بیوی اپنے بچے کو گود میں ہلکورے دیتی ایک پیڑھے پر مٹی کے چولھے کے پاس بیٹھی ہانڈی پکا رہی تھی۔

'''شاداں! شاداں! شناؤل آیا ہے۔ اٹھ، سلام کر۔ یہ تیرے باپ سے میری سفارش نہ کرتا تو تو میرے گھر کبھی نہ آتی... شناؤل، ہمارا ایک جاتک ہے۔'

''شاداں اپنے بچے کو چھاتی سے لگائے اٹھی اور جھکی آنکھوں سے کہنے لگی، 'جی آیاں نوں، بھائی جی!' اور اس نے اپنے بچے کو آگے بڑھایا۔

''میں نے گل گوتھنے ننگے بچے کو اپنے بازوؤں میں اٹھالیا۔ وہ ایک صحت مند موٹا بچہ تھا، بٹنوں سی آنکھوں والا۔ بالکل اپنے باپ پر۔ وہ رونے لگا اور میں نے اسے اس کی ماں کو دے دیا۔

'''نام کیا ہے؟' میں نے پوچھا۔

'''سکندر حیات،' اس کی ماں نے غرور اور خوشی سے کہا۔

'''مولوی غوث محمد نے کہا تھا کہ اس کا نام سکندر حیات رکھو،' عبداللہ نے کہا۔ 'بڑا ہو کر بخت والا ہوگا اور وزیر بنے گا۔'

''میں نے شاداں کو غور سے دیکھا۔ وہ سال بھر میں ہی پوری عورت بن گئی تھی۔ جسم بھرا بھرا اور گدرایا ہوا، خچر کی طرح مضبوط اور پختہ بیاہی عورت کا چہرہ۔ وہ اب بھی ایک ملکہ کی طرح حسین اور پر وقار تھی۔ وہ ایک بہتی ہوئی نزاکت سے چلتی تھی۔

''ہم لپے پتے صاف ستھرے چمکیلے برتنوں سے سجے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے تو ایک طاق میں رکھے ہوئے ٹائم پیس کا الارم بجنے لگا۔

''عبداللہ نے مسرت سے کہا، 'شابا شابا! گھڑیے، گھڑیے بول، شناؤل آیا ای۔'

''میں رنگین پایوں کی پلنگڑی پر بیٹھ گیا۔ کمرے میں شاداں کے داج کا سارا سامان ایک عجائب گھر کی طرز پر سجا ہوا تھا۔ ایک بڑے بھونپو والا گراموفون بھی تھا۔ وہاں بیٹھے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ اس کمرے سے زیادہ آرام دہ اور پر تعیش کون سا شاہی محل ہو سکتا ہے۔ شاداں میٹھی لسی ایک شیشے کے جگ میں لے آئی اور ہم نے دو دو گلاس پیے۔ عبداللہ نے اپنی بیوی کو چھیڑا،

"شاول، میں تم سے تمھاری بہن کی ایک شکایت کرنا چاہتا ہوں۔ جب سے سکندر حیات خاں ہمارے گھر میں تشریف لائے ہیں، تمھاری بہن نے میری پروا میں کمی کر دی ہے۔ نہ یہ اب میری ٹانگیں دباتی ہے نہ میرا سر سہلاتی ہے۔"
"شاداں شرماتی ہوئی فوراً باہر چلی گئی۔
"عبداللہ نے کہا، شاداں نے مجھے بڑا سکھ دیا ہے۔ اس کے آنے سے میری جون ہی بدل گئی ہے۔ سچ ہے، نیک بخت عورتیں اپنی قسمت ساتھ لاتی ہیں۔ اس کے آنے کے چھ مہینے کے اندر اندر مجھے کسی کی محتاجی نہیں رہی۔ میں اپنے پاؤں پر کھڑا ہوں۔ اپنا گھر بار اور اپنا کاروبار۔"
"پھر اس نے اچانک کہا، شاول، تمھیں جناتی کی خواہش نہیں ہوتی؟ تم اپنا گھر کیوں نہیں بساتے؟"
"میں نے جواب دیا کہ ابھی وقت نہیں۔ میں پڑھ رہا ہوں اور جب میں پڑھائی سے فارغ ہو جاؤں گا تو شادی کی سوچوں گا۔
"'جناتی کے بغیر ایک مرد کی کچھ زندگی نہیں۔ آدمی گناہ سے بچتا ہے۔ تم کیسے عورت کے بغیر رہتے ہو؟ میری سمجھ میں نہیں آتا۔'
"میں وہاں عبداللہ کے گھر کوئی دو گھنٹے بیٹھا۔ اس نے مجھے اپنی ٹکٹی کے کاروبار کے متعلق بتایا اور یہ کہ وہ کچھ پیسے آنے پر آرے اور ٹوکے کی مشین بھی لگانے کا ارادہ رکھتا ہے۔ ہم نے بھونپو والے گراموفون پر کچھ ریکارڈ بھی سنے۔ اس کی بیوی ایک لکڑی کی طشتری میں کھانا لے کر آئی۔ ساگ اور تازہ مکھن اور جوار کی روٹی۔ کھانے نے بڑا لطف دیا۔ تھوڑی دیر کے بعد میں سکندر حیات کے ہاتھ پر دو روپے رکھ کر اس خوش، بابرکت گھر سے رخصت ہوا۔ اپنی زندگی کے بنجر پن اور تنہائی کا سوچتا ہوا میں کچھ اداس اداس حویلی کو لوٹا۔
"میں اپنے تعلیمی کورس پڑھنے سے ہمیشہ گھبراتا ہوں اور اس کی وجہ سے میں متواتر دو سال بی اے میں فیل ہوتا رہا۔ والد صاحب قبلہ سخت ناراض تھے کیونکہ مجھ سے انھوں نے کافی توقعات وابستہ کر رکھی تھیں۔ اس مدت میں میں گاؤں نہ جا سکا۔ حافظ عبداللہ اور اس کا ایک ساتھی وشنو کھتری جو گاؤں میں مکینک بنا ہوا تھا، ایک بار لاہور مشینری کے کچھ پرزے خریدنے کے لیے آئے۔ عبداللہ ریواز ہوسٹل میں مجھے ملنے کے لیے آیا۔ اس کا جسم ابھی تک کسرتی تھا مگر خوشحالی اور بے فکری کی وجہ سے کچھ فربہی کی طرف مائل۔ اوائل شباب کی تازہ روئی کی جگہ اب ایک مردانہ پختگی نے لے لی تھی اور اس نے نوکیلی مونچھیں اگا لی تھیں جن کی نوکوں کو وہ مسلسل بل دیتا رہا۔ وہ بے ساختگی

سے ہنستا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اب اس کا ایک اور لڑکا بھی پیدا ہو چکا ہے۔

''اور اس بار تم نے اس کا نام خضر حیات رکھا ہوگا؟ سکندر حیات کے بعد خضر حیات،' میں نے کہا۔

''وہ ہنسا۔ 'نہیں نہیں، اس بار میں نے سب تجویزوں کو رد کر دیا۔ میں نے اس کا نام اس کے چاچا پر ثناء الحق رکھا ہے۔' اس نے فخر سے میری طرف دیکھا اور میرے دل کا کوئی اندرونی حصہ مسرت سے دمکا۔

'''چاچا رضی اکبر نے اس کی مخالفت نہیں کی؟' میں نے پوچھا۔ 'اسے ہم ملوانوں سے بڑی کد ہے۔'

'''سچ کہوں؟ میاں جی نے مخالفت کی مگر میں نے کہا کہ اس کا اصل چاچا ثناء الحق ہے اور میں اس کا نام یہی رکھوں گا۔'

'''اور بہن شاداں کیسی ہے؟'

'''ٹھیک اور خوش ہے۔ ہاں، میاں جی سے اس کی نہیں بنتی اور مجھ پر بھی غصے ہوتی رہتی ہے کہ میں میاں جی کی طرفداری کرتا ہوں۔ شادی کے وقت مجھے پتا نہیں تھا کہ وہ اتنی تیز مزاج نکلے گی۔ ایک دو بار تو وہ اس بات پر میکے چلے جانے کی دھمکی بھی دے چکی ہے۔ لیکن میں اس کو راضی کر لیتا ہوں۔ جنانی کو بھی انجن کی طرح ٹھنڈا کرنا پڑتا ہے... 'وہ کچھ سوچ میں چلا گیا۔

'''اسے خوش رکھو۔'

'''ہاں،' وہ چونکا۔ 'خوش! تم نے اسے مجھے دلایا ہے۔ میں اب بھی اس سے پہلے کی طرح محبت کرتا ہوں۔'

''وشنو کھتری ایک لمبے کوٹ میں ایک چھوٹا سا آدمی تھا، چھدرے کانوں میں مندریاں پہنے۔ بولا، 'لالہ سکھی رام کا قول تھا کہ جب عورت ہٹ پر آتی ہے تو صرف ایک چیز اسے درست کر سکتی ہے، سونٹے کی مار — اور وہ...'

''میں نے دیکھا کہ وشنو کھتری کے کوٹ کی جیب میں سے ایک بند بوتل کا منہ تھوڑا سا نکلا ہوا ہے۔ وہ مجھے شراب کی بوتل لگی اور میں تعجب کرنے لگا کہ کہیں حافظ عبداللہ کو بھی چسکی لگانے کی لت تو نہیں پڑ گئی۔ وہ کوئی آدھ گھنٹے کے بعد چلے گئے۔

'''۱۹۴۳ء کے جون جولائی کے مہینے میں مجھے اپنے والد کی ہدایت کی تکمیل میں پھر گاؤں جانا پڑا۔ میں اس مشن پر جانے سے قطعی خوش نہیں تھا، اس وجہ سے کہ فریق ثانی وہی چڑچڑا اور تلخ

کلام بوڑھا، حافظ عبداللہ کا نانا، رضی اکبر تھا۔ ایسے خانگی تنازعے بڑے تدبر اور حوصلے ہی سے نمٹائے جا سکتے ہیں؛ وہ بھی اس صورت میں، جب دونوں فریق مصالحت کی راہ اختیار کریں اور کچھ جھکیں۔ رضی اکبر ایسا شخص نہ تھا۔ وہ ساری زندگی نہ خدا کے سامنے جھکا تھا نہ شیطان کے سامنے، اور میرا خیال ہے کہ بارگاہِ ایزدی میں اس کے سجدے نیاز مندی اور عبودیت سے عاری ہوتے تھے۔ اس کا معبود وہ خود تھا — اس کا غرور اور اس کی انا۔ دریا کے پار ہماری کچھ متنازعہ زمین پر، جو ایک آدھ ایکڑ تھی، اس کے بڑے نواسے اسماعیل نے ناجائز قبضہ کر رکھا تھا۔ والد صاحب نے اسے اور رضی اکبر کو کئی بار کہا کہ وہ قبضہ چھوڑ دیں مگر یہ ایسی بات تھی جو رضی اکبر کے سینے میں ہمارے خاندان کے خلاف بھرے ہوئے زہر کو اور زیادہ گھولتی۔ میں نے سوچا کہ میں اس معاملے میں بوڑھے کی بجائے حافظ عبداللہ سے بات کروں گا کہ وہ اپنے نانا کو سمجھائے۔

”جب گاڑی جوڑے کے اسٹیشن پر پہنچی تو مطلع ابرآلود تھا۔ کالی سیاہ گھٹا وادی کی پہاڑیوں پر سے امڈتی ہوئی آسمان پر چڑھتی آ رہی تھی اور برہت کی ٹھنڈی ہوا ایک ہراول دستے کی طرح درختوں کو تھپیڑے مارنے لگتی تھی۔ نورے نے، جو گھوڑی لے کر آیا ہوا تھا، مجھے کہا کہ زور کی برسات آنے والی ہے اور بہتر ہوگا کہ چودھری عمر دین کے ڈیرے میں بارش کے رکنے تک آرام کر لیں۔ مجھے وادی کے شاداب گہرے نیلے پہاڑ، کیکروں اور جھکڑوں کے درمیان لہراتی سیاہ ہوتی ہوئی سڑک، چمکتے کڑکتے بادلوں کے نیچے کراتے ہوئے پرندوں کی نوائیں، سب اتنے بھلے اور سحر انگیز لگے کہ میں نے اس موسم میں گاؤں جانے کا ارادہ کر لیا۔ 'بارش آتی ہے تو آئے،' میں نے کہا۔ ہم چل پڑے۔ آگے آگے بدقی گھوڑی پر میں اور پیچھے پیچھے سامان سے لدے گدھے پر نورا میراثی۔

”ہم کمال پور سے گذرے اور بارش پھر بھی نہ آئی۔ اگرچہ ٹھنڈی ٹھنڈی فرفر کرتی ہوا نمی سے لدی ہوئی تھی۔ تھوڑی دور آگے ایک چھوٹی پلیا کے اوپر ہم نے ایک خمیدہ کندھوں والے، لاٹھی ٹیک ٹیک کر چلتے ہوئے بوڑھے آدمی کو جا لیا۔ میں پاس سے گذرا تو میں نے اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ یہ کھوبار کا پوسٹ ماسٹر رضی اکبر تھا — بڑھاپے اور ضعیفی اور کبڑے پن کے باوجود اسی طرح مغرور، اور ساری دنیا کے خلاف کینہ پالے۔

”'السلام علیکم چاچا جی!' میں نے گھوڑی روکتے ہوئے کہا۔ 'کہاں سے آ رہے ہیں؟'

”'وعلیکم السلام،' وہ رکھائی سے غرایا اور اسی طرح لاٹھی ٹیکتا ہوا چھوٹی مضبوط ٹانگوں سے پکی سڑک پر چلتا رہا۔

”'چاچا، میں ثناء الحق ہوں، عطاء الحق کا بیٹا۔ آپ نے مجھے پہچانا نہیں؟' میں نے کہا۔

''''اچھا اچھا! میری بینائی کمزور ہوگئی ہے مگر میں ملوانوں کو ایک میل سے سونگھ لیتا ہوں۔ ان کی بو اتنی تیز ہے۔ ثناؤ الحق خاں، تمھارے باپ کا کیا حال ہے؟''

''''وہ خیریت سے ہیں۔''

''''خیریت سے؟'' اس نے اپنی لاٹھی ہوا میں لہرائی۔ 'اسے میری طرف سے کہہ دو کہ ظلم کبھی نہیں پنپتا۔ جب تک رضی اکبر زندہ ہے، اسے واڑے والی زمین کا ایک چپہ نہیں مل سکتا۔''

''''چاچا!'' میں نے کہا، 'زمین کی کس نے بات کی ہے؟ آپ گھوڑی پر چڑھ بیٹھیں۔ کھوہار کا کافی فاصلہ ہے اور بارش آ رہی ہے۔ میں پیدل آ جاؤں گا۔''

''وہ اس اخلاق پر حیران ہوا۔ وہ اپنے زہر کو اگلنے کی خاطر تلخ کلامی کے لیے زمین ہموار کر رہا تھا اور یہاں اس کے شریک اور دشمن عطاء الحق کا بیٹا اسے سواری کے لیے اپنی گھوڑی کی پیشکش کر رہا تھا۔

''''جاؤ، جاؤ،'' وہ بولا، 'میری ٹانگیں گھوڑی سے زیادہ مضبوط اور تیز ہیں۔''

''میں نے ایک بار اور اصرار کیا اور پھر اس کی کھلی کدورت کو دیکھ کر میں نے گھوڑی کو ایڑ لگائی۔ ایک فرلانگ آگے سڑک کے موڑ پر میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ اسی طرح خمیدہ، لاٹھی ٹیکتا، تیز تیز چلتا ہوا آ رہا تھا۔ سر پر صافہ، جھریوں والے تلخ چہرے پر لال بھرواں ڈاڑھی، مچی ہوئی خشمناک آنکھیں — ایک تنہا، کھولتا ہوا بوڑھا آدمی۔ اس وقت وہ مجھے ایک المیہ کردار لگا۔

''پہلے چھینٹے کلمیانہ کے گاؤں سے کچھ آگے ہم پر پڑے۔ کھوہار یہاں سے بس ایک کوس تھا۔ ہم نہ رکے اور بڑھتے گئے۔ پرے چٹی کی پہاڑیوں پر بڑی موسلا دھار بارش ہوتی معلوم ہوتی تھی، اگرچہ یہاں ابھی بوندا باندی ہی تھی۔ آسمان بپھری ہوئی سیاہ گھٹاؤں کا ایک آتشیں کڑاو بنا تھا۔ ہم کھوہار میں داخل ہوئے تو بارش موسلا دھار برسنے لگی اور حویلی تک پہنچتے پہنچتے ہم بالکل بھیگ گئے۔ یہ ایک سیلابی بارش تھی اور اس خطے میں بھی، جو بارشوں کے لیے مشہور ہے، میں نے آسمان کو اس طرح برستے کبھی نہ دیکھا تھا۔ اب، میں نے سوچا، ہفتوں تک گاؤں کی گلیوں میں گھٹنوں گھٹنوں کیچڑ رہے گا اور ہر کوئی ہاتھ میں لاٹھی لیے اور اپنے تہبند کو اوپر اٹھائے اپنے کام پر نکلے گا اور ملیریا کے زہریلے مچھر چھتوں میں پیدا ہو کر انسان اور جانور کی زندگی اجیرن کر دیں گے۔

''میں نے چوبارے میں کپڑے تبدیل کیے۔ نورے نے مٹی کی انگیٹھی میں پھونک مار مار کر آگ جلائی اور آگ کے سامنے بھیگے ہوئے بستر کو خشک کرنے کی تدبیر کرنے لگا۔ گاؤں پر خاموشی سی طاری تھی اور سوائے موٹی چادروں میں گرتی ہوئی بارش اور بجلی کی کڑک کے اور کوئی آواز

نہ تھی۔

''میں اس بالکنی پر کھڑا ہو کر اس ہولناک بارش کا نظارہ کرنے لگا۔ اچانک چنّی کی طرف بجلی کسی نامعلوم زبان کے حروف کی شکل میں کوندی اور سارا آسمان روشن ہو گیا اور پھر ایک دہلا دینے والی گڑگڑاہٹ سے ایک چندھیا دینے والی روشنی کی تلوار نیچے لپکی، دس توپوں کی کڑک کے ساتھ۔''

''نورے نے خوف سے کہا، 'میاں جی، گاؤں کے نزدیک کہیں بجلی گری ہے۔ اللہ رحم کرے۔'

''میرا خیال ہے کوئی آدھ گھنٹے کے بعد طوفانی بارش کے شور میں میں نے دو عورتوں کی آواز سنی، 'نی شر چھوڑے عبداللہ بیچارے تے بجلی پئی اے۔' دوسری عورت نے کہا، 'ہائے ہائے نی بیچارا! میں مر گئی۔ ہائے جوان سی آتی۔'

''میرا دل ڈوب گیا اور میں دعا کرنے لگا کہ میرے کانوں نے غلط سنا ہو۔ بارش ذرا تھمی تو نورا اور میں باہر بھاگے، گلی میں بہتے پانی اور گارے میں شپ شپاتے اور دیواروں کو پکڑتے۔ کلتھی میں پہنچتے پہنچتے ہمیں کچھ وقت لگا۔ کلتھی کے کوٹھے کے چھوٹس کی چھت گری ہوئی تھی اور مشین کا انجن ٹیڑھا میڑھا اور سیاہ، اپنا آہنی پنجر نمایاں کیے پڑا تھا۔ چھ سات دیہاتی عورتیں اور مرد جمع تھے۔ انجن اور مشین کے درمیانی پٹے کے نیچے کوئلے کی طرح سیاہ، سکڑا اور جھلسا ہوا حافظ عبداللہ کا جسم پڑا تھا— بالکل ناقابلِ شناخت۔

''بعد میں روتی ہوئی شاداں نے مجھے بتایا کہ جب چھت کے گرنے کا دھماکا ہوا تو عبداللہ اس کے منع کرنے کے باوجود یہ دیکھنے کے لیے بھاگا کہ اس کی مشین کو کچھ نقصان تو نہیں پہنچا۔ پھر بجلی بڑے زور سے کڑکی اور مشین پر گری، اور عبداللہ، جو اپنی آگ سے پاس ہی کھڑا تھا، جل بھن گیا۔

''اوہ! وہ بَین جو دیہاتی بوڑھیوں نے اپنے بازو لہرا لہرا کر اس کی میت پر کیے! عبداللہ کا جسم رضی اکبر کے گھر کے صحن میں چادر میں ڈھنپا ایک چارپائی پر پڑا تھا۔ ارد گرد اس کی خالائیں، پھوپھیاں اور دوسری عورتیں سیاہ کپڑوں میں اکڑوں بیٹھی تھیں، ایک اٹھتی اور مرے ہوئے شخص کی طرف بانہہ بڑھا کر اور اسے مخاطب کر کے دل گداز بَین کرتی۔ دیہات میں جب کوئی مرتا ہے تو اس کا مناسب ماتم کیا جاتا ہے اور گاؤں کے سب لوگ اس میں حصہ لیتے ہیں۔

''اور جب ہم شام کو اس کی میت کو اٹھائے دفنانے لے گئے تو ہر ایک کی آنکھوں میں آنسو تھے اور لبوں پر رنج و غم کے الفاظ، سوائے ایک شخص کے — یہ اس کا نانا رضی اکبر تھا۔ بوڑھے ضدی آدمی کی آنکھ سے ایک آنسو نہ بہا۔ میں اس کے ساتھ چل رہا تھا۔ اس کی آنکھ کوری اور خالی تھی۔ وہ کھرے تلخ لہجے میں موسم اور فصلوں کی باتیں کرتا رہا۔ ایک بار اس نے مجھ سے میری پڑھائی کے

متعلق بھی پوچھا۔ ہاں، جب میں نے مشیت ایزدی کا ذکر کیا تو وہ بھڑک اٹھا اور حقارت اور غرور سے غرّایا، "مشیت کا کرم ہمیشہ رشی اکبر کے گھر پر ہی ہوتا ہے!" میں نے جان لیا کہ اس کے لیے اب اس دنیا میں زیادہ دیر زندگی نہیں۔"

ثناء الحق خاموش ہوگیا۔ چاند کچھ پھیکا پڑنے لگا تھا اور پہلے مرغوں کی اذانیں سنائی دینے لگیں۔

"اور یہ ایک آدمی کی زندگی کی کہانی ہے۔ میں نے حافظ عبداللہ کو اس دنیا میں آنے پر دیکھا اور مولوی کو اس کے کانوں میں کلمہ پڑھتے سنا۔ پھر وہ میری آنکھوں کے سامنے بچپن اور بلوغت کی منزلوں سے گذرا، جن میں سے سب انسان گذرتے ہیں۔ وہ اس طرح بڑھا جیسے ایک پھول زمین میں سے اگتا ہے۔ وہ جوان ہوا اور جوانوں کی طرح ایک لڑکی کی چاہت میں دیوانہ ہوگیا۔ میں نے اسے اس کی شادی کے وقت چارپائی پر کھڑے مسکراتے اور سلام کرائی قبول کرتے دیکھا۔ میں نے اسے ایک ذمے دار مرد بنتے، گھر بساتے اور باپ بنتے دیکھا، اور پھر میں اس وقت بھی موجود تھا جب اسے سوندھی مٹی کے نیچے آرام کرنے کے لیے لٹایا گیا۔ سب آدمی ان سب منزلوں میں سے گذرتے ہیں اور آخر میں زمین ان کو اپنی کوکھ میں بلا لیتی ہے اور وہ سایوں کی طرح زندوں کی آنکھوں اور ذہنوں سے غائب ہوجاتے ہیں۔ ان کے سب خواب، ارمان، پچھتاوے اور مستقبل کے ارادے ایک مشتِ خاک بن کر ہواؤں میں اڑ جاتے ہیں۔ مگر ایک طرح وہ باقی رہتے ہیں — دوسرے انسانوں کے سینوں میں۔ اس میں بڑی سچائی ہے کہ سب آدمی ایک دوسرے کے دست بازو ہیں۔ جب ایک مرتا ہے تو ہم سب اس کے ساتھ مرتے ہیں..."

پھر ہم بنچ سے اٹھے اور اپنے اپنے خوابوں اور خیالوں میں کھوئے ہوئے، ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، خاموش سڑک پر ہوسٹل کی سمت چل پڑے۔

کھویا ہوا افق

وہ سرائے جس میں جا کر میں ٹھہرا ریلوے اسٹیشن کے بالکل سامنے تھی اور دراصل یاتریوں کے لیے مخصوص تھی۔ میرا کمرہ داخلے کے دروازے کے بائیں جانب اوپر کی منزل پر تھا۔ کمرے کے دروازے پر ایک چھوٹی سی آہنی تختی لگی ہوئی تھی جس پر ایک مربعے میں چند نیک فال ہندسے مندرج تھے۔

اگر اندر کا دروازہ اور باہر کا سلاخوں والا دروازہ دونوں کھلے ہوتے تو چڑیا گھر کے کسی پنجرے میں رہنے کا احساس ہوتا اور مجھے تو کئی بار محسوس ہوا کہ اپنی سرخ ٹائی، ہیٹ اور بی اے کی ڈگری کے باوجود میں کوئی بہتر قسم کا لنگور ہوں، جو کھڑکی میں سے نیچے اسٹیشن کے سامنے بیٹھے ہوئے بندروں کو پہچان کر بھائی بندی کے جذبے کے تحت مسکرا رہا ہے۔

صبح ہوتے ہی میں بندروں اور دیوتاؤں کے اس مسکن کو جسے ہردوار کہتے ہیں، کھوجنے کے لیے نکل پڑا۔ میں نے آنکھوں پر دھوپ کا سیاہ چشمہ لگا رکھا تھا اور اپنے سبز فیلٹ کے اگلے گھیرے کو نیچے کھینچ لیا تھا۔

کسی اجنبی جگہ کو دیکھنے اور اس کا بنظر غائر مشاہدہ کرنے کا بہترین طریقہ میرے نزدیک یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو اس کی گلیوں، اس کے کوچوں اور بازاروں میں کھودے۔ میں نے آج تک کبھی کسی جگہ کے قابل دید مقامات کے بارے میں کسی سے نہیں پوچھا۔ ہمیشہ اپنی دریافتوں پر کولمبس کی طرح اچانک اور ناگہانی آنکلتا ہوں اور مجھے اس میں لطف آتا ہے۔

دسمبر کے آخری دن تھے۔ سخت سردی تھی۔ میں اس طرف ہولیا جدھر 'ہر کی پوڑی' ہے — خدا کی سیڑھی۔ نہر تک لے جانے والا یہ راستہ ایک فراخ سیمنٹ کی بنی ہوئی سڑک ہے۔ دکانیں بند تھیں مگر بندر، جو انسان کے مقابلے میں زیادہ سحر خیز حیوان ہیں، جاگ رہے تھے اور ہر جگہ موجود

تھے۔ خدا معلوم وہ میرے متعلق کیا سوچتے تھے۔ بظاہر ان کے انداز سے ایک برترانہ حقارت سی ٹپکتی تھی۔ غالباً وہ اس شہر کو اپنا شہر سمجھتے تھے اور انسانوں کو غاصب اور ناخواندہ مہمان۔ یہی وجہ ہے کہ انسان کو چھوڑ کر دوسرے حیوانوں سے ان کے مراسم نہایت خوشگوار اور مہذبانہ تھے۔ ایک جگہ میں نے دس بارہ بندروں اور ایک نوعمر سانڈ کو مکمل اتفاق سے کچھ کھاتے ہوئے بھی دیکھا۔

اپنے بائیں طرف مکانوں سے دور، بہت دور، میں نے سورج کو چند گلابی پہاڑیوں کے اوپر سے جھانکتے ہوئے دیکھا۔ ان پہاڑیوں پر زرد لمبی گھاس سونے کی تاروں کی گچھیاں لگتی تھی۔ ایک پہاڑی پر چھوٹا سا مندر تھا۔ میں نے دل میں کہا: یہ ہے وہ رومان جس کو ڈھونڈنے تم اتنی دور آئے ہو۔

میرے سامنے ایک دیوار پر لکھا تھا: ''زیب زیب کلوریم — آنکھوں کی ہر بیماری کا واحد علاج۔'' ساتھ ہی بڑے بڑے حروف میں ہمیشہ اور باناغہ ناز بیوٹی اور ناز اسنو استعمال کرنے کی ہدایت تھی۔ اس سے نیچے اردو ادب کی سب سے مشہور تصنیف کا اشتہار تھا: ہدایت نامہ خاوند، مصنفہ کویراج ہرنام داس، بی اے۔ میں لاہور سے اور کئی چیزوں کے علاوہ جس شخص سے بچا گا تھا وہ حضرت کویراج ہرنام داس، بی اے تھے جو دیواروں پر، مندروں پر، مناروں پر، ہر جگہ اپنے مختلف ہدایت ناموں سمیت موجود ہوتے اور اب یہاں بھی براجمان تھے۔

سڑک کے خاتمے پر میں پوڑی پر پہنچ گیا۔ اب زندگی اور حرکت کے آثار پیدا ہو رہے تھے۔ وہ مخلوق جو ارتقا کے مختلف مرحلے طے کر کے بندر سے انسان میں تبدیل ہو چکی تھی، اپنے اپنے کاموں پر نکل رہی تھی۔

پوڑی پر ایک بورڈ منتظمین کی طرف سے آویزاں تھا: ''پوڑی پر سوائے ہندوؤں کے اور کسی غیر مذہب کے آدمی کو جانے کی اجازت نہیں۔'' میں بزدل آدمی ہوں اور اس قسم کے نوٹسوں کا پاس کرنے والا انسان ہوں۔ میں سڑک پر کچھ آگے نکل گیا۔ ایک طرف گدلے پانی کا تالاب تھا، جس میں بھاری جسم کی ایک عورت اپنے کپڑوں اور اپنی عینک سمیت کھڑی بار بار ڈبکیاں لگا رہی تھی۔ روئی کی طرح گول، عینک لگا کر بے حد سنجیدہ چہرہ پانی کے اوپر اٹھتا اور نیچے چلا جاتا — اپنے گمان میں وہ اپنے پچھلے پاپ دھو رہی تھی، اس بے حد متین، سنجیدہ اور عینک لگے چہرے کے ساتھ!

میں اب ریلوے لائن پر پہنچ گیا اور یہاں سے واپس پوڑی کی طرف مڑا۔ گنگا کا پاٹ یہاں بہت ہی تنگ ہے۔ اس کے دوسرے کنارے پر بازار اور گھاٹوں کے درمیان ایک دیوار ہے، شیشے کی چوکور لالٹینوں والی سفید دیوار۔ اس پر بھی ایک نوٹس لگا تھا اور دیوار کے اوپر سے دوسری طرف

جھانکنے سے منع کرتا تھا، مگر میں طویل قامت انسان ہوں، پنجوں کے بل کھڑے ہوئے بغیر میں نے ممنوعہ منظر کی ایک جھلک دیکھ لی۔۔۔ لیکن یہ بتانے کی کیا ضرورت ہے کہ میں نے کیا دیکھا۔

میں نے دل کڑا کیا۔ کسی کو بھلا کیا پتا ہے کہ میں مسلمان ہوں۔ میں نے بازار کی چند پرپیچ گلیاں طے کیں اور گھاٹ پر پہنچ گیا۔ یہ اصلی پوتر گھاٹ تھی جہاں بھگوان کسی زمانے میں اترے تھے۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں پانڈوں کا ہاتھ پکڑ کر انسان اپنے تمام پاپوں سے نجات حاصل کر لیتا ہے۔

گھاٹ دھوپ میں چمک رہا تھا۔ دائیں ہاتھ دکانیں، جوتشیوں اور جڑی بوٹیاں بیچنے والے ویدوں کے اسٹال تھے اور بائیں ہاتھ گنگا، تیز رو اور بے پروا، بڑی تیزی سے اپنے دو ہزار میل لمبے سفر پر سمندر سے ملنے جا رہی تھی۔

گھاٹ زندگی کی چہل پہل اور گہما گہمی سے پرشور اور پر رنگ تھا۔ غلیظ چوپے اور مٹھائیوں کی دکانیں، خوانچے والے، بڑی بڑی چھتریوں کے نیچے بیٹھے ہوئے جٹا دھاری سادھو۔ آگے بڑھتا تو گھاٹ کے فرش پر بیٹھی ہوئی حجاموں کی فوج سے جو یاتریوں کو چھیلنے کے انتظار میں تھی۔ مجھے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ بعض نے مجھے "صاحب بہادر" کہہ کر دعوت دی، بعض نے "مہاراج" بعض نے "راجا صاحب" اور چند نے محض "رائے صاحب!"

ایک ننھے خوبصورت پل پر سے گزر کر میں چھوٹے گھاٹ پر آیا جس پر دھوپ میں چند عورتیں اپنے کپڑے اور بال سکھا رہی تھیں اور جٹا دھاری سادھو چھتریوں کے نیچے آسن جمائے آنکھیں میچے رہے تھے اور چند گزرنے والی استریوں سے یقیناً گیان دھیان کی باتیں کر رہے تھے۔

رات کو میں دیر تک سرائے کے کمرے میں لیٹا پڑھتا رہا۔ دس بجے منشی نے بجلی آف کر دی تھی لیکن میں دیا جلا کر، اس کی مدھم پیلی روشنی میں ایک بجے تک جاسوسی ناول الماری کا مردہ پڑھنے میں مشغول رہا — یہ جاسوسی ناول بھی کتنی ذہانت اور کاریگری سے لکھے جاتے ہیں، خاص طور پر اس آدمی کے لیے جو فرار چاہتا ہے! پڑھتے پڑھتے سو گیا۔ اس کے باوجود کہ میں نے الماری میں سے مردے نکلنے والے کئی خواب دیکھے، میری نیند گہری اور پرسکون تھی۔

دوسرے دن میں رڑکی چلا گیا۔ صبح اٹھنے پر زندگی مجھے ایک بار پھر لگ رہی تھی — ایک بیزار کن مشغلہ۔ زندگی کی خواہش بھی جنسی خواہش کی مانند کبھی چوٹی پر ہوتی ہے، کبھی نشیب میں۔

میں ہرکی پوڑی کی سڑک پر اتر آیا۔ سامنے سے ایک لاری آ رہی تھی، اس میں بیٹھ گیا۔ سفر بے حد طویل اور اکتا دینے والا ثابت ہوا۔ لاری بہادر پور کے گاؤں پر پندرہ منٹ کے لیے رکی۔ یہ گاؤں چند دکانوں پر مشتمل تھا۔ ایک دکان پر میلے سے بورڈ پر "غلام قادر باربر" لکھا ہوا تھا۔ نیچے

قینچیوں، استروں اور صابنوں کی ہاتھ سے کھینچی ہوئی ٹیڑھی میڑھی تصویریں تھیں۔ میں نے سوچا، یہ حجامت کرانے کا بہت ہی نادر موقع ہے۔ لاری ڈرائیور سے کہہ کر میں غلام قادر بالبر کی دکان میں داخل ہوا۔ اس اچھے آدمی نے اس خلق اور کشادہ پیشانی سے میرا استقبال کیا جیسے میں اس کا ماں جایا بھائی ہوں۔

شیو کراتے ہوئے میں نے اس کو باربر کے بجائے بالبر لکھنے کی غلطی بتائی۔ اس نے بڑے وثوق سے کہا، ''جی نہیں — اصل میں بالبر ہی صحیح ہے، باربر غلط ہے۔ بالبر بال سے بنا ہے۔ لوگوں نے خواہ مخواہ اسے بگاڑ کر باربر کر دیا ہے۔'' میں نے اس دلیل کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا۔

کچھ دیر رڑکی میں بے مقصد آوارہ پھرتا رہا۔ پھر لاری میں واپس ہردوار لوٹ آیا۔ بہادر پور کچھ دیر کے لیے رکے۔ غلام قادر بالبر کی پر وقار ہستی دکان کے باہر کھڑی تھی۔ میں نے کھڑکی میں سے ہاتھ ہلایا؛ اس پر اس نے دھیان نہ دیا۔

رات کو میں ہردوار کے واحد سنیما گنگا ٹاکیز میں فلم موجی جیون دیکھنے گیا۔ اشتہاروں کی پہلی سلائیڈ نمودار ہوئی: ہدایت نامہ خاوند'' مصنف کویراج ہرنام داس، بی اے — میرے خدا! یہ حضرت یہاں بھی موجود تھے۔

پکچر کا انجام بخیر ہوا تو میں اداسی سے منہ لٹکائے واپس اپنے سرائے کے پنجرے کو لوٹا۔ اسٹیشن کے سامنے سے گذرتے وقت سیڑھیوں پر ایک دم فراخ مسکراہٹ سے میری مڈبھیڑ ہوئی — سیاہ اچکن اور سفید طرے دار پگڑی میں ایک بہت ہی فراخ مسکراہٹ۔ یہ 'ٹ' تھا۔ پر 'ٹ' یہاں کہاں؟

اس اچانک مڈبھیڑ کا اثر کچھ دور ہوا تو میں نے 'ٹ' سے کہا، ''مجھے یوں تمھارے یہاں آ نکلنے کا وہم وگمان بھی نہ تھا۔''

'ٹ' مسکرا دیا — وہی فراخ مسکراہٹ۔

''تم آئے کیوں؟''

وہی فراخ مسکراہٹ۔ پھر، ''چلو آؤ چائے پییں — میں بھوکا ہوں!''

ہم ریلوے اسٹیشن کے ڈائننگ روم میں جا بیٹھے۔ 'ٹ' نے چائے اور توسوں کا آرڈر دیا اور بھنویں اٹھا کر گویا میرا وزن کرتے ہوئے کہا، ''تو یہاں تم رومان تلاش کر رہے ہو — کوئی ملا بھی؟''

میں نے جواب دیا، ''پالیا ہے، صرف دم کی کسر باقی ہے۔''

ایک فراخ مسکراہٹ کے بعد: ''سچ؟''

''سچ! — یہ بتاؤ تم کب آئے؟''

''چھ بجے کی گاڑی سے۔ سیدھا سرائے گیا۔ بڑی مشکلوں سے پتا چلا کہ تم وہیں ہو۔ اپنا صحیح نام تم نے کیوں درج نہ کرایا؟''

''اوہ!'' میں اس کے متعلق لکھنا بھول ہی گیا۔ بات یہ ہے کہ میں اپنی خودی سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتا ہوں — ہر پرانی چیز انسان کو ماضی کی طرف کھینچتی ہے۔

'ٹ' نے چائے پیالی میں انڈیلی۔ ''تم اپنے آپ سے بھاگنا چاہتے ہو — کیا فی الواقع ایسا ممکن ہے؟''

''میرا خیال ہے... اگر انسان اس کا فی الواقع متمنی ہو۔''

چائے خلاف معمول بہت اچھی تھی۔

'ٹ' نے پوچھا ''تم یوں ایکا ایکی کیوں اٹھ بھاگے؟''

میں نے اس کی طرف دیکھا اور کہا، ''تمھیں یاد ہوگا جب ہم کالج میں پڑھتے تھے تو میں نے ایک نظم لکھی تھی — ایک چھوٹی سی، احمقانہ، ناپختہ اور بے جوڑ سی چیز۔ آؤ نکل چلیں، آؤ بھاگ چلیں، ہمارا یہاں سانس گھٹتا ہے... تم میرا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ مگر 'ٹ'، میں سچ کہتا ہوں، انگریزی ضرب المثل کے مطابق یہ میرے جذبات آنے والے حادثات کا پیش خیمہ تھے۔ میں یہاں کیوں بھاگ آیا ہوں — اس کی وجہ سمجھنے میں اب تمھیں کوئی زیادہ دقت نہ ہونی چاہیے۔''

'ٹ' بولا، ''زندگی کو سنوارنا چاہیے نہ کہ بگاڑنا۔''

میں نے کہا، ''تم زندگی کا سنوارنا کسے کہتے ہو؟ یہ کہ میں امتحان پاس کرلوں، ایک محفوظ مگر بے رونق ملازمت حاصل کرلوں، ایک بے وقوف باتونی عورت اپنی یا میری موت تک میری زندگی کے ساتھ چپک جائے؟ یہ رنگی رواتی زندگی، معاف کرنا، ایک تیندوا ہے جو انسان کو اپنے پنجوں میں جکڑ لیتا ہے۔ بھئی میں زندگی کے فلسفے میں اسٹیونسن کا چیلا ہوں — میں تو ایک سیلانی آوارہ گرد کی طرح زندہ رہنا چاہتا ہوں اور سیلانی آوارہ گرد ہی کی طرح سڑک کے کنارے چلتا چلتا کسی جھاڑی کی اوٹ میں اس خوبصورت زندگی کو الوداع کہوں گا۔''

'ٹ' نے میری بات سن کر صرف اس قدر کہا، ''میں تمھیں لینے آیا ہوں اور تمھیں چلنا ہوگا۔''

اس کے لہجے میں بلا کا تیقن تھا۔ میں نے ہولے سے کہا، ''اچھا۔''

'ٹ' کی آمد سے رومان ہمیشہ یوں ہی ختم ہوجایا کرتا تھا۔ واپس جانا پڑتا تھا — واپس اسی دنیا میں!

دوسرے دن 'ٹ' اور میں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے سرائے سے باہر نکلے۔ پہلے ڈاک خانے گئے، پھر اسپورٹس کا سامان بیچنے والی دکان میں۔ 'ٹ' کو ڈمبل اور سینے کو کشادہ کرنے والے اسپرنگوں کو دیکھنے اور آزمانے کا خبط ہے۔ اس کے بعد 'ٹ' کا پروگرام کنگنوں اور چوڑیوں کی دکان پر جانے کا تھا۔ اس نے کہا کہ چوڑی گری ہردوار کی خاص صنعت ہے، حالانکہ میں نے اسے یقین دلایا تھا کہ ہردوار کی صنعت صرف روحانیت ہے — اس کے علاوہ وہاں کوئی اور صنعت پنپ ہی نہیں سکتی۔

'ٹ' عجیب وغریب آدمی ہے، بہت ہی خوش کلام — سوکھے سے سوکھے موضوع پر بڑی بھری گفتگو کرسکتا ہے۔ ہر چیز سے دلچسپی رکھتا ہے، ڈمبلوں اور سینہ کشادہ کرنے والے اسپرنگوں سے لے کر ریشمی اور سوتی کپڑوں تک۔ کپڑوں کی حس اس میں بہت تیکھی ہے چنانچہ اس نے ہردوار کے تمام بزازوں کو اپنی اس حس کا شکار بنایا۔ ایک گرہ کپڑا نہ لیا لیکن تعجب ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا چہرہ بیسیوں تھان کھولنے پر بھی ہشاش بشاش رہا۔

کچھ وقت یوں گذار کر ہم پھر گھاٹ پر نکل آئے۔ سورج کی چمکیلی روشنی میں گھاٹ اپنی جملہ رنگینیوں سمیت پورے جوبن پر تھا۔ تصویروں کا ایک جھرمٹ تھا جو کھلے آسمان تلے کھل رہا تھا۔ میں اور 'ٹ' دونوں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے پاٹھ شالاؤں، اسٹالوں، سادھوؤں اور حجاموں کے پاس سے گذرتے ہوئے سفید پل پر آئے جو اس گھاٹ کو برلا اور والے گھاٹ سے ملاتا ہے۔ 'ٹ' ہر چیز میں دلچسپی لے رہا تھا — بڑی بڑی چھتریوں کے نیچے، بھبھوت ملے سادھو، تلک لگانے والے پانڈے، ڈبکیاں لگانے والے یاتری، ہر ایک میں 'ٹ' کے لیے دلچسپی کا سامان موجود تھا اور میرا 'ٹ' کو گردوپیش کی چیزوں سے متعارف کرانے اور ان کو دکھانے کا انداز کچھ ایسا تھا جیسے میں اپنی جاگیر پر اپنے کسی دوست کو اِدھر اُدھر پھرا رہا ہوں۔

کچھ دیر گھومنے کے بعد ہم سڑک پر جانے کے لیے سیڑھیوں کی طرف بڑھے تو راستے میں ہمیں ایک عجیب وغریب عورت ملی۔

میں یہاں صاف کہنا چاہتا ہوں کہ اب تک جو کچھ میں نے لکھا دراصل اسی عجیب وغریب عورت کے لیے لکھا — کہ میں اس سے ملا، میں نے اسے دیکھا، میں نے اسے محسوس کیا۔ وہ ان عورتوں میں سے تھی جو گھاٹ پر بھیک مانگ کر پیٹ بھرتی اور تن ڈھانکتی ہیں — لیکن وہ ان سے بے حد مختلف تھی، اس لیے کہ وہ عورت تھی لیکن اس کا ایک ایک خدوخال کہتا تھا کہ وہ عورت سے یا تو بہت زیادہ ہے یا بہت کم — لیکن یہ کمی بھی بہت گہری تھی، یعنی اگر تھی۔

اس کی آنکھیں صاف اور بے باک تھیں، لیکن اس بے باکی میں دور، بہت ہی دور، ایک

بہت ہی جھولی نگاہ جیسے پڑے پڑے گرد آلود ہوگئی تھی۔ نچلا ہونٹ کچھ عجیب مزاحیہ انداز میں نیچے کو مڑا ہوا تھا۔ اس کے دونوں ہونٹ آپس میں کبھی نہیں ملتے تھے، شاید اس خوف سے کہ اگر ملے تو ایک دوسرے سے چپک جائیں گے۔ اس کا سراپا مل جل کر، سرکشی یا گستاخی اور ایک جلتی ہوئی خواہش، یا جلی ہوئی خواہش، کا تاثر تھا۔

مجھے معلوم نہیں میرے ان الفاظ کا کچھ مطلب بھی ہے یا نہیں — وہ ایک جلی ہوئی عورت تھی جس کے بل ابھی تک نہیں گئے تھے۔

پل پر ہمارے سامنے آتے ہی اس نے عجیب مزاحیہ انداز میں کہا، ''آؤ باتیں کریں۔ وہاں اس گھاٹ پر گنگا مائی کے پاس بیٹھ کر باتیں کریں۔''

''باتیں کریں!'' ٹ نے اپنے ہونٹوں پر وہ خاص مسکراہٹ پیدا کی جو وہ عورتوں کے دل جیتنے کے لیے استعمال کیا کرتا ہے — یہ مسکراہٹ بے حد میٹھی اور چنچلی مسکراہٹ ہوتی ہے جس میں ایک دلگیر بانکے کا احساس تنہائی صاف پڑھا جا سکتا ہے۔

'ٹ' اعمل ترین پیشہ ور عاشق ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ اس عورت کے لیے اس نے یہ حربہ کیوں استعمال کیا۔ لیکن میں نے سوچا کہ عورت کوئی بھی ہو، اس کے اندر جذبہ ترحم کو متحرک کرنا شاید ضروری ہوتا ہے۔

'ٹ' نے پھر اس سے بڑی ملامت سے پوچھا، ''آپ کا نام کیا ہے؟''

وہ عورت خلا میں دیکھتی ہوئی بولی، ''میرا نام؟ — میرے تو بہت سے نام ہیں۔ جانکی بائی، سبھا پربھا، دھرتی ماتا، سیتا، مدر انڈیا۔''

لب دہان ایسا جیسے بچے کا ہو مگر قبل از وقت بڑا ہو گیا ہو۔ صاف اور بے لاگ آنکھوں میں ایک ناقابل بیان یاس تھی — ایک کھوئی ہوئی روشنی۔

'ٹ' نے دلچسپی لیتے ہوئے صرف اس قدر کہا، ''خوب۔''

اس عورت نے جس کے اتنے سارے نام تھے، دریا کی جھلملاتی ہوئی وسعت کی سمت اپنے نیلے بھورے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا، ''آؤ نا، وہاں گنگا مائی کے پاس بیٹھ کر باتیں کریں۔''

'ٹ' بولا، ''یہیں بیٹھ جاتے ہیں — باتیں ہی ہیں، کہیں کر لیں۔ کیوں؟''

''اچھا۔''

وہ مان گئی۔ ہم تینوں پل کے فرش پر منڈیر کے پاس بیٹھ گئے۔ 'ٹ'، میں اور اس عورت کے علاوہ بیسیوں قسم کے ملنگ، یاتری، سادھو، پانڈے، لچے، لفنگے اس پل پر سے گذر رہے تھے۔ ان

میں اکثر متجسس نگاہوں سے ہمیں دیکھتے۔ غالباً سوچتے تھے کہ ہم گھاٹ کی اس عورت کے ساتھ بیٹھے کیا کر رہے ہیں۔

مندر کے نیچے پوتر تالاب تھا جو عورتوں کے لیے مخصوص تھا۔ ڈبکی لگانے کے بعد جس وقت انسانی مینڈکیاں باہر نکلتیں تو پہلے سے کہیں زیادہ مضحکہ خیز اور غلیظ دکھائی دیتیں۔ تعجب ہے کہ وہ پانی جو ان کے جسم کی غلاظت دور نہیں کرتا تھا، کیونکر ان کی روح کو مصفّٰی کر دیتا تھا۔

تقریباً تین ساڑھے تین فٹ گہرے پانی میں چھ سات لڑکیاں اور عورتیں اپنی ساڑھیوں اور دھوتیوں سمیت کھڑی ڈبکیاں لگا رہی تھیں۔ جب باہر ابھرتیں تو ایک عجیب انداز سے مسکراتیں۔ ان کے جسم کے تمام تر خدوخال — تمام ابھار اور خم، تمام راز اور اسرار — جامے سے باہر تھے۔ 'ث' بہت ہی پرسکون منظر ہے۔ وہ اس نظارے کو بھی دیکھ رہا تھا اور گھاٹ کی اس بھکارن کی طرف بھی متوجہ تھا، چنانچہ جب اس نے اپنی پھٹی ہوئی قمیص کی جیب سے ریڈ لیمپ سگریٹوں کا پیکٹ نکالا اور ہماری طرف بڑھایا تو 'ث' نے شکریہ ادا کر کے ایک سگریٹ لیا۔

اس عورت نے ہم سب کے سگریٹ سلگائے، ایک اپنے لیے سلگایا۔ پھر باتیں شروع ہو گئیں۔

'ث' نے پوچھا، ''آپ کون ہیں؟ کیا کرتی ہیں؟''

عورت نے جواب دیا، ''تم نے پریم ادیب کا نام نہیں سنا؟ اس نے ہمارے ساتھ بے وفائی کیا۔ ہم ادھر اس کے سنگ پچھلم کمپنی میں ہیروئن کا پارٹ کرتے تھے۔ اس نے ہمارے ساتھ شادی کا وعدہ کیا۔ پر وہ ایک اور عورت لے آیا۔ ہم یہاں گنگا مائی کے چرنوں میں جیون بتانے کے لیے آ گئے۔''

'ث' نے میری طرف دیکھا — ایک صرف فلموں سے اس کو کوئی دلچسپی نہیں۔ میں نے اس کو بتایا، ''پریم ادیب ایک ایکٹر ہے۔ کافی مشہور ایکٹر ہے۔''

'ث' نے اس عورت سے پوچھا، ''ادھر فلم میں آپ کا نام کیا تھا؟''

اس نے فوراً ہی جواب دیا، ''سہانا سرتھ۔''

ظاہر ہے کہ وہ سہانا سرتھ نہیں تھی۔ غیر ارادی طور پر میرے منھ سے نکل گیا، ''ہرگز نہیں۔ ث، یہ جھوٹ کہتی ہے۔''

مایوسی کا بہت ہی گہرا سایہ اس عورت کے چہرے پر پڑا اور تھوڑی دیر کے بعد گذر گیا۔ مجھے بہت افسوس ہوا کہ میں نے اس کی خود فریبی کے آبگینے کو ٹھیس پہنچائی۔

وہ اصرار کرنے لگی، ''نہیں — میں سچانا سمجھ ہوں — میں ہی سچانا سمجھ ہوں — سچانا سمجھ ہی تو ہوں — سچانا سمجھ!''

اس تکرار سے وہ مجھے نہیں، دراصل خود کو یقین دلانے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ سچانا سمجھ ہے — میں جھوٹا ہوں اور وہ سچی ہے۔ اپنے کو مزید یقین دلانے کی خاطر اس نے ایک فلمی گیت دھیمے دھیمے سروں میں گانا شروع کر دیا۔ آواز میں فن نہیں تھا لیکن درد موجود تھا۔

'ٹ' نے پوچھا، ''آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟''

اس نے جواب دیا، ''ہم — ہم امرتسر کے رہنے والے ہیں۔ اور — آپ کا نام؟''

'ٹ' نے جواب دیا، ''رام چندر!'' ہونٹوں پر وہی فراخ مسکراہٹ تھی۔

عورت نے 'ٹ' کی طرف غور سے دیکھا۔ ''تمھاری شکل بھی رام کی سی ہے۔'' مجھ سے مخاطب ہو کر اس نے پوچھا، ''تمھارا نام؟''

''میرا — مرلی دھر۔'' مجھے بھی کوئی رومانی نام نہیں سوجھا۔

عورت مسکرائی۔ ''تمھارے ہاتھ میں مرلی تو ہے نہیں۔''

میں جھینپ گیا۔ مگر ہر دوار میں جہاں ہم اترے تھے، کافی فضا میں ریڈیمپ کا دھواں منھ سے نکالتے ہوئے، مجھے ایک لمحے کے لیے محسوس ہوا کہ رومان میری زندگی کے کندھوں سے چھو گیا ہے۔ میرا نہیں، کسی اور کا — پر جانا پہچانا ہوا۔

ہم کچھ دیر باتیں کرتے رہے۔ نیچے تالاب میں عورتیں اپنے گناہ دھوتی رہیں۔ کبھی کبھی 'ٹ' کی نگاہ اس طرف اٹھ جاتی تھی۔ دفعتاً جا گی یا سچانا انتہائی طیش میں اٹھی اور پل کی منڈیر کے پاس جا کر اس نے نہانے والیوں کو ایسی ایسی ننگی گالیاں دیں کہ وہ بوکھلا کر اپنے پاپ دھونے چھوڑ کر باہر نکل گئیں۔ جب وہ 'ٹ' کے پاس آ کر بیٹھی تو 'ٹ' نے اس سے پوچھا، ''تم نے بھگا کیوں دیا ان کو؟''

عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ خلا میں چند منٹ دیکھ کر اپنی آنکھوں میں سے غصے کا میل صاف کر کے وہ 'ٹ' سے مخاطب ہوئی، ''ہمیں ایک کمبل لے دو رام — رات کو بہت ٹھنڈ لگتی ہے۔''

مجھے حیرت ہے، 'ٹ' نے بڑے روکھے انداز میں اس سے کہا، ''ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں۔''

عورت نے بڑے بھولپنے سے کہا، ''ہمیں لے دو گے کمبل؟''

'ٹ' نے پھر اسی روکھے انداز میں جواب دیا، ''نہیں۔'' لیکن فوراً ہی اس کا لہجہ بدل گیا، ''آپ ہمارے ساتھ چلیے۔ یہاں گھاٹ پر کیا پڑا ہے۔ ہم تینوں اکٹھے رہیں گے — اچھا؟''

''میں — میں کہاں رہوں گی؟''

''جہاں ہم دونوں رہیں گے — ہمارے ساتھ۔''

عورت کی آنکھوں میں وہ جو دور بہت ہی دور ایک گرد آلود سی چیز تھی، روشن ہوئی۔ اور پھر یہی چیز دو موٹے موٹے آنسوؤں میں تبدیل ہوگئی۔ ممنون و متشکر لہجے میں اس نے کہا، ''رام بھی ایسے ہی تھے۔''

یہ کہہ کر وہ خلا میں گھورنے لگی۔ 'ٹ' نے پوچھا، ''کیسے؟''

''آپ جیسے — بالکل آپ جیسے — آپ ہی کی طرح سندر اور بھگت۔'' خلا میں گڑی ہوئی نگاہیں 'ٹ' کی طرف پھیر کر اس نے بچوں کی طرح کہا، ''تم مجھے اپنے ساتھ لے جاؤ گے؟''

'ٹ' نے میری طرف اشارہ کر کے اس سے پوچھا، ''یہ کیسے لگتے ہیں تمھیں؟''

عورت نے بڑے وثوق سے جواب دیا، ''یہ — یہ لکشمن ہیں... لکشمن۔''

کہاں میں اور کہاں پر سکون رام کا البیلا، جان پر کھیل جانے والا بھائی لکشمن! مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے لکشمن کی شان میں مجھ سے کوئی گستاخی ہوگئی ہے۔

'ٹ' نے پھر بڑے پیار سے عورت سے پوچھا، ''آپ کون ہیں؟''

عورت پھر اسی وثوق سے بولی، ''میں — سیتا — میں سیتا ہوں۔''

'ٹ' کے لہجے میں فرزندانہ سا جذبہ پیدا ہوگیا، ''سیتا نہیں — کوشلیا — رام لکشمن کی ماں کوشلیا!''

''سیتا نہیں؟'' اس کے لہجے میں انتہائی استعجاب تھا، اس بچے کا استعجاب جس کے یقین کامل کو یہ کہہ کر بدلنے کی کوشش کی جائے، ''بھاپو نہیں، ماموں،'' اور وہ منہ کھولے کہے، ''ماموں؟''

'ٹ' نے قطعیت کے ساتھ کہا، ''نہیں۔''

''نہیں؟'' اور اس کئی ناموں والی عورت کی آنکھوں سے کئی آنسو چھلک پڑے۔

'ٹ' کا لہجہ فوراً ہی بے حد ملائم ہوگیا۔ ''تم ہمارے ساتھ چلو۔ ہم تمھیں اپنی ماں کی طرح چاہیں گے۔ تمھاری سیوا کریں گے۔ ہم تمھیں اپنے محبت بھرے دل دیں گے!''

''دل؟'' اس عورت کی آنکھیں کھل کر ڈراؤنی سی ہوگئیں۔ ''دل؟ کہاں ہے دل؟ لاؤ کہاں ہے تمھارا محبت بھرا دل؟'' اس نے اپنے بڑے بڑے ناخنوں والا ہاتھ یوں بڑھایا جیسے وہ 'ٹ' کا دل نوچ کر باہر نکال لے گی۔ لیکن فوراً ہی اس نے اپنا ہاتھ پیچھے ہٹا لیا۔ ''ماں سے محبت نہیں ہوسکتی۔ محبت استری سے ہوتی ہے، شو کی پاربتی سے، شام کی رادھے سے، رام کی سیتا سے — میں تمھاری

سیتے ہوں۔ میں تم سے اسی طرح محبت کیا کروں گی جس طرح سیتے رام سے کرتی تھی۔"

ٹ اور میں دونوں سمجھ گئے تھے کہ یہ عورت محبت کی بھوکی ہے — اور بھی زیادہ بھوکی ہے، اس لیے کہ اس کے آگے ایک بار ٹکڑے ڈال کر ہٹا لیے گئے ہیں۔ وہ بھیک مانگ رہی تھی، ایک حفاظت کرنے والے، پچکارنے والے مضبوط ہاتھ کی، اور ٹ اس سے ممتا طلب کر رہا تھا جو وہ اپنے وجود میں کسی اور کے لیے محفوظ رکھنا چاہتی تھی — اس ننھے جیو کے لیے جس کی دھندلی دھندلی تصویریں وہ ہزاروں بار اپنی کوکھ میں بنا اور مٹا چکی ہوگی۔

ٹ نے بڑی بے جگری کے ساتھ اس سے کہا، "نہیں، سیتے نہیں۔"

عورت مایوس ہوگئی اور خلا میں دیکھنے لگی، جہاں شاید اس کا رام کھو گیا تھا۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد اس نے ایک تازہ کوشش کی۔ ٹ سے مخاطب ہو کر اس نے بڑے ہی دل کو موم کر دینے والے لہجے میں کہنا شروع کیا، "تیرہ سال سے گنگا مائی کے چرنوں میں پڑی راہ دیکھ رہی ہوں — میرا رام ایک دن آئے گا، ضرور آئے گا — اور مجھے لے جائے گا۔" پھر اس نے ہولے سے کہا، "گنگا مائی نے مجھے وچن دیا تھا — پانی کی بوندوں نے میرے کان میں بتایا تھا۔ جا گئی، چنتا نہ کر، تیرا رام ضرور آئے گا۔" اس کی آواز بلند ہوگئی، "سو آج میرا رام آ گیا — میں نے کل رات جاڑے میں کانپتے کانپتے ایک سپنا بھی دیکھا تھا۔" جیسے اس نے آنکھیں بند کر کے خواب کو یاد کیا، "جیسے رام اور لکشمن دونوں میرے دوارے جوگی اور بیاسے آئے ہیں — رام تمھاری شکل کے تھے اور لکشمن ان کی شکل کے۔" اس نے میری طرف اشارہ کیا اور ٹ کی طرف بھیک مانگنے والی آنکھوں سے دیکھا، مگر اسے خواب کا جواب نہ ملا۔

بے حد مایوس ہو کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور جس طرح ایک سایہ چلتا ہے، وہ آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے اتر کر روانہ ہوگئی اور تھوڑی دیر بعد گھاٹ کے ان گنت روشنی کے دھبوں میں گم ہوگئی۔

میں سوچ رہا تھا کہ کئی ناموں والی عورت جو تیرہ سال سے گنگا مائی کے چرنوں میں اپنے رام کا انتظار کر رہی ہے، شاید ہمیشہ ہمیشہ کے لیے میری زندگی سے چلی گئی ہے اور میں رام کا کردار اپنے کردار میں سموتا رہ گیا ہوں۔ انسان بھی کس قدر کمزور، کس قدر عاجز اور کس قدر قابلِ رحم حد تک بے وقوف ہے۔

میں نے سوچا کہ یہ عورت کب تک اپنے موہوم رام کا انتظار کرتی رہے گی؟ کب تک یوں ہی محبت کی بھیک مانگتی رہے گی؟ کب تک؟ ایک روز یوں ہی خلا میں دیکھتی دیکھتی مر جائے گی۔ کیا وہ دوسرے جیون میں اپنے رام کو پا لے گی؟ — کون جانے۔

میں نے سوچا، اس عورت نے چوڑیاں کی ہوں گی، اور یقیناً پانڈوں، سادھوؤں اور تجاموں کے مکروہ بازوؤں میں بھی لیٹی ہوگی — یہ عورت جس کے بہت سے نام تھے اور جس کی روح گنگا جل سے کہیں زیادہ پوتر تھی۔

فورتھ ڈائمنشن

مسٹر آئن شٹائن کے نظریہ اضافیت نے، جس کی رو سے لمبائی چوڑائی اور گہرائی کے علاوہ ایک چوتھی بعد ''وقت'' کی بھی ہے، جدید علم ریاضیات کے سارے تشکل ہی کو بدل دیا ہے۔ مسٹر آئن شٹائن اور معدودے چند دوسرے ریاضی دانوں کے سوا بہت کم لوگ اس نظریے کی ماہیت کو سمجھ سکنے کا دعویٰ رکھتے ہیں، اور اگر آئن شٹائن ایک سنجیدہ اور مسلمہ شہرت کا مالک نہ ہوتا تو ممکن ہے اس نظریے کو اس کا ایک مذاق تصور کیا جاتا — ایک جدت اور لوگوں کی نظروں میں آنے کے لیے ایک چونکا دینے والا ڈھکوسلا۔ میں نے اس نظریے کو سمجھنے کی کبھی کوشش نہیں کی، لیکن وقت کے ''چوتھی بعد'' ہونے کا خیال مجھے بے حد پرکشش اور عجیب لگا ہے۔ اس نظریے میں فلسفے اور ریاضی کا امتزاج نظر آتا ہے جو ظاہراً ناممکن ہے کیونکہ فلسفہ اور ریاضی دو متضاد علوم ہیں۔ صرف آئن شٹائن ہی، جو ایک ماہر ریاضیات ہونے کے ساتھ ایک گہرا فلسفی بھی ہے، ایسے خوبصورت اور حیران کن نظریے کے متعلق سوچ سکتا اور اسے ہندسوں اور مساویوں سے ثابت کر سکتا تھا۔ مجھے یہ معلوم نہیں کہ آیا دیوتاؤں اور ملکوتی وجودوں کو اپنے آسمانی مقاموں میں بھی اعداد و شمار رکھنے کے لیے ریاضی کی ضرورت پڑتی ہے: اگر ان کو بھی ریاضی سے کام لینا پڑتا ہے تو وہ آئن شٹائن کی ایجاد کردہ ریاضی ہوگی جس میں ''وقت'' ضرور ایک چوتھی بعد ہوگا۔ اس شاعر ریاضی داں نے فلسفے اور ریاضی کو یکجا کر کے ثابت کر دیا ہے کہ وہ حقیقی معنوں میں ایک جینیئس ہے۔

ایک مشہور جدید انگریزی ڈراما نگار نے اپنے کئی ڈراموں میں اس نظریے کو بطور ایک فلسفہ اور ایک مرکزی خیال کے استعمال کیا ہے اور نتائج پرکشش اور عجیب و غریب تھے۔ آدمی اب ''وقت'' کو ایک نظریے سے دیکھنے لگ گئے ہیں۔ مختصراً اس انگریزی ڈراما نگار نے (اس کا نام پریسٹلے ہے) آئن شٹائن کے نظریے کی فلسفیانہ اصطلاح میں جو تشریح پیش کی ہے، وہ یہ ہے کہ آدمی

کبھی نہیں بدلتا: صرف چوتھی بعد، ''وقت'' بدلتی ہے اور اس بعد رابع کے بدلنے سے آدمی بظاہر مختلف نظر آتا ہے، اس وقت سے جب کہ وہ پہلے پہل اس دنیا میں آنکھیں کھولتا ہے، اس وقت سے جب کہ وہ اپنی ماں کے پیٹ میں محض ایک جنین کی شکل میں ہوتا ہے، اس وقت سے جب وہ اپنے باپ کے پٹھوں میں ایک تند اسپرم ہوتا ہے، اور اس سے بھی پہلے اپنے لاتعداد موروثوں کے خون میں، وہ وہی ایک ہی آدمی ہوتا ہے جو وہ اب ہے، جو وہ دس ہزار سال بعد ہوگا۔ میرا خیال ہے ہم سب نے کبھی نہ کبھی یہ ضرور محسوس کیا ہوگا کہ ہم ہی 'پہلی زندگی' ہیں، ہم جاودانی اور مدام ہیں اور یہ کہ ہم ابد کی تاریک کھوؤں تک زندہ رہیں گے۔ مذہب کے سب بڑے بانیوں نے اسے ضرور محسوس کیا ہوگا، ورنہ ہر مذہب میں روحوں کی ازلی تخلیق، انسانی کی زندگی کی ابدیت اور کسی نہ کسی طریق پر موت کے بعد وجود میں ہونے کا تصور نہ پیش کیا جاتا۔ مہذب مذاہب کو چھوڑ کر افریقہ کے حبشی کا ''ووڈوازم'' بھی اس کے سامنے، اگرچہ ایک مختلف طریقے پر، حیات بعد موت اور سزا و جزا کا یہی تخیل رکھتا ہے، اور یہ امر کہ آدمی کی ابدیت ہر مذہب کا بنیادی اعتقاد ہے، محض اتفاق نہیں ہو سکتا۔

اس احساس کو لکھے ہوئے لفظ کی قید میں نہیں لایا جا سکتا، اسے صرف کسی الہامی لمحے میں اچانک محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اسی احساس نے ہندوؤں کے مسئلہ تناسخ کو جنم دیا اور یہی ایک مسلمان کے سزا و جزا کے عقیدے کا موجب ہے۔ اس وقت کی ابدیت کے عظیم پس منظر کے سامنے جانچنے پر آدمی کی پیدائش اور موت اس کی ازلی و ابدی زندگی میں وہ بالکل غیر اہم اور معمولی واقعے نظر آتے ہیں اور صرف اس کے دنیاوی سفر میں آغاز اور اختتام کے دو سنگ میل قرار پاتے ہیں۔

بعض دفعہ یہ آگے بڑھتا ہوا رواں دواں وقت پیچھے بھی دوڑ سکتا ہے اور پھر بظاہر عجیب اور ناقابل فہم باتیں عمل میں آتی ہیں۔ ایسا ہی چونکا دینے والا اور ناقابل فہم تجربہ چند روز ہوئے ان سطور کے لکھنے والے کے ساتھ پیش آیا۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ اس وقت بیٹھا مابعد الطبیعاتی مسئلے کو زیر بحث لا کر پڑھنے والے کو اس 'احساس' کے سمجھانے کی غالباً بے فائدہ کوشش کا مرتکب نہ ہوتا۔

میری اولین یادوں میں سے ایک جو ایک عرصے کے دیکھے ہوئے خواب کی طرح دھندلکوں میں لپٹی ہوئی ہے، چارپائی پر سفید چادر میں ملفوف ایک ساکن لیٹی ہوئی شکل کی ہے۔ چادر برف کی طرح چمکیلی سفید ہے۔ چارپائی، جس پر وہ ساکن شکل لیٹی ہے، ایک وسیع چبوترے کے وسط میں ہے اور اس کے پیچھے ایک وسیع مکان کے برآمدے کے محرابی دروازوں کا پس منظر ہے۔ چارپائی کے اردگرد بہت سے آدمی جمع ہیں۔ ان میں سب سے ممتاز اور باقی سب لوگوں کے لیے میل مرکزی بنا ہوا ایک لمبا سفید بزرگانہ ڈاڑھی والا شخص ہے۔ بہت سے آدمی اس کے پاس آتے ہیں اور پھر

اِدھر اُدھر بکھر جاتے ہیں۔ وہ اسی طرح جامد ایک گڑی ہوئی لاٹھی کی طرح کھڑا رہتا ہے۔

وقت غالباً پہلے پہر کا ہے اور دھوپ کی روشنی زرد و زریں ہے۔ میں اپنی انّا مائی بھاں کی انگلی پکڑے ایک سنہری دھوپ میں نہائے ہوئے شہر میں پُراسرار وسیع گلی کوچوں میں چل رہا ہوں۔ (اگرچہ میں اکتیس سال تک پچکا ہوں اور کئی ملکوں اور کئی ہواؤں میں میں نے اس شہر کی تلاش کی ہے، میں نے اس شہر کو نہیں پایا۔ وہ شہر شاید نہ زمین پر ہے نہ آسمان پر — ماسوا ایک بچے کے دماغ میں۔ ہاں، قدیم فرعونوں کے تھیبس (Thebes) کی تصویروں میں مجھے اس شہر کی ایک جھلک دکھائی دی ہے۔) مائی بھاں قدرے تیز تیز چل رہی ہے۔ میری چھوٹی ٹانگیں اس کے ساتھ برابر قدم نہیں رکھ سکتیں اور میں تقریباً گھسٹ رہا ہوں۔ اچانک ہم ایک بڑے مکان کے پھاٹک کے پاس آکر رکتے ہیں جو کھلا ہے۔ اس میں سے وہ منظر نا گہانی ہماری نظروں کے سامنے آتا ہے — برف کی سفید چادر میں لپٹی ہوئی شکل اور خاموش لوگوں کا منظر جسے میں نے پہلے بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔

میں مائی بھاں سے پوچھتا ہوں، ''اماں، یہ کیا ہو رہا ہے؟'' وہ کہتی ہے، ''دیپا، وہ عورت جس کے گھر ہم جاتے رہتے تھے اور جو ہمیں تمھیں کھانڈ کا شربت پینے کے لیے دیا کرتی تھی، مرگئی ہے اور یہ اس کا جنازہ جا رہا ہے۔''

مجھے مرنے کے متعلق کوئی واضح پتا نہیں کہ وہ کیا ہوتا ہے۔ پھر بھی میں محسوس کرتا ہوں کہ اس میں ڈراؤنی، کچھ ہولناک سی چیز ہے۔ مجھے اس کھانڈ کا شربت پلانے والی موٹی مہربان عورت کا اس طرح آکر چادر اوڑھ کر ساکن لیٹ جانا بے حد عجیب معلوم ہوتا ہے۔

میں مائی بھاں سے اس کے متعلق اور بہت سی باتیں پوچھتا ہوں، لیکن وہ بڑوں کی سی بے اعتنائی کے ساتھ مجھے کوئی جواب نہیں دیتی۔ میں حیران اور عجب طور سے ڈرا ہوا اس منظر کو دیکھتا ہوں۔

جب سے مجھے یاد ہے، اماں بھاں ہماری دایہ تھی۔ ہم اس کو اس تعجب اور تعریف سے دیکھا کرتے تھے جس طرح بچے اپنے سے بڑوں کو دیکھتے ہیں۔ مجھے اس کے بغیر ایک پل چین نہ آتا تھا۔ اسے شاہزادوں اور دیوتاؤں کے عجیب و غریب قصوں کے بیچ میں سو جانے اور خراٹے لینے کی جھلا دینے والی عادت تھی اور مجھے اور میری بہن کو اسے جگانے کے لیے اس کے زور زور سے چٹکیاں لینی پڑتیں کیونکہ وہ ایک گہری نیند سوتی تھی۔ وہ جاگتی اور ہم پوچھتے، ''اماں بھاں، آگے کیا ہوا؟''

''میں کہاں پر تھی؟'' وہ پوچھتی۔

''تو کہہ رہی تھی نا، شاہزادے نے پری سے پوچھا کہ تو ہنسی کیوں اور روئی کیوں؟'' ہم بے صبری سے اسے یاد کراتے۔

وہ چند منٹ اور اونگھتے ہوئے قصہ سناتی اور ایک نہایت دلچسپ اور مضطرب کن قصے کے درمیان خراٹے لینے لگتی۔

میری اماں بکھاں ایک عام واقفیت کی عورت تھی۔ تقریباً شہر میں ہر کوئی اس کو جانتا تھا اور راستے میں کئی آدمی اس کو ٹھہرا کر اس کی خیریت پوچھتے اور حال لیتے اور دیتے۔ اماں بکھاں اپنے چالیس کے سن کے باوجود، اور اپنی فربہ مگر بھدی صورت کے باوجود، اس وقت بھی رومینٹک عورت تھی اور، میرا خیال ہے، کافی چاہنے والوں کے نام گنا سکتی تھی۔ اس کے پہلے خاوند مر کھپ گئے تھے یا وہ ان کو فراموش کر چکی تھی۔ جب میں دوسری میں پڑھتا تھا تو اس نے ہمارے پچاس سالہ سائیں بابا الہی بخش کے ساتھ، جسے ہم بابا لاہیا کہا کرتے اور جو اپنی مہندی سے رنگی ہوئی داڑھی کے ساتھ ایک نہایت پروقار شخص لگتا تھا، نکاح پڑھوا لیا جو اس کی پہلی شادیوں کی طرح عارضی نوعیت کا ثابت ہوا۔

وہ ایک اچھی اور جہاں دیدہ عورت تھی، اور غالباً بیشتر گھرانوں میں اس کی جو آؤ بھگت ہوتی تھی وہ اس کی تحصیل دار صاحب کی نوکرانی ہونے کی حیثیت سے ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ وہ ادھر اُدھر کے 'حال احوال' دینے کے فن میں اپنے طبقے کی ساری عورتوں کی طرح طاق تھی۔ اس کی زیادہ باتیں گپیں اور شہروں کے اسکینڈل کے بارے میں ہوتی ہوں گی، جن کو سننا اور جن پر بحث کرنا ہمارے گھروں کی چاردیواری میں محبوس زنانہ مکینوں کا چہیتا مشغلہ ہے۔ مجھے اس کے ساتھ بے حد محبت تھی اور میں اس سے پل بھر کے لیے جدا نہ ہوتا تھا۔ اگر وہ کہیں مجھے چھوڑ کر چلی جاتی تو میں زور زور سے رو کر اس کی دہائی دیتا اور ضد اور غصے سے آنگن کے فرش پر لوٹنے لگتا اور اس وقت تک غیر تسلی پذیر ہوتا جب تک اماں بکھاں مجھے اٹھا کر سینے سے نہ چمٹا لیتی۔ وہ ضدی اور غصیلی تھی اور مجھے یہ اکثر جتایا گیا ہے کہ میں نے اپنی ضد اور غصہ اماں بکھاں سے لیا ہے۔ اگر یہ سچ ہے تو میں اماں بکھاں کا شکر گذار ہوں کیونکہ میری ضد نے مجھے کئی حماقتوں سے بچایا ہے اور مجھے اپنی مرضی اور خوشی کے مطابق زندگی گذارنے کے لیے اکسایا ہے۔ اماں بکھاں نے مجھے اپنی آواز اور اپنا لہجہ ضرور بخشے ہیں۔ میرا دیہاتی سا رینگتا ہوا لہجہ بڑی دیر تک میرے گھر والوں کے مذاق اور قدرے مایوسی کا موجب رہا۔ وہ میرے اس لہجے کی ذمے داری میری پیاری اماں بکھاں کے سر تھوپتے تھے اور میں اس اچھی عورت کا شکر گذار ہوں (وہ مر چکی ہے) کہ اس کی وجہ سے مجھ پر اپنی کسی کوتاہی کا الزام نہیں دھرا جاتا — اصلی قصوروار مائی بکھاں ٹھہرائی جاتی ہے۔ جن دنوں میں اور اماں بکھاں گلیوں میں گشت کیا کرتے تھے اور موٹی مہربان عورتوں کے گھروں میں بن بلائے مہمان بنا کرتے تھے، ان دنوں کی میری ایک تصویر اب تک میری بڑی پھوپھی کے تختۂ آتشداں پر محفوظ ہے اور اس

وقت کے میرے جیسے اور لباس پر روشنی ڈالتی ہے — ایک سیب سے گالوں والا گول مٹول لڑکا جس کے سر پر سلما ستاروں سے کاڑھی ہوئی گول ٹوپی ہے اور جس نے اوپر اٹھی ہوئی نوکوں والے براؤن بوٹ پہنے ہوئے ہیں، ایک شش طرفی کھڑی ہوئی میز پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھا ہے اور ایک معصوم متانت سے سامنے دیکھ رہا ہے۔ پیچھے فوٹوگرافر کا پردہ ہے جس پر جھالروں والے ستون اور پیچھے گملے سے رنگے ہوئے نظر آرہے ہیں۔ مجھے بھی یاد پڑتا ہے سلما ستاروں والی ٹوپی مجھے بے حد اچھی لگتی تھی اور میں دوسری جماعت میں آنے تک اس کو پہنتا رہا۔ اونچی اٹھی ہوئی نوکوں والے بوٹوں سے مجھے سخت نفرت تھی اور میں ان کو پسند نہ کرتا تھا مگر ان دنوں ان کا رواج عام تھا۔ وہ شش طرفی منقش میز اپنے پائیدان سمیت غالباً ابھی ہے اور پھولدار گلوب والے لیمپ کی طرح اب تک (یعنی ستائیس، اٹھائیس سال گذرنے کے بعد تک بھی) ہمارے گھر میں ہے۔

میں تحصیل دار صاحب کا "کاکا" تھا۔ اس لیے میری والدہ جہاں تک ممکن ہوتا مجھے صاف کپڑوں میں رکھتی اور مجھے بتایا گیا ہے کہ اکثر جب میں اماں بہاں کے ساتھ گشت پر نکلتا تھا تو میرا لباس وہی ہوتا تھا جو میں فوٹوگراف میں پہنے بیٹھا ہوں۔ یعنی سلما ستارے والی ٹوپی، ایک زریں سی واسکٹ، شلوار اور اٹھی ہوئی نوکوں والے (کتنے بدنما!) بوٹ۔ جب میں نے بڑے پھاٹک کے پیچھے سے زردیلی ساحرانہ سی دھوپ میں چبوترے پر اس سفید ساکت میت پر نظر ڈالی ہوگی تو میرا یہی لباس ہوگا۔ اگرچہ مجھے خود یاد نہیں کہ میں نے کیا کپڑے پہنے ہوئے تھے — تو اب میں جانتا ہوں کہ میرا وہی لباس تھا۔

اس واقعے کے بعد، جب میری عمر زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین سال ہوگی، میں نو سال اور بہاول نگر میں رہا۔ میرے بچپن اور لڑکپن کا سنہری زمانہ اسی کھلے، پرفریب شہر میں گذرا۔ اس عرصے میں مجھے پھر وہ بے حد بڑے پھاٹک اور افسانوی وسعت والے چبوترے والا مکان نظر نہ پڑا، گو کہ میں نے خاص طور سے اس کی کبھی تلاش نہیں کی۔ کئی دفعہ میں تعجب کرتا کہ وہ میری یادوالی جگہ کون سی تھی اور کہاں تھی۔ مجھے اب یقین ہے کہ اگر میں اس کے پاس سے گذرا ہوں گا تو میں نے اسے پہچانا نہ ہوگا۔ بچپن میں چیزیں اصلیت سے کہیں زیادہ پراسرار اور وسیع لگتی ہیں، اور بے حد حیرت ناک!

پھر میرے باپ کی بہاول نگر سے بہاول پور تبدیلی ہوگئی۔ بہاول پور ریاست کا دارالخلافہ تھا، شاندار شہر تھا۔ وہاں نور محل تھا اور سینما۔ وہاں بجلی بھی تھی۔ میں تمام لڑکوں کی طرح ایک نئے اور بڑے شہر میں جانے پر بے حد خوش تھا۔ میں ایک نئے اسکول میں داخل ہوں گا، نئے دوست بناؤں گا، نئی اور عجیب و غریب جگہیں دریافت کروں گا — زندگی زیادہ دلچسپ ہوگی۔

مگر بہاول پور میرے لیے ایک منحوس شہر ثابت ہوا۔ یہاں ہم ایک تنگ کوچے میں ایک شاندار پختہ مکان میں آ کر ٹھہرے تھے مگر میں تمنا اور ہڑک کے ساتھ بہاول نگر میں اپنے کچی اینٹوں کے گھر کے خواب دیکھا کرتا — وہ مردانے کی چھوٹی دیوار، وہ دروازے کے باہر ایک لوہے کے بازو سے لٹکی ہوئی میونسپلٹی کی لالٹین، وہ چھوٹی دیوار کے پرے ریتیلا میدان جہاں میرے دوست مصنوعی جنگیں لڑا کرتے تھے، وہ مکان کے عقب میں، بڑے برساتی جوہڑ کے پرے، سیاہ اور پراسرار ''ریلوائی'' جہاں آدمی جا کر انجنوں اور گاڑیوں کو دیکھ سکتا تھا۔

بہاول پور میں میں اپنی جماعت میں چوکا مگر کئی وجوہ سے اداس اور کھویا کھویا سا رہنے لگا۔ یہاں ایسے دوست نہ تھے جن کے ساتھ مل کر آدمی مصنوعی جنگیں لڑ سکتا ہو یا اینٹوں کے بنے ہوئے قلعوں پر حملے کر سکتا ہو یا رنگین کاغذ کے تاج پہن کر اور لکڑی کی تلوار کمر میں رسی سے باندھ کر بادشاہ اور وزیر کے ناٹک کھیل سکتا ہو۔ میں جو ایک شوخ اور صحت مند لڑکا تھا، اب زیادہ عرصے گھر میں محبوس گزارنے لگا۔ میں ایک سوچنے والا اور راہب بن گیا۔ اپنا غم غلط کرنے کے لیے میں نے کتابوں میں خود فراموشی اور تفریح ڈھونڈی۔ کتابیں رفتہ رفتہ افیم کی طرح میری آقا بن گئیں اور ایسی دوست جنھوں نے مجھے تمام قدرتی انسانی تعلقات سے بے نیاز کر دیا۔ میں نے بی اے بہاول پور سے پاس کیا۔ اس وقت اپنی تنہائی اور دل کی تاریکی کی وجہ سے میں انسانوں سے ڈرنے لگ گیا تھا اور یقین کرتا تھا کہ میں دیوانگی کی سرحد پر کھڑا ہوں۔

پھر بھی ایک امید تھی۔ وہ امید بہاول نگر تھی۔ یہاں سے صرف سو میل دور دنیا کا خوبصورت ترین اور متبرک ترین شہر تھا جہاں میں کھویا ہوا افق پھر سے پا سکتا تھا اور اپنے بچپن کے چمکیلے دن رات کی شاید پھر تسخیر کر سکتا تھا۔ اپنے باپ کی بہاول پور میں تبدیلی کے دس سال بعد گاڑی مجھے پھر ریتیلے ٹیلوں اور چلچلاتی دھوپ میں تپتے ہوئے میدانوں میں سے بہاول نگر کی طرف لے جا رہی تھی۔ میں ایک نئی زندگی شروع کرنے کے لیے گھر سے بھاگ رہا تھا مگر نئی زندگی میرے لیے کسی جگہ بھی بہاول نگر کے حج کے بغیر ممکن نہ تھی۔ میں دہلی اور دور دیسوں کا عازم تھا مگر میں نے فیصلہ کیا کہ راستے میں چند گھنٹوں کے لیے بہاول نگر میں ضرور اتروں گا اور اس کی گلیوں میں اپنی کھوئی ہوئی خوشی کی تلاش کروں گا۔

جب گاڑی کوکتی اور گڑگڑاتی، کوئلے کے پہچانے ہوئے انباروں، شنٹ کرتے ہوئے انجنوں، ریلوائی کے بنگلوں کے پاس سے سنسناتی ہوئی بہاول نگر جنکشن میں داخل ہوئی تو میرا دل دھڑک رہا تھا۔ میرے حلق میں ایک پھانس سی تھی۔ یہ میری زندگی کے متبرک ترین لمحوں میں سے

ایک تھا۔

نیچے گملوں والے پلیٹ فارم پر اترنے پر مجھے ایک پرانا دوست مل گیا۔ جسے پہچاننے میں مجھے کچھ دقت ہوئی۔ وہ اب کافی موٹا اور جسیم ہو گیا تھا اور وہ ڈگریاں حاصل کر چکا تھا۔ پرائمری اسکول کے دنوں میں وہ ہماری مصنوعی جنگوں میں دشمن فوج کا نائب سردار ہوا کرتا اور میں نے ایک دفعہ اس کو چت کر کے اور اس کے سینے پر چڑھ کر لکڑی کی تلوار سے اس کی ناک کاٹنے کی کوشش کی تھی۔ (وہ جنگ ہم نے جیتی تھی۔) اب وہ محکمہ مال میں گرداور، قانون گو یا اسی قسم کی کوئی اور چیز تھا۔ وہ میری مریضانہ حالت پر اظہار افسوس کرتا رہا اور پھر اس نے اصرار کیا کہ میں اس کے پاس چل کر ٹھہروں اور لوگوں سے اس تخیلی خوف کے باوجود جو دس سال کی راہبانہ زندگی کا نتیجہ تھا، میں نے اس کی دعوت کو منظور کر لیا۔

گاڑی بہاول نگر میں شام کے سات بجے پہنچی تھی اور سامنے شہر پر اندھیرا چھا رہا تھا۔ میں نے پل پر ہی سے دیکھ لیا کہ ہمارے گھر کے گرد بہت سے اور مکان بن گئے ہیں اور شہر کی ہیئت بہت کچھ تبدیل ہو گئی ہے۔ وہ ریتیلا میدان جہاں ہم کھیلا کرتے تھے، اب پکے مکانوں میں تبدیل ہو چکا تھا۔ ہم شہر کے بازاروں میں سے گزرے اور میں نے کئی پرانے چہرے، ایک لرزے کے ساتھ، پہچانے۔ بازار بالکل ویسے ہی تھے، صرف دکانیں پکی ہو گئی تھیں۔

رات کو میں اپنے دوست کے ہاں رہا۔ دوسرے دن گاڑی کو گیارہ بجے چلنا تھا اور میں علی الصباح ہی اپنے کسی دوست سے ملاقات کرنے کا عذر کر کے اٹھا۔ اپنے بچپن کے بہاول نگر کو کھوجنے کے لیے چل کھڑا ہوا۔ میں پہلے اپنے پرانے گھر کی طرف گیا اور آخر اسے ڈھونڈ نکالا۔ مگر یہ ایک مختلف گھر تھا۔ اس میں اتنی ترمیمیں اور اضافے ہوئے تھے کہ وہ پہچانا نہیں جاتا تھا۔ چھوٹی کچی دیوار کا نشان نہ تھا اور نہ ہی دروازے پر میونسپلٹی کی لالٹین تھی۔ مردانہ اور زنانہ اب دو الگ الگ گھر بنا دیے گئے تھے۔ یہاں سے میں ہسپتال اور ہائی اسکول والی سڑک پر سے ہوتا ہوا ڈگی پر گیا جہاں ہم ساون کے دنوں میں بیر بہوٹیاں پکڑنے اور ساونی بنانے جایا کرتے تھے۔ وہاں سے شہر کا باہر سے چکر لگا کر میں مغربی طرف پر پرانے تھیٹر پر آیا جس کی چھت تب بھی نہ تھی اور اب بھی نہ تھی، اور جہاں نیک پروین، شیر کی گرج عرف چنگیز خاں اور سلور کنگ جیسے شاندار کھیل ہوا کرتے تھے۔ اب یہاں پاکباز محبت لگا ہوا تھا۔ اس تھیٹر کے بعد میں نے اپنے آپ کو ایک چوڑی سڑک پر پایا جو مجھے اب یاد نہ تھی۔ یہ سیدھی بازار میں کہیں جا نکلتی ہے۔

میں ایک بڑے کھلے پھاٹک کے پاس سے گزرا۔ اندر ایک چبوترے پر ایک چارپائی پر

سفید چادر میں لپٹی ہوئی ایک شکل ساکت پڑی تھی اور بہت سے لوگ جمع تھے — یاد کا ایک مبہم تار میرے دل میں گونجا، ماضی کی پہنائیوں سے گونجیں آئیں۔ میں نے اس منظر کو پہلے کہیں دیکھا تھا۔ میرے پاؤں پھاٹک کے باہر گم ہو کر رہ گئے۔

اندر چبوترے پر کئی لوگ جمع تھے۔ بعض رو رہے تھے۔ میت کے پاس ایک لمبا معمر سفید ریش شخص کھڑا تھا اور لوگ اس کے پاس آ کر اظہار افسوس کر رہے تھے — ہر ایک چیز مجھے آشنا سی لگی اور میں مسحور ہو کر دیکھنے لگا۔

اسی وقت میں نے اپنے سامنے — اتنا نزدیک کہ میں اس کو بازو سے پکڑ کر اٹھا سکتا تھا — ایک سیب سے گالوں والا لڑکا دیکھا۔ وہ ایک سلما ستاروں سے کاڑھی ہوئی قدرے مدھم گول ٹوپی پہنے تھا۔ اس کے پاؤں میں براؤن اونچی ٹو والے بوٹ تھے۔ وہ ایک موٹے فربہ چہرے والی عورت کی انگلی پکڑے، حیرت سے بڑی بڑی آنکھوں کے ساتھ سامنے چبوترے پر رکھی میت کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ فربہ چہرے والی عورت کی قمیص پکڑ کر اس کے ساتھ دبک گیا اور اس کی طرف نظریں اٹھا کر ایک بھاری پنجابی لہجے میں بولا، ''اماں، ایہہ کی ہو گیا اے؟''

بوڑھی عورت اپنے ہونٹوں میں سے بڑبڑائی، ''کاکا! آغا صاحب دی بیگم جو آپاں نوں کھنڈ کھلاندی ہوندی سی نا، اوہ فوت ہو گئی اے۔'' اور پھر وہ نیچے جھکی، چھوٹے خوبصورت بچے کی ناک صاف کرنے کے لیے جو اس کے منھ تک بہہ آئی تھی۔

اس کے بعد وہ فربہ عورت چھوٹے بچے کو ساتھ کھینچتی ہوئی پھاٹک میں سے اندر لے گئی۔

یہ میری زندگی کا سب سے عجیب واقعہ ہے، اگرچہ بہت سے اس کا یقین نہیں کریں گے۔

کاریز

گل خان مستونگ بڑے کے قصبے کا پٹھان تھا۔ عمر کوئی چالیس پینتالیس کے پیٹے میں، دراز قد، تنگ پیشانی، سر گھٹا ہوا، چھوٹی خشمناک آنکھیں جو کسی اندرونی آگ سے جلتی معلوم ہوتی تھیں۔ اس کا دہانہ چوڑا تھا اور جب وہ ہنستا تو اس کی ہنسی ہمیشہ بے مسرت اور جلی بجھی ہوتی۔ اس کی پیشانی کی سلوٹیں یہ تاثر دیتیں جیسے اس کے دماغ میں کوئی بھید چھپا ہوا ہے۔ اس کا مزاج عموماً برہم اور بگڑا ہوا رہتا تھا۔ پچھلے دو سال سے وہ پی ڈبلیو ڈی کے ایک ٹھیکیدار جلال کے پاس ملازم تھا۔ جلال اور چند دوسرے ٹھیکیدار کوئٹہ کو پانی مہیا کرنے کے لیے کاریزوں کا سسٹم تیار کر رہے تھے۔ کاریز بنانا کان کنی کی طرح بڑی جفاکشی کا کام ہے۔ ٹھیکیداروں کو مزدوروں کی بڑی دقت تھی۔ کاریز کھودنے والے ان کے پاس آتے، ایک آدھ ماہ زمین کے پیٹ میں چوہوں کی طرح سوراخ کرتے کرتے ان کی کمر ٹوٹ جاتی اور پھر وہ کسی آسان و آرام دہ روزگار کی تلاش میں چل دیتے۔ مزدوری کے عام نرخ کے مقابلے میں ٹھیکیدار ان کاریز کھودنے والوں کو اچھی خاصی اجرت دیتے، مگر کام کافی غیر دلچسپ، جان لیوا اور ہمت شکن تھا، اور مزدور زیادہ مدت نہ ٹکتے۔

جلال گل خان کی کم سخنی اور خشک مزاجی کے باوجود اس پر کافی مہربان تھا کیونکہ حقیقت یہ تھی کہ گل خان میں مزدوروں کو ڈھونڈنے اور ان سے پورا پورا کام لے سکنے کی کافی قابلیت تھی۔ اس کا ٹھیکیدار اس کی موجودگی میں کام کی رفتار کی طرف سے مطمئن رہتا۔ اس کی جان پل پل کی نگرانی اور مزدوروں کی دستیابی کی بک بک سے آرام میں رہتی اور وہ بغیر اس ڈر کے کہ کام اس کی غیر موجودگی میں رک جائے گا، ادھر ادھر اپنے دوسرے کاموں پر آ جا سکتا۔ گل خان کے مفید ہونے میں کوئی شبہ نہ تھا لیکن اس کے اپنے ہنسوڑ، خوش دل ٹھیکیدار سے تعلقات ایک مالک اور ملازم کے عام تعلقات تک ہی محدود رہے۔ وہ کبھی کسی ہنسی مذاق میں اکٹھے شریک نہ ہوئے، کیونکہ گل خان کو کھل کر ہنسنا

آتا ہی نہ تھا۔ اس میں ایک مضطرب سی گھٹن تھی۔ جلال ایک رنگین مزاج، زندہ دل پٹھان تھا، دل لگی اور کھیل تماشے کا شوقین۔ اور اگر گل خان کی طبیعت ذرا مختلف ہوتی تو اس میں شک نہیں کہ جلال اس کے ساتھ ایک ملازم کی بجائے بھائی کا سا سلوک کرتا اور اپنے دوسرے کام بھی اسے سونپ دیتا۔

ایک شام گل خان ٹھیکیدار کے مکان پر حسب معمول اپنے پچھلے دو تین روز کے کام کی روئیداد دینے اور اس سے ہدایات لینے کے لیے آیا تو اس نے جلال کے پاس غالیچے پر ایک چھوٹے قد اور کالے پٹے دار بالوں والے نوجوان کو بیٹھے ہوئے دیکھا۔ وہ دونوں کسی بات پر قہقہے لگا کر ہنس رہے تھے اور ایک بار تو گول مٹول جلال مارے ہنسی کے لوٹن کبوتر بن گیا اور اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ نوجوان ملیشیا کی قمیص شلوار پہنے تھا، اور یوں اس کی حیثیت ٹھیکیدار کے منہ لگنے کی نہیں تھی مگر اس کا مسخرا اور قدرے زنانہ انداز گفتگو ٹھیکیدار کو اتنا پر لطف اور مزے کا لگا کہ وہ ہنسی سے بے حال ہو گیا۔ گل خان دس پندرہ منٹ کھڑا رہا اور ٹھیکیدار نے اس کی طرف بالکل دھیان نہ دیا۔ جب نوجوان کی باتوں میں کچھ توقف ہوا تو ٹھیکیدار نے آنکھ اٹھائی اور اپنے فورمین سے پوچھا، "آؤ بھئی گل خان! کیا خبر ہے؟" گل خان رو کھے پھیکے لہجے میں معمول کی خبریں سنانے لگا، مگر اس کام کے متعلق ٹھیکیدار نے اسے بیچ میں ٹوکا۔ "ہاں بھئی گل خان! اس نوجوان قربان خان کا نام بھی کاریز پر کام کرنے والے مزدوروں میں شامل کر لو۔ کہتا تو ہے کہ میں پہلے یہ کام کرتا رہا ہوں، واللہ اعلم بالصواب! اور کچھ نہیں تو اپنے لطیفوں اور چٹکلوں سے مزدوروں کا دل خوش رکھا کرے گا اور وہ کام سے اتنی جلدی اکتا کر ہمیں نہیں چھوڑ جایا کریں گے۔ ایسے آدمی کی ہمیں ضرورت ہے۔" اس نے گل خان کی طرف دیکھا۔ گل خان نے یوں محسوس کیا جیسے ٹھیکیدار اسے مزدوروں کے چھوڑ جانے کا ذمے دار ٹھہرا رہا ہو۔ اس کا کھرا چہرہ اندرونی غصے سے سیاہ ہو گیا۔ ایسی بات پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ گل خان ہی اپنی مرضی سے آدمی منتخب کرتا اور رکھتا تھا اور سب کاریز کھودنے والے اسی کے توسط سے مزدوری پر لگتے تھے۔ یہ زنخا اس کے اوپر ہی اوپر جلال سے ملازمت حاصل کرنے میں کیسے کامیاب ہو گیا؟ یہ بات گل خان کو بالکل پسند نہ آئی اور وہ نوجوان قربان خان کے رکھے جانے کو اپنی معتبری اور چودھراہٹ کے لیے خطرہ پا کر دل ہی دل میں پیچ و تاب کھانے لگا۔

آخر گل خان نے قربان خان کی آنکھوں سے نظریں بچاتے ہوئے کہا، "ملک! نفری سب کام پر لگی ہے۔ ابھی کوئی جگہ خالی نہیں جہاں اس کو لگایا جائے۔"

ٹھیکیدار نے کہا، "تم اس کا نام تو کاریز والوں میں آج سے شامل کر لو۔ یہ پڑھا لکھا بھی ہے اور بلوں کی برآمدگی کے لیے دفتروں میں بھی بھاگ دوڑ کر سکے گا۔ اور اسامیاں تو خالی ہوتی ہی رہتی ہیں۔"

اب گل خان کے پاس سوائے ٹھیکیدار کے حکم کی تعمیل کرنے کے اور کوئی چارہ نہ رہا، لیکن اندر ہی اندر وہ جلتا بھنتا کباب تھا! "آؤ بھئی میرے ساتھ!" گل خان نے کہا۔

"آج نہیں،" ٹھیکیدار نے کہا "یہ کل کام پر حاضر ہو جائے گا۔ تم کیمپ میں اس کے ٹھہرنے کا انتظام کر دو — ہاں بھئی قربان! پھر وہ اپنی مشنری کی مرغیوں کو ٹیکے لگنے کا حال سناؤ۔ ہاہاہاہا۔"

اس طرح پہلی ہی ملاقات سے گل خان کے سینے میں نو وارد کے خلاف کینے اور نفرت کا زہر پرورش پانے لگا۔ جب قربان خان دوسرے دن کاڑھی ہوئی واسکٹ پہنے مزے مزے سے ٹہلتا، کام شروع ہو چکنے کے ڈھائی گھنٹے بعد اس کے پاس حاضری دینے آیا تو اس زہر میں کمی نہ ہوئی۔ نئے چھوٹے آدمی کا سارا انداز ہی یہ کہہ رہا تھا کہ اسے فورمین جیسوں کی کوئی پروا نہیں۔ اس نے کچھ کہے بغیر اپنی جرأت سے فورمین کو یہ ذہن نشین کرا دیا کہ وہ ٹھیکیدار کا اپنا آدمی ہے اور فورمین اس کا بال بھی بیکا نہیں کر سکتا۔ اپنے اندر کھولتے ہوئے لاوے کو قابو کرتے ہوئے گل خان نے بظاہر سکون سے کہا، "قربان خان! تم ڈھائی گھنٹے دیر سے آئے ہو۔ پورے ساڑھے سات بجے یہاں حاضری ہوتی ہے اور آٹھ بجے تک سب کا ریڈی لیبر اپنے ٹھکانے پر پہنچ جاتی ہے۔ اب میں تمھیں کیا کروں؟"

قربان خان نے خیمے میں اسٹول پر بیٹھتے اور مٹھی میں سے سگریٹ کا کش کھینچتے ہوئے کہا، "مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ حاضری کا وقت ساڑھے سات ہے۔ ٹھیکیدار صاحب نے بتایا ہی نہیں۔ میں اصل میں ان کے ایک ذاتی کام پر چلا گیا تھا اور یہ واہیات بس بڑی دیر لگا دیتی ہے۔"

"تو اب تمھارا کیا کروں؟"

"اگر کام نہیں ہے تو میں یہاں بیٹھ کر سگریٹ پینے کے سوا اور کیا کر سکتا ہوں! اوہ، کیا غضب کی سردی ہے۔ فورمین صاحب، یار تم نے یہاں چائے وغیرہ کا بھی کچھ انتظام نہیں کر رکھا۔"

"یہ ایک لیبر کیمپ ہے، ہوٹل نہیں،" گل خان نے دانت پیس کر کہا۔

"میں نے مستونگ میں کام کیا ہے۔ وہاں لیبر کیمپ میں کام کرنے والوں کے لیے باقاعدہ دن میں دو تین بار چائے بنتی تھی۔ ان چھوٹی چھوٹی سہولتوں سے لیبر زیادہ دل لگا کر کام کرتی ہے۔"

"ہم مزدوروں کی خاطر نہیں کرتے، ان سے کام لیتے ہیں۔"

"میں ٹھیکیدار صاحب سے کہوں گا کہ یہاں کیمپ میں چائے کا انتظام ہونا چاہیے۔ فورمین صاحب، آپ نے رول پر میرا نام درج کر لیا ہے؟"

"ہوں! کرلیا ہے۔ تم کو کاریز کے کام کا کچھ تجربہ ہے؟"
"میں نے دس پندرہ دن مستونگ میں یہ کام کیا ہے۔ لیکن مجھے زیادہ تجربہ پائپ لائن بچھانے کا ہے۔ میں نے دو سال سوئی گیس والوں کے ساتھ کام کیا ہے۔"
"تم یہاں دو دن بھی نہیں چلو گے۔ ہر کسی کا کام نہیں۔ تمھارے نرم نرم ہاتھ پاؤں..."
"لوگ پہلے اسی طرح دھوکا کھا جاتے ہیں!" قربان خان مسکرایا۔ "کئی ایک کو بعد میں پچھتانا پڑا۔ فورمین صاحب، میرے ساتھ ذرا پنجہ پکڑنے کی زور آزمائی کر دیکھو۔"
قربان خان وہاں کچھ دیر بیٹھا اور پھر فورمین کو رکھا اور غیر دلچسپ پا کر اٹھ کھڑا ہوا۔ "اچھا فورمین صاحب! میں علاقے میں گھوم گھام کر کام کو دیکھتا ہوں۔ اور ضرورت پڑی تو کسی کاریز میں اپنے تھکے ہوئے ساتھی کا ہاتھ بھی بٹا دوں گا۔ یہاں تو کچھ کام ہے نہیں۔ کل میں پورے ساڑھے سات آپ کو رپورٹ کر دوں گا۔" اور وہ سیٹی بجاتا اور کوئی قبائلی لے گاتا سامنے سرخ ننگی چٹان کے دامن میں لگی ہوئی چھولداری کی طرف چل دیا۔
دنوں کے گذرنے کے ساتھ گل خان کا باطنی زہر اور زیادہ کھلتا اور پکتا گیا۔ قربان ہمیشہ اپنے وقت پر پہنچتا، نہ ایک منٹ پہلے نہ ایک منٹ بعد۔ وہ ہمیشہ مسکراتا اور سیٹی بجاتا ہوا آتا۔ اس کی زبان کتر کتر چلتی اور وہ ہر ایک سے مذاق اور دل لگی کی باتیں کرتا۔ اس کی یہ خوش طبعی فورمین کو بے حد جھنجھلا دیتی اور بیخ پا کر دیتی اور وہ جلتا بھنتا رہ جاتا۔ قربان اپنی زندہ دلی اور یار باشی سے ساری لیبر میں ہر دل عزیز ہو گیا، اور وہ ایک اچھا مستقل کام کرنے والا تھا۔ اس کے کام کے بارے میں فورمین کو یہ تسلیم کرنا پڑا کہ وہ اول نمبر ہے لیکن اس بات نے گل خان کے حسد اور نفرت کے جذبات کو اور زیادہ شدید کر دیا۔ اس کے سینے میں لاوا سلگتا رہا، ابل کر اوپر آنے کے لیے رستہ ڈھونڈتا ہوا، اور گل خان موقعے کی تاک میں رہا۔
چھوٹی چھوٹی باتوں، چھوٹے چھوٹے واقعات نے اس باہمی دشمنی کو اور زیادہ ہوا دی۔ ایک ہی کیمپ اور ایک ہی شہر میں ہونے کی وجہ سے وہ اکثر ایک دوسرے کا راستہ کاٹتے رہے۔ مگر اب ان کے درمیان رسمی علیک سلیک بھی بالکل ختم ہو گئی۔ قربان نے فورمین کے احساسات اور اس کی ناپسندیدگی کو بھانپ لیا تھا — اور کیسے نہ بھانپتا۔ وہ بھی اب اس ناپسندیدگی کو اپنے دشمن پر الٹنے لگا۔ اس کے طریقے البتہ مختلف تھے اور بہت موثر۔ جب وہ کیمپ میں یا کسی کیفے میں اپنے ساتھیوں میں مل کر بیٹھا ہوتا اور فورمین ادھر آ نکلتا تو قربان کی زبان کچھ زیادہ ہی چہکنے لگتی۔ اس کے قہقہے اور اونچے ہو جاتے، اور وہ خاص طور پر فورمین کو چڑانے کے لیے اس کی طرف دیکھے بغیر سیٹی بجاتا اور

فحش لطیفے سناتا۔ گل خان یہ جانتے ہوئے کہ زنخا یہ حرکتیں اسے اشتعال دلانے کے لیے کر رہا ہے، بے حد تلملاتا۔ وہ اپنے طیش کو بڑے صبر سے پی جاتا اور اس کے بڑے کھردرے ہاتھ اس بانونی مسخرے زنانے آدمی کا گلا دباتے دباتے رہ جاتے۔ اس کا دل چاہتا کہ وہ اس احمقانہ چلتی ہوئی زبان اور اس کی ہنسی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دے۔ وہ اس زنخے نوجوان کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکتا تھا۔ یہ گل خان جانتا تھا کہ یہ مسخرا زنخا ٹھیکیدار کے منھ چڑھا ہوا ہے اور اس کی صحبت، اس کی نقالی، اس کے چٹکلے، بھسوڑ موٹے جلال خان کو بڑے اچھے لگتے ہیں۔ قربان ملک جلال کے لڑنے والے بٹیروں کی بھی رکھوالی کرتا اور ان کو دوائی کھلاتا، اور ایک کام تو اس نے واقعی اپنے مالک کے لیے ایسا کیا جو کوئی اور نہ کر سکتا تھا۔ ملک جلال کے ایک دو بل پی ڈبلیو ڈی والوں کے پاس پھنسے ہوئے تھے اور ایک سال سے ان کی ادائیگی میں رکاوٹ ہو رہی تھی۔ قربان کو پتا چلا تو اس نے پی ڈبلیو ڈی کے مقامی دفتر کے تین چار چکر کاٹے۔ وہاں اپنی ہنسی اور شگفتہ باتوں سے اوورسیروں، کلرکوں اور خود بڑے افسر کو دنوں میں ایسا رام کیا کہ کام کی پیمائش بھی ہو گئی، اعتراضات بھی دور ہو گئے، ایک دن میں بل بھی پاس ہو گئے اور بڑے افسر نے پندرہ ہزار چھ کا چیک کاٹ کر قربان خان کے حوالے کیا۔ جب قربان یہ چیک ملک جلال کے پاس لے کر پہنچا تو ٹھیکیدار کو یقین نہ آیا۔ اس نے اس ادائیگی سے کبھی کے ہاتھ دھو لیے تھے۔ جلال ایک فراخ دل شخص تھا۔ اس نے قربان کو چیک بھنانے کے بعد پانچ سو کی رقم بطور انعام دی اور اس کی نگاہ میں قربان کی قدر و منزلت اور زیادہ ہو گئی۔

گل خان نے سنا تو اس نے اپنے منھ کے کونے سے ایک جلے ہوئے سازشی انداز میں اپنے پاس بیٹھے مزدوروں سے کہا، ''میں جانتا ہوں، بڑے صاحب نے چیک اتنی جلدی کیوں دے دیا۔ اسے وہ عادت ہے۔ ہر کوئی جانتا ہے۔ اور یہ زنخا قربان اس معاملے میں بڑا مہربان ہے۔ تم نے اس ذوس کا جسم نہیں دیکھا — ہاہاہا۔''

مگر اس کے سننے والوں کو فور مین کی یہ جلتی دہکتی ہوئی چوٹ بری لگی۔ نہ وہ اس پر خوش ہوئے اور نہ ہنسے۔ ان میں سے ایک نے کہا، ''آپ کو کس نے بتایا؟ قربان خان کو تو یہ عادت نہیں۔ وہ شہر میں رنڈی کے پاس جاتا ہے۔''

گل خان کی بارحیں اسی طرح ہمیشہ الٹی پڑتی تھیں، اور اس کا زہر خند کسی دوسری روح کے ساتھ کبھی کوئی ربط نہ پیدا کرتا۔ یہ ایک وجہ تھی، اور کافی اہم، جس نے اسے ایک اکیلا بھیڑیا بنا دیا تھا۔

اس کی یہ حاسدانہ بات قربان تک پہنچی تو وہ زور سے ہنسا۔ اس نے کہا، ''میں نہیں جانتا کہ فور مین کو مجھ سے اوّل روز سے کیا بیر ہے۔ مگر کبھی وہ دو ہاتھ کر کے میں اسے بتا دوں گا کہ ہم میں

سے زنخا کون ہے۔"

پھر ایک ایسا واقعہ ہوا کہ ان دو آدمیوں کی باہمی تنی عروج پر پہنچ گئی۔ اس کی وجہ ایک بازاری عورت تھی۔ وہ زاہدان سے پرے کی ایک خانہ بدوش تھی — چمپئی رنگت، نیلی آنکھیں اور چوڑا ابھرواں ڈیل ڈول۔ اس کی عمر کوئی پینتیس سال تھی اور وہ اتنی خوبصورت بھی نہ تھی، مگر اس کے کولھے بہت صحت مند اور گول تھے۔ پہاڑیوں سے آئے ہوئے ادھیڑ عمر کے ملک اس میں ایک ناقابل مزاحمت جنسی کشش پاتے۔ وہ گل آفتابی کے نام سے مشہور تھی۔

گل خان اور وہ کوئٹہ میں ایک ہی وقت آئے۔ پچیس سالہ گل خان اپنے گاؤں سے، بھنے ہوئے اناج کا بقچہ لاٹھی پر باندھے، شہر میں مزدوری کرنے کے لیے آرہا تھا کہ وہ ایرانی خانہ بدوشوں کے ایک قافلے سے آن ملا۔ وہ لوگ، کچھ خچروں اور گدھوں پر، اور کچھ پاپیادہ، کوئٹہ کی طرف جارہے تھے۔ چونکہ منزل ایک ہی تھی، گل خان بھی ان میں شامل ہوگیا اور دو دن کی مسافت میں گل آفتابی کے خاندان سے اس کی اچھی خاصی راہ و رسم ہوگئی۔ خانہ بدوش کوئٹہ میں دو تین ماہ رہے۔ گل خان ان کے پاس ہمیشہ آتا جاتا رہا۔ آفتابی گل خان کے دل و دماغ پر چھاگئی اور ان کا آپس میں دوستانہ ہوگیا۔ آفتابی کے باپ — ایک لمبے، مونچھیل، بالیاں پہنے ہوئے خانہ بدوش — نے اپنی بیٹی کو بیچنے کی پیش کش کی، لیکن گل خان کے پاس پھوٹی کوڑی نہ تھی۔ جب وہ خانہ بدوش چلے گئے تو گل آفتابی پیچھے بازار کی زینت بن کر رہ گئی۔ گل خان ہمیشہ اس کے پاس آتا جاتا۔ اس کے لیے تحائف اور کپڑے خریدتا۔ اس پر دل کھول کر خرچ کرتا۔ اس نے اسے اپنی بچت میں سے پورے تین تولے سونے کے جڑاؤ کنگن اور ایک پشواز بھی بنوا کر دی۔ اتنی مدت کے تعلق کی بدولت وہ ایک طرح آفتابی کو اپنی بیوی سمجھنے لگا۔ اس کے پیشے سے اسے کوئی تعرض نہ تھا۔ نہ ہی کبھی اس نے آفتابی کو بازار چھوڑنے اور اپنے ساتھ رہنے کے لیے کہا۔ جب اسے تسکین حاصل کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی تو وہ آفتابی ہی کے پاس جاتا۔ اور وہ بھی دوسرے گاہکوں کو چھوڑ کر اس کا اپنے مرد کی طرح سے سواگت کرتی۔

ایک شام گل خان کام سے فارغ ہونے کے بعد ایک اکیلے سلگتے بھیڑیے کی طرح اس علاقے میں آفتابی کی 'دکان' کی سمت جارہا تھا کہ اس نے قربان کو اپنے ساتھیوں کے جھرمٹ میں ہنستے اور مذاق کرتے اور اکڑ اکڑ کر چلتے دیکھا۔ انھوں نے کاڑھی ہوئی رنگ دار فیتوں والی واسکٹیں پہن رکھی تھیں۔ ان کے گلوں میں چنبیلی کے ہار اور بالوں میں پھول تھے۔ قربان خان کے ہاتھ میں ٹھیکیدار کے بٹیروں کا پنجرہ تھا۔ یہ نوجوان ٹولا کسی عورت کے سامنے رکتا، اس پر پرلطف آوازے

کتا، بھاؤں بھاؤں کرتا اور آگے گذر جاتا۔ گل خان نے اپنے منھ کو وقت کے کارڈ میں چھپاتے ہوئے ایک گالی دی۔ ''زنخے کو ٹھیکیدار نے جو رقم دی ہے اس کے پیچھے اڑا رہا ہے۔'' وہ نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے دیکھیں، اور وہ ان سے کئی قدم پیچھے رہا۔ آخر گل خان نے انھیں آفتابی کی دکان کے سامنے رکتے دیکھا۔ وہ ہنستے، ناچتے، تالیاں بجاتے رہے۔ گل خان کے سینے پر سانپ لوٹ گیا۔ ''زنخا خبیث زنخا!'' گل آفتابی بھی تو زنانے کی عورت تھی۔ وہ بھی باہر آ گئی۔ پھر قربان نے کوئی ایسی بات کی کہ آفتابی ہنستے ہنستے دوہری ہو گئی۔ گل خان نے اپنی داشتہ کو زنخے کے مذاق پر ہنسنا پسند نہ کیا اور اس کی مٹھیاں غصے سے بھنچ گئیں۔ گل آفتابی نے ہنستے ہنستے قربان کو بازو سے پکڑ لیا اور اسے اندر کھینچ لی۔ ''آؤ آؤ خان، میرے پاس رہو۔'' اور قربان اپنے ساتھیوں کے نعروں میں واقعی اپنے بھیڑوں کا پنجرہ اٹھائے اندر چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد قربان نے بند دروازے میں چھپتے ہوئے منھ سے باہر جھانکا۔ ''دوستو، میرا انتظار نہ کرو۔ گل آفتابی جان مجھے ساری رات یہاں رکھنا چاہتی ہے!''

ایک بے کس زہریلے غصے سے کانپتے ہوئے گل خان نے یہ منظر دیکھا۔ اس کی محبوبہ اور اس کے دشمن کو رات بھر کے لیے اپنے پاس رکھے! گل آفتابی، گندی عورت نے اس سے — گل خان سے — کبھی جھوٹے منھ بھی یہ فرمائش نہ کی تھی کہ وہ اس کے پاس ساری رات رہے۔ زیادہ سے زیادہ دیر جو وہ اس کے پاس رہا آدھ گھنٹہ تھا، کیونکہ اس کے گاہک ہمیشہ انتظار کرتے رہتے تھے۔ زہر والیف کس میں گھلتا وہ تھوڑی دیر کے بعد وہاں سے لوٹا۔ مگر گل خان کے لیے اس رات اور آنے والی راتوں میں کوئی نیند نہ تھی۔

اس سے تین چار روز بعد قربان خان حاضری لگوا کر کام پر گیا اور پھر تھوڑی دیر بعد کیمپ کے خیمے میں لوٹ آیا۔ گل خان اسٹول پر بیٹھا حاضری کے رول کو دیکھ رہا تھا، ''فورمین'' قربان خان نے کہا، ''یہ کیا مذاق ہے؟ آپ نے مجھے بتایا کیوں نہیں۔ میں آدھ میل چل کر اپنے کاریز پر پہنچا۔ وہاں میرے مددگار کا نام و نشان نہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اکیلا آدمی کاریز نہیں کھود سکتا۔''

''بشتم خان وہاں نہیں پہنچا؟'' گل خان نے رول لپیٹتے ہوئے بظاہر حیرانی سے پوچھا۔

''نہیں۔ کیا اس کی حاضری لگی ہے؟''

''نہیں، اس کی حاضری نہیں لگی۔ بھئی قربان خان، مجھے بڑا افسوس ہے۔ اس کا مجھے خیال ہی نہیں آیا کہ بشتم خان آج نہیں آئے گا۔ کل ہی اس نے مجھے بتایا تھا کہ اس کی والدہ سخت بیمار ہے اور وہ گاؤں جا رہا ہے۔''

''خیر، تو میں اکیلے کاریز کھودنے سے رہا۔ اگر ہشتم آج نہیں آ رہا تھا تو آپ کو اس کی جگہ اور آدمی کا انتظام کرنا لازم تھا۔ آج کا کام گیا۔''

''کیوں؟ — اچھا قربان خان،'' گل خان نے کہا، ''مجھے آج نگرانی کا تھوڑا کام ہے۔ میں چل کر تمھارے ساتھ کاریز پر کام کرتا ہوں۔''

''تم، فورمین؟''

''کیوں نہیں؟ کام نہیں رکنا چاہیے۔ ایک آدمی کی مزدوری کیوں ضائع جائے؟ اور محکمے والوں نے ہمیں اکیس تک کام مکمل کر دینے کا نوٹس دے رکھا ہے۔''

دونوں آدمی رسا اور تیشے اور بیلچے اٹھائے سامنے کے گلابی پہاڑ کی طرف چل دیے۔ اس کے دامن میں ایک آدھ مربع میل کا چٹانی سنگلاخ چٹیل میدان سا تھا جس میں دو دو مزدوروں پر مشتمل پانچ ٹولیاں پانچ مختلف کاریزوں پر کام کر رہی تھیں۔ ہوا میں خشک سردی کی چٹکی تھی۔ مگر ایک نیلے رنگت کے آسمان سے سورج کی کرنیں بنجر پہاڑیوں کی سطح سے الٹ کر دن کو گرمانے لگی تھیں۔ فضا میں ایک چندھیا دینے والی دمک تھی۔ شمال کو پہاڑیوں کے تلے ایک اونچی سطح مرتفع پر چھاؤنی کی سرخ بیرکیں اونٹوں کی کوہانیں لگتی تھیں۔ راستے بھر انھیں سوائے ایک بوڑھے گڈریے کے اور کوئی نہ ملا۔ دو تین گدھ ایک مرے ہوئے گدھے کے پنجر کے آس پاس اچھل رہے تھے۔ وہ انھیں آتے دیکھ کر بالکل نہ ڈرے۔ دونوں آدمیوں نے پندرہ بیس منٹ کے راستے میں ایک آدھ بات کی، وہ بھی کاریزوں کا کام مکمل ہو جانے اور ملک جلال کے حج پر جانے کے متعلق — اپنے دلوں کی کیفیات کے بارے میں ایک بھی لفظ نہیں!

اس طرح وہ کاریز کی جگہ پر پہنچے۔ فورمین نے اپنے کپڑے اتارے۔ اس کا کسرتی جسم اب صرف انڈرویئر میں تھا۔ اس نے کہا کہ وہ پہلے نیچے جا کر کھدائی کرے گا۔ اس نے ٹھیکیدار کے پاس پہلے چھ مہینے کاریز پر کام کیا تھا۔ اس کے بعد ملک جلال نے اس کی دیانت داری اور سختی کو دیکھ کر اسے نگرانی پر رکھ لیا اور اس نے اس عرصے میں تیشے اور بیلچے کو ہاتھ نہیں لگایا تھا۔ آدمی کسی کام میں حاصل کی ہوئی مہارت جلد نہیں کھو دیتا اور گل خان کے کسے ہوئے پٹھوں میں اب بھی لوہے کی سختی تھی۔

بہت کم لوگ کاریزوں کے بارے میں جانتے ہوں گے، اور اکثر کے لیے یہ نام بالکل نیا ہوگا۔ بلوچستان کی برہنہ چٹانوں میں ہزاروں فٹ نیچے زمین دوز چشمے بہتے ہیں — چھوٹے دریا جو زمین کی سطح پر آنے کا راستہ نہیں پا سکتے۔ کاریز کنوؤں اور سرنگوں کا ایک سسٹم ہے جن کے ذریعے ان چشموں کا رخ بدل کر پانی باہر نکالتے ہیں۔ دو یا تین آدمیوں کی ٹولی ایک کاریز ہیڈ پر کام کرتی

ہے اور استعمال میں آنے والے اوزار بالکل سادہ ترین اور ابتدائی ہوتے ہیں — بیلچہ، تیشہ، ڈول، چرخی، ایک مضبوط رسا — بس انھیں اوزاروں سے یہ کٹھن اور پرمہارت کام پایہ تکمیل کو پہنچایا جاتا ہے۔ چٹانی چہرے کو بڑھانے اور چھیدنے والی کوئی مشین کام نہیں کرتی، نہ ہی آکسیجن مہیا کرنے کا بیلون یا سرنگ اڑانے کی بارود بروئے کار لائی جاتی ہے۔ خالی ماہر انسانی ہاتھ سب کام کرتے ہیں۔ ایک آدمی رسے سے بندھی چرخی کے پاس ضرورت پڑنے پر اسے گھمانے کے لیے ہر وقت چوکس کھڑا رہتا ہے۔ دوسرا رسے کے کھلے سرے کو اپنی کمر میں باندھ اور بیلچہ اور تیشہ اس میں اڑس کر نیچے کنویں میں اترتا ہے اور چٹانی زمین کی انتڑیوں میں کاٹتا اور کھودتا جاتا ہے۔ کھدائی کی مٹی ڈول کی مدد سے ساتھ ہی ساتھ اوپر کھینچ لی جاتی ہے۔ جوں جوں کھدائی ہوتی جاتی ہے، وہ چرخی والا آدمی چرخی کی مٹھیوں کو پکڑے روک روک کر رسا دیتا جاتا ہے تاکہ اس کے ساتھی کے پاؤں زمین پر ٹکے رہیں۔ وہ اتنا رسا دیتا ہے جتنا ضروری ہوتا ہے — نہ کم نہ زیادہ۔ تم جانو یہ کتنا بڑا پرمشقت اور صبر آزما کام ہے۔ کاریز کے کام کو دیکھنے ہی سے آدمی کی ہڈیوں میں خوف کی سنسناہٹ تیرنے لگتی ہے۔ ایک انسانی جسم ہوا اور روشنی سے دور زمین کے تاریک پیٹ میں چوہے کی طرح سوراخ کرتا ہوا اس کے تیشے کی ضربوں کی مدھم کٹ کٹ، قبر سے آتی ہوئی "ہاؤ!" کی پکار، اپنے ساتھی کو بتانے کے لیے کہ وہ ڈول کھینچ لے۔ کاریز کا منہ تنگ ہونے کی وجہ سے اندر ہوا گندی ہو جاتی ہے اور کھدائی کرنے والا وہاں دیر تک کام نہیں کر سکتا۔ پندرہ بیس منٹ کے بعد چرخی پر اس کا ساتھی اسے اوپر کھینچ لیتا ہے اور پھر تھوڑا سا سستانے کے بعد وہ اپنے اپنے کام ادل بدل لیتے ہیں۔ کھدائی کرنے والا آدمی چرخی سنبھال لیتا ہے اور وہ آدمی جو پہلے چرخی پر تھا، اپنے اوزار لیے نیچے اترتا ہے۔ اس طرح باری باری وہ کئی گھنٹے یہ ہولناک، اعصاب شکن کام کرتے ہیں۔ کاریز کا کام انتہائی خطرناک بھی ہو سکتا ہے۔ بعض دفعہ بند گندی ہوا میں کھدائی کرنے والے کا دم گھٹنے سے اسے غش آ سکتا ہے اور اگر اس کا ساتھی کچھ کاہل یا بے پروا ہے تو وہ اسے وقت پر اوپر کھینچنا بھول جاتا ہے۔ یہ بڑا ضروری ہے کہ چرخی والا آدمی پورا ہوشیار ہو اور اس کے کان ہمیشہ زمین پر لگے رہیں۔ ہر سال کاریز ایک آدمی کی جان ضرور لیتے ہیں۔ کاریز میں مستقل کام کرنے والے کے پھیپھڑے پتھریلی مٹی کے جم جانے سے بالآخر ایک ایسے موذی سل کا شکار ہو جاتے ہیں جس کا کوئی علاج نہیں۔

گل خان کمر کے گرد رسا باندھ کر نیچے اترا اور قربان چرخی کی مٹھی کو مضبوطی سے پکڑے اسے آہستہ آہستہ رسا دیتا جاتا۔ گل خان کی مدھم آواز آئی، "ہاؤ!" اس کے پاؤں نے اپنے تلے سخت زمین پالی تھی۔ وہ کھٹاکھٹ اپنا کام کرنے لگا۔ اب قربان کو کچھ دیر چرخی پر رہنے کی ضرورت نہ تھی

اور وہ دھوپ میں بیٹھ کر سیٹی بجانے اور کوئی قبائلی سر گانے لگا۔ اس نے اپنی قمیص کی جیب سے ڈبی نکال کر کلے میں نسوار چڑھائی۔ ''فورمین سخت جان ضرور ہے۔'' اس نے سوچا۔ اور پھر اس نے اپنے دشمن کے بارے میں مزید کچھ خیال نہ کیا۔ دوسری زیادہ خوشگوار باتیں، زیادہ رنگین احساسات اس کے دماغ کو اپنی آماجگاہ بنانے لگے۔ سب گڈمڈ — بیلے سے اس کی ماں کا پوسٹ کارڈ جس میں اس نے اس کی چھوٹی بہن درخشاں کے بیاہ کی تاریخ لکھی تھی اور اسے تاکید کی تھی کہ وہ آتے ہوئے چاندی کے کنگن اور تحفے اور کوئی اچھا جوڑا ضرور لائے؛ ٹھیکیدار ملک جلال کے بیل جو کچھ کمزور پڑ گئے تھے اور جنھیں اسے مستونگ میں تعویذ لینے کے لیے ایک پیر کے پاس لے جانا تھا؛ وہ رات جو اس نے گل آفتابی کی گرم آغوش میں گذاری تھی۔ مرد کو خوش کرنے کے سب گروں سے وہ عورت واقف تھی — وہ اپنے آپ ہنسنے لگا۔

نیچے سے آواز آئی، ''ہاؤ!'' قربان نے اٹھ کر کھودی ہوئی مٹی کا ڈول کھینچا اور چرخی سے پکھ رسا اور فورمین کو دیا۔ پھر وہ بیٹھ کر خواب دیکھنے لگا۔ فورمین کی کھٹاکھٹ اب پہلے کی طرح مضبوط نہ تھی اور تھوڑی دیر کے بعد اس نے ظاہر کیا کہ اسے باہر کھینچ لیا جائے۔ ''فورمین بہت جلد چور ہو گیا ہے۔'' قربان نے فخر سے سوچا۔ ''میں اس سے دگنا وقت اندر کام کر سکتا ہوں۔ اس میں اتنی بڑی جان کے باوجود دم نہیں۔'' وہ چرخی گھما کر رسا کھینچنے لگا اور چار پانچ منٹ کے بعد فورمین باہر نکل آیا — سر اور سارا بدن مٹی سے اٹا ہوا، جیسے بھبھوت مل رکھا ہو۔

قربان خان کو ہنسی آ گئی۔

''تم ہنسے کیوں؟'' گل خان نے پوچھا۔

''کچھ نہیں — تم جلدی چور ہو گئے، صرف دس منٹ میں۔''

''مجھے مشق نہیں رہی۔ میں دیکھوں گا تم کتنی دیر اندر رہتے ہو!''

وہ کچھ دیر ستانے اور باتیں کرنے کے لیے بیٹھ گئے۔ قربان خان نے گل خان کو نسوار کی ایک چٹکی پیش کی، اور پھر وہ سیٹی بجاتا اپنے کپڑے اتارنے لگا۔ اس کا جسم نرم اور سفید اور سڈول تھا — ایک عورت کے جسم کی طرح۔ گل خان نے دانت پیسے۔ ''زنخا!'' اس نے دل ہی دل میں کہا۔

جب وہ نیچے اترنے لگا تو ایک شک کا سایہ سا اس کے دودھ پیتے بچے کے سے مسخرے چہرے پر گذرا اور پھر زمین نے اسے ہڑپ کر لیا۔ گل خان چرخی گھما کر رسا دینے لگا، نسوار تھوکتا ہوا! اس کی آنکھوں اور چہرے پر ایک چمک تھی اور سارے انداز میں ایک کھچاؤ سا! جلد ہی نیچے سے کھٹاکھٹ کھٹاکھٹ کی آواز آنے لگی۔ ''زنخے کا ہاتھ مضبوط ہے،'' گل خان نے اقرار کیا۔ وہ بیٹھا

نہیں، بلکہ اسی طرح چرخی کی ہتھی پر ہاتھ رکھے کھڑا رہا۔ اس کے سینے میں بھی کھٹاکھٹ کی سی آواز تھی اور کوئی چیز اس کے اندر سے اوپر حلق تک آتی معلوم ہوتی تھی۔ اس نے تھوک نگلا۔ پھر اس کے چہرے پر ایک بے حسی سی جم گئی۔ ہتھیوں پر ہاتھ تھوڑے تھوڑے کانپنے لگے جیسے ان میں چیونٹیاں رینگ رہی ہوں۔ اس کے موٹے حیوانی دماغ میں وہ سارے منظر آئے جہاں اس کے دشمن زرتخے کے ہاتھوں اس کی ہتک ہوئی تھی۔ اس کا خون کھولنے لگا۔

''باؤ!''

گل خان نے ڈول اوپر کھینچا اور پھر تشنج کی کیفیت میں چرخی کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ سورج اب کافی چڑھ آیا تھا۔ فضا چاقو کے پھل کی طرح صاف اور نکھری ہوئی تھی اور وہ ایک تنہا بیابان میں پر تھے۔ فاصلے پر صرف گدھ اپنے مردار کے پاس گھوم رہے تھے۔

''باؤ!''

گل خان نے ایک اور ڈول کھولا۔ قربان کی کھٹاکھٹ اٹھی جو رک گئی تھی۔ گل خان جانتا تھا کہ وہ اب جلد تھک جائے گا اور اوپر کھینچے جانے کے لیے پکارے گا۔ نیچے ہوا بڑی گندی اور دم گھونٹنے والی تھی اور سخت جفاکش آدمی بھی وہاں زیادہ دیر کام نہیں کر سکتا تھا۔ اپنی بے صبری اور اضطراب میں فورمین کو وقت ابد تک پھیلتا ہوا لگا۔

اب کھٹاکھٹ یقیناً آہستہ ہو چکی تھی۔ اور پھر قربان کی آواز اسے اوپر کھینچنے کے لیے آئی۔

گل خان کا ہاتھ چرخی کی ہتھی پر تھا۔ اس میں حرکت نہ ہوئی۔

''باؤ! فورمین — باؤ، باؤ! — کھینچ لو!''

فورمین کا ہاتھ اسی طرح ساکن اور غیر متحرک ہتھی پر جما رہا۔ اس کا چہرہ سیاہ تھا اور ایک شیطانی زہر خند اس کے چہرے کو لپیٹ میں لیے ہوئے تھا۔

''باؤ! باؤ — فورمین!''

پھر گل خان اپنا سخت، خشمناک چہرہ لٹکائے کنوئیں کے پاس آیا۔ اس نے کف بھر کر تھوکا۔

''ڈوس — زرتخے! اب تم ادھر ہی رہو گے۔''

''خدا اور رسول کے واسطے، گل خان!''

گل خان دیوانوں کی طرح ہنسا۔ اس کے دماغ سے شکوک اور خوف اب دور ہو چکے تھے۔ وہ اپنے دشمن کو اب اوپر نہیں کھینچے گا۔ ''اندر خوب اپنے مذاق کرو، زرتخے!''

''گل خان... خدا کے واسطے... میری بہن کی شادی...''

پھر کچھ گالیوں اور دھمکیوں کی آواز آئی، بالکل مدھم — پھر منتیں — اور پھر رونے کی آواز — پھر بہت مدھم ایک آدمی کے سانس کے لیے سسکنے کی آواز — پھر رسّے پر ایک زور کی کھینچ۔ چرخی پاگل پن سے گھومنے لگی۔ ایک آخری ''ہا!'' کی سی آواز آئی — قدرے اونچی — اور پھر آوازیں بند ہوگئیں۔

گل خان نے کیمپ سے چلتے یہ اپنا منصوبہ پوری طرح تیار کرلیا تھا اور ان کو کاریز کی طرف جاتے ہوئے کسی نے نہیں دیکھا تھا، سوائے ایک بوڑھے خبطی گڈریے کے جس سے کسی کے پوچھ گچھ کرنے کا کوئی امکان نہ تھا۔ کسی کو یہ خیال بھی نہ آئے گا کہ وہ — گل خان — قربان کے ساتھ کاریز کی کھدائی پر گیا ہوگا۔ قربان کو دوسرے مزدوروں نے اکیلا کاریز کی طرف جاتا ہوا دیکھا تھا اور جس وقت وہ دوسرے مزدور کے غیر موجود ہونے کی اطلاع دینے کے لیے لوٹا تھا۔ کیمپ میں سوائے فورمین کے اور کوئی نہ تھا۔ اس نے پھر بھی مزید احتیاط کے لیے کنوئیں کے اندر رسّے کو چاقو سے اس طریق سے کاٹ کر ریشے الگ الگ کیے جس سے رسّے کے ٹوٹنے کا گمان ہو۔ اس نے سب اوزار اسی طرح چھوڑے، خود کو جھاڑا پونچھا، کپڑے پہنے اور اپنے دشمن سے خاطر خواہ انتقام کی ٹھنڈک دل میں لیے ایک چکّر والا لمبا راستہ اختیار کرکے کیمپ کی سمت چل پڑا۔

مٹھی کا لائسنشیئٹ

جعفر کی سرشت میں ایک صوفیانہ پُراضطراب کیفیت تھی۔ اس کے والدین کھاتے پیتے، روایتی، دنیادار لوگ تھے اور اس کے باپ کی تمنا تھی کہ وہ ایم اے کرنے کے بعد آئی سی ایس کے امتحان میں بیٹھے اور کسی اعلیٰ عہدے پر اس کی تعیناتی ہو۔ جعفر اس پر ہنستا۔ عہدہ اور روپے پیسے کے لیے دوڑ دھوپ اسے بڑی بے مقصد اور بے رونق سی لگتی۔ یہ زندگی کا مقصد نہیں ہو سکتا۔ اس نے ایم اے کا امتحان بے دلی سے دیا۔ وہ جانتا تھا کہ اس کے پرچے اچھے نہیں ہوئے اور اس کا پاس ہونا غیر یقینی ہے۔ نتیجے کا انتظار کرنے کی بجائے، اور گھر والوں کو بتائے بغیر، اس نے سندھ کے محکمہ تعلیم کو ایک درخواست بھیجی۔ محکمہ تعلیم کو ضلع تھرپارکر میں گریجویٹ ٹیچر کی ضرورت تھی۔ درخواست دینے کے ایک ہفتے بعد ہی وہاں سے اپائنٹمنٹ لیٹر آ گیا۔ وہ ٹین کے ایک ٹرنک میں اپنے کپڑے رکھ کر چپکے سے گاڑی میں سوار ہو گیا اور روانگی کے تین دن بعد وہ مٹھی کے گاؤں کے ہائی اسکول میں انگلش ماسٹر تھا۔ ریتیلی پہاڑیوں میں پڑی یہ دوردراز کی جگہ اسے بڑی رومینٹک لگی۔ اپنی پہلی کلاس لیتے وقت وہ نروس اور خائف تھا، مگر اس کے شاگردوں نے خاموشی اور توجہ سے اس سے انگریزی نظم کی تشریح سنی۔ (یہ اسے بعد میں پتا چلا کہ ان کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔) جب وہ کلاس لے کر اسٹاف روم میں دوسرے ٹیچروں کے ساتھ جا بیٹھا تو اسے ایک گونہ خوشی اور سکون کا احساس ہوا۔ اسے گاؤں سے باہر ایک ریتیلی بلندی پر ایک چھوٹا سا کچا مکان مل گیا۔ کرایہ چھ روپے ماہوار، بالکل نام کا۔ اس مکان میں اس کے ساتھ ایک اور ٹیچر ویرجی بھی رہتا تھا۔

غالباً اپنے آنے کے پہلے ہی روز وہ اسکول کے کھیل کے بڑے میدان میں ڈاکٹر جگدیش چندر سے متعارف ہوا۔ اس کے ایک ساتھی ٹیچر نے ڈاکٹر سے اس کا تعارف کرایا۔ ڈاکٹر جگدیش

ایک اسسٹنٹ، اس حلقے کا میڈیکل افسر، سفید ڈک کی پتلون اور کھلے کالر کی قمیص میں ایک بوٹے سے قد کا پتلا، چکیلا، کالج سے نکلا ہوا نوجوان۔ اس کا سر بڑا گنبد نما تھا اور چہرے کے نقوش جاندار اور انٹیلیکچوئل ساخت میں ڈھلے ہوئے تھے۔ فراخ پیشانی، ابھری ہوئی کنپٹیاں، تنگ منہ، آلڈس ہکسلے کی جھلک مارتا ہوا چہرہ۔ چہرے کی رنگت سپید، سرخی مائل، صحت مند تھی۔ وہ سنہری کمانیوں کے بے گر شیشوں کے چشمے لگائے تھا اور اس کی وضع میں ایک بانکی بروقسم کا چھبیلا پن تھا۔

ڈاکٹر جگدیش نے پہلے پہل قدرے برتری کے انداز میں اس کے ہاتھ میں اپنا زنا۔ لمبا ڈھیلا ہاتھ دیا — اسے دوسرے بیچاروں کی طرح جانتے ہوئے اور اس لیے اپنے اسٹیٹس کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے۔ مگر پہلی ملاقات میں ان کا ایک دوسرے سے جیسے میل ہو گیا اور جلد ہی وہ گہرے دوست بن گئے۔ جعفر انگریزی کتابوں کا بڑا پڑھاکو تھا اور یہ لت ڈاکٹر جگدیش کو بھی تھی، اگرچہ ان کے مذاق بالکل ایک سے نہ تھے۔ وہ پہروں چائے کی پیالی پر ڈی ایچ لارنس، ہکسلے اور شا کی تحریروں کی باتیں کرتے — گو خاص اور اکی شعوری طریق سے نہیں، ان مشہور ناموں پر گھسے پٹے تعریفی لیبل چسپاں کرتے ہوئے۔ ڈاکٹر جگدیش کی الماریوں میں کئی سو کتابیں تھیں، اور اس نے بتایا کہ اتنی ہی اس کے بکسوں میں بند رکھی ہیں۔

"ماسٹر صاحب!" اس نے جعفر کو کہا۔ اتنی دوستی کے باوجود وہ اسے ہمیشہ اسی لقب سے مخاطب کرتا، جس طرح جعفر اسے ڈاکٹر کہتا، "میں ان کتابوں میں سے ایک کو بھی کھونے کا حوصلہ نہیں کرتا۔ میرا پرابلم ماسٹر صاحب، اپنی ایک جگہ سے دوسری جگہ ٹرانسفر کے وقت ان کتابوں کو بحفاظت پیک کرنا اور نئی جگہ پہنچانا ہوتا ہے۔ اس پر اچھے خاصے مصارف بھی آجاتے ہیں۔ پچھلی بار جب میری بدلی یہاں شہداد پور سے ہوئی تو مجھے نون کوٹ سے ان کتابوں کے بکس لادنے کے لیے دو اونٹ کرائے پر لینے پڑے۔"

جعفر اپنے دوست کے احساسات کو سمجھتا تھا۔ کتابوں کے عاشقوں کے لیے اپنی کسی کتاب کو — خواہ وہ کتنی ہی بیکار اور غیر اہم کیوں نہ ہو — پیچھے چھوڑ دینا یا کھو دینا بڑا اہم ہوتا ہے۔ کتابیں دنیا کے سفر میں ان کا سب سے بیش قیمت سامان ہوتی ہیں جن سے چپکے رہنا ان کی عادتِ ثانیہ بن جاتی ہے اور جن سے جدائی کا صدمہ دل میں برچھی کی طرح کچوکے مارتا ہے۔

جعفر ڈاکٹر کی لائبریری سے کئی کتابیں دیکھنے اور پڑھنے کے لیے لے جاتا۔ ان میں سے بیشتر کتابیں ڈاکٹر کی پڑھی ہوئی ہوتیں، جس کا ثبوت ان میں وافر سرخ پنسل کی لکیروں اور حاشیوں میں "ویری گڈ"، "خوب کہا ہے"، "یہ نان سنس ہے!" قسم کے جملوں میں موجود ہوتا۔ ڈاکٹر جگدیش

ہونے کے باوجود ان شوہروں میں سے تھا جو اپنی بیویوں پر صحیح معنوں میں فرمانروائی کرتے ہیں اور جن کے اشارے سے سرتابی نہیں ہو سکتی۔ ستمرا سچ مچ اپنے شوہر کی زرخرید غلام تھی اور جعفر نے دیکھی کہ وہ اس سے اسی طور کا سلوک کرتا ہے۔ بیچاری ستمرا سپید کھدر کی ساڑھی پہنے ہر وقت اپنے گھر کے کام کاج میں مصروف رہتی۔ اس نے ڈاکٹر کو ایک گل گوتھنا چھوٹا سا بچہ بھی دیا تھا، دو سال کا لڑکا، اور پھر بھی ڈاکٹر اس سے پوری طرح خوش نہ تھا۔ جتنی بار جعفر وہاں گیا، اس نے نوٹ کیا کہ اپنی بیوی سے بات کرتے ہوئے اس کے لہجے میں جھنجھلاہٹ اور چڑچڑے پن کی رمق آجاتی ہے، جیسے وہ بیوی کے بجائے گھر کی خادمہ ہو۔ اس کے لیے اپنی بیوی کی حیثیت بستر کی ساتھی اور اپنی کوکھ سے اپنی نسل کو جنم دینے والی سے زیادہ نہ تھی۔ برنارڈ شا اور آلڈس ہکسلے کو پڑھنے کے بعد کوئی شخص کس طرح اتنا بے درد اور دوسروں کے احساسات سے بے پروا ہو سکتا ہے؟ ستمرا ڈاکٹر کے ان تیغ جملوں کا کبھی جواب نہ دیتی۔ وہ اپنی بڑی، سہمی ہوئی آنکھیں ایک بار اٹھا کر اسے دیکھتی اور پھر خاموشی سے اس کے حکم کی تعمیل میں لگ جاتی۔ غالباً ڈاکٹر اسے اپنے انٹلیکچوئل معیار سے بہت کمتر سمجھتا تھا۔ یہ نہیں کہ اس کا خانہ محبت سے خالی تھا۔ وہ اپنے بچے ہریش کو اکثر گود میں بٹھا کر ایک دیوانی ماں کی طرح کھلاتا، اس سے توتلی باتیں کرتا اور عجیب و غریب منہ بناتا۔ مگر ستمرا اس کے لیے صرف بچے کی ماں کی حیثیت میں وجود رکھتی تھی۔ ایک بار جعفر ڈاکٹر کے گھر پر گیا تو ستمرا کو تیز بخار تھا اور وہ اوپر کے ایک کمرے میں پڑی کراہ رہی تھی۔ ڈاکٹر دوسرے کمرے میں آرام کرسی میں دراز اور اپنی بیمار بیوی کی کراہوں سے بے نیاز برنارڈ شا پڑھ رہا تھا اور اینڈروکلیز اینڈ دی لائن کے مکالموں پر کٹ کٹ کر رہا تھا۔ اس نے فوراً جعفر کو وہ حصے پڑھ کر سنانے شروع کر دیے جنھوں نے اسے اتنا لطف دیا تھا۔

"ماسٹر صاحب!" اس نے کہا۔ "آج چائے نہیں پک سکتی۔ ستمرا فیور سے بیمار پڑی ہے۔ وہ دوا باقاعدگی سے نہیں پیتی۔ پرمیشور ان عورتوں سے سمجھے۔ ذرا اس کی کراہیں سنو۔ ایسے میں کون گھر میں چین سے بیٹھ سکتا ہے — او ستمرا! ماسٹر صاحب آئے ہیں۔ یہ آہ آہ بند کرو!"

دوسرے دن جب اس کا بخار کچھ کم ہوا، جعفر کے آنے پر اس بیچاری کو بیماری کے بستر سے اٹھ کر چائے بنانی پڑی۔ جعفر کو یقین تھا کہ اگر ستمرا مر جائے تو ڈاکٹر کو کوئی خاص غم نہ ہوگا اور شاید اپنے آرام اور راحت میں خلل پڑ جانے پر اس غریب سرگباش عورت پر غصہ بھی آئے، جیسے اس سے کوئی کوتاہی ہو گئی ہو۔ جب بھی خود ڈاکٹر پر ایسی افتاد پڑتی تو وہ شخص، جو اپنی جیون ساتھی کی تکلیف کے بارے میں اتنا بے حس تھا، اپنی دلخراش کراہوں اور کرب کی کیفیت کے مظاہروں سے ایک منظر

پیدا کر دیتا۔ وہ اپنی تکلیف کو شمہ بھر بھی نہ سہہ سکتا اور بیماری میں ایک بگڑے مزاج چھوٹے لڑکے کی طرح چڑچڑا ہو جاتا اور ناز اٹھواتا۔ ممترا بیچاری کی شامت آ جاتی۔ وہ آٹھ پہر کی خدمت پر بندھ جاتی۔ وہ اپنے پتی دیو کا سر دباتی، اس کے پاؤں سہلاتی، اسے پیچھے سے سہارا دے کر دوا پلاتی، آدھ آدھ گھنٹے بعد ٹمپریچر لیتی۔ بہت سے بے حد پڑھے لکھے لوگوں کی طرح وہ موت کے سائے سے بے حد خائف تھا — بیماری میں کراہوں اور ممترا کو احکام کے دوران "پرمیشور کرپا!" کے الفاظ بعض وقت اس کے ہونٹوں سے ادا ہو جاتے۔ ایسے موقعوں پر وہ اپنی دواؤں کی تاثیر میں اعتقاد کھو دیتا اور ممبئی کے ایک آیورویدک حکیم کرم چند وید کو اپنے علاج کے لیے بلوا کر اس کے نسخے استعمال کرتا۔ "ماسٹر جی!" وہ جعفر کی طرف اپنی درد بھری ڈبڈبائی آنکھیں پھیر کر کہتا "ماسٹر جی، ہائے، میں مر رہا ہوں۔ ماسٹر جی، کیا ہوگا، بڑا تیز بخار ہے۔ ممترا نے آدھ گھنٹے پہلے ٹمپریچر لیا تھا، ایک سو ایک سے نیچے نہیں آیا۔ ماسٹر جی، کچھ کرو۔ جگدیش کو بچا لو۔" وہ آہ و اویلا مچانے والا مریض تھا کہ اسے دلاسا دینے، اس کی آہ و بکا کو حدود میں رکھنے کے لیے اس کے تیمارداروں کی جان پر بن جاتی۔ اگلی صبح جب وہ بھلا چنگا ہوتا تو وہ اپنی یہ حرکتیں بالکل بھول جاتا۔ اسی طرح اچھلتا کودتا، چہکتا۔ مگر ممترا کو وہ تین دن رات کے مسلسل جگراتوں کی قیمت علالت کی صورت میں ادا کرنی پڑتی۔ ہمیشہ یہی ہوا کہ جب ڈاکٹر تندرست ہو کر بستر سے اٹھا، ممترا بیمار ہو کر بستر سے لگ گئی — لیکن اس بیچاری کا خیال رکھنے والا، اس کی ناز برداری کرنے والا کون تھا۔

ڈاکٹر جگدیش جعفر کا بڑا عزیز دوست تھا مگر جعفر کو کبھی کبھی یہ احساس ہوتا کہ اپنے سارے انٹیلیکچوئل ازم اور ادب انگریزی سے شغف کے باوجود اس کے دوست کے خمیر میں کچھ کچھ بیدردی کا عنصر گندھا ہوا ہے۔ ادب کے مطالعے نے اس میں ایک قسم کی انٹیلیکچوئل رعونت تو پیدا کر دی تھی مگر وسیع انسانیت پرستی اور دردمندی نہیں جو آدمیت کا خاصہ ہے۔ ڈاکٹر کے ساتھ سہ پہر کو ہسپتال کے برآمدوں اور صحن میں پڑے مریضوں کا راؤنڈ لیتے وقت اپنے دوست کی خصلت کا یہ اندازہ اسے دق سا کرنے لگتا — وہ اس وقت اپنے دوست سے تقریباً نفرت کرتا۔ تھر، کچھ اور ننگر پارکر کے صحرائی استھانوں سے یہ مفلوک الحال مریض اپنے مہلک امراض کے علاج کی خاطر پیدل یا اونٹوں پر آتے۔ اکثر مریضوں کے ہمراہ ان کے پورے کنبے ہوتے: مائیں اور بچے اور باپ۔ وارڈ میں محدود جگہ ہونے کی وجہ سے وہ ریتیلے احاطے میں آسمان کے نیچے اپنے ڈیرے ڈالتے اور اپنے چولھے گرم کرتے۔ کہیں کوئی پھولے ہوئے پیٹ اور سوکھے ہاتھ پاؤں والا لڑکا کھاٹ پر پڑا ہے، اس کی ماں بیٹھی روٹی پکا رہی ہے اور باپ اونٹ کو چارا کھلا رہا ہے؛ کہیں کوئی گھر کا مرد، کنبے کا کمانے

والا، تیز تپ میں نڈھال ساکت پڑا ہے اور تپ اترنے کا نام نہیں لیتا۔ اس کی بیوی اس کے سرہانے بیٹھی پنکھے سے مکھیاں اڑاتی ہے۔ جعفر ان مریضوں اور انھیں لانے والوں کی بے بسی اور بیچارگی پر تلملاتا، وہ ان کی زندگیوں کے اندوہ، ان کی عسرت، ان کی اذیت کا سوچتا۔ وہ سوچتا، وہ ان کے دکھوں کو کیونکر کم کر سکتا ہے۔ ڈاکٹر کو ان مریضوں کے درمیان چلتے ہوئے بمشکل یہ احساس ہوتا کہ وہ انسان ہیں۔ وہ شا اور ہکسلے کے فلسفے کی باتیں کرتا اور مریضوں اور ان کے رشتے داروں سے بات کرتے وقت اس کا لہجہ کٹیلا اور درشت ہوتا۔ اسے ان لوگوں سے، جو اس کے نزدیک نرے جانور تھے، جھنجلاہٹ سی ہوتی تھی۔ اور پھر جعفر نے مٹھی میں اپنے اسکول میں ڈاکٹر جگدیش چند کے بارے میں چند ایسی باتیں بھی سنیں جن پر وہ یقین نہ کر سکا اور جن سے اسے تکلیف پہنچی۔ اس کے ٹیچر ساتھیوں میں سے ایک نے ڈاکٹر کے لالچ اور بالحاظ فیس ہونے کی علت کی دو تین مثالیں سنائیں۔ پھر جعفر کی موجودگی سے آگاہ ہونے پر دوسرے نے بتانے والے کو کہنی ماری، جس کا مطلب یہ تھا کہ چپکے رہو، دیکھتے نہیں ہو، اس کا دوست بیٹھا ہے۔

مگر ڈاکٹر جگدیش چندر اس سے محبت کرتا تھا۔ ایک بار وہ چند دنوں کے لیے میرپور خاص کے لیے روانہ ہوا تھا تو رخصت کرتے وقت ڈاکٹر کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ اور ان سنی سنائی اور قیاس کی ہوئی باتوں نے اس کی نگاہوں میں اپنے دوست کے پیکر کو داغدار نہ بنایا۔ ڈاکٹر فراخدلی، ذہانت، شوخی اور کتابوں سے لیے کوٹس سے پر تھا اور اس کی صحبت اس تنہا گاؤں میں زندگی کو قابل برداشت بناتی تھی۔ اس کی ٹیچری کی روٹین اب بے روح اور مشینی ہو چلی تھی اور ٹیچروں میں گھٹیا درجے کی سازشوں نے اسے اس ماحول سے بددل سا کر دیا۔ ہیڈ ماسٹر ویروانی کو ہائی اسکول کے دو تین لڑکوں سے درخواست آئی کہ انگلش ماسٹر جعفر کے لیکچر ہماری سمجھ میں نہیں آتے اور ہماری کمپوزیشن کی کلاس شاد لیا کرے۔ جعفر جانتا تھا کہ اس درخواست کے پیچھے کون ہے — ماسٹر شاد، ایک میٹھا سا آدمی جو لونڈے بازی کی شہرت رکھتا تھا اور کئی والدین، جن کے چھوٹے بچوں کو اس نے ورغلانے کی کوشش کی تھی، اس کی جان کے درپے تھے۔ چالیس سال کی عمر میں وہ کہیں سے ایک دس سالہ بچی کو اپنی بیوی بنا کر لے آیا۔ جعفر سے وہ پہلے ہی دن سے بے طرح جلنے لگا کیونکہ جعفر اتنا پیپر پیڑ تھا اور اسے ڈر تھا کہ کہیں وہ اسکول میں اپنی پوزیشن نہ بنا لے۔ ایک دفعہ اس مکان میں جہاں جعفر اپنے ساتھی ٹیچر ویرجی کی شراکت میں رہتا تھا، ویرجی کے ننگر پارکر کے گاؤں سے اس کی تین رشتے دار عورتیں اسے دیکھنے کے لیے آئیں۔ ٹھپے لگی چولی اور گھگھرے میں ان کی جوانی پھٹی پڑتی تھی۔ وہ تینوں شاندار عورتیں تھیں — ہنس مکھ اور الھڑ! ان کے وحشت بھرے

سڈول اور گدرائے ہوئے بدن دیکھ کر ایک بار تو جعفر کا اندر کا سانس اندر اور باہر کا سانس باہر رہ گیا۔ وہ آزاد صحرائی شاہزادیاں وہاں چار پانچ دن رہیں — واضح طور پر "مگر!" مگر جعفر فطرتاً راست اور بزدل تھا۔ اس نے انھیں محض اتنی توجہ دی جتنی آدمی خوبصورت حیوانوں کو دیتا ہے۔ ماسٹر شاہ کو پتا چل گیا۔ یہ بات بھلا کہاں چھپ سکتی تھی۔ اس نے انسپکٹر آف اسکولز کو نئے انگلش ماسٹر اور ماسٹر ورجی کی اخلاق باختگی کے بارے میں چٹھی لکھی اور یہ مطالبہ کیا کہ ان کو ملازمت سے برطرف کیا جائے۔ یہ درخواست رپورٹ کے لیے ہیڈ ماسٹر ورمانی کے پاس آئی تو اس نے جعفر کو بھی دکھائی۔ اگر ڈاکٹر جگدیش چندر اسے تسلی دینے کے لیے نہ ہوتے تو جعفر اسی وقت استعفیٰ دے کر وہاں سے بھاگ جاتا۔

ہر اتوار وہ بستی کے باہر ریتیلے ٹیلوں پر دور نکل جاتے۔ ایک چپراسی سر پر چھوٹا والا گراموفون اور ریکارڈ ساتھ لیے ہوتا۔ کسی جھونپڑی پر ایک صحرائی جھاڑی کے نیچے بیٹھ کر وہ پکنک مناتے، کانن بالا اور کے سی ڈے اور سہگل کے ریکارڈ سنتے، گھی چپڑی روٹیاں کھاتے اور سرِ شام باتیں کرتے لوٹتے۔ مگر پھر ایک واقعہ ہوا جس نے ان دونوں کی دوستی کو جیسے کند آرے سے ذبح کر دیا۔

جعفر کے مکان سے پتھر کی مار پر ہسپتال کی مارچری تھی — لاش گھر۔ یہ ایک پختہ اینٹوں کا مکعب کمرہ تھا، کافی اونچا اور ایک آہنی دروازے کے ساتھ، جس میں اکثر قفل پڑا رہتا تھا۔ ڈاکٹر یہاں اپنے پوسٹ مارٹم کیس کیا کرتا تھا۔ اکا دکا گدھ اس کے آس پاس اڑتا ہوتا۔ اسکول سے جاتے یا لوٹتے ہوئے مارچری جعفر کی راہ میں پڑتی اور عمارت کا ویران منحوس چہرہ ہمیشہ اس کی رگوں میں خون کو جما سا دیتا اور بے آرامی کے سے احساسات اسے ستاتے۔ اسکول کا چپراسی، کارا، جو ان کا کھانا پکاتا تھا، انھیں مارچری کی بدروحوں کی خوفناک کہانیاں سناتا۔ اس نے اپنی دو آنکھوں سے راتوں میں مقفل دروازے کو خود ہی کھلتے اور اس میں سے سر کے بغیر عصر اپنے ایک عورت کو نکلتے اور پرے ریتیلے ٹیلوں کی جانب چلتے ہوئے دیکھا تھا، اور کئی دوسرے لوگوں نے اکثر رات کو وہاں سے غیر انسانی چیخیں اور پکاریں سنی تھیں۔ ان قصوں کی وجہ سے — گو جعفر مافوق الفطرت باتوں میں یقین نہیں کرتا تھا — یہ جگہ اس کے تخیل میں ہمیشہ ایک برے خواب کے طور پر جاگتی رہتی۔

ایک صبح وہ ورجی ٹیچر کے ساتھ اسکول جاتے ہوئے مارچری کے پاس سے گذرا تو دو آدمی ایک کھاٹ پر پڑی لاش کو مارچری کے دروازے کے پاس دھر رہے تھے۔ کھاٹ پر ایک چوڑے ہاتھ پاؤں کے بھیل لڑکے کی لاش تھی۔ جعفر نے دیکھا کہ لنگوٹی کے سوا مرے ہوئے لڑکے کا جسم ننگا تھا اور قدرے سوجے ہوئے آبنوسی جسم میں نیلاہٹ جھلک مار رہی تھی۔ ورجی نے ایک آدمی سے،

جو اس لڑکے کا باپ نکلا، تھری زبان میں پوچھ گچھ کی۔ ادھیڑ عمر کے، تیر کی طرح سیدھے بھیل سے انھیں معلوم ہوا کہ سرو (یہ لڑکے کا نام تھا) رات کو بنیوں (کھیتوں) میں پانی دے رہا تھا — ان کی زمین بارہ میل دکھن کو نمک کی جھیلوں کے پاس تھی — جب اسے ایک زہریلے سانپ نے کاٹ لیا۔ انھوں نے سب دوا دارو، ٹونے ٹوٹکے، منتر لڑکے کو بچانے کے لیے کیے مگر سانپ بڑا زہری تھا۔ دو گھنٹے کے اندر سرو کے سانس پورے ہو گئے۔ سرو اس کا اکلوتا بیٹا تھا۔ وہ اس کی لاش کو اب سرکار کے قانون کے مطابق پوسٹ مارٹم کرانے لایا تھا اور پولیس سے اجازت کے بغیر اس کا کریا کرم نہیں ہو سکتا تھا۔

اسکول میں اپنی کلاس لیتے ہوئے اس گرنیل بھیل لڑکے سرو کی شکل جعفر کی آنکھوں کے سامنے پھرتی رہی جو رات کے پہلے پہر اپنی بنیوں پر زندہ اور بھلا چنگا تھا، اور اب اس کی میز اور سامنے کے بلیک بورڈ کی طرح بے جان تھا — جراحی کے نشتر سے چیر پھاڑ کیا جانے والا مردار۔ اس کے والدین کے دل پر، جن کا وہ اکلوتا بیٹا تھا، کیا گذری ہوگی! اس نے اپنے دوست ڈاکٹر جگدیش کو دستانے چڑھائے، سفید ڈھاٹا اور اوور آل اوڑھے، لڑکے کی لاش پر ماہر ہاتھوں سے پوسٹ مارٹم کرتے دیکھا — مگر جب وہ اسکول ختم ہونے کے بعد ڈیڑھ بجے دو پہر کو گھر جاتے ہوئے مارچری کے پاس سے گذرا تو لڑکے کی لاش ابھی تک کھاٹ پر مارچری کے باہر دھری تھی۔ مکھیاں اس کے گرد بھنبھنا رہی تھیں۔ ایک عورت اس کے سرہانے بیٹھی پنکھا جھل رہی تھی۔ ایک ڈھیلا ڈھالا سندھی پولیس مین، مارچری کا جمعدار اور دو تین گدھ میت کے گرد منڈلا رہے تھے۔ لڑکے کا باپ جعفر کو دکھائی نہیں پڑا۔ وہ پولیس مین اور جمعدار سے نہیں پوچھنا چاہتا تھا کہ لڑکے کے پوسٹ مارٹم میں اتنی دیر کیونکر ہوگئی۔ شاید اس کا دوست ڈاکٹر جگدیش چندر آج معمول سے زیادہ مصروف تھا یا اسے ٹمپریچر ہو گیا تھا۔ وہ سیدھا ہسپتال میں ڈاکٹر کے کمرے کی طرف گیا۔ ڈاکٹر اپنے کمرے میں کرسی پر بیٹھا سامنے ایک سفید پیڈ پر پنسل سے آڑی ترچھی لکیریں بنا رہا تھا اور اپنی ڈسپنسری کی کھڑکی کے پاس جھکے ہوئے نوجوان کمپاؤنڈر سے سندھی میں گفتگو کر رہا تھا۔ جعفر نے ابھی تک بمشکل سندھی کے آدھ درجن الفاظ سیکھے تھے۔ بعض لوگوں کو نئی زبان سیکھنے کا knack نہیں ہوتا، اور جعفر ان میں سے تھا، اس لیے ڈاکٹر اور کمپاؤنڈر کے درمیان گفتگو کا drift اس کی سمجھ میں نہ آیا۔

''ڈاکٹر، ابھی تک ہسپتال میں بیٹھے ہو؟'' جعفر نے کہا۔ ''میں اسکول سے فارغ ہو کر گھر جا رہا تھا تو خیال آیا کہ تمھیں دیکھتا چلوں۔ مجھ کو یہ امید نہ تھی کہ تم ابھی تک ہسپتال میں مکھیاں مار رہے ہو گے۔''

''ماسٹر صاحب!'' ڈاکٹر بولا، ''میں آج کافی مصروف رہا ہوں۔ صبح میں دو تین مریضوں کو دیکھنے جانا پڑا۔ ابھی ابھی سب انسپکٹر پولیس ملیسانی کو مارفیا کا ٹیکا لگا کر آرہا ہوں۔ اور ابھی مجھے ایک لڑکے کا پوسٹ مارٹم کرنا پڑے گا۔ لائف از بلڈی ہیل ان دس گاڈ ڈیم پلیس۔''

''ہاں، مارچری کے باہر ایک لڑکے کی لاش پڑی ہے۔ اس کے باپ سے پتا چلا کہ وہ سانپ کے کاٹے سے مرا۔''

''ہاں، یہی مجھ کو بتایا گیا۔''

''تم کیا سمجھتے ہو؟''

''غالباً یہ اسنیک بائٹ ہی کا کیس ہے۔ یہ کیس اس علاقے میں بڑے عام ہیں۔ مگر میں نے ابھی اس لڑکے کو نہیں دیکھا۔ پوسٹ مارٹم کے بعد ہی کسی صحیح نتیجے پر پہنچا جا سکتا ہے۔''

''تم پوسٹ مارٹم کس وقت کررہے ہو؟ لاش یہاں صبح سے پڑی ہے۔ اس کے رشتے دار بڑے پریشان ہوں گے۔''

''میں اوزاروں کو اسٹیر لائز کرارہا ہوں...'' اور پھر ڈاکٹر کے چشموں کے پیچھے اس کی آنکھیں چمکیں اور ایک ناخوشگوار بے رحم سا twist اس کے نقوش کو مسخ کر گیا۔ وہ کہنیوں کے بل میز پر جھکا۔ ''ماسٹر صاحب... میرا کمپاؤنڈر غلام مصطفیٰ مجھ کو بتارہا تھا کہ مجھ سے پہلا ڈاکٹر اللہ ڈنو ایسے کیس میں تین چار ہزار روپے سے کم نہیں لیتا تھا۔ یہ کوئی زیادہ فیس نہیں، اور یہ لوگ اسے ادا کرسکتے ہیں۔ ماسٹر صاحب، یہ لوگ اتنے غریب نہیں جتنے نظر آتے ہیں۔''

"Wretch!" جعفر نے کہا، ''ڈاکٹر اللہ ڈنو یقیناً رِچ ہوگا۔ ڈاکٹر کے بھی کچھ ایتھکس ہونے چاہئیں۔''

مگر ڈاکٹر نے اپنے پیشرو کو ملامت نہ کی، جو جعفر کو بڑا عجیب سا لگا، اور پھر ڈاکٹر کا تلخ اور اپنے پیش رو کے 'گٹس' پر حسد کا انداز! جعفر کو یقین تھا کہ اس کا دوست اس ڈاکٹر اللہ ڈنو کی کمینگی کی سطح پر کبھی نہیں اتر سکتا — اتنا سلجھا ہوا مہذب آدمی، کتابوں کا رسیا۔

''ویل ڈاکٹر!'' جعفر نے اٹھتے ہوئے کہا، ''روپیہ دنیا میں سب کچھ نہیں ہوتا۔ گاڈ ڈیم ٹو ڈاکٹر اللہ ڈنو — میں شام کو تمھیں ملوں گا۔''

''چیریو،'' ڈاکٹر نے کہا مگر جعفر نے نوٹ کیا کہ اس کے دوست کو کسی بات کا غصہ ہے، اور وہ اس سے آنکھ ملانے سے کترارہا ہے۔

وہ ہسپتال کے کمپاؤنڈ سے باہر آیا۔ مرے ہوئے لڑکے کی کچھ اور رشتے دار عورتیں اس کی

کھاٹ کے گرد جمع ہو رہی تھیں مگر اس کا باپ اسے دکھائی نہ دیا۔ پھر اس نے باپ کو دیکھا۔ وہ مُکھی کے شہرے مکھی کرم چند کے ہمراہ ہسپتال کی طرف آرہا تھا — اس کا چہرہ غم اور پریشانی میں ڈھل گیا تھا۔ مکھی اپنے لمبے کوٹ اور دھوتی میں اپنے چھوٹے چھوٹے قدم ناپتا ہوا، اور کافی سنجیدہ اور معتبر، لمبے تڑنگے بجیل کے پہلو میں ایک موٹیلا سا بالشتیا لگتا تھا۔ جعفر نے اپنے گھر کے بیلے پر پیچھے نظر دوڑائی تو سرو کا باپ اور مکھی ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں داخل ہو رہے تھے۔ سرو کا باپ مکھی کرم چند کو ڈاکٹر کے پاس کس غرض سے لے آیا اور گاؤں کا سب سے مالدار اور معزز ہندو کس consideration پر تیز دھوپ میں ایک نادار بجیل کے ہمراہ چلنے پر رضا مند ہوا ہے؟ سرو کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے صبح سے کیوں رکھی ہوئی ہے؟ تو کیا اس کا دوست ڈاکٹر جگدیش چندر بھی دوسرا ڈاکٹر اللہ ڈتو تھا؟ نہیں نہیں، ڈاکٹر ایسا حریص، ایسا سفاک نہیں ہو سکتا۔ اور پھر بھی...

ویر جی جب مُکھی سے لوٹا اس نے بھی وہاں بہت سی باتیں سنی تھیں۔ مارفیا اڈکٹ موٹے سب انسپکٹر نے مکھی کرم چند کے توسط سے بجیل سے بڑی حیص بیص کے بعد ڈیڑھ ہزار روپیہ لیا تھا اور ڈاکٹر پوسٹ مارٹم رپورٹ کے تین ہزار روپے کا تقاضا کر رہا تھا۔ بجیل کے پاس روپے کہاں سے آتے! اس نے مکھی کرم چند کے پاس اپنی تھوڑی زمین رہن رکھ دی تھی اور مہربان دل مکھی اسے تین ہزار روپے قرض دینے پر اور ہر دو افسروں کو رقم پہنچانے پر رضا مند ہو گیا تھا... جعفر کے دل میں اپنے دوست کا چہرہ دھندلانے لگا۔ اس کا خون اس درندگی اور بے رحمی پر کھول گیا۔

کوئی چار بجے جب وہ لیٹا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا تو دروازے پر دستک ہوئی۔ ویر جی نے دروازہ کھولا۔ مکھی کرم چند اور سرو کا باپ اندر آئے۔ مکھی نے پرنام کیا اور خالی کرسی پر بیٹھ گیا۔ سرو کا باپ کھڑا رہا — غم کی تصویر۔

پھر مکھی نے کہا، "یہ اس لڑکے کا باپ ہے جس کا پوسٹ مارٹم ہونا ہے۔ ہم آپ کے پاس اسی لیے آئے ہیں کہ آپ ڈاکٹر صاحب کے بڑے دوست ہیں۔ آپ کی سفارش کو ڈاکٹر صاحب ضرور مانے گا۔ ڈاکٹر صاحب پوسٹ مارٹم رپورٹ کے تین ہزار روپے مانگتا ہے۔ یہ بجیل ڈیڑھ ہزار تک دینے کو تیار ہے۔ اس سے زائد اس کے پاس رقم نہیں ہے۔ آپ ڈاکٹر صاحب سے سفارش کریں کہ وہ ڈیڑھ ہزار روپے لے لیں۔ اس کے بیٹے کی لاش صبح سے پوسٹ مارٹم کے لیے رکھی ہے، اور ان لوگوں کی رسم ہے کہ جب تک مردے کا کریا کرم نہیں کر چکتے، ہمارے گھر کے لوگ اور رشتے دار کچھ کھا نہیں سکتے۔ ڈاکٹر صاحب پوسٹ مارٹم میں دیر کر رہے ہیں۔ آپ اس بیچارے کی مدد کریں اور ہمارے ساتھ چل کر اس غریب کی سفارش کر دیں۔"

''سفارش! میں اس شخص کو بتاؤں گا کہ وہ کیا ہے!'' جعفر نے سوچا۔ وہ بے قابو غصے سے سپید اور پتے کی طرح کانپتا ہوا بستر سے اٹھا اور ان کے ساتھ چل پڑا۔ راستے میں اس نے کوئی بات نہ کی — اور مکھی رام چند اس کے ساتھ قدم ملانے کی کوشش کرتا رہا۔ اب وہ پچھتانے لگا کہ کاش وہ انگلش ماسٹر کو سفارش کے لیے نہ کہتا۔ اگر گرما گرمی ہوئی تو ممکن ہے ڈاکٹر اتنا بگڑ جائے۔ لڑکے کی لاش اب بھی مارچری کے پاس پڑی تھی۔ جعفر نے مکھی اور جمیل کو وہاں انتظار کرنے کے لیے کہا اور خود ہسپتال کے کمپاؤنڈ میں داخل ہوا۔ وہ اپنے آپے میں نہیں تھا اور نہیں جانتا تھا کہ کیا کرے گا اور کیا کہے گا۔

ڈاکٹر جگدیش اپنے ہسپتال کے کمرے کے باہر کمپاؤنڈر کے ساتھ کھڑا تھا۔ وہ سیدھا اس کی طرف گیا۔

''ماسٹر صاحب آگئے!'' ڈاکٹر نے مسرت سے کہا اور پھر جعفر کے غصے اور دیوانگی سے لال چہرے کو دیکھ کر اس کی مسکراہٹ بجھ گئی۔ پہلے وہ اپنے دوست انگلش ماسٹر کو اس ٹینشن کی حالت میں دیکھ کر حیران سا ہوا۔ اس نے جعفر کو ایسی حالت میں کبھی نہ دیکھا تھا — یہ اس کے لیے ایک نیا چہرہ تھا۔ وہ غالباً بھانپ گیا کہ اس کے دوست کو کسی چیز نے الٹ کر رکھ دیا ہے اور اس چیز کا تعلق اسی سے ہے۔

''ڈاکٹر!'' جعفر نے انگریزی میں کہا۔ غصے سے اس کی زبان میں ہکلاہٹ تھی۔ ''میں نہیں جانتا تھا تم اتنے ریچ ہو، مکمل بیسٹ۔ تمھیں اپنا دوست کہتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے — ایسی درندگی اور بے رحمی تم کیسے کر سکتے ہو؟ ایک نادار مفلس بھیل سے، جس کا جوان اکلوتا بیٹا مر گیا ہے، تین ہزار روپے کا تقاضا کرنا! کس لیے؟ تاکہ تم اس کو پوسٹ مارٹم رپورٹ لکھ دو کہ اس کا بیٹا واقعی اسنیک بائٹ سے مرا اور اسے گھر والوں نے زہر دے کر نہیں مارا!''

ڈاکٹر جگدیش چندر کا چہرہ پیلا پڑ گیا۔ اس نے مجوب ہو کر کہا، ''ماسٹر صاحب، سنو...''

''تم کیا کہہ سکتے ہو جو میں سنوں؟'' جعفر نے کہا۔ ''میں تمھیں سناتا ہوں تم کیا ہو۔ تم ایک وائپر ہو۔ اپنی اس نفیس ریشمی قمیص اور پتلون کے ساتھ ایک مکمل اسکاؤنڈرل — صبح سے لڑکے کی لاش پوسٹ مارٹم کے لیے پڑی ہے اور اس کا باپ اور مکھی ہسپتال اور پولیس اسٹیشن کے کئی پھیرے کر چکے ہیں۔ اور تم پوسٹ مارٹم نہیں کرتے کیونکہ لڑکے کا باپ تمھاری فیس نہیں دے سکتا۔ تم پوسٹ مارٹم نہیں کر رہے جو تمھارا فرض ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ جب تک ان کا اس مصیبت سے چھٹکارا نہیں ہوتا اور وہ لڑکے کا کریا کرم نہیں کرتے ان میں سے کوئی بھوجن نہیں کرے گا...''

''ماسٹر صاحب، تم بیٹھو۔ میں تمھیں بات بتاتا ہوں۔''

''میں نہیں سنوں گا،'' جعفر نے کہا۔ ''میں تمھیں کہنے آیا ہوں کہ تم میرے دوست نہیں ہو۔ تم جیسا رینج میرا دوست نہیں ہو سکتا۔ کیا تم جانتے ہو یہ پروفیشنل مس کنڈکٹ ہے۔ میں تمھاری میڈیکل ڈائرکٹریٹ کو رپورٹ کروں گا.... تم جانتے ہو میں کیا محسوس کرتا ہوں؟ میں چاہتا ہوں، تمھاری تمام کتابوں کو آگ لگا دوں....''

پھر اسی طرح غصے سے کانپتے ہوئے وہ پلٹا اور اس شخص نے، جسے وہ اپنا دوست کہتا تھا اسے جاتے ہوئے دیکھا — کن جذبات سے؟ یہ کوئی نہیں جان سکتا۔ وہ کمپاؤنڈ سے باہر آیا اور مارچری کے پاس کھڑے مکھی اور بجیل پر ایک ایسی نظر ڈالتا ہوا جیسے وہ ان کو نہیں جانتا، وہ ٹیکری پر اپنے مکان کی طرف چل دیا۔ وہاں جا کر وہ بخار کی سی حالت میں لحاف منھ پر لپیٹ کر اپنے بستر میں گھس گیا — شام کو اسے دیر سے معلوم ہوا کہ آخر ڈاکٹر نے لڑکے کا پوسٹ مارٹم کر دیا اور اس کے والدین اسے گھاٹ پر شمشان بھومی کریا کرم کے لیے لے گئے۔ اگلی صبح بجیل اس کا شکریہ ادا کرنے آیا۔ اس سے اسے پتا لگا کہ اس کی سفارش سے ڈاکٹر نے کچھ لینے سے انکار کر دیا تھا — وہ ڈیڑھ ہزار بھی نہیں جو مکھی نے اسے دینے کی کوشش کی۔

مگر جعفر ڈاکٹر سے پھر کبھی نہ ملا۔ ان کے درمیان ایک جھجک اور شرم کی دیوار حائل ہو گئی تھی، اور اگرچہ جعفر کا غصہ وقت گذرنے کے بعد سرد پڑ گیا اور وہ ڈاکٹر کے ساتھ کتابوں کی گفتگو اور شام کو لمبی سیروں کو مس کرتا تھا مگر پھر اس نے ہسپتال کی جانب کبھی رخ نہ کیا۔ اس نے اپنے اسکول جانے کا راستہ ہی بدل دیا۔ نہ ہی ڈاکٹر نے اس سے ملنے کی کوشش کی۔ ممکن ہے اس کی یہ جھجک شرم اور غرور کی وجہ سے ہو۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ایک دفعہ وہ مل کر بیٹھتے اور آپس میں بات چیت کرتے تو پرانی محبت اور دوستی پھر عود نہ کر آتی۔ ڈاکٹر سے ایک دوبار منٹھی بازار میں اس کا آمنا سامنا ہوا جہاں وہ کسی مریض کو دیکھنے کبھی آ نکلتا تھا۔ انھوں نے ایک دوسرے کو آنکھیں بھر کر دیکھا اور ایک دوسرے کے پاس سے اس طرح گذر گئے جیسے وہ اجنبی ہوں — یا ازلی دشمن۔

اور پوسٹ مارٹم کے واقعے کے بعد وہ منٹھی میں ایک مہینہ اور ٹھہرا۔ پھر گھر سے اسے اطلاع مل گئی تھی کہ وہ ایم اے میں پاس ہو گیا ہے۔ اس کے والدین نے، جنھیں اس کا پتا اس کے ایک دوست سے مل گیا، اسے واپس آنے کے لیے لکھا۔ اس کی ماں بیمار تھی۔ جعفر نے استعفیٰ دے دیا اور ستمبر کی ایک شام کو وہ وہاں سے ریلوے اسٹیشن کے لیے اونٹ پر سوار ہوا۔ اس کے ہیڈ ماسٹر ویروانی، اس کے ٹیچر ساتھی اور چند شاگرد اسے الوداع کہنے کے لیے آئے۔ اس نے ان سے وعدہ

کیا کہ وہ انھیں خط لکھتا رہے گا اور سچی بات یہ ہے کہ وہاں سے جاتے ہوئے اور اس جگہ کو چھوڑتے ہوئے اس کا دل غمگین تھا۔ جگدیش چندر — اسے معلوم تھا — اس کے جانے کے بارے میں جانتا تھا۔ نیلے جھٹپٹے میں بڑے میدان کے پرے ہسپتال کی عمارتیں، گاؤں سے الگ تھلگ، ڈوبتے سورج کی کرنوں میں دمکتی ہوئی کھڑی تھیں۔ وہاں اس کے آس پاس کوئی حرکت نہ تھی — ماسوا مارچری کے گرد بیٹھے ہوئے دو گدھوں کے۔ جعفر کی آنکھیں کسی وجہ سے بار بار اس عمارت کی طرف اٹھیں — شاید وہ جاتے ہوئے اپنے پرانے دوست یا پرانے دشمن کو ایک بار دیکھنے کی امید کر رہا تھا۔

اس کا اونٹ کھڑا ہوا اور اس کے الوداع کرنے والوں کو چھوڑ کر اپنے رات بھر کے لمبے صحرائی سفر پر جھولتا ہوا شمال کو روانہ ہو گیا۔ جب وہ اس ریت کے ٹیلے پر چڑھ گئے جو شمال کی طرف اس گاؤں کا گھیراؤ کیے ہوئے ہے، تو اس نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ اس کے ساتھی اب بکھر گئے تھے۔ ہسپتال کی دیوار کے پاس اس نے ایک سفید آشنا شکل اس کی سمت منھ کیے کھڑی دیکھی۔ اسے گمان ہوا کہ اس نے ایک ہاتھ کو اٹھتے اور ہوا میں لہراتے ہوئے بھی دیکھا۔ پھر وہ شکل مڑی اور جلدی سے ہسپتال کے کمپاؤنڈ کی طرف چلنے لگی۔ اتنے میں اس کا اونٹ بھی اترائی پر آیا اور پیچھے کے گاؤں کا منظر اس کی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ اس کے گلے میں ایک lump سا تھا، دل کی دھڑکن تیز تھی۔

وہ آگے چلتے ہوئے اندھیرے میں ایک مڑی ہوئی دوستی کی یاد لے چلا تھا اور جھکی ہوئی سرمگیں آنکھوں کی بھی...

چھپٹر

چھوٹے برہمن لڑکے کو چھپٹر کی سمت ہانکتے ہوئے اسے تین طرف سے استادانہ پھرتی کی حرکات کے ذریعے گھیر گھار کر زچ کرتے اور اس کی خوبصورت سیاہ آنکھوں میں دیوانی دہشت کو امڈتے دیکھتے ہوئے، غضنفر کو ایک بے ضبط انبساط، ایک عجیب طاقت کا احساس ہوا۔ وہ یہ کیوں کر رہا تھا؟ وہ یہ نہیں جانتا تھا؛ یہ شاید خون کی حدت سے پیدا شدہ ایک ازلی عمل تھا— جنسی خواہش کی طرح جبری، قسمت کی طرح بے مفر اور ناگزیر۔ اسی قسم کی سحر انگیز مسرت کی کیفیت سے، اس کے پہلے، پتھر اور دھات کے زمانے کے، بوزنے آباواجداد جنگل میں ہرنوں اور وحشی سوروں کی گھات لگاتے ہوں گے یا آوارہ پھرتی بوزنی عورتوں کے غول پر پل پڑتے ہوں گے۔ غضنفر کی آنکھوں میں چمک تھی اور شکار کی نشیلی لذت اس کی رگ و پے میں پھڑکتی ہوئی، اس کے بازوؤں اور ٹانگوں کو ایسی حیران کن قوت دے رہی تھی۔ وہ کچھ کچھ جانتا تھا کہ چھوٹے برہمن لڑکے کے پیچھے چھپٹر ہے اور اگر اسے اس طرح گھیر کر دھکیلا گیا تو وہ ناگزیر طور پر چھپٹر میں جا گرے گا، اور اس کے باوجود وہ اس کھیل سے دستبردار ہونے کو آمادہ نہ تھا۔ شاید ایسا کرنا اس کے اب بس میں نہیں تھا۔ انجانی، براقی کی زورآور طاقتیں اسے اس عمل پر چلائے جا رہی تھیں۔ چھوٹا لڑکا، خوف سے پھولا ہوا، چمکتے مٹیالے چھپٹر کو اپنے عقب میں لیے، اپنے خوفناک شکاری کے چنگل سے بچ نکلنے کے لیے جتن کر رہا تھا۔ اس کی کوششیں غیر موثر تھیں۔ اس کے دائیں طرف ریت کا ایک چھوٹا سا ٹبہ تھا اور بائیں طرف کانٹے دار صحرائی جھاڑیوں اور پودوں کا ایک قطعہ۔ وہ دائیں اور بائیں بھاگنے کی کوشش کرتا، مگر اس کے فرار کے راستے مسدود تھے اور اس کا چابکدست شکاری وہاں پہلے سے موجود ہوتا۔ چھوٹے لڑکے کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ رحم یا مدد کے لیے روتا، مگر شدید خوف نے اسے گونگا کر دیا تھا— اور اگر وہ چیخ و پکار بھی کر سکتا تو اسے یہاں بھلا کون سن سکتا۔ کوئی انسان آس پاس نظر نہیں آتا

تھا۔ زندہ چیزیں ملیالے دکھتے آسمان پر منڈلاتی ہوئی دو تین چیلیں تھیں اور ایک بکری جو اپنے گلے سے بچھڑ گئی تھی اور پرلے کنارے پر جھاڑیوں میں منھ مار رہی تھی۔

غضنفر دس گیارہ برس کا ایک صحت مند، گٹھا ہوا لڑکا تھا— سیب سے لال گال، گھنگھریالے گھنے بال، سرخ اور سپید رنگت، کھیل کود کا شوقین۔ وہ اپنی عمر کے بیشتر لڑکوں سے زیادہ مختلف نہیں تھا۔ اس کا باپ اس علاقے کا ڈپٹی کلکٹر تھا، اس شہر کے چار پانچ حکام میں سے ایک۔ اس وجہ سے اسے اپنے ہم جماعتوں اور استادوں کی بےجا توجہ حاصل تھی۔ ایک اونچے افسر کا بیٹا ہونے کی بدولت وہ اس کا بےحد لحاظ کرتے۔ کلاس میں شرارتیں کرنے یا گھر کا دیا ہوا کام نہ کرکے آنے پر جہاں دوسرے لڑکے پٹتے یا بنچ پر کھڑے کرائے جاتے، غضنفر اکثر بچ جاتا۔ استاد اس کے بہانے کو سچ سمجھنے میں مصلحت جانتے۔ کوئی یہ بات بھی نہ تھی کہ وہ اپنی پڑھائی میں پھسڈی تھا۔ ٹیوٹر اسے گھر پر پڑھانے آتے تھے اور اس سے اچھی خاصی محنت لیتے۔ صرف ایک بار سارے اسکول کے روبرو اسے چند دوسرے لڑکوں کے ساتھ ہاتھوں پر بید لگے۔ اس وقت اس کا چہرہ سپید تھا۔ وہ خوف اور تکلیف سے زور زور سے بلبلایا، ایک بزدل کی طرح۔ ایک نیا ہیڈ ماسٹر وہاں حال میں تبدیل ہو کر آیا تھا، بڑا بارعب، جابر اور کڑا انضباط رکھنے والا۔ ہر کوئی اس سے ڈرتا تھا۔ اس نے آتے ہی اس رسم کی طرح ڈالی کہ ہر صبح حاضری کے وقت وہ لڑکے جو کسی سخت شرارت یا نازیبا فعل میں ماخوذ ہوتے، سارے اسکول کے روبرو سب سے اونچی سیڑھی پر بلائے جاتے اور وہ انھیں ہاتھوں پر بید سے سزا دیتا۔ جتنا بڑا قصور ہوتا، اتنی ہی زیادہ بیدوں کی تعداد ہوتی۔ وہ سارے اسکول کے لیے ان کی مثال بناتا اور اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بید زنی چھوٹے بڑے لڑکوں کے دلوں میں خوف کی سردی دوڑا دیتی، اگرچہ ان کے لیے جرم کی نوعیت بیشتر پراسرار اور قیاس کا معاملہ رہتی۔ اسکول کے روبرو پٹنے والے البتہ سب کی نظروں میں بدی، سیاہ کاری کے عجوبے بن جاتے— ایک بالکل الگ افسانوی مخلوق۔ چھوٹے لڑکوں پر ان کی دھاک بیٹھ جاتی۔ وہ ان کو دور سے تحیر اور رشک سے دیکھتے اور ان سے بچ کر رہتے، گویا کہ ان کی قربت ہی آلودہ کرنے والی ہو۔ غضنفر جونیئر طالب علموں میں پہلا لڑکا تھا جسے اسکول کے ان منتخب نمبریوں میں شامل ہونے کا افتخار حاصل ہوا۔ اس نے اپنی سزا کو ایک مرد کی طرح ڈھٹائی اور بہادری کے ساتھ برداشت نہیں کیا تھا اور سارے اسکول کے سامنے ایک چھوٹے بچے کی طرح چیخ اور بلبلا اٹھا تھا۔ اس اہانت کے خیال سے وہ بعض دفعہ تلملانے لگتا۔ وہ جرم جس کی اسے یہ عبرتناک سزا ملی تھی، اسکول کے بیت الخلاؤں پر چاک سے فحش عبارتوں کا لکھنا تھا— عبارتیں جن کا وہ مطلب بھی پوری طرح نہیں جانتا تھا۔ ایک ماسٹر نے اسے یہ کرتے ہوئے

دیکھ لیا اور ہیڈ ماسٹر کو رپورٹ کر دی، جس نے اسے اس وقت کچھ نہیں کہا، مگر دوسرے دن حاضری کے وقت اس کا نام اس دن کے مجرموں میں سر فہرست تھا، اور سزا ملتے وقت اسے یہ بھی نہ بتایا گیا کہ اسے کس جرم کی سزا دی جا رہی ہے۔ یہ ہیڈ ماسٹر کا طریقہ تھا — جرم کو ظاہر نہ کرو، لڑکوں کو اس کے بارے میں قیاس کے گھوڑے دوڑانے دو، تاکہ کسی قصور پر پکڑے جانے اور مار کھانے کے خوف میں کانپتے رہیں۔ غضنفر کے دل میں ہیڈ ماسٹر کے خلاف سخت غصہ تھا اور اسے جلد ہی انتقام کی ٹھنڈک مل گئی۔ غضنفر کے باپ کو اس سزا کی خبر پہنچی۔ غضنفر نے گھر پر کسی سے اس کا ذکر نہ کیا، مگر کسی دوسرے لڑکے کے والد نے اس سے اس کا ذکر کر دیا۔ اس نے اپنے اکلوتے لاڈلے بیٹے کو ایسی شرمناک حرکت کا قصوروار نہ گردانا، اور جب اس نے غضنفر سے پوچھا، اس نے سزا ملنے سے انکار نہ کیا، مگر یہ کہا کہ فحش عبارتیں اس نے نہیں بلکہ دوسرے لڑکوں نے لکھی تھیں۔ ڈپٹی کلکٹر نے غصے میں ہیڈ ماسٹر کو ایک سخت جلا کٹا خط لکھا، جس میں اسے اس سے ملنے کے لیے کہا گیا۔ ہیڈ ماسٹر نے جواب میں غضنفر کے جرم کی وضاحت کی اور لکھا کہ اگر وہ اس کا اپنا بیٹا ہوتا تو بھی اس کو ایسی ہی سزا دیتا۔ وہ البتہ غضنفر کے باپ کو ملنے نہ آیا۔ ہیڈ ماسٹر کے جواب نے غضنفر کے باپ کو مطمئن نہ کیا اور اس کا غصہ اور بھڑک اٹھا۔ وہ فوراً بپھرا ہوا ہیڈ ماسٹر کے آفس میں پہنچا اور سارے اسکول نے وہ تیز و تلخ باتیں سنیں جو ان کے درمیان ہوئیں۔ اس جھگڑے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ڈپٹی کلکٹر اور دوسرے والدین کی شکایت پر ہیڈ ماسٹر کو وہاں سے تبدیل کر دیا گیا۔ اس سے غضنفر کی اسکول میں ساکھ اونچی ہو گئی اور وہ اکثر شیخی بگھارتا، ''اباجی نے اس کی خوب درگت بنائی اور اسے چھڑی سے پیٹا۔ وہ تو اسے نوکری سے علیحدہ کرنے لگے تھے، مگر اباجی نے کہا میں کسی کی روزی پر لات نہیں مارنا چاہتا، بس بدلی کافی ہے۔''

غضنفر کو چھوٹے برہمن لڑکے، لیلا رام، پر اپنی طاقت کا احساس پہلی بار ایک دوپہر کو ہوا۔ اس نے اس سے پہلے اسے غالباً دیکھا بھی نہ تھا، اگرچہ وہ اسی اسکول میں غضنفر سے دو درجے نیچے چوتھی جماعت میں پڑھتا تھا۔ وہ اور اس کے چیلوں کا سارا ٹولہ فارغ ہو کر ہائی اسکول کے سرائے نما بورڈنگ میں بیر چننے جا وارد ہوا۔ مضافات کے گنے چنے ہندو لڑکے اور چار پانچ اسکول ماسٹر اس شکستہ حال بورڈنگ میں رہتے تھے۔ اس کے احاطے کے درمیان میں ایک گھنیری بیری کا درخت تھا جس پر لال پکے پکے بیروں کے خوشے لٹکتے رہتے؛ بہت سے نیچے زمین پر بکھرے ہوتے اور اس لیے بیر حاصل کرنے کے لیے اس کی ٹہنیوں میں ڈھیلے اور پتھر مارنے کی ضرورت بھی نہ پڑتی۔ ایک لنگی والا بھینگا ماسٹر اللہ بخش اکثر، اس بیری کو اپنی واحد ملکیت سمجھتے ہوئے، لڑکوں کو اس کے بیر نہ توڑنے دیتا۔ وہ ماسٹر پورا موذی تھا اور لڑکوں کی اس سے جان جاتی تھی۔ اس کی موجودگی میں کوئی

بیری کے پاس پھٹکنے کی جرأت نہ کرتا۔ اللہ بخش ان دنوں کسی کے کہنے کے مطابق پولیس کے ڈر سے بھاگا ہوا تھا اور اس لیے بورڈنگ اور اس کی بیری ہر ایک کے لیے آزاد علاقے بنے ہوئے تھے۔ جب غضنفر کا ٹولہ وہاں پہنچا، پانچ چھ ہندو لڑکے بیری کے گرد جمع تھے اور بیر چن رہے تھے۔ ایک دو بیر گرانے کے لیے روڑے اٹھائے ہوئے تھے۔ غضنفر کے ٹولے کے وہاں پہنچتے ہی وہ کچھ پیچھے ہٹ گئے، جیسے چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے ہوں۔

"اوئے، یہ بیری تمھارے باپ کی ہے؟ چلو، بھاگو!" غضنفر نے ایک لیفٹیننٹ کی طرح چھاتی تان کر اکڑتے ہوئے کہا۔ ہندو لڑکے خاموش کھسکتے ہوئے وہاں سے کھسکنے لگے، لیکن زیادہ عجلت سے نہیں — وہ بزدلی اور ہتک کی بات ہوتی: وہ وہاں سے رخصت ہونا چاہتے تھے، مگر اپنا بھرم رکھ کر، اور ان میں سے دو تین نے بیر چننا جاری رکھا۔ اور پھر غضنفر نے ان میں ایک چھوٹے سے گہری شربتی آنکھوں والے شرمیلے لڑکے کو دیکھا۔ یہ لیلا رام تھا۔ وہ بے حد خائف اور ڈرا ہوا، حفاظت کے لیے ایک بڑے لڑکے کشن چند کی بغل سے گویا چمٹا ہوا تھا۔ وحشت زدہ ہرنی کی سی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ کشن چند، مقامی اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہریش چند کا لڑکا، غضنفر کا ہم عمر اور ہم جماعت تھا۔ وہ اپنی جماعت میں امتحانوں میں ہمیشہ اول آتا اور اسکول کی فٹ بال ٹیم کا بھی کھلاڑی تھا۔ غضنفر اور کشن چند میں باہمی دوستی تو نہ تھی، مگر وہ ایک دوسرے سے صلح اور مروت کے جذبے سے ملتے جلتے، کیونکہ کشن چند کا باپ، ڈاکٹر ہریش چند، غضنفر کے گھرانے کا ایک طرح سے فیملی ڈاکٹر تھا۔ جب غضنفر کو پچھلے سال تپِ محرقہ ہوا تھا تو ڈاکٹر ہریش نے اس کا علاج کیا تھا اور وہ اسے دیکھنے دن میں تین یا چار بار آتا۔ جب غضنفر کی ماں نمونیے سے بیمار پڑی تھی اور اس کی جان کے لالے پڑ گئے تھے تو ڈاکٹر ہریش کے ہی ہومیوپیتھک سفوفوں سے اس کو افاقہ ہوا تھا۔ غضنفر کا باپ ڈاکٹر ہریش کی بڑی قدر کرتا اور اس کے بیٹے کشن کو غضنفر کے سامنے مثال کے طور پر پیش کرتا، جس پر غضنفر دل ہی دل میں جلن اور حسد کے مارے کڑھتا۔ اب کشن چند کی موجودگی میں غضنفر چھوٹے برہمن لڑکے کو چھیڑنے یا تنگ کرنے کی جرأت نہ کر سکا، اگرچہ اس کی روتی بے بس صورت کو دیکھ کر اس کے ہاتھوں کے تلوے کھجلانے لگے۔ اسے ڈرانے اور رلانے اور اذیت دینے میں کتنا مزہ آتا! غضنفر کشن چند سے ادھر اُدھر کی باتیں کرنے لگا، مگر اس کی آنکھیں چھوٹے لیلا رام پر جمی ہوئی تھیں جو انجانے خوف سے دبکا جاتا تھا۔ یکلخت لیلا رام نے اپنے محافظ کو بے پروا پا کر اور ان سفاک آنکھوں کی تاب نہ لا کر جو اسے گھور رہی تھیں، وہاں سے بورڈنگ کے دروازے کی طرف اس طور سے دوڑ لگائی جس طرح ہرن شکاری کتوں کے سامنے بھاگتا ہے۔ غضنفر کا ایک لیفٹیننٹ جھوٹ موٹ

اس کے پیچھے بھاگا اور پھر ہنستا ہوا لوٹ آیا۔

''کشن چند، اس لڑکے کا کیا نام ہے؟'' اس نے کشن سے پوچھا۔ ''یہ اتنا ڈرتا کیوں ہے؟''

''اس کا نام لیلا رام ہے۔ اس کے پتا کی ریلوے بازار میں فلیکس بوٹوں کی دکان ہے۔'' کشن نے بتایا۔ ''یہ سب نئے لوگوں سے بے حد خوف کھاتا ہے اور کبھی گھر سے اکیلا نہیں نکلتا۔''

غضنفر کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی اور اس کے لیے اچنبھا تھا کہ کوئی دوسرے لوگوں سے اس حد تک خائف ہو کہ انھیں دیکھتے ہی اس کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں۔ اس کے ساتھ ہی یہ خیال بڑا مسرت بخش تھا کہ چھوٹا لڑکا اس سے اتنا خائف ہے۔ ایک عجیب طاقت کا احساس اس کو ہوا اور اسے یوں لگا جیسے کہ اس کا قد بڑھ گیا ہے اور اس کے بازوؤں میں دگنا زور آ گیا ہے۔ اس کے ساتھ ایک عجیب پُرحدت بے کلی کے حظ نے، جسے وہ کوئی نام نہیں دے سکتا تھا، اس کے سارے رگ و پے، سارے وجود میں سنسناہٹ سی پیدا کر دی۔ اس دن سے پیلا سفید ہرنی کی آنکھوں والا لیلا رام اکثر اسے دن کے تخیلات اور رات کے خوابوں میں منڈلانے لگا۔ جب وہ اس کو سوچتا یا اسے اپنے دوستوں کے جھرمٹ میں دیکھتا، اس کا چہرہ کچھ تمتما اٹھتا۔ دل کی دھڑکن تھوڑی تیز ہو جاتی، بازوؤں کی مچھلیوں میں تناؤ سا آ جاتا۔ اس سہمے ہوئے لڑکے کو بری طرح مارنے پیٹنے، ڈرانے اور بازوؤں میں بھینچ کر ادھ موا کرنے کی خواہش اس کے جسم میں مچلنے لگتی، مگر وہ اسے کوئی گزند نہ پہنچا سکتا تھا کیونکہ لیلا رام ہمیشہ اپنے تین یا چار دوستوں کی ٹولی میں ہوتا تھا اور کشن چند کے پہلو میں دبکا ہوا۔ کشن کی موجودگی میں اسے لیلا کو چھیڑنے یا پیٹنے کی جرأت نہیں ہوتی تھی، کیونکہ اس کی طرف سے ایسی کوئی حرکت ڈاکٹر ہریش چند کے توسط سے اس کے باپ کے کانوں میں جا پہنچتی، جو وہ نہیں چاہتا تھا۔ ہاں، ایک دفعہ لیلا رام اسے اکیلا ملا۔ تب نچلی جماعتوں کے امتحانات ہو رہے تھے۔ غضنفر اسکول کے ہال کمرے کے سامنے برآمدے میں بستہ لیے حاضری کی گھنٹی بجنے کا انتظار کرتا رہا۔ لڑکے اپنی قلم دواتیں اور کاپیاں لیے ہال کمرے میں امتحان کے لیے جا رہے تھے۔ اتنے میں غضنفر نے لیلا کو سامنے سے آتے دیکھا۔ وہ اکیلا تھا اور بڑی جلدی میں کہ کہیں پرچہ شروع نہ ہو جائے۔ غضنفر کو ہال کمرے کے دروازے پر کھڑا دیکھ کر وہ ٹھٹکا اور اس کا چہرہ خوف سے پیلا پڑ گیا۔ وہ الٹے پاؤں بھاگ کھڑا ہوا، مگر اسے پرچہ دینے کے لیے ہال کمرے میں جانا تھا اور اسے پہلے ہی دیر ہو چکی تھی۔ غضنفر کے چہرے پر ایک شیطنت کی کیفیت سی آئی۔ وہ آگے آگے بڑھا اور دونوں بازو پھیلا کر لیلا کا راستہ روکنے کو کھڑا ہو گیا۔ لیلا بیچارہ سخت دہشت اور ہراسانی کے عالم میں راستہ پانے کے لیے کبھی ایک طرف بھاگتا، کبھی دوسری طرف، مگر جدھر وہ جاتا غضنفر بانہیں چوڑی کیے اسے روکنے کے

لیے موجود ہوتا۔ یہ کھیل کچھ عرصے تک ہوتا رہا۔ آخر لیلا نے ایک طرف سے کچھ راستہ پا کر جست لگائی اور اپنے خوفناک حریف کو جل دے کر گولی کی سی تیزی سے امتحان کے کمرے میں داخل ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ غضنفر ہنسا اور حقیقت میں اس نے لیلا کی بدحواسی پر بڑی مسرت محسوس کی اور اپنی جواں مردی پر غرور۔۔۔ اور اس کی دل کی گہرائیوں میں ایک بے نام سی خلش سی بچی تھی اور ہونٹ لعاب سے گیلے۔ وہ حاضری کے لیے کمرے او پر کی جماعت کے لڑکوں میں جا شامل ہوا۔

اس فیصلہ کن ہفتے کو، جب اسکول میں چھٹی تھی، غضنفر کا باپ اپنی کھیتی پر تھا۔ غضنفر دن چڑھتے ہی گھر سے نکلا۔ اس کی ٹولی کے چھوکرے پرانے مڈل اسکول کے سامنے میدان میں ''میرا گھوڑا پیچھے'' کا کھیل کھیل رہے تھے جس میں تم ایک ٹانگ پر کھڑے ہوئے گھٹنوں کو پاؤں کے پیچھے سے خالوں میں سے نکالتے ہوئے اس طرح کہ وہ کہیں پڑ نہ آئے۔ غضنفر بھی کھیل میں شریک ہو گیا۔ وہ تھا بڑا ضدی اور خود رائے، اور کسی کھیل کے قاعدوں سے خود کو برتر سمجھتا تھا۔ جلد ہی اس کے ساتھی اس سے بگڑ گئے کہ وہ کھلنڈرا رہا ہے اور وہ کھیل چھوڑ کر تھر سے نیچے چڑھ جائے اور ان کو لوٹ دیتا۔ اسپتال والی پکی سڑک پر چل پڑا۔ آگے ایک چار دیواری تھی، جس کے دروازے پر اسٹیٹ اسٹیبل کا بورڈ آویزاں تھا۔ دیوار پر بہت سے چھوٹے لڑکے اوپر چڑھے بیٹھے تھے اور اندر ہونے والے نظارے کو غور اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے۔ غضنفر اچھل کر دیوار پر چڑھ گیا، جس کے دوسری طرف کوئی اپنی گھوڑی کا جفتی کرانے کے لیے آیا تھا۔ سرکاری گھوڑا اپنی اگلی ٹانگیں پوری اونچائی تک اٹھانے میں دقت محسوس کر رہا تھا اور سائیکل کے ہینڈل جیسی مونچھوں والا ایک شخص چابک ہاتھ میں لیے اسے 'میٹنگ' (mating) کی صحیح پوزیشن میں لانے میں مدد کر رہا تھا۔ غضنفر دوسرے لڑکوں کی طرح اس ملاپ کے مقصد کو پوری طرح نہیں سمجھتا تھا، مگر منظر تھا بڑا پرلطف، اور مضحکہ خیز بھی۔ وہ اور اس کے دوست، جب کوئی گھوڑی کا جفتی ہونے کے لیے آتی، یہاں موجود ہوتے اور موقع نہ جانے دیتے۔ جب گھوڑا اپنا کام کر رہا ہوتا تو وہ خوب ہنستے۔ اپنے دوستوں سے لڑ کر آنے کے بعد وہ ابھی غصے میں تھا، اس بار اسے اس تماشے کا خاص مزہ نہ آیا۔ تماشا ختم ہونے کے بعد وہ آگے نکل آیا۔ کچھ دیر جنازہ گاہ کی دیوار کے اوپر چڑھا رہا اور پھر شہر کی آخری عمارتوں کو چھوڑتا ہوا ریت کے ٹیلوں کے درمیان پڑے چھپڑ کی طرف جا نکلا۔ یہ جگہ اپنی عجیب جھاڑیوں، جنگلی پودوں اور تھرے آسمانی پانی کی مستطیل کی وجہ سے اس کے لیے ایک کشش رکھتی تھی اور اسے مقناطیس کی طرح کھینچا کرتی۔ وہ اکثر اپنی ٹولی کے ساتھ یا اکیلا وہاں جا نکلتا تھا۔۔۔ اور پھر دفعتاً اس نے لیلا رام کو دیکھا، وہ اکیلا چھپڑ کے کنارے کھڑا اس میں کنکر روڑے پھینک رہا تھا۔ ایک وحشیانہ سی کیفیت غضنفر کی آنکھوں میں آئی اور

اس کا دل زور زور سے دھک دھک کرنے لگا۔ وہ چھپڑ کی طرف بھاگنے لگا۔

اس فیصلہ کن جمعے کے دن لیلا رام اسی صبح اپنے دادا کے لیے، جو ایک مدت سے بیمار تھا، دوا لینے کے لیے گیا تھا۔ واپس آ کر وہ اپنا اسکول کا کام کرنے بیٹھ گیا۔ وہ بڑا محنتی طالب علم تھا؛ اگرچہ خصوصی طور پر ذہین نہیں تھا، مگر ماسٹر کے بیدوں یا سزا سے بڑا ہول کھاتا تھا۔ دوپہر کو اس کی ماں نے رسوئی میں کھانا پروس کر اسے کھلایا اور پھر تھال میں کچھ مکھانے اور چاول رکھ کر شہر کے باہر گنیش جی کے مندر میں پوجا کے لیے چلی۔ لیلا رام کو اس دن خدا جانے کیا سوجھی کہ وہ بھی چپکے سے کچھ فاصلے پر اپنی ماں کے پیچھے پیچھے چلنے لگا، اس طور سے کہ اس کی ماں کو پتہ نہ تھا کہ اس کا بیٹا اس کے پیچھے پیچھے آ رہا ہے۔ ایسی بات اس نے پہلے کبھی نہ کی تھی۔ اگر وہ اپنی ماں کو اسے ساتھ لے جانے کے لیے کہتا تو وہ اس کی اجازت نہ دیتی، کیونکہ بوڑھا دادا بیمار تھا اور گھر پر اور کوئی نہ تھا۔ ماں کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے، وہ اب اس کی حفاظت میں بھی تھا اور آزاد بھی، گو دادے کو اکیلا چھوڑ آنے پر اس کے ضمیر نے اسے کچھ کوسا۔ شہر کے باہر آ کر ماں گنیش کے مندر کے اندر چلی گئی۔ لیلا نے اسے اندر جاتے دیکھا اور جانتا تھا کہ اس کی ماں کی پوجا بڑی لمبی ہوتی ہے اور وہ وہاں سے آدھ گھنٹے سے پہلے نہیں نکلے گی۔ اب وہ یہ وقت کیسے گذارے۔ وہ اتنی دور چل آیا تھا اور چھپڑ، جہاں وہ اپنے دوستوں کے ساتھ آتا تھا، مندر سے ایک فرلانگ آگے، قریب ہی تھا۔ اس کے دمکتے نیلے پانی کی جھلک اسے دعوت دینے لگی۔ وہ یہ ارادہ کر کے اس کی سمت گیا کہ وہ وہاں کچھ دیر کھیلے گا اور پھر اپنی ماں کے پوجا پاٹ سے فارغ ہونے سے پہلے مندر کے باہر واپس آ جائے گا۔ وہ ریت کے ٹیلوں اور آک اور کوڑتموں کی جھاڑیوں میں سے اپنا راستہ ڈھونڈتا ہوا، چھپڑ کے کنارے جا پہنچا اور اس کے گدلے پانی میں کنکر پھینک کر لہروں کے بننے اور گم ہونے کا کھیل کھیلنے لگا۔ وہ اسی کھیل میں مشغول تھا کہ اس کے دشمن نے اسے دیکھا اور آنکھوں میں خون اتارے اپنے شکار کی طرف لپکا۔

غضنفر لیلا رام سے پچیس تیس قدم کے فاصلے پر تھا۔ جب لیلا نے اسے دیکھا، ایک لمحے کے لیے تو دہشت کے مارے اس کے قدم زمین سے جمے کے جمے رہ گئے، جیسے ہرن اپنی موت کو بھیڑیے یا کسی درندے کی شکل میں سامنے پا کر وہیں کھڑے رہ جاتے ہیں اور ہل نہیں سکتے۔ اس کی پیٹھ اینٹھ گئی، اس کے اعصاب تن گئے۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا اور پھر چھپڑ کے کنارے ایک طرف بھاگ کھڑا ہوا۔ مگر اس کے شکاری نے اس کی یہ بچنے کی چال جانچ لی تھی اور اس کا راستہ روکے آگے موجود تھا، اور وہ اپنے شکار کو ہر فرار کے راستے سے گھیر گھار کر چھپڑ کی طرف بڑھنے پر مجبور کرتا رہا —اپنی کامیابی پر پُریقین، جیسے ایک بلی جانتی ہے کہ آخرکار وہ اپنے چوہے کو اپنے پنجوں میں دبوچ

لے گی۔ لیلا بھی شاید یہ دل میں جان گیا تھا کہ اپنے اس خوفناک ایذا رسان سے، جو اس پر بڑھتا آ رہا تھا، کوئی فرار نہیں۔

غضنفر یہ نہ بتا سکتا کہ وہ یہ سب کچھ کیوں کر رہا تھا، کہ اس کھیل میں کیا تک تھی، کون سا آخری مقصد اور کون سی اندھی قوت اسے اس خوبصورت، دہشت زدہ برہمن لڑکے کو ذبح کرنے کے لیے لیے جا رہی تھی۔ وہ یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ شکار کو پکڑنے کے بعد، اس لڑکے کو قابو کرنے کے بعد، وہ اس کے ساتھ کیا کرے گا۔ اسے یہ کھیل کھیلتے ہوئے فقط ایک دیوانہ وار خوشی کا احساس تھا اور اس کا خون چڑھا ہوا تھا اور اس کی کنپٹیاں دھم دھم بج رہی تھیں اور اس کی آنکھوں میں ایک قاتل کی دمک تھی۔ وہ اب اس لڑکے لیلا کو بچ کر نہ جانے دے گا۔ یہ ایک خاموش مقابلہ تھا۔ لیلا نے خوف سے اپنی گویائی کھو دی تھی اور اگر وہ چلاتا یا مدد کے لیے آواز بھی دیتا تو اسے کوئی نہ سن سکتا۔ کیچڑ ایک ویران جگہ تھی، جہاں شہر کے لوگ کم ہی آتے اور اس وقت تپتی دوپہر میں سوائے پرلے کنارے پر جھاڑیوں میں منہ مارتی چند مریل بھینسوں یا مٹیالے آسمان پر اڑتی چیلوں کے وہاں کوئی زندہ چیز آس پاس دکھائی نہ دیتی تھی۔ شہر کے آخری گھر، کیچڑ کی طرف پشت کیے ہوئے، پیلے اور گلابی اور ہرے اور دھوپ میں شیشے بلور کی طرح چمکتے ہوئے، تقریباً ایک فرلانگ دور تھے۔ اور چند عورتیں اور مرد جو ان کے پاس جیسے چل پھر رہے تھے، رنگین کھسکتی ہوئی پتلیاں لگتے تھے۔ مندر سے گھنٹے کی مدھم جھنجھناہٹ آئی اور ایک لمحے کے لیے لیلا نے سوچا کہ اس کی ماں پوجا سے فارغ ہو کر اسے مندر کے باہر تلاش کر رہی ہے۔

لیلا کے لیے اب ادھر ادھر بھاگنے کی جگہ نہ تھی اور وہ تقریباً کیچڑ کے ریتیلے کنارے پر گھر گیا تھا۔ اس کے جفاکار نے اس پر آخری ہلہ کیا۔ حملے کا ڈر اس کے حلق میں اٹک گیا۔ کوئی آواز یا چیخ اس کے منہ سے نہ نکلی۔ اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ اس نے اپنے دشمن کے بازو اپنے کندھوں پر محسوس کیے اور پھر آناً فاناً آخری لمحے میں چھوٹے لڑکے میں سے جینے کی کوشش کی ایک ہولناک قوت ابل پڑی۔ اس نے اپنے طاقتور حریف کو کمر کے گرد گویا آہنی پنجے سے جکڑ لیا اور پیچھے کیچڑ میں گرتے ہوئے اسے بھی اپنے پھندے میں جکڑے ساتھ لے گیا۔

جب ایک گھنٹے کے بعد دونوں ڈوبے ہوئے لڑکوں کی لاشیں کیچڑ کی چوگھرے کے تختوں میں پھنسی ہوئی ملیں تو ان دونوں کے جسم ایک دوسرے سے اس طرح گھتے اور الجھے ہوئے تھے اور بازو ایک دوسرے کے گرد یوں حمائل جیسے وہ دو عاشق ہیں: اور شکاری اور شکار — شانت اور مطمئن — ایک تھے۔

لالٹین

میرے خسر مستری مہتاب دین کا نام تم نے سنا ہوگا — اس لیے نہیں کہ وہ حکومت کا کوئی وزیر ہے یا کسی فلم کا ڈائریکٹر یا کسی جماعت کا لیڈر ہے؛ وہ تو ان میں سے کچھ نہیں ہے۔ ''ہے'' کی جگہ پر ''تھا'' کہنا چاہیے تھا، اس لیے کہ پچھلے مہینے کی پندرہ کو جمعے کے مبارک روز، شام کے پانچ بجے، مستری موصوف کے فانی اور مستعار حصے کو میری آنکھوں کے سامنے سائیں ڈورے شاہ کے گورستان میں سپردِ خاک کیا گیا۔ اس کے غیر فانی اور دائمی حصے کے متعلق، جس کو اصطلاحِ عام میں ''روح'' کہا جاتا ہے، میں کچھ نہیں کہنا چاہتا کہ کہاں ہے— خدا ہی بہتر جانتا ہے— مگر مجھے بالکل کوئی تعجب نہیں ہوگا اگر وہ حصہ سیدھا بہشت میں گیا ہو۔ مستری مہتاب دین ان بے ضرر، محنتی، غیر دلچسپ انسانی روبوٹوں میں سے تھا جو عمداً گناہ کرنے کے اتنے ہی نااہل ہوتے ہیں جتنے نیکی کے ایک مثبت عمل کے۔ جہاں تک مجھے معلوم ہے، وہ اپنی بیوی کا وفادار تھا، ایک مہربان اور منصف باپ تھا اور پانچوں نمازیں بلاناغہ ادا کرتا تھا۔ مختصراً وہ اس قسم کے لوگوں میں سے تھا جو سیدھے بہشت میں جاتے ہیں (اگر تم بہشت کی قسم کی چیزوں میں یقین رکھتے ہو تو)۔ ہاں، اگر تم نے (غالباً) اس کا نام سنا ہوگا تو حال میں، اخباروں میں، ایک خوفناک حادثے کے ضمن میں، جس میں... مگر شاید تم نے نہیں سنا اور مجھے تمھاری خاطر یہ کہانی خراب نہیں کرنی چاہیے۔

مستری مہتاب دین سے میری واقفیت تین چار سال سے تھی — اس وقت سے جب میں پہلے پہل اپنے مربی اور مہربان خان بہادر سخاوت علی کے توسط سے مل رائٹ شاپ میں بطور ایک غیر تربیت یافتہ مزدور بھرتی ہوا اور مستری کے ساتھ کام سیکھنے پر لگا دیا گیا۔ انسانیت کو کئی ایک لحاظ سے کئی ایک اقسام میں تقسیم کیا گیا ہے — زندہ دل اور مردہ دل؛ باتونی اور چپ، وغیرہ، اور میں

نے بھی ایک تقسیم کا سوچا ہے جو اپنے طور پر اتنی ہی اچھی ہے جتنی کوئی اور۔ مجھ سے پوچھو تو دنیا میں دو قسم کے آدمی بس رہے ہیں: ایک وہ جو مستری ہیں اور دوسرے وہ جو مستری نہیں ہیں۔ کم از کم میں اپنے ذاتی تجربے کی بنا پر کہہ سکتا ہوں کہ مستریوں اور غیر مستریوں میں نفسیاتی لحاظ سے جو تفاوت کی خلیج ہے وہ کبھی پاٹی نہیں جا سکتی۔ میں نے کئی ایک مستریوں کے تحت کام کیا ہے، ایک دو سے میرے دوستانہ مراسم یہاں تک بڑھے ہوئے ہیں کہ میں ان کو ان کے نام سے بلاتا ہوں، اس لیے ان کے متعلق میری رائے ایک ایسے آدمی کی رائے ہے جو جانتا ہے۔ میں یہ اقرار کرنے کو تیار ہوں کہ وہ سب قابل قدر آدمی ہوتے ہیں اور فیس اور بیونے کے ایسے ایسے تجربات کر سکتے ہیں جو کم از کم میرے لیے تو حیران کن اور قابل رشک ہیں، مگر وہ مستریانہ نفسیات، وہ خاموش برتری کا انداز جس سے وہ باقی انسانیت سے ایک الگ اور ممتاز حیثیت کا دعویٰ کرتے ہوئے معلوم ہوتے ہیں، ایک ایسی خصوصیت ہے جو خاص مستریانہ ہے۔ یہ نہیں کہ ان کا اس احساس برتری میں کچھ اپنا قصور ہے: یہ یقینی بات ہے کہ اگر کل تم خود مستری بن جاؤ تو تم بھی اس برگزیدہ جماعت کے ایک فرد کی حیثیت میں کچھ الگ سی، کچھ سنجیدہ سی اور کچھ پدرانہ سی شفقت کی نمائش کرنے کی کوشش کرو گے۔ پرانی روایات کو جھٹلایا نہیں جا سکتا اور میں خود جس دن سے مستری بنا ہوں، بے حد متین اور اتنا ذمے دار ہو گیا ہوں جیسے ایک دم میری زندگی کے بیس مزید سال گذر گئے ہوں۔ مستری بننے سے پہلے میں زور زور سے ہنسنے کے لیے مشہور تھا، اب میں صرف مسکراتا ہوں — اور مستری اور غیر مستری میں یہی ایک نمایاں فرق ہے۔ مگر یہ سب بحث غیر ضروری ہے اور اس تاریخ سے اس کا چنداں تعلق بھی نہیں۔ پھر بھی اس سے تم کو میرے مرحوم خسر کے کردار کا تھوڑا بہت اندازہ ہو جائے گا کیونکہ وہ اپنی جماعت کا ایک مکمل نمائندہ تھا۔

مہتاب دین مل رائٹ شاپ میں ہیڈ مستری تھا — بھاری گٹھا ہوا جسم، کندھوں سے کچھ آگے کو جھکا ہوا، چھوٹی چھوٹی آنکھوں پر عینک لگی ہوئی، تنگ ماتھے پر گہری مستقل لکیریں، ہٹلر کی سی تراش کی مونچھیں۔ جیسا کہ میں نے لکھا ہے، وہ اپنی جماعت کا ایک صحیح نمونہ تھا۔ اس جیسے دس ہزار اور ہوں گے۔ ورکشاپ کے بیس برس اور ایک محنتی، وقت طلب عادت کی بدولت اس نے اپنے کام میں ایک حقیقی قابلیت اور مہارت حاصل کر لی تھی۔ سکھ چارج مین کو چھوڑ کر وہ شاپ میں سب سے زیادہ اہم اور معتبر آدمی تھا۔ ایک طرح اسی کی وجہ سے شاپ کی سوراخ کرنے اور کاٹنے والی مشینیں سارا سارا دن گھر گھراتی رہتی تھیں۔ اسی کے بنائے ہوئے ماپ کے پورے دائروں میں وہ سوراخ کرتی تھیں اور اسی کی کھینچی ہوئی سطروں پر وہ کاٹتی تھیں۔ یہ تصور کرنا مشکل ہے کہ اگر وہ کسی دن نہ

آسکتا تو شاپ کے کام کی کیا حالت ہوتی — غالباً شاپ کی آدھی مشینوں کو بیکار رہنا پڑتا۔ مگر مہتاب دین سورج کی طرح پابند اور گھڑی کی طرح باقاعدہ تھا اور جہاں تک مجھے علم ہے وہ نہ تو کبھی بیمار ہوا اور نہ ہی کسی اور وجہ نے کبھی اسے اپنی ڈیوٹی سے غیر حاضر کیا۔

پہلے پہل مجھے اس کے ساتھ ہی کام پر لگایا گیا، اور یہ اس کی بردباری اور تحمل کی دلیل ہے کہ جتنا عرصہ میں نے اس کے ساتھ کام کیا، اس نے کبھی میرے ساتھ غصے یا خفگی کا اظہار نہیں کیا۔ مجھے یقین ہے کہ میں اس کے لیے زیادہ کارآمد نہ تھا؛ کئی کاموں کو میں نے بگاڑا ہوگا۔ میں نیا آدمی تھا اور اپنے کام میں زیادہ دلچسپی نہیں لیتا تھا۔ مجھے غلط فہمی تھی کہ خدا نے مجھ کو مختلف اور بہتر چیزوں کے لیے پیدا کیا ہے اور ہمیشہ میرے دماغ میں سنیما کا ایکٹر یا کتابوں کا مصنف بننے کی خواہشیں بسی رہتی تھیں۔ اندریں حالات کام میں دلچسپی خاک لیتا۔ میرے بجائے شاید ایک گوریلا مستری کا زیادہ معاون اور مددگار ہو سکتا۔ شروع شروع میں مستری اور میرے تعلقات میں کچھ کھنچاؤ اور دوری سی رہی: ایک تو اس وجہ سے کہ ایک مستری (اور پھر ہیڈ مستری) اور ایک معمولی ورکر میں اصلی دوستی ہے ہی ناممکن؛ دوسرے، میں اپنے آپ کو اس کے سامنے ایسا محسوس کرتا جیسا کہ ایک کند ذہن لڑکا اپنے اسکول ماسٹر کے سامنے۔ کبھی کبھی میں مستری کو ادھر ادھر کی باتوں سے ہنسانے کی کوشش کرتا، لیکن اگر کبھی وہ مجھے ممنون کرنے کے خیال سے مسکراتا بھی تو بڑی برتری اور دوری کے انداز میں۔ میرا مطلب ہے کہ مستری اور میں کبھی 'لنگوٹیے' نہیں بن سکے — ان آخری دنوں میں بھی نہیں۔ اگرچہ اس نے کبھی کسی لفظ یا اشارے سے مجھ پر اس قسم کا کوئی اظہار نہیں کیا، پھر بھی میں یہ محسوس کرتا تھا کہ مستری مہتاب دین میری پیشہ ورانہ نااہلیت کو اور ہر بات میں میری غیر سنجیدگی کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ اگر مستری اس قدر نیک دل اور متحمل نہ ہوتا تو خان بہادر کے مربیانہ رسوخ کے باوجود میں شاپ سے کبھی کا بغیر نوٹس کے نکالا جا چکا ہوتا — اس صورت میں اب غالباً میرا خسر کوئی اور ہوتا۔

میں اور مستری مہتاب دین ایک ہی گلی میں رہتے تھے، بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ ہم ہمسائے تھے۔ تم نے وہ گلی ضرور دیکھی ہوگی جو ہوٹل ڈی ریولی کی بغل میں سے ہوتی ہوئی لنڈے بازار میں مسجد شہید گنج کے سامنے آنکلتی ہے، اور تم نے اس طرف جاتے ہوئے اپنے بائیں کو ان سیاہ اور مایوس کن بالاخانوں کی قطار بھی دیکھی ہوگی جن کی لکڑی کی عجیب منقش بالکنیوں پر ہمیشہ غلیظ اور دبیز پردے پڑے رہتے ہیں۔ اس قسم کے بالاخانے تم کسی وقت ریلوے روڈ یا کسی اور روڈ پر بھی دیکھ سکتے ہو۔ مجھے یہ علم نہیں کہ ان کو کس نے ایجاد کیا، کون ان کا پہلا نقشہ گر تھا: مگر وہ جو ایک دائمی اور

مستقل انحطاط کی حالت ان پر چھائی رہتی ہے، میرے لیے ان کو رومانس کی چیزیں بنا دیتی ہے۔ تم نے گذرتے وقت کئی دفعہ تعجب کیا ہوگا کہ ان بالا خانوں میں کس قسم کے لوگ رہتے ہوں گے اور شاید تمھارے تصور نے خوبصورت اور ماہ چہرہ زلیخاؤں کے خواب دیکھے ہوں گے جو ان دبیز پردوں کے پیچھے ساری عمر ایک اداس کنوار پن میں گذار دیتی ہیں اور بوڑھی چڑیلیں ہو کر مر جاتی ہیں، یا کبھی تم کچھ کچھ یہ امید کرنے لگ جاتے ہوگے کہ کوئی ہاتھی دانت جیسا زرد سپید ہاتھ، جس کے اوپر نازک کلائی پر طلائی کنگن ٹھٹھا اور کھنکھنا رہے ہوں گے، تم کو چھتے ہوئے پردے کے پیچھے کسی الغوزے یا طنبورے پر حرکت کرتا ہوا دکھائی دے گا اور ہوشربا الف لیلوی گانے کی لہریں نیچے تمھارے کانوں میں آئیں گی، اور کوئی بوڑھا سفید مہربان داڑھی والا آدمی، شاید بخارا کا کوئی سوداگر بچہ، تم کو ہاتھ کی جنبش سے اوپر آنے کا اشارہ کرے گا — میرے دوستو، ان بالا خانوں میں نہ تو کوئی بخارا کا سوداگر بچہ ہے اور نہ اپنی جوانی کے کھنڈروں میں بیٹھی ہوئی زلیخا ہیں۔ ان میں ٹھوس اور معتبر اور سنجیدہ آدمی رہتے ہیں جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ زندگی کوئی مذاق نہیں اور اس کے ساتھ سنجیدگی سے نمٹنا چاہیے۔ ان بالا خانوں میں سے ایک میں مستری مہتاب دین اپنی بیوی اور چار بچوں کے ساتھ رہتا تھا، اور اگر اب بھی تم ان مکانوں کے متعلق رومانی خیالات رکھنے یا سوچنے پر اصرار کرو تو یقیناً تم باؤلے ہو — میری طرح۔

اس گلی کے نکڑ پر میرا، یا یوں کہو کہ میرے دوست شیخ شیر علی شیر فروش کا، بالا خانہ ہے اور اس کے نیچے اس کی دکان ہے جس پر ہر وقت خالص دودھ مل سکتا ہے۔ دودھ کے خالص ہونے کی میں خود گواہی دیتا ہوں۔ مجھے دن میں کئی بار وہاں دودھ پینے کا اتفاق ہوتا ہے اور مجھے یہ کہنے میں مطلق باک نہیں کہ میں نے ہمیشہ دودھ کو عمدہ اور خالص پایا۔ شیخ شیر علی طبعاً دوسرے شیر فروشوں کی طرح ملاوٹ کی قسم کی چھوٹی اور ذلیل کمینگیوں پر اتر ہی نہیں سکتا۔ اگر تم کو اس دکان کے پاس سے کبھی گذرنے کا اتفاق ہوا ہے تو تم نے ایک اونچے گنبد نما سر اور چشموں والے، ادبی ڈھال کے چہرے والے آدمی کو دودھ کی ایک بڑی کڑھائی میں چمچہ پھیرتے دیکھا ہوگا، اور اگر تم چہروں کو یاد رکھنے والے آدمی ہو تو وہ چہرہ جلدی نہیں بھول سکتے۔ میرا یہ دوست ایک شاعر ہے، ایک فلاسفر — ان بڑی شاعروں اور فلاسفروں میں سے نہیں جو سوائے اپنے آپ کے ساری دنیا سے بیزار معلوم ہوتے ہیں۔ زندگی کے متعلق اس کی ایک اپنی انفرادی روشن فلاسفی ہے اور اس کے لیے کڑھتے ہوئے دودھ میں اتنا ہی رومان، اتنی ہی شعریت ہے جتنی کہ ایک خوبصورت عورت میں۔ بے حد قابل اور ذکی ہے میرا یہ دوست۔ اس نے کچھ جدت پسند شاعری بھی لکھی ہے — میرا مطلب اس

شاعری سے ہے جس کا ایک مصرع بہت لمبا ہوتا ہے اور دوسرا بالکل چھوٹا، اور جس کا مطلب صرف لکھنے والا شاعر ہی سمجھ سکتا ہے اور وہ ایک معرکہ آرا علمی مضمون ''قرونِ وسطیٰ کے سماج میں بھینسوں کی اہمیت'' کا بھی مصنف ہے جو ان اصحاب کے لیے جو بھینسوں میں کسی قسم کی دلچسپی رکھتے ہیں، نہایت کارآمد اور مفید ہے۔ میں نے اس کو ابھی تک نہیں پڑھا کیونکہ مجھے بھینسیں بالکل اچھی نہیں لگتیں۔ اس کے علاوہ شیخ شیر علی نے فلم کمپنی کے لیے ایک ڈراما بھی لکھا ہے — منظر نامہ اور مکالمہ اور سب کچھ۔ اس کا نام دوشیزہ فرانس عرف محبوبہ مصر ہے۔ یہ سچے عشق کی کہانی ہے، خاص کر آخری سین بے حد دردناک ہے جس میں شیخ کے لڑکے ہیرو اور شیخ کی (ایک دوسرے شیخ کی) لڑکی ہیروئن کی روحیں ہاتھ میں ہاتھ ڈالے قبروں میں سے آسمان کی طرف اٹھتی اور گاتی ہوئی دکھائی گئی ہیں۔ شیخ شیر علی نے یہ ڈراما مشہور فلم کمپنی فصلی بٹیرے لمیٹڈ کو بھیجا ہوا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اگر فصلی بٹیرے تھوڑے بہت بھی اہل نظر ہوئے تو فوراً اس ڈرامے کو اپنی اگلی فلم کے لیے خرید لیں گے۔ وہ ڈرامے کو چھ سات ہزار سے کم میں قطعاً نہیں بیچے گا۔ غالباً فصلی بٹیرے اس کو اپنی فلم کمپنی میں مستقل مکالمہ نویس کے عہدے کی پیشکش بھیجیں گے۔ اس صورت میں اس کا وعدہ ہے کہ وہ دودھ کی یہ دکان مجھے سونپ جائے گا۔

ہماری دکان کے سامنے، ایک دو گھر چھوڑ کر، محمد الدین درزی کی دکان کے اوپر، مستری مہتاب دین کا بالاخانہ تھا، جس کی بالکنی پر ہمیشہ تاریک اور غلیظ بوریاں لٹکتی رہتی تھیں۔ سورج کتنا ہی چمکیلا کیوں نہ ہو اور آسمان کتنا ہی نیلا، جس وقت تمھاری نظر ان تاریک بوریوں پر پڑتی (میری نظر اکثر ان پر پڑتی تھی) آسمان بھورا اور میلا سا ہو جاتا اور کثیف سے بادل تمھاری روح پر چھا جاتے اور تم کو مستری مہتاب دین پر، اس کے مستری ہونے کے باوجود، رحم سا آنے لگتا۔ پھر مستری مہتاب دین ایک غیر دلچسپ، معمولی سا آدمی تھا اور میں جانتا تھا کہ تصور کی بلند ترین پرواز بھی اسے بخارا کے سوداگر بچے میں تبدیل نہیں کر سکتی اور اس لیے وہ عجیب اسرار اور رومانیت کا ہالہ جو مجھے ساتھ کے بالاخانوں کے گرد نظر آتا تھا اور جو ان کی دائمی غلاظت کو ایک خوبصورت رومان کی شکل دے دیتا تھا، مستری کے بالاخانے کے گرد مجھے نظر نہ آتا۔ یہ احساسات اس دن سے پہلے کے ہیں جس دن میں نے ورکشاپ سے لوٹتے وقت بوری کے پیچھے سے ہاتھی دانت جیسے ایک زرد و سفید ہاتھ کو باہر گلی میں کدو کے چھلکے پھینکتے دیکھا۔ اس دن سے تو میرا یہ عالم تھا کہ میری نظریں ہمیشہ ان تاریک غلیظ بوریوں پر یوں گڑی رہتیں جیسے وہ دنیا کے خوبصورت ترین اور عجائب ترین حریری پردے ہوں۔ اس دن سے بوڑھا مستری مہتاب دین بھی مجھے کچھ کچھ مہربان ڈاڑھی والا بخارا کا سوداگر بچہ لگنے لگا

— اگرچہ اس خود فریبی کی تکمیل میں ایک خرابی یہ تھی کہ مستری مہتاب کی داڑھی نہ تھی۔ تاہم ان سب باتوں کا ذکر مناسب موقع پر تفصیل سے آئے گا۔ پہلے میں تم کو لالٹین کے بارے میں بتا لوں — یا لالٹین کے ڈھانچے کے بارے میں، جس کا اس تاریخ میں اتنا ہی اہم مقام ہے جتنا کسی اور انسانی کردار کا۔ تب بھی یہ لالٹین میرے لیے زندہ تھی — معصوم اور بے ضرر اور بیکار۔ بعد میں یہ میرے گمانوں سے بھی کئی چھے زیادہ زندہ نکلی، اور پھر اتنی معصوم اور بے ضرر بھی نہیں جتنی یہ نظر آتی تھی۔

مستری مہتاب دین کے بالاخانے کے نیچے اس دروازے پر جہاں سے سیڑھیاں اوپر چڑھتی تھیں، کوئی پچیس فٹ اوپر یہ لالٹین اڑی تھی — ایک ٹوٹا ہوا، زنگ خوردہ لالٹین کا ڈھانچہ۔ اس کا لوہا اب سیاہی مائل سرخ ہو کر ابھر رہا تھا، دیوار میں سے نکلتا ہوا لوہے کا ایک بازو اس کو گلی کے اوپر سہارا دیے ہوئے تھا اور لوہے کا بازو کئی برس سے یہ کام کرنے کی وجہ سے کچھ جھک گیا تھا یا اندر سے دیوار میں اس کی نشست کھلی اور کھوکھلی ہوگئی تھی کیونکہ اب وہ بازو کچھ نیچے جھک آیا تھا اور اس کے ساتھ لالٹین کا ڈھانچہ بھی۔ میرے خیال میں شاید ہی کبھی کسی نے اس کی طرف دھیان دیا ہو، مگر میں اس کو دیکھ کر اکثر سوچا کرتا کہ شاید اس کو روشن ہوئے عمریں بیت گئی ہوں گی اور یہ کہ اب اس میں کبھی روشنی نہیں ٹمٹمائے گی۔ وہ ایک خاموش اور رومانی دنیا کی نشانی تھی۔ پھر یہ بجلی کے اونچے بدصورت کھمبے اس روشنی اور رومان میں کریہہ بدتمیز اجنبیوں اور غیر ملکیوں کی طرح گھس آئے تھے — پہلے بڑی سڑکوں اور شاہراہوں پر، اور بعد میں ان چھوٹی گلیوں میں بھی — اور وہ چوکور خود پوش لالٹینیں جو گلیوں کے نکڑوں پر سے اندھیری راتوں کو جگاتی تھیں اور شہر کے رہنے والوں اور باہر کے مسافروں کے لیے لامحدود ممکنات کی حامل تھیں، جن کی مدھم زرد کانپتی روشنیوں میں گدڑی والا فقیر ایک بھیس بدلا ہوا ہارون الرشید نظر آنے لگتا تھا اور ناممکن ترین باتیں سچی ہونے لگتی تھیں — وہ چوکور خود پوش لالٹینیں ماضی کی چیزیں ہوگئیں۔ لوگ ان کو دیواروں میں سے اکھاڑ کر لے گئے۔ اب ان دنوں تم لاہور کے سارے گلی کوچے چھان مارو، تم کو شاید ہی لالٹین کا کوئی پرانا ڈھانچہ کسی دیوار کے کونے میں اٹکا ہوا مل سکے، کیونکہ جنگ کے بعد سے لوہا مہنگا ہو گیا ہے، لوگ اب ٹھوس اور لالچی بن گئے ہیں اور دیوار میں لگی ہوئی لالٹین کی رومانیت اور شعریت کو وہ نہیں سمجھ سکتے۔ ایسے زمانے میں اس لالٹین کے ڈھانچے کا دیوار میں اٹکا رہ جانا مجھے ایک عجیب بات لگا۔ غالباً کبھی کسی کا اس کی طرف دھیان نہیں گیا تھا کیونکہ یہ بہت اونچی تھی اور دیوار کی طرح بے رنگ تھی۔ اگر کسی نے کبھی اس کی طرف دھیان دیا بھی ہو تو اس کا لوہا اب اس قدر زنگ خوردہ اور بیکار ہو چکا تھا کہ اس کو چاندی کے سکوں میں تبدیل نہیں کیا جا سکتا تھا — یا شاید اسے ابھی اپنی قسمت کی تکمیل کرنی تھی اور انسانوں

کے اس ڈرامے میں کرم کے لکھے کے مطابق وہ آخری اور خوفناک پارٹ ادا کرتا تھا جس کے لیے یہ اتنے برس سے اس دیوار میں اس خطرناک حالت میں لگی ہوئی تھی۔ ان بتوں، جیسا کہ میں نے اوپر لکھا ہے، ماضی کی یہ نشانی مجھے بالکل معصوم اور بے ضرری نظر آتی تھی اور اس چیلنج میں جو وہ بجلی کے کھمبوں کو دیتی معلوم ہوتی تھی، ایک دیدہ دلیری اور بہادری کا انداز تھا۔ اس بیچاری حرماں نصیب لالٹین پر ایک الگ کہانی لکھی جا سکتی ہے اور اگر کوئی شاعر اس کو دیکھ پاتا تو اس پر ایک رباعی کی صورت میں ایک چھوٹا سا خوبصورت کتبہ لکھنے پر مجبور ہو جاتا جو اس لالٹین کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے غیر فانی بنا دیتا۔

شاید تم اس لالٹین کے اس قدرے طویل بیان سے اکتا گئے ہو گے، لیکن یہ لالٹین اس تاریخ کے اہم کرداروں میں سے ہے اور میں اس کو آسانی سے چار پانچ سطروں میں ٹال دینا انصاف سے بعید سمجھتا تھا۔ ہاں، اگر تمھاری خوشی یہی ہے تو میں اب اس کا ذکر نہیں کروں گا — البتہ میں آخری صفحے کی ذمے داری قبول کرنے کو تیار نہیں ہوں کیونکہ وہاں تو وہ خود آ ٹپکتی ہے۔ بہرحال اب میں اسے چھوڑتا ہوں اور اپنی کہانی جاری رکھتا ہوں۔

ہمسائے ہونے کے باوجود شاذونادر ہی میں اور مستری مہتاب دین گلی میں ایک دوسرے کی صورت دیکھتے ہوں گے۔ کبھی بہت سویرے جب میں ورکشاپ کی ٹرین کو پکڑنے کے لیے گلی میں سے دوڑتا ہوا جاتا تو وہ مجھے ایک مطمئن چال سے خراماں خراماں جاتا ہوا ملتا۔ ''ابھی وقت ہے،'' وہ اپنی چوڑی، موٹی اور بھاری جیبی گھڑی کو مسترِیانہ خود اعتمادی سے دیکھ کر مجھے بتاتا اور پھر ہم اکٹھے ہی ریلوے اسٹیشن کے اس یارڈ تک جاتے جہاں سے ہماری ورکشاپ کی گاڑی چلتی ہے، اکٹھے ہی ایک کمپارٹمنٹ میں بیٹھتے اور اکٹھے ہی بجھی صبح میں انجنوں اور ریلوے لائنوں اور سگنلوں کے پاس سے تیس میل کی رفتار پر گڑگڑاتے ہوئے گذرتے۔ ورکشاپ میں تو میں ہمیشہ رہتا ہی اس کے ساتھ تھا۔ ورکشاپ سے واپسی کے وقت ہم قدرتاً ایک دوسرے سے بچھڑ جاتے۔ میں اس وقت، جبکہ جسم اور دماغ بالکل تھکے ہوئے ہوتے تھے، اس سنجیدہ اور غیر دلچسپ معمر آدمی کی صحبت پر اپنے ہم عمر بے فکروں کی صحبت کو ترجیح دیتا تھا۔ مستری کا بظاہر ایک کافی گہرا دوست تھا جو ساتھ کی لوکو شاپ میں کرین پر کام کرتا تھا۔ وہ اور مستری ورکشاپ سے ہمیشہ اکٹھے لوٹتے۔ کبھی کبھی وہ چھٹی کا سائرن بولنے سے کچھ پہلے ہی شاپ کے باہر آ کر مستری کا انتظار کرتا۔

اس کا نام مستری رحیم بخش تھا۔ وہ ایک موٹا، بھاری، عامیانہ قسم کا آدمی تھا — ایک لمبی، مہندی سے رنگی ہوئی سرخ ڈاڑھی والا آدمی جو بائلروں کی صحبت میں رہ رہ کر اب خود اس حد تک

ایک باغر گننے لگ گیا تھا جس حد تک ایک انسان باغر لگ سکتا ہے۔ اس کے ہونٹ موٹے اور وحشیانہ سے تھے۔ اس کی آنکھیں بالکل چھوٹی تھیں اور ان میں ایک عیارانہ دمک سی تھی۔ میں کئی دفعہ تعجب کرتا کہ مستری مہتاب دین اور مستری رحیم بخش عادات اور طبیعت کے اتنے اختلافات کے باوجود کیونکر اتنے گہرے دوست ہیں۔ میں نے سوچا، شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ مستری مہتاب دین اپنی خوش اخلاقی کی وجہ سے کسی سے اختلاف رائے نہیں رکھتا اور فوراً ہر شخص سے ہر معاملے میں اتفاق کر لیتا ہے، اور رحیم بخش جیسے شوریدہ اور شولیدہ آدمی کو، جسے اور کوئی منھ لگتے نہیں دیتا، مستری مہتاب دین میں ایک ایسا آدمی مل گیا ہے جو اس کی ہاں میں ایک شاکرانہ انداز کی ہاں ملانے کو تیار رہتا ہے۔ میں نے یہ بھی دیکھا کہ یہ مستری رحیم بخش ہی تھا جو مستری مہتاب دین کی سوسائٹی کا متلاشی تھا — شاید روح کے اس سکون اور اطمینان کی خاطر، جو مستری کی صحبت میں اسے حاصل ہوتا تھا۔ کئی دفعہ وہ ہماری مل رائٹ شاپ میں آ جاتا اور دیر تک ریلوے ورکشاپ کی اندرونی سیاست پر باتیں کرتا رہتا۔ اپنے چارج مینوں کو برا بھلا کہتا، اپنی مرحومہ بیوی کو یاد کرتا اور جب وہ آدھے گھنٹے میں ایک سو ایک موضوعات پر بول چکتا، اور مستری مہتاب دین اس کی ہر بات سے فوراً اتفاق کر چکتا، تو وہ واپس اپنی شاپ میں اپنے کام پر چلا جاتا۔ اسے اپنی آواز سے محبت تھی، جو کچھ اس قسم کی تھی جیسے ریل کے پہیے کی آواز جسے بریک لگائی گئی ہو۔ میں اس سے قدرے نفرت کرنے لگ گیا۔ میں نے اس کی کبھی پروا نہ کی۔ کبھی کبھی وہ ایک خاص پدرانہ انداز میں میری طرف دیکھ کر مستری مہتاب دین سے پوچھتا، "مہتا بیا، یہ ہمارا چھوکرا اسامیل کچھ سیکھ بھی رہا ہے؟" — جیسے وہ ذاتی طور پر میری تربیت کا ذمہ دار اور میرا نگران ہو۔ ایسے وقت وہ مجھے بڑا برا لگتا — آدمی کے لیے اس کا ایک باپ ہی بہت کافی ہوتا ہے۔

مستری مہتاب دین کا شام کا وقت عموماً ان موٹی بوریوں کے پیچھے اپنی بیوی اور بچوں کے ساتھ گذرتا۔ تفریحات اور کھیل تماشے اس کے لیے کوئی کشش نہیں رکھتے تھے۔ ہاں، ایک دفعہ میں نے اس کو مستری رحیم بخش کے ہمراہ ایک سینما میں دیکھا۔ غالباً اس کا یہ دوست، جس کے سامنے وہ انکار نہیں کر سکتا تھا، اس کو بوریوں کے پردے والی بالکنی کے سکون سے کھینچ کر یہاں لے آیا ہوگا — کچھ ساتھ کی خاطر اور کچھ شاید اس لیے کہ مستری مہتاب دین دونوں کے ٹکٹ خریدے گا۔ (انھوں نے غالباً مجھے نہ دیکھا۔ فلم شاید تھیڑ تھی جو ڈائرکٹر مارو دھاڑ کی ہدایت کی ہوئی ہے۔ پہلا ہفتہ تھا اور رش بڑا زبردست تھا۔ میں لوگوں کے سروں کے اوپر لیٹا ہوا ہاتھ ٹکٹ کی کھڑکی کے اندر ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میرے عزیز دوست شیخ شیر علی نے مجھے پیچھے ٹانگوں سے سہارا دے رکھا تھا — آدھ

وہ بے فکری کے پیارے دن!)

عموماً میرا شام کا وقت بھی شیخ شیر علی سے مصنفوں اور کتابوں کی باتیں کرتے گذرتا۔ شاید ہی کسی شخص کو ان حیران کن آدمیوں کے متعلق جو کتابیں اور افسانے اور نظمیں لکھتے ہیں، اتنی معلومات ہوں گی جتنی شیخ شیر علی کو۔ اس کی باتوں میں گہری عقیدت سے زیادہ رشک کا رنگ ہوتا تھا۔ مجھ سے پوچھو تو واقعی وہ لوگ کمال کرتے ہیں۔ مجھے تو ایک خط لکھنا پڑتا ہے تو مصیبت پڑ جاتی ہے۔ ''آپ کی خیریت نیک مطلوب ہے'' سے آگے ایک لفظ نہیں سوجھتا۔ (شیخ شیر علی کے کہنے پر میں نے ایک جاسوسی ناول خوفناک نقاب پوش کا آغاز کیا تھا مگر پہلے باب کے بعد، جس میں ہیرو ہیروئن کو دیکھ کر فوراً غش کھا کر گر پڑتا ہے اور اسے ہسپتال پہنچایا جاتا ہے، میری ساری خلاقانہ طاقتیں جواب دے گئیں۔) خود شیخ شیر علی، جو فی الواقع ایک جینیس، ایک نابغہ ہے، ابھی تک اپنا نام کسی رسالے میں چھپا ہوا نہیں دیکھ سکا۔ اس کا معرکہ آرا مضمون ''قرونِ وسطیٰ کے سماج میں بھینسوں کی اہمیت'' پانچ چھ رسالوں سے واپس آ چکا ہے۔ اور تو اور، مدیر رسالہ مویشی تک نے اس کو چھاپنے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ میں نے یہ کہہ کر شیر علی کی ڈھارس بندھائی کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ مضمون اشاعت کے قابل نہیں: اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ غافل لوگ بھینسوں کے ماضی یا مستقبل سے قطعاً بے پروا ہیں۔ پھر بھی مویشی والا معاملہ ایسا تھا کہ اس کا جواب میرے پاس بھی نہ تھا۔

مہینے میں چار پانچ بار مستری مہتاب دین ہماری دکان پر دودھ پینے آتا — کبھی اکیلا اور کبھی مستری رحیم بخش کے ہمراہ۔ ایسے موقعوں پر میں دل ہی دل میں خوش ہوتا۔ میں فیاضانہ لہجے میں کہتا، ''بھائی شیر علی، مستری مہتاب دین کے گلاس میں بالائی ذرا زیادہ ڈالنا۔'' مجھے اب تک صرف اس قدر اثر اور رسوخ حاصل ہو سکا ہے کہ لوگوں کے دودھ میں زیادہ بالائی ڈلوا دوں، اور وہ بھی صرف شیخ شیر علی کی دکان پر۔ مستری مہتاب دین کے گلاس میں بالائی زیادہ ڈلوانے سے مجھے قطعاً یہ غلط فہمی نہ تھی کہ وہ میری اس فیاضانہ سفارش کی وجہ سے میرے بارے میں اپنی رائے بدل دے گا۔ اس کی توقع ہی فضول تھی۔ میرے متعلق مستری کی جو رائے ان دنوں تھی اس کا مجھے بخوبی علم تھا، تم بھی اس کو جانتے ہی ہو۔ میں فقط اس کو اپنا ممنون کرنے کا خواہش مند تھا۔ دراصل میں مستری کو اپنی طاقت اور رسوخ کے مطابق ممنون کر کے صرف اپنی خود بینی کے جذبے کو تسکین پہنچا رہا تھا۔ (اگر تم کو زیادہ بالائی والا دودھ پینے کا شوق ہے تو میں دوست بنانے کے لیے مناسب ترین آدمی ہوں۔)

اور اب میں اس شام پر آتا ہوں جس کا ذکر میں نے پہلے کیا ہے، جب شرارت کا آغاز ہوا۔

جب ایک چھوٹے ، ہاتھی دانت جیسے سفید ہاتھ نے بوری کے پردے سے باہر ایک تھالی کو اوندھا کر کدو کے چھلکے تقریباً میرے سر پر الٹ دیے۔ مجھے تاریخ بھی یاد ہے — اگرچہ میں اس قسم کا آدمی ہوں جو کئی دفعہ سال تک بھول جاتا ہے۔ مئی کے مہینے کی ستائیس تھی اور جمعے کا دن تھا۔ میں معمول کے مطابق شام کو ریلوے اسٹیشن سے اکیلا واپس آ رہا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ اس دن یہ بالا خانے مجھے روز سے کہیں زیادہ مایوس کن اور دل دُکھا دینے والے معلوم ہوئے۔ ان کو دیکھ کر مجھے یہ احساس ہوا جیسے کسی نے کیچڑ سے بھرا ہوا ہاتھ میرے دل پر رکھ دیا ہو اور میں کچھ سوچنے سا لگ گیا کہ آخر میں نے اب تک خودکشی کیوں نہیں کی۔ اصل میں اس روز میرے ساتھ ورکشاپ میں بعض ناخوشگوار باتیں ہوئی تھیں اور اس وقت مجھے زندگی کچھ زیادہ روشن نظر نہیں آ رہی تھی۔ مستری مہتاب دین نے مجھے لوہے کا ایک ٹکڑا ناپ کے مطابق فائل کرنے کو دیا تھا اور میں نے غفلت اور لاپرواہی کی وجہ سے اس کو اتنا زیادہ فائل کر دیا تھا کہ اس کی لمبائی ناپ سے آدھا انچ کم ہو کر رہ گئی تھی۔ مستری نے مجھے ایک لفظ بھی نہ کہا، مگر میں اس کی آنکھوں میں اور بشرے پر لکھی ہوئی خفگی اور ناراضگی پڑھ رہا تھا۔ اس کے بعد اس نے سارا دن مجھے کام میں مدد دینے یا نہ دینے کے لیے بلایا تک نہیں اور میں نے بھی شرمندگی اور خفت کی وجہ سے اس کے سامنے آنے کی بجائے شاپ میں اِدھر اُدھر گھوم کر وقت گذارنے کو بہتر سمجھا۔ یہ بھی وقت گذارنے کا ایک نہایت خوشگوار طریقہ۔ میں ایک جگہ ورکمینوں میں کھڑا ہوا ان کے ساتھ گپیں ہانکنے لگا۔ وہ کام چھوڑ کر ہنس رہے تھے اور میرا خیال ہے، میں ایک فلم میں ایک مشہور مزاحیہ ایکٹر کی نقل اتار رہا تھا، کہ یکایک ہم میں سے فورمین کی نظر ہم پر پڑ گئی۔ وہ غصے میں بھاگتا ہوا آیا اور جو الفاظ اس نے میرے بارے میں استعمال کیے وہ تمھیں بتاؤں تو تم یقین ہی نہیں کرو گے۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ میری ڈیوٹی کہاں تھی۔ میں نے جواب دیا کہ میں مستری مہتاب دین کے ساتھ کام کرتا ہوں۔

اس نے پوچھا، ''تم اس وقت مستری مہتاب دین کے پاس کیوں نہیں ہو؟'' میں حاضر جواب نہیں ہوں۔ میں نے جلدی میں ایک نہایت احمقانہ سا جواب دیا ''میں مستری مہتاب دین کو ڈھونڈنے ہی جا رہا ہوں۔ خدا جانے وہ کہاں گم ہو گیا ہے۔'' فورمین نے میرے بارے میں چند مزید ناشائستہ کلمات استعمال کیے جو یہاں جگہ کی قلت کی وجہ سے لکھے نہیں جا سکتے۔ وہ مجھے بازو سے پکڑ کر میرے چارج مین کے روبرو لے گیا۔ سکھ چارج مین نیک دل آدمی تھا۔ وہ کسی کا برا نہیں چاہتا تھا۔ اس نے کہا کہ اس نے ابھی تھوڑی دیر پہلے مجھے مہتاب دین کے ساتھ کام کرتے دیکھا تھا۔ مستری مہتاب دین کو بلوایا گیا۔ فورمین نے پوچھا، ''ویل مستری صاحب، یہ آدمی ابھی تمھارے

ساتھ کام کرتا؟'' مستری مہتاب دین نے پہلے مجھے ایک روٹھے ہوئے باپ کی طرح دیکھا اور پھر فورمین کو جواب دیا، ''ہاں صاحب، ابھی میرے ساتھ کام کر رہا تھا۔'' میں نے پہلے بھی تم کو بتایا ہے کہ مستری مرحوم دل کا صاف تھا مگر یہ کہہ کر تو اس نے گویا مجھے بے داموں مول لے لیا۔ میرا دل چاہا کہ اس کو گلے لگاؤں اور اس کو اس کے ہونٹوں کی مکھیوں (میرا مطلب اس کی مونچھوں سے ہے) کے اوپر چوم لوں۔ فورمین مجھے مستری کے حوالے کر کے چلا گیا اور یوں میری خلاصی ہوئی۔ مگر اس واقعے کی ندامت ابھی میرے دل سے گئی نہ تھی۔ کبھی سوچتا کہ یہ ورکشاپ کی نوکری میرے بس کی نہیں، اسے چھوڑ دوں۔ پھر خان بہادر کی ناراضی کا خیال آتا۔ کبھی دل میں فیصلہ کرتا کہ یہاں میرا کیریکٹر تباہ ہو رہا ہے۔ اس سے تو بہتر ہے کہ رائل بینڈ میں نوکری کر لوں یا سالویشن آرمی میں شامل ہو جاؤں یا کافی ہاؤس میں پارٹ ٹائم بیرا بن جاؤں۔ وہاں کے دو تین بیرے میرے دوست تھے اور رائل بینڈ میں میرا ایک دوست جھانگی رام ملازم تھا۔ میں نے اس کو ایک دو بار شادیوں پر اپنی سرخ کارچی ہوئی شاندار یونیفارم میں بینڈ کے ساتھ بگل پھونکتے ہوئے دیکھا تھا اور اس کی خوش قسمتی پر رشک بھی کیا تھا۔

یہی خیالات لیے ان بالاخانوں کے پاس سے گزر رہا تھا کہ مجھے وہ سفید ہاتھی دانت کی انگلیاں بورے سے باہر ایک تھالی اوندھاتی نظر آئیں۔ میرا کلیجہ دھک سے رہ گیا۔ اس سپنے کی چکاچوند نے مجھے اس درجہ محو کر دیا کہ کم سے کم اس وقت مجھے مطلق پتا چلا نہیں کہ وہ اوندھاتی ہوئی چیز کیا تھی جو مجھ سے ایک قدم آگے نالے میں گری۔ پرانے ناولوں کے مصنفوں کے مطابق مجھے وہیں بے ہوش ہو کر گر پڑنا چاہیے تھا مگر میں نے سوچا کہ برسر بازار بے ہوش ہو کر گرنا کچھ اچھا نہیں معلوم ہوتا اور میں نے اس کو (بے ہوش ہونے کو) کسی اور وقت پر اٹھا رکھا۔ میری آنکھوں کے سامنے سفید لمبی مخروطی انگلیاں ناچنے لگیں۔ (میں وہاں سے ہٹا تو جب جا کر معلوم ہوا کہ تھالی میں سے کدو کے چھلکے گرے تھے۔)

یہ بالاخانہ وہی تھا جس میں مستری مہتاب دین رہتا تھا، اور ان انگلیوں کی مالکہ یقیناً اس کی لڑکی رضیہ کے سوا اور کون ہو سکتی تھی۔ رضیہ کا نام میں نے ایک دو دفعہ مستری مہتاب دین اور مستری رحیم بخش کی باتوں میں سن لیا تھا۔ پھر ایک دفعہ میرے سامنے مستری مہتاب دین نے رضیہ کے رشتے کے بارے میں مستری رحیم بخش سے یہ درخواست کی تھی کہ وہ کسی اچھے بر پر نظر رکھے۔ تب اس کا صرف نام ہی سن کر ایک گرم سیال سی دمک میرے سارے بدن میں سرایت کر گئی تھی، اور اب رضیہ کی دو انگلیاں دیکھ کر تو میں اس کا غلام ہو گیا تھا۔ مجھے یکلخت یہ خیال آیا کہ میری عمر اب پچیس

کے لگ بھگ ہونے والی ہے اور مجھے اب تک ایک شادی شدہ آدمی ہونا چاہیے تھا۔ کیا رضیہ میری بیوی بن سکے گی؟ لیکن مستری مہتاب دین نہیں مانے گا۔ وہ مجھے ایک نکما، بیکار آدمی سمجھتا ہے جسے کام کرنے یا سیکھنے کا بالکل شوق نہیں۔ میں اس کی نظر میں مستقل مزاج لڑکا نہیں تھا۔ میں اب خوب دل لگا کر کام کروں گا اور مستری مہتاب دین کو اپنی رائے تبدیل کرنے پر مجبور کر دوں گا۔

رات کو میں اور شیر علی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ بعد میں شیر علی کو نیند آنے لگی اور مجھے اس کو جگانے کے لیے کئی بار اس کے چٹکی لینا پڑی۔ میں نے اسے بتایا کہ کس طرح شام سے میں بالکل نیا آدمی ہو گیا ہوں اور شادی کتنی اچھی چیز ہے۔ ان باتوں کا شیر علی پر کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ وہ عورتوں کی پوری نسل ہی کے خلاف ہے۔ اس نے مجھے سمجھانے کی کوشش نہیں کی کیونکہ اسے تجربہ حاصل تھا کہ جس آدمی پر ایک بار صنف نازک کا جادو چل جائے اس کو سمجھانا اپنا وقت ضائع کرنا ہے۔ مگر ایک سچا اور وفادار دوست ہونے کی حیثیت سے اس نے مجھے چند ذہانت بھری تجویزیں بتائیں جن پر عمل کر کے میں اپنی منزل مقصود پر پہنچ سکتا تھا، اگرچہ اس نے بعد میں یہ بھی جتا دیا کہ اس کی رائے میں منزل مقصود اس قابل ہی نہیں تھی کہ اس کے لیے اتنا قیمتی وقت برباد کیا جائے۔

میں نے کڑک کر کہا، ''اب چپ ہو جاؤ۔ میں نے رضیہ کے بارے میں تمھاری رائے پوچھی ہی کب تھی؟''

اس نے جواب دیا، ''مگر کیا تم نے یہ بھی سوچا ہے کہ جن سفید انگلیوں نے تمھیں پاگل بنا دیا ہے، وہ شاید رضیہ کی نہ ہوں، اس کی ماں کی ہوں، مستری مہتاب دین کی بیوی کی۔''

اس امکان کا مجھے گمان ہی نہیں تھا کہ وہ انگلیاں رضیہ کے علاوہ کسی اور کی بھی ہو سکتی ہیں، مگر میں اس بارے میں شبہ کر کے اپنی مشکلات میں اضافہ نہیں کرنا چاہتا تھا۔ البتہ ان انگلیوں میں جو چمک تھی، وہ ادھیڑ عمر کی کسی عورت کی انگلیوں میں ہو ہی نہیں سکتی۔ شیر علی نے مجھے جو تجویزیں بتائیں ان میں سے پہلی تو یہ تھی کہ میں ورکشاپ میں جی لگا کر کام کروں؛ مستری مہتاب دین کے سامنے ہمیشہ ایک برخوردار بنا رہوں اور اس کی موجودگی میں کسی سے کوئی مذاق نہ کروں۔ وجہ یہ تھی کہ مستری سنجیدہ اور متین لوگوں کو بہت وقعت کی نظر سے دیکھتا تھا۔ دوسری تجویز یہ تھی (اور مجھے یہ جان کر حیرت ہوئی کہ میرا دوست شیر علی مستری کے خانگی حالات کے متعلق کافی واقفیت رکھتا تھا) کہ مستری مہتاب دین کے دو چھوٹے لڑکے آوارہ تھے۔ پڑھنا پڑھانا تو ایک طرف، وہ سارا سارا دن گلی کے لونڈوں کے ساتھ کنکوے بازی میں گذارتے تھے۔ میں نے ان میں سے ایک کو جس کی عمر یہی کوئی دس برس کی ہوگی، ایک دفعہ ایک فلم کی اشتہاری پارٹی کے ہمراہ ایک پوسٹر اٹھائے ہوئے بھی دیکھا تھا۔

شیر علی نے کہا، ''اگر تم مستری کے لڑکوں میں سے کبھی کسی کو ایسا کرتے دیکھو تو کان سے پکڑ کر اسے فوراً مستری کے سامنے لے آؤ۔ اس طرح مستری محسوس کرنے لگے گا کہ تمھیں اس کے بیٹوں کا خاص خیال ہے۔ وہ تھوڑے ہی عرصے میں تم کو اپنے گھر کا آدمی سمجھنے لگے گا۔'' تیسری تجویز یہ تھی کہ مستری مہتاب دین کی بیوی حکیم علم علی، مشہور موجد سرمہ، کی تیسری بیٹی تھی۔ حکیم صاحب کا دعویٰ تھا کہ جو کوئی بھی ان کا سرمہ استعمال کرے گا، وہ دن کو تارے دیکھنے لگے گا۔ چنانچہ شہر امور میں اب تک ایسے لوگ موجود ہیں جن کو دن کے وقت صرف تارے ہی نظر آتے ہیں اور وہ حکیم صاحب مرحوم کی روح کو دعائیں دیتے ہیں۔

شیر علی نے کہا، ''جب بھی تم مستری مہتاب دین سے ملو، باتوں باتوں میں حکیم علم علی مرحوم کے سرمے کا ذکر ضرور لے آؤ۔ یہ ذکر ذرا اونچی آواز میں کرنا تاکہ اندر مستری کی بیوی بھی سن لے۔ مثلاً تم قسم کھا کر ایک مادرزاد اندھے کا ذکر کر سکتے ہو جس نے مرحوم کا مشہور سرمہ استعمال کیا تو ایک ہفتے کے بعد دیکھنے لگا۔ یا تم اپنی ہی مثال دے سکتے ہو کہ جن دنوں تم یہ سرمہ استعمال کرتے تھے، تم نے عید کا چاند دو بجے دوپہر ہی کو دیکھ لیا تھا، یا اسی قسم کی خرافات۔ یہی ایک طریقہ ہے جس سے تم مستری کی بیوی کے دل میں گھر کر سکتے ہو۔ اور پھر ایسا وقت بھی آ سکتا ہے جب وہ اپنے مستری سے صاف صاف کہہ دے کہ اس دنیا میں رضیہ کے لیے مناسب ترین رشتہ تمھارا ہی ہے۔ میری طرف سے لکھ کر رکھ لو کہ جو شخص کسی عورت کے باپ کی تعریف کرے گا، وہ اسے اپنا سب سے بڑا ہمدرد سمجھنے لگے گی۔ مجھے یقین ہے کہ جب تم حکیم کا ذکر اتنی عقیدت سے کرو گے تو مستری کی بیوی چق اٹھا کر بے دھڑک اندر چلی آئے گی اور تمھیں بیٹا کہہ کر اپنے والد مرحوم کی طبابت کا کوئی اور محیر العقول معجزہ سنا دے گی۔ عورتیں ایسی ہی ہوتی ہیں۔''

دوسرے دن صبح میں اٹھا تو اس پختہ ارادے کے ساتھ کہ آج میں مستری کے قلعے پر ہلہ بول دوں گا اور اسے فتح کر کے رہوں گا۔ ورکشاپ میں میں نے پورا دن لگا کر مستری کا ساتھ دیا اور مناسب حد تک مؤدب رہا۔ شام کو واپس آ کر میں مستری کے بیٹوں کو ڈھونڈنے نکل کھڑا ہوا۔ اس دن تو میری تلاش ناکام رہی مگر دوسری شب کو میں نے ریوالی سینما کے پاس دو لڑکے دیکھے، جو فلم تھیٹر پر بحث کر رہے تھے۔ ان میں سے ایک مستری مہتاب دین کا لڑکا تھا۔ میں نے لپک کر کہا، ''اے فضلو! تم کہاں آوارہ گردی کرتے پھر رہے ہو؟'' پھر میں نے مستری کے بیٹے کو بازو سے پکڑا اور اسے گھسیٹتا ہوا گلی میں لے چلا۔ اس نے میرا ہاتھ کاٹنے کی بار بار کوشش کی اور میری شان میں کچھ ناشائستہ کلمات بھی استعمال کیے جو طوالت کے خوف سے یہاں نہیں لکھے جا سکتے۔ لڑکے نے رو

رو کر آسمان سر پر اٹھا رکھا تھا۔ لڑکیوں میں سے کئی عورتیں چقیں بنا کر جھانکنے لگی تھیں۔ مستری مہتاب دین بھی سیڑھیاں اترا۔ میں نے چھوٹتے ہی کہا: "یہ سینما کے آس پاس آوارہ گردی کر رہا تھا، اس لیے میں اسے پکڑ لایا ہوں۔"

"مگر میں نے اسے آج خود ہی سینما دیکھنے کی اجازت دی تھی!" مستری حیران ہو کر بولا۔

"مگر..." میں نے کچھ کہنا چاہا مگر کچھ نہ کہہ سکا۔ آخر میں کہہ ہی کیا سکتا تھا؟ میں آج بھی جب سوچتا ہوں کہ اس وقت مجھے کیا کہنا چاہیے تھا تو کوئی معقول بات سمجھ میں نہیں آتی۔

"خیر، کوئی بات نہیں۔" مستری بولا۔ "جاؤ فضلو، سینما دیکھو۔"

خاصی دیر کے بعد میں صرف اتنا کہہ پایا: "اس نے راستے میں میرا ہاتھ کاٹنے کی بھی کوشش کی۔" مگر افسوس کہ میرے اس فقرے کا خاطر خواہ اثر نہ ہوا، بلکہ الٹا اثر ہوا۔ سب لوگ مسکرانے لگے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں مجھے بھی مسکرا دینا چاہیے تھا۔ میں بھی مسکرانے لگا۔ بہت عجیب مسکراہٹ، جو دکھائی دیتی بھی ہے اور نہیں بھی دکھائی دیتی۔

شیر علی کا بتایا ہوا پانسہ بالکل الٹا پڑا تھا مگر مستری مہتاب دین میری نیک نیتی سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے اندازہ کر لیا کہ میرے سینے میں خالص سونے کا دل ہے۔ اس واقعے یا حادثے کے تین دن بعد مستری نے مجھے اور شیخ شیر علی کو رات کے کھانے پر مدعو کیا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ شیر علی کس بلا کا شاطر ہے۔ اتوار کا دن تھا۔ سارا دن میں رات کے کھانے کے خواب دیکھتا رہا۔ میں آئینہ کم ہی دیکھتا ہوں۔ وجہ یہ ہے کہ آئینہ دیکھنے کے فوراً بعد جو پہلا خیال میرے ذہن میں آتا ہے وہ یہ ہوتا ہے کہ خودکشی کر لینی چاہیے۔ اس کے باوجود میں لاہور کے کم سے کم تین ایسے آدمیوں کا نام لے سکتا ہوں جن کے مقابلے میں مجھے بڑے اعتماد کے ساتھ خوبصورت کہا جا سکتا ہے، اور پھر اصل چیز تو انسان کا دل ہوتا ہے اور اب تک، پیارے قارئین، تم پر ثابت ہو چکا ہوگا کہ میرا دل سونے کا ہے۔ اس روز میں نے کوئی دو گھنٹے بناؤ سنگھار میں صرف کیے۔ چار بجے کے قریب مولوی کرم الٰہی حجام کی دکان پر (جو ہائی اسکول میں میرا کلاس فیلو تھا) دوبارہ ڈاڑھی منڈائی، آئینے میں اپنی صورت دیکھی اور مختلف زاویوں سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کرتا رہا کہ کس زاویے سے میں ذرا خوبصورت، یا کم بدصورت، نظر آ سکتا ہوں۔ کسی بھی زاویے کا نتیجہ حوصلہ افزا نہ تھا، مگر میں شاید ان لوگوں میں سے ہوں جن کے ساتھ آئینے پوری طرح انصاف نہیں کرتے۔ میک اپ کے بعد کپڑوں کا مسئلہ سامنے آیا۔ نتھو دھوبی کی لانڈری میں جا کر میں نے اس سے کسی گاہک کے کپڑے کرائے پر لیے۔ یہ سوٹ ایک بہت چھوٹی ٹانگوں والے بہت موٹے آدمی کا تھا۔ نتیجہ یہ کہ کوٹ

بالکل ڈھیلا تھا اور پتلون میرے ٹخنوں سے چار ایک انگل اونچی تھی۔ وہاں سے میں شیخ شیر علی کو دم بخود کرنے کے لیے اس کی دکان پر پہنچا۔ اس نے مجھ پر ایک نظر کچھ یوں ڈالی جیسے مجھے پہچانا تک نہ ہو اور ایک گاہک کو آنکھ مار کر اسے اپنے مذاق میں شامل کرتے ہوئے بولا، ''کیوں صاحب بہادر، دوودھ بیچیں گے؟'' فوراً بعد مجھے معلوم ہوا کہ شیر علی مجھے بنا رہا تھا۔ اس نے مجھے پہچان لیا تھا اور بعد میں مجھے بتایا کہ میں اس لباس میں پروفیسر لگتا ہوں — لوہے کے کوئلے اور کمیں اٹکنے والا پروفیسر۔

شام کو شیخ شیر علی اور میں مستری مہتاب دین کے بالاخانے پر پہنچے۔ مستری کی بیٹھک ایک سستے شریفانہ انداز میں سجائی گئی تھی۔ دو تین پرانے صوفے تھے اور دیواروں پر ''بعد مدت کے لائے ہو تشریف'' کے اکٹھے تین طغرے اور ترک رہنماؤں کی رنگین تصویریں تھیں۔ ایک کونے میں گراموفون رکھا تھا جس پر قوالوقوال کا ایک ریکارڈ بج رہا تھا۔ اس کے پاس ہی ایک چغد قسم کا نوجوان بیٹھا سر دھن رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی مجھے اس سے نفرت ہوگئی۔ مجھے دیکھ کر وہ اٹھا اور بولا، ''السلام علیکم پروفیسر صاحب!'' اس کے بعد بھی وہ مجھے پروفیسر کہنے پر مصر رہا، بلکہ کھانے کے بعد تو اس نے مجھ سے درخواست کی کہ میں سب حاضرین کو تاش کے کھیلوں سے محظوظ کروں۔ میرا ذاتی نظریہ یہ ہے کہ مذاق کی ایک حد ہونی چاہیے اور حد سے باہر جانے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مذاق کرنے والے کی تربیت میں غفلت برتی گئی ہے۔ اس کے باوجود دعوت بہت کامیاب رہی۔ مستری مہتاب دین ہمیں فقیروں کی کرامات سناتا رہا۔ اس نے بتایا کہ کسی فقیر نے ایک جھاڑی کے سائے میں آرام کیا اور جب وہاں سے اٹھا تو جھاڑی کو دعا دے گیا۔ ایک بار مستری مہتاب دین اپنے سات دوستوں کے ہمراہ اس جھاڑی کے پاس سے گذرا۔ جھاڑی کے پتوں کا رنگ ایسا تھا کہ دیکھتے ہی اشتہا پیدا ہو جاتی تھی۔ دوستوں میں سے ایک آدمی نے اس جھاڑی کے چند پتے کھالیے اور یکا یک اس کی بھوک اتنی بڑھ گئی کہ پہلے تو آٹھ آدمیوں کا بندھا ہوا کھانا چٹ کر لیا اور پھر اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہو کر بولا، ''بھاگ جاؤ، ورنہ میں تم کو بھی کھا جاؤں گا۔'' سب دوست اسے مذاق سمجھ کر زور زور سے ہنسنے لگے اور نتیجہ یہ نکلا کہ وہ اپنے سب ساتھیوں کو کھا گیا، سوائے مستری مہتاب دین کے، جس کی طرف رخ کرنے کے بعد اسے ایک ڈکار آئی اور اس کی بھوک مٹ گئی۔ ان باتوں نے کمرے میں ایک ایسی فضا پیدا کر دی جس میں اگر کوئی غیر ممکن الوقوع کہانی بھی سنائی جاتی تو اس پر فوراً یقین کر لیا جاتا۔ اس فضا نے میری حوصلہ افزائی کی اور میں نے حکیم حاجی علم علی کے مشہور سرمے کا ذکر چھیڑ دیا اور اس مادر زاد اندھے کا ذکر کیا جس نے یہ سرمہ استعمال کرنے کے بعد عید کا چاند دن کے دو بجے ہی دیکھ لیا تھا۔ میں نے یہ باتیں اونچے لہجے میں اور بڑے والہانہ پن سے

سنا کیں کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ دروازے کے پرلی طرف مستری کی بیوی اور اس کی بیٹی سب کچھ سن رہی ہیں۔

اس کھانے کے بعد دوسرے ہی دن مستری مہتاب دین نے ورکشاپ میں اپنے لڑکوں کی پڑھائی کے بارے میں مجھ سے مشورہ کیا اور اسی شام سے میں ٹیوٹر کی حیثیت سے ان لڑکوں کی بیٹھک میں پڑھانے کے لیے جانے لگا۔ (میں مڈل پاس ہوں۔) میں وہاں زیادہ دیر تک تو نہ ٹھہرتا مگر جتنی دیر ٹھہرتا زنانے کے دروازے کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھتا کیونکہ میرا خیال تھا کہ رضیہ یا اس کی ماں کا مجھے زیادہ واضح طور سے دیکھنا میرے حق میں کسی طرح مفید نہیں ہوگا۔ (میں نے پہلے بھی عرض کیا ہے کہ میں صورت شکل کا کچھ ایسا ہی ہوں۔) میں مستری مہتاب دین کی آنکھوں میں اپنے لیے ایک نئی روشنی سی دیکھتی جو ایک آدمی کی آنکھوں میں اس شخص کو دیکھ کر آجاتی ہے جس کو وہ دامادی کا شرف بخشنے کا آرزومند ہو۔ مستری رحیم بخش سے اب وہ بظاہر بہت کچھ کھنچ گیا تھا اور ان کے تعلقات کے درمیان یقیناً موٹے موٹے پردے حائل ہو رہے تھے۔ رحیم بخش اب بھی کبھی کبھی مہتاب دین سے گپیں ہانکنے کے لیے مل رائٹ شاپ میں آتا مگر دس بارہ منٹ بھی نہ ٹھہرتا اور اب جو باتیں وہ دونوں کرتے ان میں وہ پرانا بہاؤ، بے تکلفی اور دوستی کی گرمی یکسر مفقود ہوتی۔ میرے لیے یہ معما سمجھ سے بالا تھا کہ کس طرح دو پرانے دوست بغیر کسی نمایاں وجہ کے ایک دوسرے سے کھنچے جا رہے تھے۔ لیکن میں دل ہی دل میں حالات کی اس روش پر خوش تھا۔ ایک تو یہ سرخ ڈاڑھی والا آدمی مجھے مطلق نہیں بھاتا تھا۔ دوسرے مستری سے اس کی بے رخی اور کھنچاؤ میرے حق میں مفید ثابت ہو رہا تھا۔ میں رفتہ رفتہ مستری مہتاب دین کی دوستی اور اعتماد حاصل کر رہا تھا اور ایک لحاظ سے اس سرخ ڈاڑھی والے آدمی کی جگہ پر قابض ہو رہا تھا۔

میں نے حالات کی اس متوقع اور مبارک تبدیلی کا شیخ شیر علی سے ذکر کیا۔ اس نے مجھے گرجائی کے اوپر سے رحم اور ترس کی نظروں سے دیکھا۔ وہ مجھے اس بے وقوف بکرے کی مانند سمجھ رہا تھا جو خود ہی قربان ہونے کے لیے بھاگا جا رہا ہو۔

اس نے کہا، ''اب تمھارے لیے مجھے کوئی امید نظر نہیں آتی۔ تم صاف تباہی کے گڑھے کی طرف جا رہے ہو۔''

''کیسے؟'' میں نے پوچھا۔

''بوڑھے مہتاب دین کے دل نے اب تم کو اپنا داماد قبول کرلیا ہے۔ صرف تمھارے ارادہ جتانے کی دیر ہے اور بوڑھا اچھل پڑے گا۔ میں تمھیں بتاؤں، وہ اب صرف تمھاری منشا معلوم

کرنے کے انتظار میں ہے۔ اب تباہی سے تمھارا بچنا مجھے محال دکھائی دیتا ہے۔"

"گدھے! اس کی انگلیاں سفید، لمبی اور مخروطی ہیں۔"

"تو کیا ہوا!" شیخ شیر علی بولا۔ "کئی عورتوں کی انگلیاں سفید، لمبی اور مخروطی ہوتی ہیں۔ خود میری انگلیاں لمبی اور مخروطی ہیں۔" اس نے اپنی ہتھیلی کو دادجری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

کبھی ہے میرا دوست شیر علی، صنف نازک سے نفرت کرنے والا۔ تاہم وہ ایک دوست کی خاطر مرنے مٹنے کو بھی تیار رہتا ہے۔ میں نے بمشکل اس کو اس بات پر رضامند کر ہی لیا کہ وہ اس کام کو انجام تک پہنچانے کی ذمے داری اپنے سر لے لے اور مناسب طریق پر مستری مہتاب سے مجھے فرزندی میں قبول کرنے کی درخواست کرے۔

"مگر ایک بات میں تم کو پہلے سے بتا دوں،" شیخ شیر علی بولا، "جب تمھاری بیوی آ جائے گی تو تمھیں اپنے لیے ایک الگ مکان ڈھونڈنا پڑے گا۔ میں اپنے گھر میں کسی بے وقوف اور ہر بات میں دخل دینے والی باتونی عورت کی موجودگی برداشت نہیں کر سکتا۔ یہ میرے اعصاب کے لیے نقصان دہ ہے۔"

"نہیں، نیا مکان ڈھونڈنے کی نوبت ہی نہیں آئے گی،" میں نے اسے تسلی دی۔ "ابھی چند دنوں میں تم کو فصلی بٹیروں سے مکالمہ نویس کے عہدے کی پیشکش آ جائے گی اور تم کو یہ مکان ہمیں سونپ کر مستقل طور پر بمبئی چلے جانا ہوگا۔ پھر بھی جب تم کبھی لاہور آؤ تو یہ یاد رکھنا کہ ہمارے مکان کے دروازے تمھارے لیے ہمیشہ کھلے ہیں۔ ہمارے گھر کو اپنا گھر سمجھنا۔ مردانے کی بیٹھک میں ایک بستر ہمیشہ تمھارے لیے بچھا رہے گا اور میں اور رضیہ تمھارے لیے چائے کی ایک پیالی اور ایک رکابی زیادہ خرید لیں گے اور ہم انھیں کسی اور کو ہاتھ نہیں لگانے دیں گے۔ 'یہ تمھارے چچا شیخ شیر علی کے لیے ہیں،' ہم اپنے بچوں سے کہیں گے۔"

اب یہ بتانا باعث طوالت ہوگا کہ کس طرح اسی شام شیخ شیر علی مستری مہتاب دین سے اکیلا ملنے کے لیے اس کے بالاخانے میں گیا اور کس طرح انھوں نے خوش اسلوبی سے اس معاملے کو طے کیا اور کس طرح جب شیخ نے مستری سے رخصت چاہی تو مستری کی عینک خوشی سے چمک رہی تھی۔ معاملے کے طے پانے میں بالکل کوئی دیر نہ لگی، کیونکہ جتنا میں داماد بننے کے لیے بے صبر تھا اسی قدر مستری خسر بننے کے لیے بیتاب تھا۔ دوسری صبح جب ورکشاپ کی ٹرین کی طرف جاتے ہوئے مستری مہتاب دین مجھے گلی میں ملا تو میں کچھ جھینپ سا گیا — اسکول کے لڑکے کی طرح جو اپنی کسی شرارت پر شرمندہ ہو۔ مستری مہتاب دین بے حد خوش معلوم ہوتا تھا۔ اس کی عینک ٹمٹماتی تھی۔ اسے

یقیناً مجھ میں وہ تمام خوبیاں اور اچھی عادات و صفات نظر آرہی تھیں جن کی ایک مکمل اور مثالی داماد سے خواہش کی جا سکتی ہے۔ اس کے باوجود گاڑی میں ورکشاپ پہنچنے تک مہتاب دین کے چہرے پر کبھی کبھی ایک تاریک سایہ سا آجاتا۔ جیسے کوئی ضدی تکلیف وہ بھوت اس کی خوشیوں کے آنگن میں گھس آنے پر مصر ہو۔ کیا اس بھوت کا مجھ سے کوئی تعلق ہے؟ شاید مستری میرے چال چلن سے پوری طرح مطمئن نہیں؟ مگر اسی دن مجھ کو معلوم ہو گیا کہ اس تاریک سائے کا مجھ سے کوئی تعلق نہیں — اس لمحے جب مستری رحیم بخش مل رائٹ شاپ میں مستری مہتاب دین کو ملنے کے لیے آیا۔

ہم کسی پہیے پر بولٹوں کا نشان لگا رہے تھے — خسر اور داماد دونوں خوشی اور اطمینان کی ایک ابدی جنت میں بیٹھے ہوئے تھے — جس وقت وہ سرخ ڈاڑھی والا آدمی ایک انسانی بالڈر کی طرح دندناتا ہوا شاپ کے اندر آیا۔ اس کی آنکھوں میں ایک کینہ ور اور خطرناک سی نظر رکی ہوئی تھی جس طرح ایک حملہ آور مرکھنے بیل میں ہوتی ہے، اور اس کو دیکھ کر مستری مہتاب دین کا چہرہ خوف سے سیاہ پڑ گیا۔ ان دونوں کو دیکھ کر مجھ پر فوراً اس حقیقت کا انکشاف ہو گیا کہ پچھلے چند دن انھیں نہ صرف ایک دوسرے سے دور، بے اعتنائی اور بے تعلقی کے صحرا میں لے گئے تھے بلکہ انھیں ایک دوسرے کے خوفناک جانی دشمنوں میں تبدیل کر دیا تھا۔

''مبارک ہو بھئی!'' اس نے بڑے طنز سے ہنستے اور مجھے کندھے سے پکڑتے ہوئے کہا، مگر اس کی آنکھوں میں مطلق کوئی ہنسی نہ تھی، صرف ایک خوفناک دمک تھی۔

مستری مہتاب دین سے اس نے صرف ایک پر معنی لہجے میں یہی کہا، ''کہو، تم آج شام کو گھر پر ہی رہو گے؟ مجھے تم سے ایک دو باتیں کرنی ہیں۔''

اور اس کے بعد وہ چلا گیا۔ میرے اعصاب بالکل تندرست ہیں، مگر میں اقرار کرتا ہوں کہ اس کے جانے کے آدھ گھنٹے بعد تک میں بالکل اپنے آپ میں نہیں تھا۔ میں نے اور مستری مہتاب دین نے پہیے کے اوپر سے ایک دوسرے کو دیکھا۔ اس کے چہرے پر وہ سیاہ سایہ زیادہ گھنا ہو گیا تھا۔ مبارک؟ ایسی خوفناک مبارک کبھی کسی نے کسی کو نہ دی ہوگی — مبارک، جو ایک دھمکی معلوم ہوتی تھی۔ اس کو میری منگنی کے بارے میں بتایا کس نے تھا؟ شاید مہتاب دین اور میری نئی نئی دوستی سے اس نے یہ نتیجہ خود ہی اخذ کر لیا تھا۔ اور پھر ایسی باتیں چھپی کب رہتی ہیں!

اس کے باوجود اگر شام کو میری ملاقات اس نوجوان سے نہ ہو جاتی جس سے مجھے مستری کے کھانے پر بار بار 'پروفیسر' کہنے پر نفرت ہو گئی تھی، تو میں اس واقعے کا زیادہ خیال نہ کرتا۔ اس نوجوان کا نام میں نہیں بتاؤں گا اور کہانی کے مقصد کے لیے اس کی ضرورت بھی نہیں۔ وہ مال پر ایک

فوٹوگراف کمپنی میں ملازم ہے اور مستری مہتاب دین کی بیوی رشتے سے اس کی پھوپھی لگتی ہے۔ میں اور شیخ شیر علی اپنے ادبی دیوتاؤں کی تلاش میں رات کو کھانا کھانے ایک ہوٹل میں گئے اور جب ہم کھانے کا آرڈر دینے کے بعد کھانا آنے سے مایوس ہو کر چند سیاہ اچکنوں اور گنجے سروں والے آدمیوں کی باتیں سننے کی کوشش کر رہے تھے، یکایک ایک گرجتی ہوئی ''ہیلو پروفیسر!'' نے ہمیں چونکا دیا اور پیشتر اس کے کہ ہمیں معلوم ہوتا کہ یہ پروفیسر کہنے والا کون ہے، وہی نوجوان ہمارے سامنے کرسی پر آ بیٹھا۔

اس وقت مجھے اس کے ''ہیلو پروفیسر'' میں طنز آمیز تمسخر کی ذرا سی آنچ بھی معلوم نہ ہوئی اور نہ ہی مجھے اس کا ''پروفیسر'' کہنا زیادہ برا لگا، کیونکہ سیاہ اچکنوں اور گنجے سروں والے آدمی بھی اچانک مجھے دلچسپی اور رشک کی نگاہ سے دیکھنے لگے — انھوں نے غالباً یہ سمجھا کہ میں اصلی پروفیسر ہوں۔

''بڑی بھوک لگی ہے،'' اس نے کہا۔ ''کھانے کا آرڈر دیا ہے یا کھا چکے ہو؟ اچھا، بہت اچھا۔ ہاں بھئی، مبارک ہو۔ پھوپھی نے آج صبح مجھے بتایا۔ وہ پہلے بھی تم ہی کو چاہتی تھیں۔ صرف بوڑھا مہتاب دین کشمکش و پیش میں تھا۔ وہ بھی تمھارے خلاف نہیں تھا، مگر اس کے دل پر کچھ اور سوار تھا۔ تمھیں بتاؤں؟ اس کے دل پر کچھ عرصے سے وہ مستری رحیم بخش سوار تھا۔ خیر، تم خوش قسمت ہو پروفیسر۔ میرا مطلب ہے، اپنی شکل وصورت کے مقابلے میں تمھاری قسمت بہت اچھی ہے۔ رضیہ ہزاروں میں ایک لڑکی ہے۔ مجھے مٹھائی کھلاؤ۔ میں نے اور پھوپھی نے زوردار طریق پر بوڑھے مہتاب دین کے سامنے تمھارے حق میں وکالت کی: 'ہمیں پروفیسر چاہیے۔ پروفیسر جیسا اور کوئی نہیں!' ہم نے مہتاب دین سے اصرار کیا اور آخر اسے منوا کے چھوڑا، میری پیٹھ ٹھونکو۔ تمھاری کامیابی کا سہرا میرے سر ہے۔''

بعد کی باتوں نے، جو اس نوجوان نے مرغ پلاؤ اور شاہی ٹکڑوں کو 'نگلتے' ہوئے کہیں، (کھانے کا لفظ اس کے لیے استعمال ہی نہیں کیا جا سکتا؛ وہ مہینوں کا بھوکا معلوم ہوتا تھا)، ہم پر واضح کر دیا کہ وہ اپنی پھوپھی کے گھر کے اندرونی حالات سے کما حقہٗ واقفیت رکھتا ہے اور یہ کہ اس کی پھوپھی گھر کی کوئی بات اس سے چھپا کر نہیں رکھتی بلکہ وہ اس کا ہمراز اور مشیر ہے۔ بظاہر اسے اپنی پھوپھی کے خانگی معاملات پر برسر بازار ایک مکمل اجنبی سے بحث کرنے میں بھی کوئی عذر نہیں تھا۔

''رضیہ بڑی اچھی لڑکی ہے — نہایت خوبصورت لڑکی،'' اس نے اونچی آواز میں ہمیں اور سارے ہوٹل کو سناتے ہوئے کہا۔ ''میں سمجھتا ہوں تم واقعی قابل رشک ہو۔ وہ ایسی بیوی ہے جس پر ایک پروفیسر بجا طور پر فخر کر سکتا ہے۔''

اس نے ہمیں اس سرخ ڈاڑھی والے آدمی مستری رحیم بخش کے بارے میں چند ایسی باتیں سنائیں جس سے میرا خون کھولنے لگ گیا اور اس سے میری نفرت دوچند ہوگئی — گھناؤنی شرمناک باتیں، اور بالکل غیر متوقع۔ مستری رحیم بخش ایک یہودی تھا — میرا مطلب ہے اس کی عادات یہودیوں کی سی تھیں اور وہ اپنے ہمسایوں کو سود پر روپیہ دینے کا عادی تھا۔ کوئی عادت انسان کے بدترین اور اسفل ترین جذبات کو اس حد تک سطح پر نہیں لاتی جتنی یہ سودخوری کی عادت۔ مستری مہتاب دین بھی اس سرخ ڈاڑھی والے آدمی کے قرضے کے بوجھ تلے دبا ہوا تھا — قرضہ، جو پہلے پہل مستری نے دوستانہ انداز میں تھوڑا تھوڑا کرکے لینا شروع کیا تھا اور جو اب دو ہزار تک پہنچ چکا تھا۔ رحیم بخش کی پہلی بیوی دو تین سال ہوئے مرچکی تھی اور اس کی لومڑی کی سی آنکھیں ایک عرصے سے رضیہ پر تھیں۔ جب تم ایک آدمی کے مقروض ہوتے ہو تو کسی وجہ سے اس کے روبرو تم میں ایک احساس کمتری سا پیدا ہوجاتا ہے؛ تم اس کے سامنے آنکھیں نہیں اٹھا سکتے۔ کمزور سادہ لوح آدمی اپنے قرض خواہ کے ہاتھوں میں آسانی سے کٹھ پتلی بن جاتا ہے۔ بعینہٖ یہی کیفیت مستری مہتاب دین کی ہوئی۔ رحیم بخش نے مستری مہتاب دین کو ایک پاکباز اور صاف دل، سیدھا آدمی سمجھ کر اس پر ڈورے ڈالنے شروع کیے اور چالاکی کی باتیں کرکے اس سے یہ زبانی اقرار لینے میں بھی کامیاب ہوگیا کہ وہ رضیہ کا رشتہ مستری رحیم بخش کو دے گا۔ اس کے عوض مستری رحیم بخش یہ لکھ دینے کو تیار تھا کہ وہ مہتاب دین سے قرضے کی ایک ایک پائی وصول کرچکا ہے۔

دوسرے دن مستری مہتاب دین زیادہ خوش تھا۔ رات کو مستری رحیم بخش نہیں آیا۔ میں نے لڑکوں سے فارغ ہوکر مستری سے باتیں شروع کیں اور رات کو جو کچھ سنا تھا اس کا ذکر چھیڑا — مگر احتیاط کے ساتھ، تاکہ اس کو یہ معلوم نہ ہو کہ میری کیا غرض ہے۔ میں نے اس کی ڈھارس بندھائی کہ دو ہزار کوئی بڑی رقم نہیں اور انشاءاللہ ہم دونوں مل کر مستری رحیم بخش کے قرضے کی ایک ایک پائی چکا دیں گے۔ مستری کے دل پر اس بات کا بے حد اثر ہوا کہ میں ابھی سے اپنے آپ کو اس کے گھر کا ایک فرد سمجھنے لگا تھا۔ مستری کو اب میری موجودگی سے اطمینان محسوس ہوتا تھا۔

شیخ شیر علی نے مستری سے دوبارہ مل کر میری شادی کی تاریخ بھی طے کرلی۔ ستمبر کے پہلے ہفتے میں۔ دن اسی طرح کسی واقعے کے بغیر گذرنے لگے۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ وہ دن میرے لیے سخت انتظار اور بے پایاں خوشی کے دن تھے۔ ایک شام میں نے دروازے کے پیچھے سے رضیہ کی جھلک بھی دیکھ لی تھی۔ خوبصورتی اور معصومیت کا وہ لشکارا اب بھی میرے دل کو منور کردیتا ہے۔ اب میں مزید انتظار نہیں کرسکتا تھا۔ میری نیندیں اس کے خوابوں سے چھلکنے لگی تھیں۔ رضیہ کی ماں

اب مجھ سے پردہ نہیں کرتی تھی بلکہ میرے سامنے بے دھڑک آتی جاتی اور کھلم کھلا باتیں کرتی۔ وہ کافی باتونی عورت تھی (کون عورت باتونی نہیں ہے!) اور اس میں ایک دلچسپ قوت بیانیہ تھی جس سے وہ معمولی واقعات اور عام لوگوں پر ایسا رنگ چڑھاتی تھی کہ وہ آسانی سے بھلائے نہیں جا سکتے تھے۔ اس کی باتیں سننے کے بعد اس کا باپ ایک عام سرے کا بازاری موجد معلوم نہیں ہوتا تھا بلکہ ایک پہنچا ہوا ولی جس کا سرمہ اس کا ایک ادنیٰ ترین کرشمہ ہو۔ وہ دیندار بھی تھی اور صفائی پسند بھی، اور میں دل ہی دل میں خوش ہوتا تھا کہ رضیہ نے بھی یہ ساری صفات اپنی ماں سے ورثے میں پائی ہوں گی۔ وہ بھی اتنی ہی دلچسپ باتیں کرتی ہوگی، وہ بھی دیندار اور صفائی پسند ہوگی۔ میں جلد ہی رضیہ کی ماں کا لاڈلا اور چہیتا بن گیا کیونکہ مجھے بڑی بوڑھیوں کو خوش کرنے کا ایک قدرتی ملکہ حاصل ہے۔ وہ چھتی ہوئی بوسیدہ بوریوں والا بالاخانہ اب میرے لیے چمکتی ہوئی چلمنوں والا شاندار محل تھا جس کے گرد میرے خواب منڈلاتے تھے۔ اور وہ بدنصیب لالٹین بھی... (مگر میں اپنا وعدہ بھول رہا ہوں اور پھر اس کا ذکر کر بیٹھا ہوں!) وہ لالٹین جو بس دیوار میں ذرا سی اٹکی ہوئی تھی، میرے تصور میں کئی دفعہ جلنے لگ جاتی...

اور اب میں ستمبر کی پہلی کے خوفناک دن پر آتا ہوں — وہ دن جب تقدیر کی ضرب پڑی، بجلی کی طرح ناگہانی اور لرزہ خیز۔ تقدیر کی ضرب انسانوں پر ہمیشہ اچانک آ پڑتی ہے اور میرے خیال میں یہ مشیت کے لیے اچھی بات نہیں کہ... (مگر نعوذ باللہ، میں مشیت سے جھگڑنے والا کون!) حسبِ معمول میں اور مستری مہتاب دین اکٹھے علی الصباح ورکشاپ جانے والی ٹرین میں سوار ہوئے۔ مجھے یاد ہے، جب گاڑی چلی تو کسی نے زور زور سے نعت گانی شروع کردی۔ فوراً ہی سارا ڈبا گانے والے کا ساتھ دینے لگا اور میں اور مستری مہتاب دین بھی آہستہ آہستہ نعت کے الفاظ گانے والے کے پیچھے دہرانے لگے۔ میں نے دیکھا کہ وہ محبت اور مذہبی عقیدت کا جذبہ جو سادہ اور نیک طبیعتوں میں اس قدر قوی ہوتا ہے، مستری مہتاب دین پر طاری ہونے لگا — اس حد تک کہ اس کا بدن تھرکنے لگا اور اس کی عینک جھک گئی اور اس کے شیشے دھندلا گئے۔ وہ عقیدت و وارفتگی سے کانپتی ہوئی آواز میں گائے جا رہا تھا۔ اس وقت اسے یوں عقیدت سے گاتا دیکھتے ہوئے مجھے یہ گمان تک نہ تھا کہ آج یہ سسکتی ہوئی گاڑی اسے آخری بار ورکشاپ کی طرف لے جا رہی تھی جہاں اس کے ماضی کا زیادہ تر حصہ پڑا ہوا تھا، جہاں اس نے اپنی بڑی لڑائیاں فتح کی تھیں، جہاں مشینیں اس کے اشارے کی منتظر کھڑی رہتی تھیں۔

ورکشاپ میں مستری مہتاب دین بڑے اچھے موڈ میں تھا۔ میں نے شاید یہ ذکر نہیں کیا کہ

اس سے ایک دن پہلے اس کو ہیڈ مستری بنا دیا گیا تھا اور یہ امر قدرتی طور پر اس کی خوشی اور اطمینان کا موجب تھا۔ اس دن بھی میں نے اس کو ہنستے ہوئے تو نہیں دیکھا البتہ اس کی مسکراہٹیں پہلے سے زیادہ فراخ تھیں۔ ہم ایک گھنٹہ اکٹھے مل رائٹ شاپ میں کام کرتے رہے۔ اس کے بعد چارج مین نے مجھے ورک مینوں کی ایک پارٹی کے ہمراہ اوپیٹ فیکٹری میں واٹر پائپ لگانے کے لیے بھیج دیا۔ جب میں واپس آیا تو مستری مہتاب دین اپنے اوزار وغیرہ اٹھائے کچھ جھکا ہوا سا مل رائٹ شاپ سے باہر لوکو شاپ کی طرف آ رہا تھا جہاں لوہے اور بھاپ کے ان عظیم الجثہ دیووں کی (جن کو تم آہنی پٹریوں پر بھاگتے ہوئے دیکھتے ہو) مرمت اور فٹنگ ہوتی ہے۔ اسے comp-air پر کچھ کام کرنا تھا جو مل رائٹ شاپ میں دستیاب نہ تھی۔ میں بھی مستری مہتاب دین کے ساتھ ہو لیا کیونکہ لوکو شاپ دیکھنے کا جو موقع بھی آئے میں ہمیشہ اس کا خیر مقدم کرتا ہوں۔ ہم ان ایک سو تین NB پائپ کے دیووں کے پاس سے گذرے جو لوکو شاپ کے باہر بیکار اور ابدی انتظار میں کھڑے ہوئے تھے، کیونکہ وہ ایک ریلوے انکوائری بورڈ کی تحقیق کے مطابق بھاگتے بھاگتے لوہے کی پٹریوں سے نیچے اتر جانے کا رجحان رکھتے تھے۔ اب انھیں شریر لڑکوں کی طرح ایک طرف بیکار کھڑا کر دیا گیا تھا جہاں وہ کوئی شرارت نہیں کر سکتے تھے۔ شاید وہ اب کبھی ریل گاڑی نہیں کھینچیں گے۔ ان کے غرور اور طاقت کے دن ختم ہو چکے ہیں۔ مستری مہتاب دین نے فخریہ ان میں سے ایک انجن کی طرف اشارہ کیا جس کے پہیوں کی فٹنگ ۱۹۲۹ء میں اس نے کی تھی۔ انجنوں کے پاس سے ہوتے ہوئے ہم لوکو شاپ میں داخل ہوئے۔ مشینوں اور کلوں کی مسلسل گڑگڑ، غیر زمینی بدروحوں کی طرح چیختی ہوئی comp-air کی سوراخ کرنے والی سوئیاں، گڑگڑاتی ہوئی ٹرالیاں، کلہاڑے اور ہتھوڑے کا شور، شعلوں کی لمبی لکیریں اندھیرے میں زبانوں کی طرح لپکتی اور غائب ہوتی ہوئیں۔ درمیان میں کہیں کہیں انجنوں کے مہیب اور سیاہ ڈھانچے کھڑے ہیں — خاموش اور بے حس، جن کی تیارداری کے لیے لاتعداد مشینیں سارا دن گڑگڑاتی رہتی ہیں اور ہزاروں آدمی اپنا پسینہ بہاتے اور اپنے کپڑے سیاہ کرتے ہیں۔ کہیں کہیں ورٹیکل کرینوں کے آہنی پنجے نگاہ کو روکتے ہیں — آہنی پنجے جو گذرنے والوں اور کام کرنے والوں کے سروں کے اوپر دھمکی کے انداز میں جھولتے رہتے ہیں، آہنی پنجے جو بڑھائے جا سکتے ہیں اور سمیٹے جا سکتے ہیں جو دو دو من بھاری پہیے کو اسی طرح آسانی سے اوپر اٹھا لیتے ہیں جیسے ہم روئی کا پھاہا اٹھاتے ہیں۔ میں مسحور سا ہو کر پھٹی پھٹی آنکھوں سے ایک آہنی پنجے کو ایک بائلر کو دبوچے اور اس کو دور ایک انجن کی طرف لے جاتے ہوئے دیکھنے لگا۔ آہنی پنجے کی حرکات کو کرین کے اوپر ٹرالی میں بیٹھا ہوا سرخ ڈاڑھی والا ایک آدمی کنٹرل کر رہا تھا — ٹرالی اوپر اپنی

پٹڑیوں پر دوڑ رہی تھی اور اس بائلر کو اپنی منزل پر لیے جا رہی تھی۔

مستری مہتاب دین کچھ عرصے کے لیے ایک کیبن میں ایک اسسٹنٹ چارج مین سے باتیں کرنے کے لیے رکا۔ اسسٹنٹ چارج مین نے ایک خالی comp-air کے ٹیوب کی طرف اشارہ کیا جس پر اس وقت کوئی کام نہیں کر رہا تھا اور جسے مستری مہتاب دین اپنے استعمال میں لا سکتا تھا۔ میں نے پہلے comp-air سے سوراخ ہوتے نہیں دیکھا تھا اور مجھے اسے دیکھنے کا اشتیاق تھا۔ ہم دونوں اس ٹیوب کے پاس جا بیٹھے اور مستری مہتاب دین پنسل سے اپنے نشانات کو زیادہ واضح کرنے لگا۔ ہمارے پاس ہی بائیں طرف ایک انجن کا آدھا اگلا ڈھانچہ کھڑا تھا، چار پانچ آدمی کوئلے سے سیاہ اوورآلوں میں کھڑے ہوئے امید اور انتظار کے عالم میں اوپر چھت کی طرف یوں دیکھ رہے تھے جیسے بنی اسرائیل میں سے ہیں اور آسمان سے کسی نعمت کے اترنے کے امیدوار ہیں۔ ان میں سے ایک بے چین لہجے میں چلا رہا تھا، ''ذرا آگے... اور دائیں... شاباش۔''

مستری مہتاب دین یکلخت اٹھ کھڑا ہوا۔ comp-air کی ٹیوب ذرا دور اور کچھ اونچی تھی اور وہ بیٹھے بیٹھے اس تک ہاتھ نہیں پہنچا سکتا تھا۔ میں نے انجن کے گرد کھڑے ہوئے آدمیوں کی نگاہوں کے مرکز کی طرف دیکھا۔ یہ مرکز اوپر کرین کی ٹرالی تھی جو اپنے آہنی جھولتے ہوئے ہاتھ میں ایک گول سلنڈر نما بائلر کو اٹھائے اس کو انجن کی طرف لا رہی تھی۔ پھر یکا یک میں نے دیکھا کہ مستری مہتاب دین ٹھیک اس انجن اور اس آتے ہوئے آہنی پنجے کے درمیان کھڑا ہوا تھا۔ میں اس کو خطرے سے آگاہ کرنے کے لیے چلایا۔ اسی وقت انجن کے گرد کھڑے ہوئے دوسرے آدمی بھی چلائے۔ میرے چلانے پر اس نے جلدی سے منھ میری طرف پھیرا اور عین اسی وقت بائلر ٹھیک اس کے منھ کے اوپر آ کر لگا۔ ایک لمحے کے لیے مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے میں ایک لٹو پر کھڑا ہوں — ساری ورکشاپ میری آنکھوں کے سامنے گھوم سی گئی۔ پھر میں نے ایک پل کے لیے بائلر کی چمکتی ہوئی پیتل کی رم کو دیکھا جو مستری مہتاب دین کو ٹھوڑی سے جکڑے فرش پر گھسیٹ رہی تھی۔ جب کہیں وہ آہنی پنجہ اور وہ بائلر اپنے دیوانے سفر کو روک سکے، مستری مہتاب دین کا جسم ایک گٹھڑی کی طرح نیچے فرش پر گرا۔ یہ سانحہ اتنا ہولناک اور اچانک تھا کہ اب بھی مجھے یہ ایک مبہم سا بدخواب معلوم ہوتا ہے۔ میرے گرد ایک ہزار آدمیوں کا شور تھا۔ ہم سب مستری کے جسم کی طرف بھاگے۔ میری آنکھوں کے سامنے اب بھی چرے ہوئے جبڑے کا عکس سا ہے۔ اوورآل میں ملبوس ایک آدمی نے خون میں لتھڑے ہوئے جسم پر سیدھا ہوتے ہوئے کہا، ''مر گیا...''

بہت سے آدمی اوپر ٹرالی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میں نے بھی اوپر دیکھا۔ کرین کی ٹرالی

میں بیٹھا ہوا آدمی اوپر سے جھکا ہوا نیچے اپنے کیے کو دیکھ رہا تھا۔ اس کی ڈاڑھی مہندی سے رنگی ہوئی سرخ تھی اور مجھے اس کے موٹے ہونٹوں میں ایک خوفناک سی ہنسی چنگاریاں چھوڑتی ہوئی معلوم ہوئی۔ وہ مستری رحیم بخش تھا۔

بعد میں سب نے کہا کہ یہ ایک حادثہ تھا — ایک بہت افسوسناک حادثہ۔ مگر اس حادثے کے متعلق میرے اپنے خیالات تھے اور میں نے ان خیالات کو اپنے تک ہی رکھا۔ شاپ میں سب سے زیادہ مغموم خود مستری رحیم بخش معلوم ہوتا تھا جس کی سرخ ڈاڑھی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی اور جو ہر ایک سے کہتا پھرتا تھا کہ وہ اپنے ایک ہی اور بہترین دوست کا قاتل ہے۔ دوسرے ورکر مین اس کی ڈھارس بندھاتے، اس سے ہمدردی جتاتے اور اسے اطمینان دلاتے کہ اس میں اس کا مطلق قصور نہیں تھا اور مستری مہتاب دین کی موت قدرت کی طرف سے آئی تھی۔

(بعد میں انکوائری کمیٹی نے مستری رحیم بخش کو صاف بری کر دیا — اسے آئندہ صرف محتاط رہنے کی "سزا" دی گئی — شاید یہ حادثہ ہی تھا۔)

ان دنوں کا روزنامچہ لکھنا، لکھنے والے اور پڑھنے والے دونوں کے لیے تکلیف کا باعث ہوگا۔ یہ وہی پرانی رونے دھونے اور رنج و الم کی کہانی ہے جو گھر کے روٹی کمانے والے کی موت کے بعد ہمارے ہزاروں گھروں میں دہرائی جاتی ہے۔ بیوہ اور رضیہ کا غم بیان کرنے کے بجائے تصور کیا جا سکتا ہے۔ میں اس بارے میں صرف اسی قدر لکھوں گا کہ میں مرحوم کی تجہیز و تکفین سے لے کر بعد کی دلدوز گھڑیوں تک اس غمزدہ کنبے کے لیے ڈھارس اور امید کا باعث بنا۔ بیوہ مجھ پر بیٹے کا دعویٰ رکھنے لگی اور میں بھی اسے اپنی ماں سمجھنے لگا۔

ان آدمیوں میں سے جو مرحوم کی ماتم پرسی اور چہلم پر آئے، مرحوم کے کچھ گوجرانوالہ کے رشتے دار بھی تھے — معمولی، چھوٹے سے آدمی جنھوں نے رسم کے طریقے پر بیوہ اور بچوں کو گوجرانوالہ چلنے اور اپنے پاس رہنے کا مشورہ دیا۔ بیوہ نے، جو ایک خوددار عورت تھی اور رشتے داروں کے ٹکڑوں پر پلنا غلط سمجھتی تھی، انکار کر دیا۔ پھر اس کو میرا بڑا سہارا تھا۔ ان رشتے داروں کے علاوہ ورکشاپ کے کئی ورک مین ماتم پرسی اور ہمدردی کے لیے آئے کیونکہ اپنی دینداری اور خوش خلقی کی وجہ سے مرحوم مستری ورک مینوں میں کافی ہر دلعزیز تھا۔ ان لوگوں میں مستری رحیم بخش بھی شامل تھا — اور اس کا غم دوسروں کے غم سے زیادہ گہرا اور حقیقی دکھائی دیتا تھا۔ اس کے پاس عورتوں کی طرح آنسوؤں کا ایک نہ ختم ہونے والا ذخیرہ تھا جسے وہ بات بات پر بہانے کو تیار تھا۔ (مگر مجھے کسی کی نیت پر شک کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔) بیوہ بھی، جو اپنے غم کے شدید ترین لمحوں میں چیخ چیخ

کہ مستری رحیم بخش کو اپنے خاوند کا قاتل بتلاتی تھی اور اس کو غائبانہ ہزاروں بددعائیں ارسال کرتی تھی، اپنے پرسکون لمحات میں اس بات کو ماننے لگی تھی کہ اس کا خاوند ایک حادثے میں مرا ہے۔ مجھے بھی کچھ کچھ یقین ہو گیا کہ مرحوم کی موت ایک حادثہ تھی، اگرچہ اس یقین نے اس نفرت کو جو میرے دل میں اس سرخ ڈاڑھی والے آدمی کے خلاف گھر کر چکی تھی، کسی طرح بھی کم نہ کیا۔

مستری مہتاب دین کی موت کے ڈیڑھ مہینے بعد میں شیخ شیر علی کی دکان پر بیٹھا اپنی شادی کے سلسلے میں کچھ مشورہ کر رہا تھا کہ مستری کا چھوٹا لڑکا فضل پیغام لایا کہ اماں بلاتی ہیں۔ بچہ لڑکا کچھ ڈرا اور سہما ہوا سا تھا۔ میں نے اس سے کچھ پوچھے بغیر بالاخانے کا رخ کیا۔ اوپر پہنچا تو مجھے اندر کمرے میں سے وہ گھٹی ہوئی شوریدہ آواز سنائی دی جو میری اس قدر جانی پہچانی تھی اور جس سے میں نفرت کرتا تھا۔ میں اندر داخل ہو گیا۔ بیوہ کچھ ڈری اور سکڑی ہوئی نیچے دری پر بیٹھی تھی۔ مستری رحیم بخش لنڈے بازار کے ایک صوفے پر بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر ایک فاتحانہ خود اعتمادی سی تھی اور ہونٹوں میں دبی ہوئی عیارانہ مسکراہٹ جو میں نے اس وقت اس کے چہرے پر دیکھی تھی جب وہ ترائی میں سے جھکا ہوا نیچے مستری کی لاش کو دیکھ رہا تھا۔ کوئی میرے کانوں میں کہہ رہا تھا: یہی قاتل ہے، قاتل یہی ہے! اس نے میری آمد کو مطلق کوئی اہمیت نہ دی۔ وہ اپنی گھٹی ہوئی قابلِ نفرت آواز میں کہہ رہا تھا۔ ''مرحوم میرا تین ہزار روپے کا مقروض ہے۔ بے شک، بہن، یہ سنگدلی معلوم ہوتی ہے کہ میں اب اس روپے کا تقاضا کروں جبکہ مرحوم کے خاندان پر یکلخت اتنی سخت مصیبت ٹوٹ پڑی ہے، مگر میں کیا کروں، مجھے فی الواقع اس روپے کی اس وقت شدید ضرورت ہے۔ نواں کوٹ میں میرے مکان کی تعمیر صرف روپے کی کمی کی وجہ سے رکی ہوئی ہے۔''

''مگر تمہارے وہ کاغذات کہاں ہیں جن پر قرضے کی لکھت پڑھت ہوئی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

اس نے مجھے ایک کینہ بھری مسکراہٹ کے ساتھ دیکھتے ہوئے جواب دیا، ''بے شک مرحوم میرا بہترین دوست تھا مگر روپے کے معاملے میں یہ میری پرانی عادت ہے کہ میں زبانی قول اقرار سے لکھت پڑھت کو زیادہ محفوظ سمجھتا رہا ہوں۔ میرا مقولہ ہے کہ حساب حساب ہے۔'' اس نے اپنے لمبے بھورے کوٹ کی اندرونی جیب میں سے کاغذات کا ایک پلندا نکالتے ہوئے کہا، ''کاغذات اب بھی میرے پاس ہیں۔ یہ سرکاری اسٹامپ والے کاغذ ہیں اور ان پر مرحوم نے اپنے ہاتھوں سے لکھا ہے کہ اس نے فلاں فلاں تاریخ کو مجھ سے اتنا قرضہ لیا۔ عام آدمیوں سے میں روپے کے پیچھے چار آنے سالانہ سود لیتا ہوں مگر مرحوم کو میں نے بغیر سود کے قرض دیا تھا۔''

''تین ہزار روپے!'' بیوہ گڑگڑاتے لہجے میں بولی، ''دیکھو بھائی رحیم بخش، تم اس کے اتنے

گہرے دوست تھے۔ تمھیں معلوم ہے ہم پر کتنی بڑی مصیبت آئی ہے۔ اس وقت ہمیں ہوش نہیں۔ گھر کا کمانے والا چل بسا ہے اور مجھے یہ معلوم نہیں کہ اس مہینے مکان کا کرایہ کیسے چکاؤں گی۔ میں تمھاری پائی پائی ادا کردوں گی، مگر مجھے کم از کم تین چار مہینے کی مہلت تو دو۔"

"میں اس روپے کا بالکل تقاضا نہ کرتا،" مستری رحیم بخش بولا، "اگر میرے قواں کوت والے مکان کی تعمیر روپے کی کمی کی وجہ سے رک نہ جاتی۔ تعمیر کے رکنے سے مجھے مالی نقصان ہو رہا ہے۔ اس وقت تک وہ مکان کرائے پر چڑھا ہوا ہوتا۔ اب میں انتظار نہیں کر سکتا۔"

تھوڑی دیر تک کمرے میں بالکل خاموشی رہی۔ اس آدمی کی سنگدلی اور بے حسی نے ہمیں کچھ عرصے کے لیے مبہوت کر دیا۔ اس خاموشی کو آخر اسی نے توڑا۔ "ہاں، ایک صورت ہو سکتی ہے اور تم وہ جانتی ہو۔" اس کے چہرے پر وہی فاتحانہ مسکراہٹ تھی، ایک اطمینان سا جیسا شاید اس مکڑے کو محسوس ہوتا ہوگا جو ایک مکھی کو اپنے جالے میں پھنسا ہوا دیکھ لیتا ہے۔

مجھے معلوم تھا کہ وہ صورت کیا تھی جس کی طرف اس مکار بوڑھے نے اشارہ کیا تھا... مگر یہ کیسے ممکن تھا! بیوہ بھی دل میں جانتی تھی کہ یہ ناممکن ہے۔ وہ اپنی لاڈلی بچی کا ہاتھ اس بوڑھے کے ہاتھ میں دینے پر اس کی موت کو ترجیح دے سکتی تھی۔ مگر عورت ایک کمزور مخلوق ہے — کمزور اور متلون مزاج۔ مجھے فوراً احساس ہوا کہ مستری رحیم بخش کے پھیلائے ہوئے جال میں کوئی چیز پھنس کر تڑپنے لگی ہے۔

بیوہ شاید اب بھی منت سماجت سے اس سنگ دل کو متاثر کرنے کی کوشش کرتی مگر میں بول پڑا، "مستری رحیم بخش، تم ان عورتوں کو زیادہ تنگ نہ کرو۔ تم میرے ساتھ نیچے دکان پر چلو۔ تمھارا سارا روپیہ میں چکاؤں گا — میں!" اگرچہ مجھے اس کا ذرہ برابر بھی پتا نہ تھا کہ میں اتنا سارا قرضہ کیسے چکا سکوں گا۔

بیوہ نے مجھے کچھ تشکر اور کچھ شک کی نظروں سے دیکھا۔ بوڑھا رحیم بخش اسی کینہ بھری مسکراہٹ کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ ہم سیڑھیوں سے اترنے لگے۔ میں سوچ رہا تھا کہ شیخ شیر علی کا بینک میں کچھ روپیہ جمع ہے؛ شاید وہ مجھے ادھار دینے پر رضامند ہو جائے، یا شاید قانونی طور پر کوئی ایسا رخنہ مل جائے جس سے یہ بوڑھا مستری بیوہ سے قرضہ وصول کرنے کا حقدار ثابت نہ ہو سکے۔ جو کچھ بھی ہو، اس بات کا میرے دل میں پختہ ارادہ تھا کہ اب میں یہ نوبت نہیں آنے دوں گا کہ بوڑھا دوبارہ جا کر بیوہ اور رضیہ کو کڑھائے اور رلائے۔ جس وقت ہم بالاخانے سے اترے، رحیم بخش میرے ساتھ دکان پر چلنے کے بجائے مجھے سیڑھیوں کے دروازے کے سامنے روک کر کھڑا ہو گیا۔

اس کی آنکھوں میں ایک لومڑی کی سی عیاری تھی۔ وہ شاید اس شبے میں مبتلا ہو رہا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو، میں سچ مچ ہی اس کا قرضہ چکا دوں اور بیوہ کو اس کے چنگل سے رہائی مل جائے — ظاہر ہے کہ وہ یہ نہیں چاہتا تھا۔

"میری بات سنو،" وہ کہنے لگا، "تم اس معاملے میں کیوں پڑتے ہو؟ تم نے کیا سارے جہان کے دکھ درد کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟ کیا یہ لوگ تمھارے قریبی رشتے دار لگتے ہیں کہ تم ان کی خاطر تین ہزار سے ہاتھ دھونے کو تیار ہو رہے ہو؟ تم کو آج کے زمانے میں شاید روپے کی صحیح قدر و قیمت معلوم نہیں۔" پھر اس نے اچانک پینترا بدلا، "میری بات سنو۔ مجھ سے ایک ہزار روپیہ لو اور اس معاملے میں دخل نہ دو۔ تم اس بات میں آ ہی نہیں... میں..."

وہ اپنے فقرے کو مکمل نہ کر سکا۔ اس کی تھکی آواز فوراً گویا کٹ کر رہ گئی۔ اوپر خطرناک طور پر اٹکی ہوئی اس لالٹین کے ڈھانچے نے یہی لمحہ اپنے گرنے کے لیے چنا۔ میں نے لالٹین کو اس کے سر کے اوپر تڑاخ سے گرتے دیکھا۔ اس نے قدرتی طور پر اپنے بازو سر کو بچانے اور مقدر کے اس وار کو روکنے کے ارادے سے اٹھانے چاہے مگر لالٹین تو ہاتھ اٹھنے سے پہلے گر چکی تھی اور مستری رحیم بخش دروازے سے باہر آخری سیڑھی پر منھ کے بل جا گرا تھا۔ ایک لمحے تک وہ درد اور تکلیف سے کلبلاتا رہا اور پھر بے ہوش ہو گیا۔ لالٹین اس کے سر کے اوپر بیس فٹ کی بلندی سے گری تھی اور گری بھی سیدھی اپنی بھالا نما دم کے بل پر جو ٹھوس لوہے کی تھی اور لالٹین کا سب سے بھاری حصہ تھی۔ وہ نوکدار دم اس ساری قوت کے ساتھ جو بیس فٹ کی بلندی نے اس میں پیدا کر دی تھی، اس کے سر میں آ گڑی اور اس کی پیشانی کو چھیدتی ہوئی نیچے سڑک پر کھنکھناتی ہوئی جا پڑی۔ شیخ شیر علی نے اپنی دکان سے لالٹین کو مستری رحیم بخش کے سر پر گرتے ہوئے دیکھا۔ دو تین راہ چلتوں اور دکانداروں نے بھی یہ منظر دیکھا اور وہ بھاگتے ہوئے آ پہنچے۔

جلدی سے مستری رحیم بخش کو ایک فوجی ٹرک میں ہسپتال پہنچایا گیا۔ مگر میں نے سنا ہے کہ وہ رستے ہی میں مر گیا۔ ایک حادثہ — نہایت افسوسناک حادثہ!

رضیہ اب میری بیوی ہے اور ہم دونوں شیخ شیر علی کے بالا خانے میں رہتے ہیں۔ شیخ شیر علی کو ابھی تک فصلی بٹیرے لمیٹڈ سے مکالمہ نویسی کی پیش کش نہیں آئی اور اس لیے اس نے چار و ناچار اپنے آپ کو ایک باتونی عورت کی موجودگی برداشت کرنے پر رضا مند کر لیا ہے۔ اسے شکایت ہے کہ اس طرح کچھ عرصے تک اس کے اعصاب پر غیر موافق اثر پڑے گا، مگر اس کا تو وہ بھی اقرار کرے گا کہ جو کھانے رضیہ بناتی ہے وہ بے حد لذیذ ہوتے ہیں اور ہوٹل کے کھانوں سے کہیں زیادہ ٹھوس اور

قوت بخش۔ کہتے ہیں، ایک اچھی بیوی اپنے ساتھ اچھی قسمت بھی لاتی ہے۔ دوسری بیویوں کے متعلق تو مجھے معلوم نہیں مگر رضیہ کی صورت میں یہ بالکل درست ہے۔ شادی کے دوسرے ہی دن مجھے فورمین نے بلا کر یہ خوش خبری دی کہ مجھے اسی مہینے سے مستقل بنا دیا گیا ہے۔ (خان بہادر کا اس میں مطلق کوئی ہاتھ نہیں۔) رضیہ صرف میرے لیے خوش قسمتی نہ لائی، بلکہ میرے دوستوں کے لیے بھی، کیونکہ جس روز مجھے مستقل بنایا گیا شیخ شیر علی کو مدیر رسالہ بھینس کا خط موصول ہوا جس میں اس کے مضمون ''قرون وسطیٰ کے سماج میں بھینسوں کی اہمیت'' کا شکریہ ادا کیا گیا تھا اور استدعا کی گئی تھی کہ آئندہ بھی اسی پائے کے مضامین سے رسالے کی قلمی معاونت کو جاری رکھا جائے۔

آخری دن

ہم ڈھاکہ کے پریس کلب میں بیٹھے تھے۔ یہ ہمارا اس میٹھی دھوپ اور زمردیں کنجوں کے شہر میں آخری دن تھا۔ ہم اکتائے ہوئے اور کچھ اداس تھے۔ ہم میں سے نصف لوگ پہلے ہی اپنی خیر سگالی کو ختم کر کے کیلوں کے گچھوں سے لدے پھندے واپس مغرب کو فلائی کر چکے تھے۔ ناولسٹ پامپس ابھی تک ڈھاکے ہی میں تھا۔ لیکن وہ کلب کے لنچ پر موجود نہیں تھا۔ کلب ایک چھوٹے سے باغ میں ایک خوش نما دو منزلہ عمارت ہے۔ ڈھاکے کے اخبار نویس اس معاملے میں بہت خوش نصیب ہیں کہ انھیں ایسا پرسکون اور آرام دہ گوشہ میسر ہے۔

لنچ کچھ مشرقی تھا، کچھ مغربی اور مناسب پیمانے پر پر تکلف۔ ہمارے علاوہ میز پر انفارمیشن آفیسر اور ڈھاکے کے انگریزی اخباروں کے نمائندے تھے اور وہ دو خوبصورت اور چار منگ لڑکیاں تھیں، جن میں سے ایک بے حد شرمیلی تھی۔ اخبار نویسوں نے خود کھانا ترتیب دیا۔ مجھے ان کی سادہ اور غیر رسمی سی مہمان نوازی بڑی بھائی۔ لنچ کے بعد ہم اوپر کی منزل کے لاؤنج میں باتیں کرنے اور سگریٹ پینے کے لیے جا بیٹھے۔ وہاں کسی نے بلدیہ گارڈنز کا ذکر کیا اور کہا کہ ہم اسے دیکھے بغیر ڈھاکہ سے نہ جائیں۔

''ابھی کیوں نہ چلیں؟'' لڑکیوں میں سے ایک نے تجویز پیش کی۔ دبی دبی شرمیلی ہنسی ہنستے ہوئے، مسٹر گوگول، توپ و تفنگ کے گنجے، باتونی اور دلچسپ نمائندے نے خود کو بطور گائیڈ پیش کیا۔ گوگول نے کہا کہ وہ اس جگہ سو بار ہو آیا ہے اور اس کے چپے چپے سے اسے نفرت ہے، لیکن وہ میزبانی کی روایات کی خاطر ہمارے ساتھ جائے گا۔ ہم مائیکروبس میں ٹھنس ٹھنسا کے بیٹھ گئے۔ بورس میرے ساتھ بیٹھا تھا۔ ہم دونوں میں ابھی تک بول چال بند تھی: چالنا کی دریائی بندرگاہ کے سخت جھگڑے کے بعد ایک دوسرے کو زہر لگتے تھے۔

مائیکروبس ایک خاموش سڑک کے کنارے پتوں اور پھولوں سے ڈھنپے ہوئے ایک دروازے پر رکی اور ہم نیچے اترے۔ مسٹر گوگول نے اندر جانے کے ٹکٹ خریدے — اندر جانے کا ٹکٹ تھا! مجھے بیچارے گوگول پر ترس آیا۔ میرا خیال ہے کہ دوسروں کے لیے ٹکٹ خریدنے کا اس کا پہلا تجربہ تھا اور ہمیشہ دوسرے اس کا ٹکٹ خریدتے تھے۔ میزبانی کی قیمت ہوتی ہے۔ مجھے ایک غریب اخباری نمائندے کے اس طرح لٹنے کا افسوس ہوا، لیکن ہم بھلا کیا کر سکتے تھے۔ بیچارہ، بیچارہ گوگول!

پہلے ہم عجائب گھر میں داخل ہوئے، جو بعد یہ باغ کا ایک حصہ ہے۔ یہ میوزیم مجھے پرسکون اور تابوتی لگا۔ فضا میں وہ میٹھی پھپھوندی کی سی بو تھی جو عجائب گھروں سے مخصوص ہے۔ سبز روشنی رنگے ہوئے شیشوں سے چھن کر آ رہی تھی اور اندر کے جھینپے و باہ کرتی تھی۔ دو کمرے تھے، دونوں میں مجموں اور نوادرات سے پر گلاس کیس سجے ہوئے تھے۔ دیواروں پر ٹیپو بہادر اور مغل زمانے کے جنگی ہتھیار لٹک رہے تھے۔ توڑے دار بندوقیں، پیش قبض، خنجر، برچھے اور کئی دوسرے ہتھیار جن کے میں نام نہیں جانتا۔ میں نے اس وقت نا راست پامپس کی غیر موجودگی کو محسوس کیا۔ پامپس، جو خود کو قدیمی اسلحہ پر اتھارٹی سمجھتا ہے، یہاں خوب اپنے علم کے جوہر دکھاتا اور بڑے اعتماد سے چہکتا۔ میں نے سوچا، پامپس کی حسو پرمی کتنی ہی بے کار اور غلط معلومات سے مخلص ہوتی ہے۔ یہاں اس کی تردید کرنے والا کوئی نہ تھا، وہ جو چاہتا کہتا چلا جاتا۔

دونوں خوبصورت لڑکیاں، جو یہاں پہلے آ چکی تھیں، مجھے شیشے کے صندوقوں میں رکھی ہوئی چیزیں دکھانے لگیں۔ وہ بڑی اچھی لڑکیاں تھیں، پر مذاق اور سلجھی ہوئی۔ میں نے خود کو اکیلا محسوس کرتے ہوئے ان کو ساتھ چپکا لیا تھا اور وہ بھی، میرا خیال ہے مجھے پسند کرنے لگ گئی تھیں۔ پریس کلب میں میں نے انھیں پامپس کو سندر بن ایڈونچرز کا خیال سنایا تھا، جس کو انھوں نے مزے سے سنا تھا اور خوب ہنسی تھیں۔ بورس میری وجہ سے خود بخود ہی اس دلنواز صحبت سے الگ رہنے پر مجبور ہو گیا تھا۔ بہرحال، اس کا ستارہ کافی کچھ ماند پڑ چکا تھا۔ گلاس کیسوں کے درمیان پھرتے ہوئے جب دو تین بار ہماری نظریں ٹکرائیں (ہم ہمیشہ کنکھیوں سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے تھے، چونکہ نفرت بھی ایک قسم کی محبت ہے) تو مجھے ان میں خون آشامی کی جھلک دکھائی دی۔ مسٹر گوگول گائیڈ کا حق پوری طرح ادا کرنے پر تلا ہوا تھا۔ اگرچہ اتنی بار یہاں کی سیر کرنے کے بعد بھی اس کی معلومات ہمارے جتنی ہی تھیں، لیکن اسے اس جگہ کی تاریخ کے بارے میں کچھ سوجھ بوجھ تھی، برائے نام سی۔ اس نے اس کے بل بوتے پر ہمیں ایک پوری کہانی سنائی۔

اس جگہ کوئی ایسی چیز نہیں، جسے بلدیہ کی کارگذاری سے منسوب کیا جا سکے۔ عجائبات اور

نوادرات کا مجموعہ ایک گذرے ہوئے متمول شہری کا فراہم کردہ ہے۔ کس لگن، کس محبت سے اس نے ان عجوبوں کو ڈھونڈا اور حاصل کیا ہوگا۔ کتنے ہزاروں، لاکھوں روپے ان کے حصول پر خرچ آئے ہوں گے۔ اپنی ساری عمر میں اس نے یکسوئی سے اور دل و جان سے اپنے شوق کے پودے کی آبیاری کی اور آرٹ اور حسن کی تلاش میں زندگی دے دی اور اس منزل تک پہنچنے کے جنون میں اس کے قدم کبھی نہ ڈگمگائے۔

عجائب گھر کے داخلے پر اس میوزیم کے خالق کی بڑی فریم شدہ تصویر لگی تھی۔ لوگوں نے اسے فخریہ انداز سے ہمیں پوائنٹ آؤٹ کیا۔ کس جگہ، میں نے سوچا، میں نے اس چہرے کو دیکھا ہے۔ چھوٹی بھینگی قدرے پرحسرت آنکھیں، تنگ نیچا ماتھا، پچکے ہوئے گال، موٹے حساس ہونٹ، ٹھوڑیاں دو تھیں اور چہرہ پلپلا، سر پر سفید پگڑی تھی۔ میں نے اسے کہاں دیکھا ہے؟ کسی پرانی فلم میں، لاہور کے کسی پھل فروش کی دکان پر... نہیں، اسکول کی تاریخ کی کتاب میں۔ راجہ رام موہن رائے کی تصویر کے عکس سے نقوش میرے سامنے ابھرے۔ فوٹو پرنٹ بھی اسی نسل کا تھا: سفید، دھندلا، مبہم۔ میں نے تصویر کو غور سے دیکھا تو یہ وہ آدمی تھا جس کے دل میں نادر چیزوں اور درختوں کے لیے اتنی لگن تھی۔ اس کے چہرے میں کوئی ایسی بات نہ تھی جس سے اس کے ستھرے مذاق اور ذوق حسن کا پتہ ملتا۔ یہ ایک عام گول مٹول، معصوم، تن آسان بنگالی چہرہ تھا۔ کیا چہرے واقعی اتنا کچھ بتا سکتے ہیں جتنا صورت شناسوں کا دعویٰ ہے؟ کیا وہ دل کا سب حسن اور سوز، اس کی لگن اور تپش آشکار کر سکتے ہیں؟ میں نے سوچا، ممکن ہے وہ محض ایک شوقین مزاج آرٹ کے خزانے جمع کرنے والا آدمی ہو، جس کو ان چیزوں کی حقیقی قدر و قیمت معلوم نہ ہو اور جو انھیں خودنمائی کے جذبے کے تحت اکٹھا کرتا ہو۔ میں یقیناً غلط تھا... تصویر کو دوبارہ دیکھنے سے مجھے اس میں ایک عجیب خوبصورتی نظر آئی۔ یہ ایک شانت، مطمئن چہرہ تھا، اپنی فربہی کی تہوں کے باوجود۔ آنکھوں میں حسرت ضرور جھانکتی تھی، ایک مضطر تمنا؛ ان سے زیادہ معصوم آنکھیں میں نے نہیں دیکھیں۔

لوگوں نے تصویر کے عین نیچے ایک جڑے ہوئے کتبے کی عبارت کی طرف ہماری توجہ دلائی۔ ہم سب نے اسے باری باری پڑھا۔ اس کے باوجود کہ زندگی اور گذرے ہوئے سالوں نے ہمیں سرد دل اور رحم کے جذبے سے خائف بنا دیا تھا، اس کتبے کی عبارت میں اتنا درد تھا کہ ہم جذباتی ہوگئے۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں اور میں نے جلدی سے اپنے آنسوؤں کو لڑکیوں سے آنکھ بچا کر پونچھ ڈالا۔ میں بلاوجہ ہنس پڑا۔ یہ کتبہ اس امیر آدمی نے اپنے بیٹے کی یادگار میں نصب کرایا تھا، جو عین جوانی کے عالم میں داغ مفارقت دے گیا تھا۔ کتبے کی انگریزی عبارت بڑی ہی

مرصع اور قدرے مضحکہ خیز تھی، لیکن اس کے ایک ایک لفظ میں باپ کی شدتِ غم کی آنچ تھی۔

آخر میں آنے والوں سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ اس نوجوان کی سمادھی پر پھول ضرور چڑھاتے جائیں۔

اس کتبے کے پیچھے ایک پُردرد چھوٹی سی کہانی ہے۔ اگر صرف گوگول بتاتا تو میں بھی یقین نہ کرتا، لیکن میں نے دیکھا کہ میں اسے ایک دو مقامی آدمیوں سے سنا اور یہ ضرور سچ ہوگی۔ اس میوزیم اور باغ کے معمار کی پہلی بیوی شادی کے چند سال بعد ہی مرگئی ہوگی۔ اس کے بطن سے اس آدمی کا ایک بیٹا تھا اور بیوی کے مرنے سے اس کی ساری محبت اپنے بیٹے پر مرکوز ہوگئی۔ دس بارہ سال گزر گئے، اس آدمی نے دوسری شادی کر لی۔ پھر جیسا کہ عموماً ہوتا ہے اور جیسا اپنی چاہت سے اس نے دوسرا بیاہ رچایا۔ نئی عورت جوان اور خوبصورت تھی، لیکن اس کا دل پتھر کا تھا۔ وہ کہانیوں کی سوتیلی ماؤں کی طرح سخت دل اور بے رحم تھی۔ وہ دوسری رانی تھی۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے شوہر کو اپنے بیٹے سے اس طرح محبت ہے تو اس نے بیٹے کی طرف سے باپ کا دل میلا کرنے کے لیے کئی تریا چلتر کیے۔ سال کے بعد بھگوان نے اس کی گود بھری۔ تب تو اس پر اپنے سوتیلے بیٹے کا وجود ہی کھٹکنے لگا اور وہ اسے نقصان پہنچانے کے درپے ہوگئی۔

وہ یہ جانتی تھی کہ اس کے شوہر کی جائیداد کا وارث بڑا بیٹا ہی ہو سکتا ہے۔ ایک دن وہ ایک کھیل کھیلی۔ اپنے سوتیلے بیٹے سے، جو اب جوان ہو چکا تھا، بڑے چاؤ اور چاہ سے پیش آئی اور اسے اپنے ہاتھ سے دودھ کا گلاس پلایا۔ لڑکے کے دل میں کوئی وسوسہ نہ تھا، وہ دودھ پی گیا، یہ گمان کیے بغیر کہ اس امرت میں زہر گھلا ہے۔ چند گھنٹوں کے اندر اندر، طبیبوں اور حکیموں کی چارہ سازیوں کے باوجود وہ مر گیا۔ اس کے مرجانے کا اس کے باپ کو سخت صدمہ ہوا۔ ایسی باتیں کب چھپ سکتی ہیں۔ بات ظاہر ہونے سے نہ رہ سکی۔ جب باپ پر پورا حال کھلا کہ اس کے لڑکے کی موت کیونکر ہوئی تو فرطِ غم سے اس نے اپنے حواس کھو دیے۔ وہ بدل گیا، اسے دنیا کی کسی شے سے دلچسپی نہ رہی — اپنے میوزیم اور باغ سے بھی نہیں۔ بیٹے کی موت کے چند ماہ بعد ہی وہ اس سے جا ملا۔

گوگول نے کہا کہ وہ سوتیلی ماں ابھی تک زندہ ہے اور پاس کے مکان میں رہتی ہے۔ مائیکرو بس کے ڈرائیور عزیزالرحمٰن نے بھی اس کی گواہی دی۔ بورس اس سارے معاملے کے متعلق بہت زیادہ جذباتی ہو رہا تھا۔ اس نے اعلان کیا کہ اس عورت سے ملنا چاہیے، لیکن کسی دوسرے نے اس کی حامی نہ بھری۔ گوگول نے کھلم کھلا اس کا مذاق اڑایا۔

ہم میوزیم سے باہر باغ میں آگئے۔ گھنے پتوں میں جھٹپٹے کا سماں تھا اور روشنی گویا شفاف پانی

میں سے تھر تھرا رہی تھی۔ یہاں دو یا تین پودوں کے لیے شیشے کے گھر تھے۔ پودے زیادہ تر ایسے تھے جو ان ہواؤں میں نہیں اگتے۔ "گرین ہاؤسوں" سے آگے ہم باغ میں اور جنوری کی سہ پہر کی گلابی دھوپ میں آئے۔ باغ بظاہر اجڑا ہوا اور ویران تھا۔ آسیب زدہ روشوں اور راستوں کے بغیر باڑ کے لٹکتے ہوئے باغ دیکھنے کا مجھے اتفاق نہیں ہوا۔ ان کا منظر بھی کچھ ایسا ہوگا۔ میرا چہیتا انگریزی مصنف رابرٹ لوئی اسٹیونسن اجڑے باغوں سے محبت کرتا تھا اور اس کی ایک نظم "حسین گھر" اس طرح شروع ہوتی ہے: "پھل اور پھول سے ننگا باغیچہ... ایسی جگہ میں رہتا ہوں: باہر سے اجڑی پجڑی اور اندر سے بے سامان..." مجھے بھی اجڑے باغ پسند ہیں۔ خصوصاً یہ بلدیہ باغ۔ قتل و خون کے لیے یہ بڑی موزوں جگہ ہے اور جب بھی میں نے کسی کے قتل کا ارادہ کیا (ایسے تین چار آدمی میری نظر میں ہیں جن کے بارے میں کبھی کبھی میرے دل میں ایسی خواہش پیدا ہوتی ہے) تو میں اس کو باتوں باتوں میں یہاں لے آؤں گا۔ جب میرا انجان شکار جاوا کے ربڑ کے درخت کو حیرت سے دیکھنے میں منہمک ہوگا، میں چپکے سے اپنا لمبا چاقو اس کی پیٹھ میں جھونک کر اسے چلتا کروں گا۔ سورج کی گھڑی کے پیچھے ایک گھنی اندھیری جگہ ہے جہاں لاش کو مناسب طریق سے ٹھکانے لگایا جا سکتا ہے۔

میں نے بورس کی طرف کنکھیوں سے دیکھا۔ کیا اس کے دماغ میں بھی اس وقت قتل کے خیالات گذر رہے ہیں؟

گوگول کی زبان کبھی چلنے سے نہ رکتی تھی۔ میرا خیال ہے کہ وہ دنیا کے سب سے گپی آدمیوں میں ایک ہوگا۔ لیکن وہ اپنے اخبار کا بڑا کامیاب نمائندہ تھا، پیچ لڑانے میں ماہر۔ پچھلے پانچ سال سے وہ ڈھاکہ میں اخبار کے کام کو سنبھالے ہوئے تھا۔ ہر کوئی اسے جانتا تھا اور وہ ہر کسی کو۔ مگر گوگول قدرے بے پرواہ اور غیر سنجیدہ گائیڈ تھا۔ کوئی اس کی بات کا یقین نہیں کر سکتا تھا۔ ایک درخت کی طرف اپنی سوٹی سے اشارہ کرتے ہوئے گوگول نے بتایا کہ یہ ربڑ کا درخت ہے۔ یہ اس قسم کی کوئی چیز نہ تھا، اگرچہ کئی اس کی طرف اشتیاق سے لپکے۔ یہ ایک عام کیکر تھا۔ جب لڑکیوں میں سے ایک نے وضاحت کی کہ میاں گوگول، ربڑ کا درخت تو وہ آگے کونے پر ہے، تو مجال ہے گوگول کو ذرا خفت ہوئی ہو۔ اس نے جان بوجھ کر غلط معلومات نہ دی تھیں۔ اس نے صاف صاف اقرار کیا کہ اس کے لیے سب درخت ایک سے ہیں اور اس سے یہ توقع کی جا سکتی ہے کہ کیلے کے پودے کو آم کا درخت بنادے۔

ہم میں سے بیشتر میرے خیال میں گوگول کی کشتی میں سوار تھے۔ ذاتی طور پر میں اب تک ٹاہلی، سرس یا کیکر کے درخت کو ایک نظر میں نہیں پہچان سکتا۔ اپنے پیشے اور کام سے متعلق باتوں کے

علاوہ ہمارا عام علم بہت محدود ہوتا ہے اور ہم خدا کی زمین میں آنکھیں موند کر چلتے ہیں۔ اس اجڑے باغ میں کئی نادر درخت تھے جن کے پودے اس کے مالک نے دور دور کے دیسوں سے منگوائے تھے اور انھیں بڑی محنت اور محبت سے سینچ کر پروان چڑھایا تھا۔ وہ ایسے درخت تھے جو بنگال کی دھرتی میں نہیں ہوتے — ملایا، فجی اور برازیل کے انجانے درخت۔ ہمیں ان کے نام بھی بتائے گئے اور اب مجھے یہ اقرار کرتے ہوئے شرم آتی ہے کہ ان میں سے صرف ربڑ کا درخت میرے ذہن میں رہ گیا ہے۔

ہم ایک پتھر یلے حوض پر آئے — پانی کے بغیر ایک حوض۔ چوڑی سیڑھیاں نچلی تہہ تک جاتی تھیں۔ کبھی یہ پرفضا جگہ ہوگی۔ اب یہ ایک وحشیانہ تنگی کی حامل تھی۔ خالی، شکستہ حوض، ویران درخت، یہ سب اس رنجیدگی کی کہانی بتاتے تھے جس نے ایک امیر اور سلجھے ہوئے خاندان کو آلیا تھا۔ ہم درختوں کو دیکھتے ہوئے تالاب کے گرد چلے اور آخر بیلوں سے پٹے ہوئے ایک کونے میں سورج کی گھڑی پر آئے۔ ہم مغرب سے آنے والوں میں سے شاید کسی نے پہلے سورج کی گھڑی نہ دیکھی تھی اور ہم نے اس عجوبے کو دلچسپی سے دیکھا۔ ڈاکٹر پامپس ذوالست یہاں ہوتا تو وہ اس موقعے پر سورج کی گھڑی پر ایک طویل اور پر مغز لیکچر دیتا اور بغداد کے اس مسلمان موجد کے حالات زندگی پر ایک تبصرہ کرتا جس نے سب سے پہلے یہ گھڑی ایجاد کی تھی۔ وہ اس کی بابت پتہ چلائے بغیر ہمیں بتانے کی کوشش کرتا کہ اس سے وقت کیسے دیکھا جا سکتا ہے۔ سورج کی گھڑی ایک پتھریلے چبوترے پر مشتمل تھی جس پر مدھم ہندسوں کے نشان تھے۔ اس کے اوپر ایک لوہے کے پتر کا سایہ پڑتا ہے اور وقت کی نشاندہی کرتا ہے۔ درختوں کے دھندلکے میں پتر کا سایہ غیر واضح اور نامعلوم سا تھا۔ ہم گوکول اور چند دوسروں نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ میں یہ دیکھ کر حیرت زدہ ہوا کہ یہ گھڑی محض ایک آرائشی عجوبہ ہی نہ تھی، یہ قریب قریب صحیح وقت بتاتی تھی۔ سورج کی گھڑی اس باغ کے آخر میں تھی۔ ہم وہاں سے ہچکچاتے، دبے قدموں سے رخصت ہوئے تاکہ خوابیدہ روحوں کو نہ جگائیں۔

لیکن میں نہیں جانتا کہ میرے ساتھیوں کے احساسات کیا تھے۔ سوچ رہا تھا کہ وہ آدمی جس کے اندر اتنی لگن تھی اور جس نے یہ میوزیم اور باغ بنایا تھا، ہزاروں میں ایک تھا۔ وہ ایک دھرماتما تھا۔ ایسے آدمی کم ملتے ہیں۔ اس خراب آباد میں، جہاں ہم میں سے بیشتر زندگی کی گھڑیوں اور الجھنوں کو چھوٹی چھوٹی رنجشوں، خانگی تلخیوں اور حقیر مصروفیتوں کی نذر کر دیتے ہیں اور ساری عمر اپنی ناکامیوں کے نوحے کرتے گذار دیتے ہیں، ایک لگن رکھنے والا آدمی قابل ستائش ہے۔

باہر جانے سے پہلے مس مزا اور میں نے دونوں ہاتھ جوڑ کر اس آدمی کو پرنام کیا جس کے دل میں حسن کی اتنی لگن تھی اور جو درختوں کو پیار کرتا تھا۔

سہ پہر اور شام

دن چمکیلا تھا، اور مزے دار گرم۔ یہ دسمبر کا مہینہ تھا اور آسمان پر ایک شفاف سرمائی نیلاہٹ تھی۔ میں اور میرا ساتھی، جو ایک اسکول ماسٹر ہے، چمکیلے دن میں ریل کی پٹری کے ساتھ ساتھ پل کی طرف چلنے لگے۔ پل، بڑا اور وسیع، زرتار کے مہین جالے کا بنا ہوا گورکھ دھندا ہمیں لگا۔ نیچے دریا بہتا تھا، پُرامن، خاموش، سکڑا ہوا۔

ہم اس اجنبی شہر میں بارہ تیرہ سال کے بعد آئے تھے، سیر کے لیے، اپنے چھوٹے چھوٹے تفکرات کو بھلانے کے لیے، اور ہر ایک چیز ہمارے لیے نئی اور اچھوتی اور عجیب تھی۔ اسکول ماسٹر ایک چھوٹے لڑکے کی طرح خوشی سے کودنے پھاندنے لگا۔ ہمارے دل گانے لگے۔

ہمارے دائیں اور بائیں ریتیلے پتھر کی چٹانوں پر روہڑی کا ناممکن، ناقابل یقین شہر آباد تھا۔ پتھر کے اونچے ڈھلوانی دیواروں کے اور پُرکینہ آنکھوں کے سے روزنوں والے مہیب مکان۔ کلبلاتے ہوئے اور ایک دوسرے کے اوپر گرتے پڑتے ہوئے تنگ کوچے سیڑھیوں کے ذریعے اوپر چڑھتے ہیں اور سانپ کی طرح لہراتے ہوئے گم ہو جاتے ہیں، اور یہ یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ وہ مخلوق جو یہاں بستی ہے، انسان کہلاتی ہے۔ یہ شہر چڑیلوں اور بھتنوں کے لیے بنا ہوا لگتا ہے اور شاید وہ یہاں رہتے ہوں۔

روہڑی میں اب دلّی اور یوپی کے مہاجر ٹھنسے ہوئے ہیں۔ پھر ہم نے نیچے دمکتے دریا کے کنارے پر لانچ دیکھی۔ لانچ میں سواریاں بیٹھی تھیں۔ چند پار جانے والے لوگ تیز تیز قدم اٹھاتے ہوئے لانچ کی طرف جا رہے تھے۔

''وہ لانچ رہی،'' میں نے کہا۔

''یہ چلنے والی ہے۔ اسے پکڑنے کے لیے ہمیں بھاگنا پڑے گا۔''

اسکول ماسٹر اور میں پٹری سے نیچے اترے اور ریتیلے میدان میں بھاگتے ہوئے لانچ تک جا پہنچے۔ یہ لبالب بھری ہوئی تھی اور وقفے وقفے میں چیپ چیپ کر رہی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ یہ چلنے والی ہے۔ سندھ میں ہر ایک چیز کی طرح یہ ایک مسرت خیز طور پر بوسیدہ اور شکستہ لانچ تھی۔ اس کے دو الگ الگ خانے تھے، ایک عورتوں کا اور دوسرا مردوں کے لیے۔ اوپر کا کمرہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔

ہم کنارے اور لانچ کے درمیان پٹری کے تختے کے ذریعے لانچ پر پہنچ گئے اور مردوں کے خانے میں گھسم گھسا ہو کر بیٹھ گئے۔ لانچ چیپ چیپ کرتی رہی۔ دو اور مسافر دور پٹری سے بھاگتے چلے آ رہے تھے۔

"اوے ہوے جا کیہڑی آے!!" کالی قمیص اور کالی شلوار میں ملبوس ایک سندھی نے کنڈکٹر سے کہا۔

لانچ نے اس وقت حرکت کی جب وہ دو مسافر بھی سوار ہو گئے۔ کنڈکٹر نے کنارے تک پہنچنے والے تختے کو کھینچ لیا اور اسے انجن والے خانے میں ڈال دیا۔ دونوں مسافر تختے پر بیٹھ گئے۔ لانچ چیپ چیپ کرتی ہوئی چھچھلے پانی کو چیرنے لگی۔

ہم نے مسافروں کا جائزہ لیا۔ سندھی مسافر تو تھوڑے سے تھے، زیادہ تر ہمارے ہم سفر ہندوستان سے آئے ہوئے مہاجر تھے۔ شرفی قسم، چھوٹے دکاندار، دستکار۔ ان کے ستے ہوئے، صابر، حیران چہروں پر جلاوطنی اور تھکن لکھی ہوئی تھی۔ ہر ایک کا چہرہ ایک لمبا دلدوز ناول تھا، لیکن کون اس کو پڑھ سکتا تھا؟ کون بتا سکتا تھا کہ وہ کیا سوچتے ہیں، اس غیر مانوس ماحول میں کیسا محسوس کرتے ہیں؟ زنانہ خانے میں گداگر عورتوں کی ایک پوری ٹولی سفر کر رہی تھی۔ اس ٹولی کی ایک لڑکی کھڑی نعت خوانی کر رہی تھی: "محمدؐ نے دنیا پہ..." نعت کے لفظ مجھے یاد نہیں رہے۔ وہ چھیپالی کے ہوئے کپڑوں میں ملبوس ایک سانولی سلونی تیرہ سالہ لڑکی تھی۔ تیکھے نابالغ نقوش، سیاہ اڑتے ہوئے بال، اور پختہ ابھرا ہوا سینہ۔ وہ ہشاش بشاش، وحشی اور بے پروا تھی۔ ہم نے لانچ کے انجینئر کو انجن کے خانے کی دیوار پر سے رمز و کنایہ کی زبان میں اس سے فحش مذاق کرتے دیکھا۔ مگر لڑکی کو اس کی پروا نہ تھی۔ وہ بالکل شرم کے بغیر تھی۔ وہ اس چھیڑ خانی پر مسکراتے ہوئے اپنی نعت گاتی رہی۔ وہ گا چکی تو لانچ میں کئی نیک دل لوگوں نے، جو اس کی نعت خوانی سے بے حد متاثر ہوئے تھے، اسے پیسے دیے۔

لانچ کے انجینئر نے ہمیں تقریباً اپنے گنوں اور اپنی مکینکی کارروائیوں سے گرویدہ کر لیا۔ وہ

مسخرے بندر کی سی صورت کا شوخ و شنگ بدمعاش تھا۔ عمر کوئی اٹھارہ کے لگ بھگ، کینوس کا اوورآل جسم پر اور کانوں میں چھوٹی چھوٹی بالیاں۔ اس کے بال گھنگھریالے تھے۔ وہ ایک لحظہ نچلا نہ بیٹھتا اور ہر وقت فرسودہ انجن کے مختلف حصوں سے چھیڑ کرتا رہتا۔ جب بھی وہ ایسا کرتا، انجن پہلے سے ایک مختلف آواز پیدا کرتا۔ اس انجن کی کئی آوازیں تھیں۔ ایک تو تھی: پھٹ پھاہ پھٹ پھاہ پھٹ پھاہ۔ یہ عموماً گرگر گرگرم میں بدل جاتی اور یا شرڑا شرڑا شرڑا میں۔ ایک چوتھی آواز بھی تھی، چھن چھن چھناک، گویا کسی مندر میں جھانجے بج رہے ہوں۔ انجن کی یہ نغمہ سرائی تھی تو دلپذیر، مگر چھن چھن چھناک کی منزل پر مسافروں کو محتاط ہو کر بیٹھنا پڑتا تھا، کیونکہ اس موقعے پر انجن کا کوئی پرزہ جلتا ہوا گرم پانی باہر اُگلنے کی کوشش کرتا تھا۔ انجینئر انجن کے ان مختلف چونچلوں سے بے حد لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اسے ٹھونکتا بجاتا اور فاتحانہ طور پر مسافروں کی طرف دیکھتا، جیسے کہہ رہا ہو کہ میری چابکدستیوں ہی کی وجہ سے تو یہ قدیم کنگ گذری لانچ پانی پر ہے۔

جہاں انجینئر کا جواب نہ تھا، لانچ کا کنڈکٹر مایوس کن تھا — ایک باؤلا سا دیہاتی گھامڑ جو غالباً نیا نیا کنڈکٹر بنا تھا۔ میں نے اسے ٹکٹوں کے لیے چھ آنے کے پیسے دیے۔ اس نے دو ٹکٹ تھمائے اور ساتھ ہی پانچ روپے میں سے بقیہ ریزگاری مجھے دینے لگا تھا۔ یہ پانچ روپے اسے کسی اور نے دیے تھے۔ وہ اپنے پیشے کا بالکل اہل نہ تھا اور اس نے اتنی بدحواسیاں کیں کہ اسکول ماسٹر اور میں تعجب کرنے لگے کہ اس کو کنڈکٹر کس نے بنایا ہے۔

لانچ دریا میں ایک جزیرے کے پاس سے گذری جس پر آم اور کھجور کے جھنڈوں کے درمیان ایک مندر تھا، اور پھر چٹن کی سمت مڑی۔ بہت سے روبڑی جانے والے مسافر وہاں کھڑے لانچ کا انتظار کر رہے تھے۔ پانی پر مستولوں کا ایک جنگل تھا اور کئی بڑی دریائی کشتیاں وہاں لنگرانداز تھیں۔ چٹن کے پیچھے ایک بڑی عمارت کے سامنے سرخ نیلے پیلے لاجوردی علم سے لٹک رہے تھے جیسے یہ کسی کی تاجپوشی کا دن ہو۔

لانچ سے نیچے اترتے ہی سامنے ایک چھوٹا سا اسٹال تھا۔ مڑی ہوئی ٹانگوں کی ٹین کی کرسیاں، لکڑی کے بنچ، امرودوں کے چھلکے۔ اسکول ماسٹر اور میں کچھ دیر ایک بنچ پر بیٹھ کر دریا اور واٹر فرنٹ کا نظارہ کرتے رہے۔

کنارے پر کوڑے کرکٹ کے مٹمیلیں ڈھیر تھے اور مہاجر لوگوں کے گھاس پھوس کے جھونپڑے۔ ہمارے گرد ناقابلِ تصور غربت اور خستہ حالی تھی۔ ہم نے ڈونگوں کے تختوں پر کئی فاقہ زدہ، غلیظ مردوں اور عورتوں اور بچوں کو دیکھا۔ دنیا کو خالی، پُریاس نظروں سے تکتے ہوئے، ایک

دوسرے کی جوئیں نکالتے ہوئے، اپنے چیتھڑوں میں پیوند ٹانکتے ہوئے، بار بار پانی میں تھوکتے ہوئے۔ دو تین ننگے بھجنگ غلیظ بچے اسٹال کے پاس آئے اور امرودوں کے پھینکے ہوئے چھلکوں کو تلاش کرنے لگے۔

چھ سات کتے اور کتورے اسٹال کے پاس ساکت اور بے حس پڑے تھے۔ وہ مردہ تھے یا نیم مردہ۔ ایک مرے ہوئے کتے کا پنجر پاس ہی پڑا گل سڑ رہا تھا۔ "اوپر درخت پر دیکھو،" اسکول ماسٹر نے کہا۔ ایک اونچے بڑ کی چوٹی پر پر پھیلائے دو بڑے گدھ ساکن بیٹھے تھے۔ وہ درخت کا حصہ لگتے تھے۔

"تم انھیں پہچانتے ہو؟" اسکول ماسٹر نے پوچھا۔

یہ ایک عجیب وغریب سوال تھا۔ کیا اسکول ماسٹر مذاق کررہا ہے؟ پھر میں سمجھ گیا۔

"ہاں — مردار کھانے والے۔ ان کی شکل ان میں سے بعض کے ساتھ ہو بہو ملتی ہے۔"

"شہر میں چلیں؟"

"اب آئے ہیں تو چلنا تو چاہیے۔"

"یہاں بار بھی ہے۔"

"وہ اس وقت بند ہوگی۔"

ہم لانچ سے اٹھ کر سیڑھیاں چڑھ کر سڑک پر پہنچے۔ وہ لمبے جھنڈے اور رنگین علم جو ہم نے لانچ میں سے دیکھے تھے، وہ دستی کرگھوں پر بنے ہوئے رنگدار سوتی کپڑے تھے۔ ہم نے چار پانچ کرگھے دیکھے۔ بوڑھے جلاہے، سوت کے گولے پاس لیے، ان کرگھوں کو گھمارہے تھے۔ ہم سب سکھر کی بندر روڈ پر آنکلے۔ ایک طرف بڑی بڑی عمارتیں ہیں، دوسری طرف جھونپڑیاں اور چھوٹی دکانیں ... ہم نے ایک محرابی دروازے پر ایک بورڈ پڑھا: "خان بہادر گلاب بخش لچھو رام اینڈ کو۔" ہمیں ہنسی آگئی۔

"پانچ چھ مہینے تک،" اسکول ماسٹر نے کہا، "لچھو رام غائب ہو جائے گا اور صرف خان بہادر گلاب بخش رہ جائے گا۔ ہمیشہ یہی ہوتا ہے۔"

ہم شہر میں گئے۔ بار بند تھی اور سکھر میں ہمارے کرنے کے لیے کچھ نہ تھا۔ ہم آخر واپس لانچ کے پتن پر آگئے اور امرودوں کے اسٹال کے بنچ پر آبیٹھے۔ دریا کے پانی میں اب گلاب گھل رہا تھا اور سورج کافی ڈھل چکا تھا، اگرچہ ابھی شام نہ ہوئی تھی۔ لانچ کا نام ونشان نہ تھا۔ بے شمار مسافر لانچ کے انتظار میں اسٹال کے بنچوں پر بیٹھے تھے، امرود کھاتے، تھوکتے، مکھیاں اڑاتے۔ ان کے

چہروں پر انتہائی صبر ثبت تھا اور کوئی ان سے آن کے کہتا کہ لانچ دو دن بعد آئے گی تو وہ پھر بھی اس کے لیے انتظار کرتے۔

ہم بنچ پر بیٹھ گئے۔ سات کتے ابھی تک اسی طرح پڑے تھے۔ پاس کے بڑ کے درخت پر گدھ اسی طرح بیٹھے تھے گویا کہ وہ اس درخت کا حصہ ہوں۔ کھڈی میں لڑکے اسی طرح کرگھے اور گزری ہوئی سلاخ کے درمیان آجا رہے تھے۔ کالی شلوار اور رنگین قمیص میں ایک سندھی چوہے دان اٹھائے آیا۔ چوہے دان میں چار موٹے بھورے چوہے تھے اور سندھی ان کو دریا میں ڈبونے کے لیے لایا تھا۔ وہ کنارے پر بیٹھ گیا۔ ننگے بھجنگ بچے تماشا دیکھنے کے لیے اس کے گرد جمع ہو گئے۔ اس نے چوہے دان کو پانی میں ڈالا۔ پانی یہاں بے حد کم تھا اور چوہے چوہے دان کی چھت تک چڑھ آئے۔ چوہوں نے ڈوبنے سے انکار کر دیا۔ کائیاں، پر فریب چوہے! سندھی نے آخر چوہے دان کو پانی میں رکھ کر اس کی کھڑکی کو کھول دیا کہ چوہے اپنے قید خانے سے باہر نکلیں گے تو خود بخود ڈوب جائیں گے۔ چوہے باہر نکلے، مگر وہ ڈوبے نہیں۔ وہ اچھل کر کنارے پر آ گئے اور ایک قطار میں کرگھوں کے مہاجر جلاہوں کی جھونپڑیوں میں بھاگ گئے۔ سندھی بڑا کھسیانا ہو کر اپنا چوہے دان اٹھا کر چلا گیا۔

ایک گھنٹہ گزر گیا۔ لانچ ابھی تک نہ آئی تھی۔ اسکول ماسٹر اور میں روہڑی پہنچنے کے لیے تانگہ کرنے کا سوچ رہے تھے۔ ہمیں گاڑی بہرحال پکڑنا تھی۔ اتنے میں کسی نے کہا ''لانچ آ گئی۔'' ہم نے دریا کی طرف دیکھا۔ ایک آگ سے دہکتے ہوئے دریا میں لانچ مندر والے جزیرے کے موڑ پر گھوم رہی تھی۔ سب مسافر بنچوں سے اٹھ کر پتن پر جمع ہو گئے۔ وہ پچاس سے کچھ اوپر تھے۔

ہم لانچ میں سب سے آخر میں چڑھے اور پھر انجن کے خانے پر آر پار پڑے ہوئے تختے پر بیٹھ گئے۔ چھن چھن چھناک پر جب اسکول ماسٹر پر تپتے گرم پانی کے چھینٹے پڑے تو بالیوں والے انجینئر نے اسے کونے میں اپنی لوہے کی نشست پر بٹھا دیا۔ لانچ لوگوں سے ٹھنسی ہوئی تھی۔ کئی مسافر اس کے نمگیرے کے ڈنڈوں سے پرخطر طریق پر چمٹے ہوئے اس کی دیواروں پر بیٹھے تھے اور آدھ درجن کے قریب اس کے پیش عرشے پر ہوں گے۔

چگ چگاتے، پھٹ پھٹاتے، چھن چھناتے، مختلف قسموں اور سروں کے راگ الاپتے، ہم آتشیں پانی میں سفر کرنے لگے۔ سورج اب غروب ہونے کو تھا اور دریا شام میں پرسکون اور خوبصورت لگتا تھا۔ گداگر عورتوں کی ٹولی اب بھی لانچ میں ہماری ہم سفر تھی اور ابھرے سینے والی کمسن لڑکی نعت پڑھ رہی تھی۔ شاید یہ ٹولی مستقل لانچ میں رہتی تھی، مسافروں کی تفریح طبع کے لیے،

یا شاید لانچ کے پروپرائٹر کا ان کی کمائی میں کچھ حصہ طے تھا۔

انجینئر کی ساری توجہ اب انجن نے اپنی طرف مبذول کر لی۔ پل کے پاس انجن نے پھٹ پھٹ پٹاخ کی اور بند ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ وہ اس کی توقع کر رہا تھا۔ انجینئر نے پھر سے کچھ کر دو، تین پرزوں کو ٹھونکا، ایک لیور کو کھینچا۔ پھر پھٹ پھٹ پٹاخ ہوئی اور لانچ تیر کی طرح پل کی طرف بھاگی۔ انجینئر نے مسرت سے نعرہ لگایا۔

ہم کنارے پر پہنچے تو سورج غروب ہو چکا تھا اور شام پڑ چکی تھی۔ ریتیلے ملگجے میدان کے پیچھے روہڑی کا شہر اپنی تنگ چٹانوں پر ایک مقبروں اور حجروں کا شہر لگتا تھا، تاریک اور خوفناک۔

کنارے پر لوگوں کا ہجوم تھا۔

کسی نے کہا کہ ایک عورت نے ابھی ابھی دریا میں ڈوب کر اپنی جان دینے کی کوشش کی تھی، مگر چند ملاحوں نے اسے دیکھ لیا اور اسے کشتی میں ڈال کر لے آئے ہیں۔ یہ مجمع اسی کے گرد اکٹھا ہے۔

اور ادھر جاتے ہوئے ایک آدمی ٹانگوں والا دبلا آدمی جو نیکر پہنے تھا اور آدھا فوجی اور آدھا سوڈا واٹر بیچنے والا لگتا تھا ہمیں ملا۔ وہ اس قسم کا آدمی تھا جو خواہ مخواہ ہر کسی کو معلومات دیتے پھرتے ہیں۔

''وہ کیا تھی؟'' ہم نے اس سے پوچھا۔

''یہ جنانی تھی دریا کے اندر چلی گئی اور آگے ہی آگے بڑھتی گئی۔ جب یہ ڈوبنے لگی تو اس کی خوش نصیبی سے یہاں ایک کشتی والے نے اسے دیکھ لیا کہ کوئی جنانی ڈوب رہی ہے۔ وہ جنانی کو کڈھ کے لے آیا۔''

اسکول ماسٹر نے پوچھا، ''وہ خودکشی کیوں کر رہی تھی؟ کون تھی وہ؟''

''وہ جی، اس کے متعلق سنیا تو ایسا ہے کہ اس جنانی دا خصم کراچی میں فٹر کا کام کرتا ہے۔ اس کا کوئی خط پتر آیا۔ اس جنانی کی ساس نے اسے کہہ دیا کہ تیرے خصم نے تیرے کو سلام نہیں لکھیا اور لکھا ہے کہ مجھ کو جنانی سے نفرت ہے۔ اس جنانی کو اس کا بڑا صدمہ ہوا اور چوری چھپے نکل کر یہاں دریا میں ڈوبنے آ گئی۔ سنیا تو ایسا ہے!''

اسکول ماسٹر نے کہا، ''اس بیچاری کی ساس اور نندوں نے اسے طعنے دیے ہوں گے اور اسے جلی کٹی سناتی رہتی ہوں گی۔ بعض عورتیں بڑی ظالم ہوتی ہیں۔''

''سب جنانیاں ٹمپلیری (ٹمپریری) ہوتی ہیں!'' نیم فوجی اور نیم سوڈا واٹر بیچنے والے نے ساری دنیا کی عورتوں پر حتمی فیصلہ کر دیا۔ یہ آدمی ہمارے ہمراہ اسی جگہ آیا جہاں لوگ اکٹھے ہوئے تھے۔

وہ عورت جس نے خودکشی کرنے کی کوشش کی تھی، ہجوم کے حلقے کے درمیان پاؤں کے بل

بیٹھی تھی۔ اس کی عمر کوئی پچیس برس کے لگ بھگ ہوگی۔ اس نے اپنے آنچل سے ایک لمبا گھونگھٹ نکال رکھا تھا اور اپنے بھیگے تر بتر کپڑوں میں سمٹ اور سکڑ کر بیٹھی تھی۔ وہ ایک لال چھینٹ کی چوڑی دار شلوار پہنے تھی اور اس کی بانہوں میں چاندی کے کنگن تھے۔ سرد پانی میں دیر تک رہنے سے وہ ٹھٹھری ہوئی تھی اور خوفناک طور پر کپکپا رہی تھی۔ ہم نے اس کے دانت سردی سے کٹکٹے ہوئے سنے۔

ایک گٹھے ہوئے بدن کا سندھی شخص، جس کے چہرے پر بڑے بڑے سرخ گل مچھے تھے، حلقے میں اندر آیا اور عورت کے آمنے سامنے کچھ فاصلے پر اکڑوں اس طرح بیٹھ گیا جیسے مداری جمورے کے سامنے بیٹھتا ہے۔ وہ عورت سے پوچھ گچھ کرنے لگا۔

"مائی، تو نے اپنی زندگی لینے کی کوشش کیوں کی؟" اس نے پوچھا۔

"بھائی، یہ ساس ہے نا، یہ مجھ سے کہے ہے، بجن بھائی..."

وہ اپنے مطلب سے بے ربط طور پر بھٹکنے اور بہکنے لگی۔ وہ ایک باؤلی، بے سری عورت لگتی تھی جو اپنے حواس کھو چکی ہو۔ اس کے دانت سردی سے بج رہے تھے۔

"ہاں مائی۔ کہو" لال گل مچھوں والے سندھی نے حوصلہ افزائی کی۔

"ہاں تو بھائی... اب میرا خاوند کہے ہے میں اس کو طلاق دوں۔ بجن بھائی ... تو مرے باپ نے کہا... بجن بھائی تو میرے جیور ہیں نا، میرے کنگن... میری نتھ اور میرے جھانجھن..."

لال گل مچھوں والے کی پوچھنے کی سب کوشش فضول ثابت ہوئی۔ عورت کی باتیں بالکل بے ربط تھیں اور ہر ایک نے اُسے باؤلی قرار دیا۔ اس کی باتوں سے یہ سراغ لگانا مشکل تھا کہ کون سی بات نے اُسے ڈوب کر مر جانے پر آمادہ کیا۔

"یہ بھی بالکل کھسکی ہوئی جنانی ہے،" نیم فوجی نے کہا

اب پولیس موقعے پر پہنچ گئی۔ وہ دو سندھی سپاہی تھے، وردی کے بغیر مگر سر پر لال پگڑیاں جمائے۔ ایک کے ہاتھ میں حکومت کا ڈنڈا تھا۔

"آؤ مائی، اٹھو۔ ہمارے ساتھ چلو" ان میں سے ایک نے کہا۔

عورت سمٹی بیٹھی رہی۔ وہ ٹس سے مس نہ ہوئی۔ اس کے دانت بجنے لگے اور وہ ڈری ہوئی تھی۔ اس نے سمجھا کہ وہ اسے گھر جانے کے لیے کہہ رہے ہیں۔

"بھائی، مجھ کو کہاں لے جاؤ گے؟ بھائی، میرا خاوند کہے..."

"نہیں مائی، اٹھو۔ ہم تمھیں گھر نہیں لے جائیں گے۔"

وہ قدرے تامل کے بعد اٹھی اور پولیس کے ساتھ چپ چاپ روانہ ہوگئی۔ پولیس مین اور

تماشائیوں کا ایک چھوٹا سا گروہ رتیلے میدان پر روہڑی کی طرف چلنے لگا۔ ہم اس عورت کے راز پر تعجب کرتے ہوئے گہری شام میں اسٹیشن کی طرف روانہ ہوئے کیونکہ گاڑی کا وقت ہو چکا تھا۔

جب ہم روہڑی کے تاریک کلبلاتے ہوئے شہر کے پاس سے گذرے تو میں نے اسکول ماسٹر سے کہا، "وہ ایک دل گردے کی عورت تھی۔"

"اس میں کوئی شک نہیں،" اس نے کہا، "خودکشی کے لیے بڑے حوصلے کی ضرورت ہے۔"

اور پھر ہم دونوں کو کافی دیر تک کے لیے چپ ہو جانا پڑا، کچھ سوچتے ہوئے... پتہ نہیں کیا؟

فرشتے

طارق اقبال کالج کے بڑے ہال میں ایک عجیب بے فکری اور مسرت سے گھوم رہا تھا۔ کوئی گیارہ کا وقت تھا۔ اس کی کلاسز ختم ہو چکی تھیں اور وہ ہال میں آ گیا تھا۔ وہ یوں ہی دیواروں پر چوکھٹوں میں لگے گروپ فوٹو دیکھنے لگا — اپنے ان پیشروؤں کی تصویریں جنھوں نے ہاکی ٹیم یا ڈراما کلب یا تیراکی کے مقابلے میں نام پیدا کیے تھے اور کپ جیتے تھے۔ اس نے اپنے اس مستون، اخروٹ کی منقش چھت کے ایوان میں چلنے اور اس ممتاز مجمعے کا ایک فرد ہونے پر بڑا فخر محسوس کیا۔ یہ ناقابلِ یقین تھا! ونڈرفل! وہ گورنمنٹ کالج لاہور کا طالب علم بن جانے پر اپنی خوش قسمتی پر اترانے لگا۔ یہ کالج صوبے کا بہترین امتیازی تعلیمی ادارہ تھا، تعلیم اور اسپورٹس کی شاندار روایات کے ساتھ، اور اس کے فارغ التحصیل طلبا حکومت میں سب سے اچھے عہدوں پر فائز ہوتے تھے۔ کسی اور کالج میں اتنا نامی اور قابل اسٹاف نہ تھا — ایچ ایل او گیرٹ اسکوائر، احمد شاہ بخاری پطرس، بی اے کینڈیٹ، اے ایس ہیٹ اسکوائر۔ اور تو اور، اس کی عمارت کتنی انوکھی اور پر تصویریت تھی۔ اسے دیکھتے ہی آدمی کا دل ربڑ کی گیند کی طرح اچھلنے لگتا تھا۔ اس کے کلیسائی مینار، ڈھلانی سلیٹ کی چھتیں، برجیاں، اونچے دروازے، مورش محرابیں، اقلیدسی قوسوں کے دریچے۔

طارق اقبال کو ایک مہینہ پہلے اس کالج کے فرسٹ ایئر میں داخلہ ملا تھا۔ عام سیکنڈ ڈویژنر ہونے کے باوجود مناسب سفارش نے اس کا کام کیا۔ وہ سولہ سال کا ایک ذہین، شرمیلا، خوش شکل لڑکا تھا۔ گھنگھریالے گھنے بال، معصومیت اور استعجاب سے بھری سیاہ آنکھیں، ستواں ناک، خوبصورت متناسب خدوخال۔ اس کے مضامین انٹر آرٹس کے تھے: انگلش، حساب، فزکس اور فرنچ۔ وہ واحد لڑکا تھا جس نے اس سال فرنچ لی تھی اور اس سے کچھ الجھنیں پیدا ہو گئیں جو اسے کبھی کبھی فکرمند کر دیتیں۔ قدرتاً وہ بے پروا تھا اور اپنی پڑھائی کی طرف زیادہ توجہ نہیں دیتا تھا، لیکن اسے انگریزی

ادب میں لڑکوں کے لیے لکھی ہوئی مہماتی کتابوں سے بڑی محبت تھی اور وہ آٹھ اوپر کی منزل پر لائبریری روم کے گرد منڈلاتا ہوا دیکھا جاتا۔

پچکھوں میں گورنمنٹ کالج کے پرانے نامی طلبہ کی تصویریں دیکھتے ہوئے، جو اس سے برسوں پہلے اس عالیشان ایوان میں چلے تھے، انھیں کلاس روموں میں بیٹھے تھے، وہ ایک ۱۹۲۹ء کی کالج ہاکی ٹیم کے گروپ کے آگے رکا۔ اس کا گول مٹول، مضبوط ماموں، جمال خان، جو اس کے ساتھ اسے کالج میں داخل کروانے آیا تھا، سب سے پہلے اسے اس کی فوٹو دکھانے کے لیے لایا۔ اس کی ایک وجہ تھی — جمال خان اس گروپ میں ایک ہاکی سامنے رکھے دوسرے کھلاڑیوں سے آگے نکل کے اور ہتھیلی پر سر رکھے لیٹا تھا۔ اگر جمال خان اسے نہ بتاتا تو طارق اقبال اسے کبھی نہ پہچان سکتا۔ فوٹو میں اس کا ماموں اپنی نیکر اور جرسی میں ایک چھریرا، سرخی بدن کا جوان لڑکا تھا۔ طارق اقبال نے تعجب کیا کہ یہ چمکدار چہرے والا چست لڑکا کیونکر وہ جسیم تھل تھل کرتے ہوئے جسم کا آدمی بن گیا جو اس کا ماموں اب تھا۔ وہ واحد سرگرمی تھی جو اس کا ماموں اب سرانجام دینے کا اہل تھا۔ اپنے قہقہوں کو اتنی قوت سے چھوڑتا تھا کہ وہ کمرے کی چھت سے چپک جاتا۔ جمال خان اس گپ پر خوب داد طلب ہوتا اور اسے دن میں بار بار دہراتا۔ مگر طارق اقبال اپنے ماموں کا بڑا شکر گزار تھا — اسی کی وجہ سے تو اسے داخلہ ملا۔ ایک تو وہ اولڈ بوائے تھا۔ پھر وہ کالج ہاکی الیون میں ان دنوں رہا جب احمد شاہ بخاری بھی کالج میں پڑھتا تھا۔ وہ اور بخاری ایک ہی عمر کے تھے۔ جمال خان اسے انٹرویو سے پہلے بخاری کے پاس اسٹاف روم میں لے گیا۔ بخاری اسے دیکھ کر بڑا ہنسا۔ "ملک جمال خان، بڑا موٹا ہوگیا ہے یار!" بخاری نے طارق اقبال کا نام نوٹ کر لیا اور وعدہ کیا کہ وہ پوری مدد کرے گا۔ اس پر بھی جمال خان مطمئن نہ ہوا۔ اس نے فارسی کے پروفیسر سے، جس سے اس کی چچازاد بہن بیاہی ہوئی تھی، انٹرویو بورڈ کے بیشتر پروفیسروں کے نام ذاتی خط لکھوائے۔ یہ خط لفافوں میں ڈالے گئے اور ان پر پتے لکھ دیے گئے۔ جب طارق اقبال کو انٹرویو کے لیے بلایا گیا تو ملک جمال خان بھی اپنے شملے کو اونچا کیے اس کے ہمراہ اندر گیا۔ اس نے جاتے ہی پہلا کام یہ کیا کہ وہ خط متعلقہ پروفیسروں میں تقسیم کر دیے، جن کے نام وہ تھے۔ وہ ان کو پڑھنے لگے اور انھوں نے فارسی کے پروفیسر کے احترام میں اس سے کوئی سوال نہ پوچھا۔ ملک جمال خان نے اس پر اکتفا نہ کیا بلکہ وہ اپنے ہمراہ ایک بستے میں طارق اقبال کے باپ کی خان صاحبی کی سند اور وہ سرٹیفکیٹ بھی جو اسے سرکار برطانیہ سے عنایت ہوئے تھے، لے کر آیا تھا، مگر اس بستے کو کھولنے کی ضرورت نہ پڑی۔

اور انٹرویو! طارق اقبال نے اس کے بارے میں سوچا تو اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے

نمودار ہو گئے۔ وہ ایک نیم دائرے میں لٹکے ہوئے دس بارہ معاندانہ اور اجنبی چہروں کے روبرو کھڑا تھا۔ انتہائی نروس اور لٹکی ہوئی قمیص پر اپنے چھوٹے بالائی رنگت کے کوٹ کے دامنوں کو مروڑتا ہوا بورڈ کا پریذیڈنٹ، انگریز پرنسپل ڈنی کلف، اپنے سیاہ گاؤن اور کلہاڑے چہرے کے ساتھ درمیان میں بیٹھا تھا۔ وہ اسے سولی کا حکم دینے والا جج لگا۔ اس کے ساتھ دائیں طرف ایک اچھے سلے ہوئے بھورے رنگ کے سوٹ میں خندہ رو اور خوبصورت پروفیسر احمد شاہ بخاری بیٹھا تھا۔

''کیا تم ہاکی کے اچھے کھلاڑی ہو؟'' پرنسپل ڈنی کلف نے اس کی درخواست کو دیکھتے ہوئے پوچھا جس میں اس نے کھیلوں کے خانے میں یہ ظاہر کیا تھا کہ وہ ہاکی کھیلتا ہے۔

''بہت اچھا تو نہیں، مگر میں اسکول میں ہاکی کھیلتا رہا ہوں۔'' یہ ایک لحاظ سے سچ تھا مگر طارق اقبال ان لڑکوں میں سے تھا جو ہر قسم کے کھیلوں میں بالکل پھسڈی رہتے ہیں۔

پرنسپل نے اس سے دو تین سوالات پوچھے اور پھر اس کے ایک سوال کا اس نے ایک بڑا احمقانہ جواب دیا۔

''تم نے اپنے مضمون میں فرنچ کیوں چنی ہے؟ پرشین کیوں نہیں؟'' پرنسپل نے پوچھا۔

''کیونکہ میں پرشین کا ایک لفظ نہیں جانتا'' طارق اقبال نے جواب دیا۔

کوئی زور سے ہنسا — غالباً یہ پروفیسر احمد شاہ بخاری تھا۔ مگر پرنسپل نے اس کافی بے وقوفی کے جواب پر پوچھا، ''اور فرنچ کا تمہیں ایک لفظ آتا ہے؟''

اس کا اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا، اور اس کے فوراً بعد اس کا انٹرویو ختم ہو گیا۔ اور ملک جمال خاں اپنا بستہ اٹھائے دوسرے دروازے سے باہر آ گیا۔ وہ برآمدے میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ خدا جانے اس کا داخلہ ہوا یا نہیں۔ تب احمد شاہ بخاری باہر آیا اور لکڑی کے جنگلے پر جھک کر ایک شوخ لڑکے کی طرح سیٹی بجانے لگا۔ پھر اس نے جمال خاں کو دیکھا اور اسے بتایا کہ اس کے بھانجے کو لے لیا گیا ہے۔

میں اس بھدے، بے وقوف لڑکے سے اب کافی بدل گیا ہوں، طارق اقبال نے سوچا۔ اب وہ شلوار قمیص کی بجائے ایک دھاری دار اور سرخی مائل سوتی سوٹ پہنے ہوئے تھا جو اس نے شاہ عالمی کے ایک ہندو درزی سے سلوایا تھا۔ اس کی قمیص کے کالر کھلے تھے اور اس نے ابھی ٹائی باندھنی نہیں سیکھی تھی، پھر بھی اس نے اپنے کو اسمارٹ محسوس کیا۔ وہ اپنے نئے سوٹ پر بڑا مغرور تھا۔

وہ پرانے کالجین کے گروپ دیکھتے دیکھتے اپنے خوابوں میں کھو گیا۔ طارق اقبال جاگتے میں اکثر وقت خواب دیکھتے گذارتا تھا۔ اس نے اب خود کو ایک آل راؤنڈر کے روپ میں دیکھا۔ نہ

صرف کھیلوں میں چوٹی پر بلکہ اپنی کلاس میں بھی سب سے اول نمبر پر۔ ہر کوئی اس کی صلاحیت اور قابلیت پر رشک کر رہا تھا۔ کبھی ایسا قابل اور ہونہار لڑکا اس کالج کے ایوان میں سے نہیں گذرا تھا اور پرنسپل ڈی کلف ایسے لائق لڑکے کے اپنے کالج کا طالب علم ہونے پر بجا طور پر نازاں تھا۔ ایک ہاکی گراونڈ طارق اقبال کے سامنے ابھرا۔ وہ سینٹر فارورڈ تھا اور اتنا تیز اور پھرتیلا کہ ہاف ٹائم سے پہلے اس نے ایف سی کالج کی ٹیم پر پانچ گول کر دیے۔ اس کے کالج فیلو خوشی سے اچھلے اور چلائے: ''ویل ڈن طارق! گو اہیڈ طارق!'' ہاف ٹائم پر خود پرنسپل اٹھ کر غرور سے اس سے ہاتھ ملانے اور اسے تھپکی دینے آیا اور اس کے کالج فیلوز نے اسے کندھوں پہ اٹھا لیا۔ ہاف ٹائم کے بعد اس نے چھ اور گول کیے۔ اور اس کے کالج فیلوز خوشی سے پاگل ہو گئے۔ ''یہ وہ وزرڈ نہیں!'' ہر کوئی کہنے لگا۔ پھر اس نے تیراکی کے انٹر کالج مقابلے میں خود کو دو lengths سے اول آتے اور ایک بڑی ٹرافی جیتتے دیکھا۔ کرکٹ کے گراونڈ میں اس نے دو گھنٹے میں تین سنچریز کیں اور بعد میں اس لیے آؤٹ ہوا تا کہ دوسروں کو بھی کھیلنے کا موقع ملے۔ جمنیزیم میں وہ بہترین ایتھلیٹ تھا، سب سے خوبصورت اور مکمل جسم کے ساتھ۔ وہ کالج ڈیبیٹنگ سوسائٹی میں چمکا۔ کالج کے ڈرامیٹک کلب میں اس کی ایکٹنگ سب سے زیادہ سراہی گئی اور کالج میگزین میں اس کے انگریزی مضمون کے اتنے اچھے اسلوب پر تو خود پروفیسر اے ایس بخاری عش عش کر اٹھا اور اسے بار بار مبارکباد دینے پر مجبور ہوا۔

وہ آپ ہی آپ خوشی سے مسکرایا۔ اس نے اپنی دائیں بانہہ کو دوہرا اور سخت کر کے اپنے بائیں ہاتھ سے اپنے بازو کی مچھلیوں کو ٹٹولا۔ جمنیزیم اور تیراکی کے تالاب میں ورزش نے اس کی مچھلیوں کو سخت کر دیا تھا اور ان کا ناپ ساڑھے تیرہ انچ تھا۔ اس نے چند روز پہلے اس قابل فخر واقعے کی خبر اپنے باپ کو لکھ بھیجی تھی۔ اس کا والد ضرور مسکرایا ہوگا، مگر اس نے جواب میں لکھا کہ اس کے ایک خاص آدمی نے اسے پانچ بار سینما پر دیکھا ہے، جس سے ظاہر ہے کہ وہ اپنی پڑھائی کی طرف مناسب توجہ نہیں دے رہا۔ خط میں ایک چھپی ہوئی دھمکی تھی کہ اگر وہ اسی ڈگر پر چلتا رہا تو اسے گورنمنٹ کالج سے اٹھا لیا جائے گا۔

ہال میں اکیلے گھومتے ہوئے ایک چیز نے طارق اقبال کی مسرت میں کھنڈت ڈال دی۔ اس نے زبانوں میں فرنچ لی تھی۔ مگر مسٹر ہیٹ، ایم اے، فرسٹ ایئر کی فرنچ کلاس لے کر اپنے کام کو بڑھانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ مسٹر ہیٹ کے پاس گیا تھا اور مسٹر ہیٹ نے اسے برآمدے میں چلتے ہوئے اکسانے کی کوشش کی تھی کہ وہ فرنچ چھوڑ دے اور کوئی اور زبان، فارسی یا عربی، لے لے۔ مسٹر ہیٹ کے اس رویے کا نتیجہ یہ ہوا کہ فرنچ کی کلاس ہی نہ ہوئی۔ طارق اقبال کو چاہیے تھا کہ وہ فارسی یا عربی

لے لیتا مگر اس نے فکر نہ کی۔ اسے ایک کلاس کم بھگتنا پڑتی تھی۔ اب پہلا سہ ماہی امتحان سر پر تھا اور طارق اقبال کبھی کبھی فکر مند ہو جاتا۔ وہ کیسے چار مضامین کی بجائے صرف تین میں امتحان دے کر پاس ہوگا؟ یہ سارا مسٹر ہیبت کا قصور تھا جو فرنچ کلاس لینے سے گریزاں تھا۔ طارق اقبال جلا کیا کرتا۔ یہ بادل اس کی روح پر تھوڑی دیر ہی رہا۔ پھر اس نے اپنے biceps کو ٹٹولا، اپنے نئے سلے ہوئے دھاری دار سوٹ کو تعریفی انداز میں دیکھا اور اپنی عظمت کے سپنوں میں کھویا گھومنے لگا۔

ہال کے خاتمے پر ایک برآمدے کے شروع میں اسٹاف روم تھا۔ لمبا جالی دار دروازہ کھلا تھا۔ اس نے اندر جھانکا۔ پروفیسر بخاری اور عربی کا باریش پروفیسر، جس کا نام وہ نہیں جانتا تھا، ایک ہی میز کے پرلی طرف بیٹھے گپ شپ کر رہے تھے۔ طارق اقبال نے قیاس کیا کہ پروفیسر بخاری عربی کے پروفیسر سے کسی مذہبی معاملے پر وضاحت چاہ رہا تھا، اور ان دونوں کے چہرے مسکراہٹ سے روشن تھے۔ طارق اقبال نے سوچا کہ پروفیسر بخاری کے ساتھ باتیں کرنا کتنا ونڈرفل ہوگا! بخاری، جو ہلی اسے کیمبرج تھا، اتنا خوبصورت اور خندہ رو، اور پھر جس نے پطرس کے مضامین لکھے تھے۔ کیا وہ اسے اس لڑکے کی حیثیت میں پہچان لے گا جسے ملک جمال خاں اس کے پاس داخل کرانے کے لیے لایا تھا؟ چار پانچ منٹ طارق اقبال کمرے کے باہر منڈلاتا رہا، یہ سوچتے ہوئے کہ اندر چلا جائے یا نہ جائے۔ پھر بخاری کے چہرے پر خوش فطرتی اور دوستی کی چمک پا کر اس کا حوصلہ بندھا اور وہ اندر چلا گیا۔

بخاری اور عربی کے پروفیسر نے اس مخل ہونے والے لڑکے کو تعجب اور دلچسپی سے دیکھا۔

''گڈ مارننگ سر!'' طارق اقبال نے اپنا ہیٹ اتار کر ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا۔

اسے انگریزی میں بات کرنے کا بڑا شوق تھا۔ کالج کے پراسپکٹس میں لکھا تھا کہ طلبا سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ کلاس میں اور ہوسٹل میں باہمی بات چیت صرف انگریزی ہی میں کریں گے۔ لیکن جوں ہی اس نے گڈ مارننگ کہا اس نے سوچا کہ کہیں اس نے غلط تو نہیں کہا — کہیں اسے گڈ آفٹر نون تو نہیں کہنا چاہیے تھا؟

''گڈ مارننگ۔'' پروفیسر بخاری نے خندہ روئی سے کہا اور اس جواب نے طارق اقبال کو گڈ مارننگ کے صحیح ہونے کے متعلق مطمئن کر دیا۔ پروفیسر بخاری کی پر شفقت مسکراہٹ نے اس کی ہمت بندھائی۔

''سر،'' طارق اقبال نے ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا، ''میرا نام طارق اقبال ہے اور میں فرسٹ ایئر کا طالب علم ہوں۔ آپ کو یاد ہوگا سر، کہ ملک جمال خاں مجھے آپ کے پاس داخلے کے لیے لے

کر آیا تھا۔"

اسے اپنی انگریزی پر فخر تھا اور اس نے اچھے تلفظ میں صحیح انگریزی بولنے کی کوشش کی تاکہ پروفیسر بخاری، بی اے کینٹب، جو کیمبرج کے لہجے میں بولتا تھا، اس سے متاثر ہو جائے۔

"او ہاں!" بخاری نے کہا، "ملک جمال خاں اور میں سیکنڈ ایئر میں اکٹھے تھے۔ وہ ہاکی کا بڑا اچھا کھلاڑی تھا۔ تم اس کے کیا لگتے ہو؟"

"میں اس کا بھانجا ہوں۔"

"کیا تم بھی ہاکی کھیلتے ہو؟"

"نہیں سر نہیں۔" طارق اقبال کی آنکھیں خوبصورت اور جامہ زیب پروفیسر پر اس طرح اٹھیں جیسے ایک چاہنے والے کی آنکھیں اپنی محبوبہ پر۔ "میں اسکول میں ہاکی کھیلتا رہا ہوں مگر سر، میں کھیلوں میں اتنا اچھا نہیں۔"

"یہ کوئی بات نہیں۔" بخاری نے کہا، "جو تمھیں فکرمند کرے۔ میں خود کھیل میں پھسڈی تھا۔ اور تم کس کس چیز میں دلچسپی رکھتے ہو؟"

"سر، مجھے ادب سے بڑی دلچسپی ہے۔ میں انگریزی ناولوں کا بڑا شائق ہوں۔ میں نے رابنسن کروسو اور رائیڈر ہیگرڈ کی شی پڑھی ہے۔"

"اوہ!" پروفیسر بخاری نے کہا۔

"اور سر، میں نے آپ کی کتاب پطرس کے مضامین بھی کوئی آدھ درجن دفعہ پڑھی ہے۔ میں اسے پڑھ کر بہت ہنسا۔ یہ اردو میں بہترین مزاحیہ کتاب ہے۔ میں بھی بڑا ہو کر ایسی ہی کتاب لکھنا چاہوں گا۔"

پروفیسر بخاری کو اپنے اس نوجوان پرستار کی تعریف بڑی اچھی لگی۔ لڑکے کے انداز میں اتنی چمک، بھولپن اور سچائی بے ساختگی تھی کہ اس نے پروفیسر کا دل جیت لیا اور شاید اسے وہ وقت یاد آ گیا جب وہ طارق اقبال کی طرح اس کالج کے ایوان میں پہلی بار داخل ہوا تھا۔

"تمھیں کالج کی زندگی کیسی لگ رہی ہے؟" پروفیسر بخاری نے پوچھا۔

"اوہ سر! یہ ونڈرفل ہے۔ میں کھیل تو نہیں کھیلتا مگر میں سوئمنگ پول میں روز تیرنے جاتا ہوں اور کالج جمنیزیم میں جا کر ورزش کرتا ہوں۔ سر، آپ کو یہ سن خوشی ہوگی کہ میرے بائیسپ کا ناپ ساڑھے تیرہ انچ ہے۔"

"اوہ واقعی!" پروفیسر بخاری نے کنکھیوں سے عربی کے پروفیسر کو دیکھا، "یہ تو بڑی خوشی کی

بات ہے! کیا تم پہلوان یا مکا باز بننے کے لیے خود کو ٹرین کر رہے ہو؟''

''نہیں سر! مگر میں ایک اچھا تندرست لڑکا بننا چاہتا ہوں اور اپنے بدن کو کسرت اور ورزش سے گٹھیلا اور مضبوط بنانے کا مجھے بڑا شوق ہے۔ سر، میں ڈرامیٹک کلب اور ڈیبیٹنگ سوسائٹی میں کیسے شامل ہو سکتا ہوں؟''

''ڈراما کلب ابھی شروع نہیں ہوا۔ جب ان کا کوئی پلے کرنے کا ارادہ ہوا تو مجھے آ کر ملنا۔ تمھیں ایکٹنگ کا شوق ہے؟''

''جی ہاں سر! اپنے اسکول میں ہم نے ایک بار شیکسپیئر کے جولیس سیزر کا کچھ حصہ کیا تھا۔ میں بروٹس بنا تھا۔ رومنز، کنٹری مین اینڈ لورز!...''

''جب کوئی ڈراما اسٹیج کرنے کا فیصلہ ہوا تو میں دیکھوں گا کہ تمھیں بھی کوئی پارٹ ضرور ملے۔ ڈیبیٹنگ سیکھنے کے لیے پہلے اپنے گروپ کی میٹنگ میں تقریریں کیا کرو۔''

''سر، کیا میں آپ کے گروپ میں شامل نہیں ہو سکتا؟''

''اچھا میں دیکھوں گا۔ اب تم کس پروفیسر کے گروپ میں ہو؟''

''پروفیسر واسطی کے۔''

''میں واسطی سے بات کروں گا اور ایسا انتظام کروں گا کہ تم میرے گروپ میں آ جاؤ۔ اور تمھیں کوئی مشکلات ہوں تو میرے پاس بے دھڑک آ جایا کرو۔''

اس نے پروفیسر بخاری کو بتایا کہ کیسے اس نے فرنچ زبان لے رکھی ہے اور مسٹر ہیٹ فرنچ کلاس نہیں لیتا۔

''اسے لینی چاہیے۔ تم نے مسٹر ہیٹ سے پوچھا ہے؟''

''جی ہاں سر! اس نے دو گھنٹے مجھے اس بات پر آمادہ کرنے میں صرف کیے کہ تم فرنچ چھوڑ دو اور کوئی اور زبان لے لو۔ دراصل وہ ایک کلاس سے بچنا چاہتا ہے۔''

بخاری نے سوچ کر کہا، ''ان حالات میں تم فارسی کیوں نہیں لے لیتے؟''

پھر طارق اقبال کے منھ پر وہی انٹرویو والا جواب آنے لگا کہ جناب اس لیے کہ مجھے فارسی کا ایک لفظ نہیں آتا۔ اس نے اس جواب کو گویا نگلا اور کہا، ''اچھا سر، اگر آپ مشورہ دیتے ہیں تو...''

وہ کچھ دیر اس طرح کھڑا اور ہاتھ ہلاتا بخاری سے باتیں کرتا رہا اور دل ہی دل میں پھولا نہیں سما رہا تھا کہ وہ اپنے نامی پروفیسر کے سامنے اتنی اچھی انگریزی بول رہا ہے۔ حقیقتاً وہ اتنی اچھی انگریزی نہ تھی، اور اس کے بعض فقروں کی بناوٹ بخاری کے ہونٹوں پر شفیق مسکراہٹ لے آئی۔

دو آرٹسٹ — بلکہ تین

میں آموں کے باغ میں ایک گھاس کے قطعے پر کہنیوں کے بل لیٹا ہوا "باغ میں شام" کے عنوان کی ایک نظم کے چند شعر موزوں کر رہا تھا۔ (یہ میری طویل ترین اور کامیاب ترین نظم ہے) کہ میں نے سامنے سے دو آدمیوں کو آتے دیکھا، وہ اس قسم کے اوزار اٹھائے ہوئے تھے، جو موسیقی میں کام آتے ہیں اور ان کے پھٹے پرانے کپڑے اور چہروں کی مظلومیت ظاہر کرتی تھی کہ وہ دو ایسے آرٹسٹ تھے جو ناقدریِ زمانہ کا شکار تھے۔

وہ میری طرف آ رہے تھے۔ کسی نے غالباً ان کو بتا دیا تھا کہ میں خود آرٹسٹ ہوں اور فن کے قدر دانوں میں سے ہوں۔ جہاں میں لیٹا تھا، وہ اس سے تھوڑی دور پرے مودب کھڑے ہو گئے... پھر کورنش بجا لائے۔

ان میں سے ایک لمبا، میلی کچیلی ڈاڑھی لٹکائے شخص تھا۔ وہ کندھے سے طبلوں کی جوڑی لٹکائے ہوئے تھا اور سیدھا قصہ چہار درویش کے صفحات میں سے نکلا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ دوسرا، جو ستار اٹھائے تھا، ایک بوٹے سے قد اور چھریرے جسم کا انسان تھا۔ اس کے چلے، بھنچے سے چہرے پر ایک پرکشش سی مسکراہٹ تھی۔ اپنے میلے کالے کوٹ میں وہ ایک چھوٹا سا چنچل بھتنا لگتا تھا۔ اس کی مسکراہٹ میں ایک عجیب ہتھیار ڈلوا دینے والی صفت تھی۔ ایک بچہ بھی جان سکتا تھا کہ یہ شخص حقیقی آرٹسٹ ہے۔

"کیوں، کیا بات ہے؟" میں نے اٹھ کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

دو کورنش بجالانے والے آدمیوں کے سامنے وہ حالت جس میں میں شعر لکھ رہا تھا، زیادہ پروقار نہ تھی۔

"سرکار، ہم آپ کو کوئی خاص چیز سنانے آئے ہیں،" بھتنے نے کہا۔

"مجھے راگ سے زیادہ دلچسپی نہیں۔"

"سرکار سن لیں، طبیعت خوش ہو جائے گی۔ آپ کے سننے کا راگ ہے، سرکار۔ وقت کی چیز ہوگی۔"

"میں اس وقت مصروف ہوں،" میں نے کہا۔ "میں نظم لکھ رہا ہوں۔"

میں نے دیکھا کہ ان کے چہرے لٹک گئے۔ وہ میرے پاس بڑی امید سے آئے تھے، اور اب ان کی مایوسی نے مجھے شرمندہ کر دیا۔ مجھ پر فاقوں کی نوبت تو کبھی نہیں آئی۔ مگر میں جانتا تھا کہ غریب، درماندۂ روزگار آرٹسٹوں کے لیے یہ دنیا بڑی ظالم ہے۔

پھر مجھے ایک خیال آیا۔ میں نے اگلے روز رات کو اپنے چند دوستوں کو کھانے پر مدعو کر رکھا تھا۔ یہ سازندے وہاں اپنے راگ سنا سکتے ہیں۔

"اچھا، کل رات کو آؤ،" میں نے کہا۔ "گاتے بھی ہو؟"

"ہاں سرکار،" بڈھے نے کچھ شک سے اپنے ساتھی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ "میں تو صرف ستار بجاتا ہوں۔ بابا گاتا ہے۔"

"اچھا پھر کل..."

ان کے چہرے کچھ روشن ہو گئے۔ وہ پھر کورنش بجالائے اور رخصت ہو گئے۔

"ساتھی آرٹسٹ!" میں نے آہ بھری اور اپنی شعروں کی کاپی کو بند کر کے ایک فاختہ کی کوکو کے شور پر سگریٹ پینے لگا۔

یہ جنوری کے آخری دن تھے۔ میرے مہمان چھ بجے شام ہی سے آنے شروع ہو گئے۔ ڈنر قدرے اسپیشل تھا اور وہ اسٹارچ سے اکڑے ہوئے کالر اور جیکٹ پہنے ہوئے تھے۔ یہ ایک ملا جلا فنکشن تھا اور اس میں خواتین بھی تھیں: اپنے بھڑکیلے کپڑوں اور رنگے ہوئے چہروں میں وہ بڑی حسین اور شاندار دکھائی دے رہی تھیں — انگورا بلیوں کی طرح۔ ان کے سامنے ان کے خاوند محض ان کے غلام اور نازبردار لگتے تھے۔ جیسے جیسے مہمان آتے جاتے، میں ان کا پورچ میں استقبال کرتا اور بیٹھنے کے کمرے تک ان کی راہنمائی کرتا، جو چار سفید نیون لیمپوں سے منور تھا۔

کوئی سات بجے کے قریب میں نے ان دونوں کو آتے دیکھا۔ (میں ان کے بارے میں بھول ہی گیا تھا۔) سردی کافی تھی اور وہ دونوں اپنے پھٹے ہوئے کوٹوں میں بالکل ٹھٹھرے ہوئے تھے۔ میں نے بڈھے کے دانتوں کو بجتے ہوئے سنا۔

"آ... آداب عرض، سرکار!" وہ دور سے کورنش بجالائے۔

میں قدرے تذبذب میں پڑ گیا۔ اگرچہ وہ میرے ساتھی آرٹسٹ تھے۔ میں ان کے آنے پر زیادہ خوش نہ تھا۔ ان کو اب لوٹا دینا ظلم تھا، اس لیے کہ ان کے دل ٹوٹ جائیں گے۔ خود ایک آرٹسٹ ہونے کی وجہ سے میں جانتا تھا کہ ہمارے دل آبگینوں سے بھی زیادہ نازک ہوتے ہیں۔

کیا میں انھیں بیٹھنے والے کمرے میں لے جاؤں؟ وہاں وہ درمیان میں فرش پر بیٹھ کر اپنے ساز بجا سکتے ہیں۔ پھر میں نے وہاں بیٹھے ہوئے اسٹارچ سے اکڑی ہوئی قمیصوں والے مردوں اور ریشمی کپڑوں میں مغرور عورتوں کے بارے میں سوچا۔ یہ پھٹے لباس میں بدحال اور بے حیثیت آرٹسٹ ان کے بلند احساسات کو یقیناً ٹھیس پہنچائیں گے۔ ان کی نفرت اور حقارت کا نشانہ براہ راست مجھے بننا پڑے گا۔ ان میں سے کوئی بھی، میں نے سوچا، فن یا موسیقی کی ذرہ برابر بھی پروا نہیں کرتا۔ بیٹھنے والے منور کمرے کی دنیا وسیع ضرور تھی، لیکن غیر فنکارانہ تھی — کھوکھلی، شوریدہ، تمسخرانگیز، جو اس سے مطلقاً بیگانہ تھی کہ ایک طویل نظم کی بحروں میں لکھنے والا شاعر کس قدر خون پسینہ بہا کر مصرعوں کو موزوں کرتا ہے۔

اٹھتی ہوئی بھنوؤں، خاموش حقارت کو جانتے ہوئے بھی میں نے آرٹسٹوں کو بیٹھنے والے کمرے میں بٹھایا۔ وہ سردی کے مارے مرغے بن رہے تھے۔ میں نے ان کو گرم چائے پلوائی اور انھیں گانا بجانا شروع کرنے کے لیے کہا۔ بھٹنے نے، جس کا نام فیاض علی تھا، تھوڑا سا اٹھ کر آداب عرض کیا اور ایک فنکارانہ سنجیدگی سے اپنے ستار کو گھٹنے پر لٹایا اور اس کی چابیوں کو مروڑ کر اوزار کو سُر تال سے درست کرنے لگا۔ وہ دونوں اپنے فن کے کمالات کے مظاہرے کی اجازت دیے جانے پر بچوں کی طرح خوش تھے۔ ان کو غالباً یہ خیال ہی نہ تھا کہ ان کا وہ کسب اور علم جس پر وہ اتنے نازاں تھے، ان کے سننے والوں کے لیے ایک بے معنی شور ہو سکتا ہے۔ جس طرح راگ ان کو وارفتہ اور مسحور کر دیتا تھا، اسی طرح ان کو یقین تھا کہ وہ دوسروں کو بھی خوش کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ ایک پرانی روایت کے موسیقار تھے؛ انھیں یہ معلوم نہ تھا کہ فلموں نے گانے کے مذاق کو عام اور سستا بنا دیا ہے، اور یہ کہ ان کی جنس کے خریدار اب خال خال رہ گئے تھے۔ وہ اپنے راگ ان لوگوں کے لیے چھیڑ رہے تھے جو... جو بہرے تھے، بدذوق تھے۔

"سرکار، یہ سمپورن راگ ہے، دھیان سے سنیے گا۔ شام کے وقت یہی موزوں ہے..."

سازندوں کو شروع کرا کے میں بیٹھنے والے کمرے میں مہمانوں کے درمیان جا بیٹھا۔ ان میں سے بعض رمی کھیلنے میں مشغول تھے، دوسرے ادھر اُدھر کی باتیں کر رہے تھے۔

طبلے کی تھپ تھپ اور ستار کا دھیما نوحہ کھلے دروازے میں سے اندر آنے لگا۔ اس کی طرف

کسی نے توجہ نہ دی۔ ہم سب اپنی باتیں کرتے رہے۔

''ریڈ ناٹن جوکر ہے۔''

''— ہاں۔ وہ میجر جنرل شیخ میرے برادر ان لا ہیں۔''

''مجھے اولڈ موبائل پسند ہے۔''

''شیورلیٹ بہتر ین ہے۔''

''— یہ بٹن۔ جلال دین سے خریدا ہے۔ اصلی ریشم ہے۔''

ایک پرکشش، نازک اندام اور خوش مذاق خاتون نے مجھ سے کہا، ''ان سے کہیے، کوئی فلمی گانا سنائیں۔''

میں اٹھ کر سازندوں کے پاس گیا۔ فیاض علی سنجیدگی سے کسی استادانہ راگنی و بجانے میں مگن تھا۔

''بھئی، اسے بند کرو۔ یہ کوئی نہیں سنے گا،'' میں نے کہا۔ ''کوئی فلمی راگ سناؤ۔''

میں یہ دیکھ رہا تھا کہ اس سے ان کے دلوں کو تکلیف پہنچی۔ بوسیدہ داڑھی والے حبشی کی داڑھی کے بال خفگی سے اٹھ گئے۔ گو وہ روٹھے ہوئے مفلوک الحال آرٹسٹ تھے، مگر انھیں اپنے فن پر ناز تھا۔ فلمی راگ کا کہہ کر میں نے ان کی توہین کی تھی۔

بوسیدہ داڑھی والا آدمی کوئی غزل گانے لگ گیا۔ اسے فلمی گیت نہ آتے تھے۔ وہ گانے کا استاد نہ تھا۔ کھانے کے بعد بھی وہ پھٹو یہ ساز بجاتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنے سننے والوں کو بھانپ گئے ہیں، کیونکہ ان کے راگوں میں جان نہ پڑی۔ وہ بے دل سے تھے؛ ان کے گانے سے کوئی بھی دلچسپی نہیں لے رہا تھا۔

آخر میں نے انھیں رخصت ہونے کی اجازت دی۔ کچھ معذرت کے انداز میں، جیسے یہ ان کی فنکارانہ اہلیت کے مقابلے میں ایک ناقابلِ قدر معاوضہ ہو، ان کو دس روپے کا نوٹ دیا۔ ان کے چہرے چمک اٹھے۔ یہ ان کے لیے دولت تھی۔ انھیں اتنے انعام کی توقع نہ تھی۔

''سرکار،'' فیاض علی نے کورنش بجالاتے ہوئے کہا۔ ''آج کچھ محفل جمی نہیں۔ ہمیں پھر اپنی خدمت میں کبھی کبھار آنے کی اجازت دیں، سرکار۔'' اس کے لہجے میں التجا تھی۔

اس کے بعد تین دن بمشکل گذرے تھے کہ وہ میرے بنگلے کے باہر موجود تھے۔ ان کے دماغ میں یہ خیال پختہ ہوگیا تھا کہ اس ناقدر شناسوں کے شہر میں پرانی کلاسیکی موسیقی کا واحد قدر دان میں ہی تھا۔ (حقیقت یہ ہے کہ کلاسیکی موسیقی میرے لیے لاطینی ہے اور میں دادرے اور ٹھمری میں فرق نہیں بتا سکتا۔)

میرے نوکر نے آ کر مجھے اطلاع دی، ''صاحب، اس دن والے گویے پھر آئے ہوئے ہیں۔'' اس کے کہنے کا انداز ظاہر کرتا تھا کہ وہ انھیں پسند نہیں کرتا۔

''انھیں دو روپے دے دو،'' میں نے کہا۔

''بس جی، آٹھ آنے کافی ہیں۔ ان لوگوں کا کیا ہے جی، یہ پھر ٹل جاتے ہیں۔ ان کا کام ہی یہ ہے۔''

''چلو دو روپے دے دو، اس دفعہ،'' میں نے اس کی منت کی۔

میرے نوکر نے تھوڑی دیر کے بعد اندر آ کر مجھے اطلاع دی کہ وہ اب تک کھڑے ہیں اور مجھے سلام کرنا چاہتے ہیں۔ خود ایک آرٹسٹ ہونے کی وجہ سے مجھ میں اتنا جگرا نہ تھا کہ ان کو چلے جانے کے لیے کہوں... میں ایک آرٹسٹ کے احساسات جانتا تھا۔

میں باہر گیا، کچھ جھینپا ہوا اور اپنے کو مجرم محسوس کرتا ہوا۔

''سرکار، راگ سنیے گا۔ ٹھاٹھ کی چیز ہے۔ دل کھل جائے گا،'' فیاض علی نے فرشی سلام کرتے ہوئے کہا۔

''میں اس وقت تو مصروف ہوں...'' میں نے کہا۔

''سرکار، پندرہ منٹ سن لیں... صبح کا راگ ہے... ہمارا دل رہ جائے گا، سرکار۔''

میں ان کے احساسات کو سمجھ گیا۔ وہ اپنے آپ کو بھک منگا محسوس نہیں کرانا چاہتے تھے۔ وہ دو روپے ایسے ہی قبول کرنے کو تیار نہ تھے۔ اس کے معاوضے میں وہ مجھے اپنے عظیم فن کا تحفہ دینا چاہتے تھے، جسے انھوں نے پشت در پشت اور سالوں کی محنت اور مشق سے حاصل کیا تھا۔ ان کی خود داری مقتضی تھی کہ وہ اپنے انعام کو کمائیں... ان کا دل رکھنے کو میں ان کا راگ سننے پر رضامند ہو گیا۔

میں موسیقی کے رموز و اسرار سے بیگانہ ہوں، مگر میں یہ دیکھ سکتا تھا کہ فیاض علی خوب ستار بجاتا تھا۔ اس کی پتلی، پھرتیلی، انگلیاں چابکدستی اور استادی سے ستار کے تاروں پر حرکت کرتیں — اس کے راگ کی حس بالکل خطا نہ کرتی تھی، سُر اور تال کبھی نہ بھٹکتے تھے۔ اسے سنتے ہوئے اور دیکھتے ہوئے، میں اس حسن کی آن بان، اس کے تموج کا ہلکا اور نامکمل سا اندازہ کر سکتا تھا جسے وہ تخلیق کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

''بہت اچھا بجاتے ہو۔''

''سرکار، کبھی کبھی حاضر ہونے کی اجازت عطا فرمائیں...''

''دیکھو بھئی، مجھے موسیقی سے دلچسپی نہیں۔ میں پکے راگ کو نہیں سمجھتا۔''

"سرکار، راگ بڑی اچھی چیز ہے۔ حکم ہو تو میں شام کو ایک دو گھنٹے ستار کا علم سکھانے آ جایا کروں۔ سرکار، یہ ایک کمال علم ہے۔"

"نہیں، یہ مجھے اب نہیں آ سکتا... آخر تم بتاؤ، تم نے اسے کتنے برس میں سیکھا؟"

اس نے مجھے بتایا کہ وہ بچپن سے ستار بجانے کا کام کرتا رہا ہے اور ابھی تک اس فن کو سیکھ رہا ہے۔ کئی ایسے مشکل راگ ہیں جنھیں ابھی تک وہ اپنے تاروں میں مقید نہیں کر سکا۔

"تو تم یہ کیسے کہتے ہو کہ میں اسے اب اس عمر میں سیکھ لوں گا؟"

"سرکار، آسان راگ تو بجا سکیں گے۔ محنت اور شوق کی بات ہے۔ سرکار، ہمارا بھی کچھ روٹی کپڑے کا بندوبست ہو جائے گا۔"

میں نے انکار کر دیا۔ ایک تو مجھے یقین تھا کہ میں کبھی ستار بجانا نہیں سیکھ سکتا، دوسرے یہ ڈر کہ میرے دوست مجھ پر ہنسیں گے۔

وہ پھر دوسرے تیسرے ہفتے آنے لگے۔ ان کا بس چلتا تو وہ ہفتے کی بجائے دوسرے تیسرے روز ہی آتے، مگر میرے نوکر رفیق کا سرد مہر رویہ ایسا کرنے سے ان کو باز رکھتا تھا۔ جب بھی وہ آتے، میں ان کو اندر بلا لیتا۔ ان کے راگ سنتا اور کچھ انعام دے دیتا۔ انعام دیتے وقت اپنے آپ کو بڑا گھٹیا محسوس کرتا۔ ان کے فن کا مول وہ ایک دو چاندی کے ٹکڑے نہیں تھے، جو میں انھیں دیتا تھا۔ وہ اس انعام کو اس قدر آداب اور تکلف سے قبول کرتے کہ میرے لیے پریشانی کا موجب ہو جاتا۔ راگ کے بعد فیاض علی اور میں فن اور زمانے کی ناقدر شناسی کی باتیں کرتے۔ اس گفتگو کی تان ہمیشہ اس بات پر ٹوٹتی کہ وہ مجھ سے درخواست کرتے کہ میں ان سے راگ کا سبق لیا کروں۔ گفتگو عموماً اس قسم کی ہوتی:

"فیاض،" میں کہتا، "تم جانتے ہو، اس فن کی یہاں کوئی قدر نہیں۔"

"ہاں سرکار، ہندوستان میں بڑی قدر تھی۔ بڑے بڑے راجہ نواب گانے بجانے کا شوق رکھتے تھے اور منھ مانگا انعام دیتے تھے۔ یہاں تو جب سے آئے ہیں، فاقوں مر رہے ہیں۔"

"تم کوئی اور کام کیوں نہیں کرتے؟"

"اور کیا کروں، سرکار؟ مجھے صرف ستار بجانا آتا ہے۔ ساری عمر ستار سیکھتے اور بجاتے گذر گئی۔"

"کوئی دوسرا کام... آدمی کو روٹی تو کسی طور کمانا ہی ہے۔"

"دو سال پہلے پشاور ریڈیو میں نوکری مل رہی تھی۔ ٹیسٹ میں کامیاب ہو گیا تھا۔ پھر والد

صاحب نے بلوالیا،" وہ اداس لہجے میں کہتا۔

"تمھارے والد صاحب کہاں ہیں؟"

"وہ پیر جلال والی کے ہاں ستار بجانے پر ملازم ہیں۔"

"وہ تمھاری مدد نہیں کرتے؟"

"نہیں سرکار، انھوں نے دوسری شادی کر لی ہے۔ چاہیں تو کیوں نہیں مدد کر سکتے۔ میں نے کئی بار لکھا ہے کہ مجھے وہاں بلا لیں۔"

"تمھارے کتنے بچے ہیں؟"

"سرکار، پانچ..."

"دیکھو،" میں کہتا، "ایسے کام نہیں چلے گا۔ اس طریقے سے تم اپنے بچوں کو نہیں پال سکتے۔ تم کو کوئی ایسا کام کرنا چاہیے جو معاشی کے لیے مفید ہو۔"

"سرکار، شام کو ایک دو گھنٹے کے لیے آ جایا کروں؟ یہ بہت بڑا علم ہے۔" اور اس کے فاقہ زدہ ستے ہوئے چہرے میں آنکھیں دمکنے لگتیں۔

"نہیں،" میں اس کی آنکھوں میں روشنی کو بجھتے دیکھتا، "میں راگ نہیں سیکھ سکتا..."

میرے ملازم کو مجھے ان دو جھک منگے آرٹسٹوں سے بچانے کی فکر تھی، جو اس کی رائے میں مجھے لوٹ رہے تھے۔ اس نے میرے ایک دنیادار، موٹے اور کھتولی دوست کو شریک کار بنایا اور ان دونوں نے مل کر ستار والی پارٹی کی آمد پر سب دروازے بند کر دیے۔ وہ اب بنگلے کے نزدیک نہیں پھٹک سکتے تھے۔ میں اکثر ان دونوں کو اپنے سازوں کے ساتھ دور دور منڈلاتے ہوئے دیکھا کرتا... دراصل وہ میرے پاس صرف روپے کے لیے ہی نہ آتے تھے! مجھے کچھ کچھ شک ہے کہ فیاض علی کو مجھ سے تھوڑی سی محبت ہو گئی تھی، جیسی کہ مجھے بھی اس سے یقیناً تھی — ہم تینوں فنی محبت کے رشتے میں منسلک تھے۔ ہم بڑی آرٹسٹ برادری کے افراد تھے۔ ہماری زندگی کی حیثیتوں میں جو فرق تھا، وہ ظاہری تھا یا اتفاقی تھا۔ یہ درست ہے کہ ہمارے فن جداگانہ تھے اور ہمارے راستے بھی مختلف، پھر بھی ہمارا مقصد ایک تھا۔ ہم قدرت کے بیچ کر نکل جانے والے مبہم حسن اور سوز کو گرفتار کرنا چاہتے تھے — وہ آواز کے ذریعے، میں الفاظ کے سہارے۔ ہم تینوں، یہ سچ ہے، معمولی اور ناکامیاب آرٹسٹ تھے — ان کے راگوں کو کوئی نہیں سنتا تھا اور ایڈیٹر میری طویل نظموں کو توہین آمیز الفاظ سے واپس بھیج دینے کے عادی تھے — مگر ہم آرٹسٹ ضرور تھے، الوہیت سے ہمارے دل فروزاں ضرور تھے۔

ایک دن میں اپنے پاور ہاؤس کے باہر کھڑا پھاٹک پر ٹیوب لائٹ لگوا رہا تھا کہ مجھے اپنے پیچھے کسی کے کھڑے ہونے کا احساس ہوا۔ مڑ کر دیکھنے پر میں نے اپنے دونوں دوستوں کو منڈلاتے ہوئے پایا۔ مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔

''کیوں، کیا بات ہے؟'' میں نے ایک ہرجائی محبوب کی طرح بناوٹی روکھے پن سے کہا۔

''سرکار،'' فیاض علی نے کہا، ''اب تو بڑے دن سے سرکار نے یاد نہیں فرمایا۔ ایک خاص ٹھمری کی چیز ہے، صرف آپ کے سننے کی۔''

''تم جانتے ہو، راگ سمجھنے کی مجھ میں صلاحیت نہیں۔''

''سرکار، آپ سنیں گے تو جانیں گے۔ بڑودہ میں راجہ اجیت چند اسے بڑے شوق سے سنا کرتے تھے۔''

''دیکھو، تم کوئی اور کام کیوں نہیں کرتے؟'' میں جھلایا۔ ''تمھارا فن وغیرہ ٹھیک ٹھاک ہے، لیکن آدمی کو پیٹ بھی بھرنا پڑتا ہے کہ نہیں؟''

''سرکار، قسم لے لیجیے، کل سے ایک کھیل اڑ کر منھ میں نہیں گئی۔'' فیاض علی کی آنکھوں میں آنسو جھلک آئے۔ بوسیدہ داڑھی والے آدمی نے ایک واقعی ہاں میں سر ہلا دیا۔

مجھے بے حد افسوس ہوا۔ فی الواقع ان کے چہرے بھوک سے نڈھال اور ستے ہوئے تھے اور ان کی وضع بالکل ننگے بھوکے مفلسوں کی سی تھی۔ بڑی، گرجتی ہوئی دنیا ان کے دکھوں اور ان کے مصائب سے بے تعلق تھی۔ مگر ایک آرٹسٹ اپنے آرٹسٹ بھائیوں کو کیسے فاقے میں مرتے دیکھ سکتا ہے۔ میں ان سے اتنا عرصہ جان بوجھ کر بچنے کی کوشش کرتا رہا ہوں، میرے ضمیر نے مجھے سخت ملامت کی۔

میں نے انھیں کچھ رقم دی۔

''فیاض علی۔''

''سرکار۔''

''کل سے تم پاور ہاؤس میں آئل مین کی جگہ کام کرو گے۔''

''سرکار، اس کی بجائے اگر شام کو ایک دو گھنٹے —''

''حضور، مجھے بھی کہیں نوکری دلوا دیجیے،'' بوسیدہ داڑھی والے شخص نے منت کی، ''دعا دوں گا۔''

''میں تمھیں منیجر بینک کے نام چٹھی لکھ دوں گا۔ ان کو چپراسی کی ضرورت ہے۔''

دوسرے دن وہ دونوں آزاد آرٹسٹ ملازمت کی قید میں پابند ہوگئے۔ یہ ان کے لیے ایک

نئی اور مختلف زندگی تھی۔ ان کے کام ایسے تھے جو انھوں نے پہلے کبھی نہ کیے تھے — مگر مہینے کے آخر میں بندھے بندھائے روپے تو تھے۔ میں ان ہم سفروں کے ساتھ اپنا فرض سرانجام دے کر اطمینان اور خوشی محسوس کرنے لگا۔ اب ان پر فاقے تو نہیں پڑیں گے۔

میں نے فیاض علی کو بوڑھے تجربہ کار ڈرائیور سردار کے حوالے کیا کہ اسے دو تین مہینے میں فرسٹ کلاس آئل مین بنا دے۔ بوڑھے سردار نے مسکراتے ہوئے اپنے عجیب شاگرد کو دیکھا، ایک ایسی نظر سے جو صاف کہہ رہی تھی کہ یہ آئل مین بننے والی شکل تو نہیں۔

اس کی ملازمت کے دوسرے دن صبح جب میں پاور ہاؤس گیا تو میں نے اسے اپنی بغل میں ستار دبائے جلدی سے پھاٹک میں سے اندر جاتے ہوئے دیکھا۔

''فیاض علی۔''

''سرکار۔'' اس نے کورنش بجالاتے ہوئے کہا۔

''یہ ستار تم ساتھ کس لیے لے جارہے ہو؟''

''سرکار، دل بہلاوے کا سبب بھی تو ہونا چاہیے۔ حکم ہو تو کچھ راگ عرض کروں۔ اب تو بڑی مدت ہوگئی۔''

اس دفعہ مجھے واقعی غصہ آیا۔ میں نے حکم دیا کہ وہ ستار کو واپس جا کر گھر چھوڑ آئے اور اسے اپنے ساتھ پاور ہاؤس میں نہ لایا کرے۔ وہ منہ لٹکائے اپنے ساز کو چھوڑنے چلا گیا۔ اس نے اپنے نئے کام کو سیکھنے، اس میں دل لگانے کی کوشش ضرور کی، مگر یہ اس کے بس کا روگ نہیں تھا۔ ایک آدمی جو بچپن سے راگ اور راگ راگنیوں کی دنیا میں رہتا ہو، وہ ڈیزل انجنوں کی صحبت میں کیسے آسودہ رہ سکتا ہے! سردار سے میں اکثر اس کا حال پوچھتا رہتا۔ اس سے مجھے معلوم ہوتا رہتا کہ اسے انجن کا کام مطلقاً نہیں آرہا۔ شروع شروع میں اس نے کوشش ضرور کی تھی، لیکن اب اس نے دلچسپی لینا بھی چھوڑ دیا تھا اور اداس پھرتا رہتا تھا۔

سردار نے کہا، ''صاحب، کوئی اور آدمی رکھو۔ یہ تو مستقل عذاب ہے۔ اسے ذرا جھڑک کے کچھ کرنے کو کہو تو آنسو اس کی آنکھوں میں امڈ آتے ہیں...''

سردار کا کہنا درست تھا۔ میں ایک دفعہ اچانک انجن روم میں چلا گیا۔ فیاض علی ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ مجھے آتا دیکھتے ہی وہ ہڑبڑا کر اٹھا اور ایک تیل کی کپی اٹھا کر گویا انجن کو تیل دینے لگا۔ جب میں پاس آیا تو وہ کپی سمیت کورنش بجالایا۔

''تمھیں ابھی معلوم نہیں ہوا کہ پاور ہاؤس کے آداب میں کورنش بجالانا نہیں؟''

"جی سرکار۔"

"اور سرکار بھی مت کہو۔"

فیاض علی کی مسکراہٹ بجھ گئی۔ اس نے مجھے اس طرح غصے میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یقیناً اس وقت میں اسے ایک مختلف آدمی نظر آیا ہوں گا۔ سچی بات تو یہ ہے کہ میں اس سے ذرا بھی خفا نہ تھا، مگر دوسرے آدمیوں کے سامنے مجھے بننا پڑ رہا تھا۔

اس کے شاید دوسرے دن ہی سردار ڈرائیور نے مجھے رپورٹ کی کہ فیاض علی کام پر نہیں آیا۔ وہ اس سے اگلے روز بھی نہ آیا۔ اس نے ملازمت چھوڑ دی تھی اور تنخواہ لینے کا بھی انتظار نہ کیا تھا۔ وہ مجھے ملنے بھی نہ آیا۔ اسے غالباً ڈر تھا کہ میں اس پر ناراض ہوں گا کہ اس نے ملازمت کیوں چھوڑ دی۔ میں اس پر ناراض کیوں ہونے لگا! البتہ اس کے بارے میں جاننے کے لیے اب میں پریشان ضرور تھا۔ میں اس کے ساتھ اس قدر درشتی سے پیش آنے پر نادم تھا جس کی وجہ سے وہ نوکری چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

میں نے اسے دو مہینے تک نہیں دیکھا۔ اور پھر ایک دن میں شہر کی گلیوں میں بجلی کے کھمبے سیدھے کرا رہا تھا کہ میں نے بازار میں فیاض علی اور بوسیدہ داڑھی والے گویے کو ساز اٹھائے آتے دیکھا۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ جلدی سے ایک گلی میں مڑ گئے۔ انھوں نے پھر اپنے گانے بجانے کے پیشے کو شروع کر دیا تھا۔ ان کے آرٹسٹک ضمیر نے فاقے اور مصائب کے ممکنات پر فتح حاصل کر لی تھی اور وہ پھر اپنے سچے پیشے کی طرف لوٹ گئے تھے — لوگوں کے دلوں کو حسن اور سوز سے روشناس کرنے کا پیشہ۔

میں نے بجلی کے پول کو دیکھا، جو پہلے سے بھی ٹیڑھا ہو گیا تھا۔۔ اور پھر میں اپنے دو بہادر آرٹسٹوں کے پیچھے بھاگا۔ میں نے ان کو جا لیا۔ پیچھے سے میں ان دونوں کے درمیان جا گھسا۔ اپنے ایک بازو کو ایک کی گردن میں ڈالا، دوسرے کو دوسرے کی گردن میں۔ گلی کے آخر تک ہم نے آپس میں کوئی بات نہ کی، لیکن ہمارے ہونٹ مسکراتے رہے اور خوشی کے آنسو ہماری آنکھوں سے چھلک پڑے۔

موسیقاروں کے درمیان

اس کے بھائی کی ڈبا فاکس ویگن نے ان دونوں کو بغداد ریلوے اسٹیشن کی عمارت کے سامنے اتارا —بلاشبہ یہ ہارون الرشید یا صدام حسین کا بغداد نہ تھا، بلکہ ان کی سکونت کے شہر کا اسی نام کا ایک چھوٹا، قدرے ویران اسٹیشن، جہاں سے ریل گاڑی پوربی سمت سرحدی شہروں اور قصبوں کو جاتی تھی۔ بہت کم مسافر یہاں سے ریل کے ذریعے سے سفر کرتے تھے، کیونکہ پختہ میٹلڈ سڑکوں کے بچھ جانے سے اور مرفہ الحالی کی وجہ سے بیشتر لوگ بسوں یا کاروں سے سفر کو ترجیح دیتے تھے۔ اس لائن پر صرف دو مسافر گاڑیاں چلتی تھیں: ایک جو ہر ایک اسٹیشن پر رکتی تھی، اور دوسری جو چند ایک اسٹیشنوں کو چھوڑ جاتی تھی۔ تم اسے اس لحاظ سے ایکسپریس کہہ سکتے تھے۔

دوپہر کے بارہ کا وقت تھا اور دن گرم، جھلسا دینے والا۔ وہ ایک عجیب جوڑا تھے۔ یہ دونوں، اور بادی النظر میں باپ بیٹا بلکہ دادا اور پوتا معلوم ہوتے تھے۔ حقیقت میں ان کے درمیان ایسا کوئی رشتہ نہ تھا — وہ دوست تھے، ایک طرح سے یارِ غار جنھیں ڈیڑھ برس کی اتفاقیہ ملاقات کے بعد، عمروں کے تفاوت کے باوجود ان کے سانجھے مذاق اور طبیعتوں کے میل نے ایک دوسرے سے قریب کر دیا تھا۔ آرٹ اور ادب، انسانوں اور چیزوں کے بارے میں ان کی پرجوش گفتگوؤں اور شام کو سکونتی شہر کی سڑکوں پر لمبی سیروں نے ان کی دوستی کو پروان چڑھا دیا تھا۔ وہ اب تقریباً لازم و ملزوم ہو گئے تھے۔ انھیں ایک دوسرے کے بغیر چین نہ آتا تھا، اور تم ایک طرح کہہ سکتے تھے کہ وہ دو دلسوز عاشقوں کی طرح ایک دوسرے پر جان دیتے تھے۔ ان کے ماں باپ کے رکھے نام کچھ اور تھے، مگر وہ ایک دوسرے کو ڈان کوہکزوٹ اور سانچو کے ناموں سے بلاتے — سروانتیز کے کرداروں کے ناموں پر۔ سچی بات یہ ہے کہ اصل ڈان کوہکزوٹ اور سانچو کی طرح یہ دونوں بھی سرپھرے اور پاگل تھے — بہر حال، ان کے سکونتی شہر کے اکثر لوگ ان کو ایسا ہی سمجھتے تھے، اور

کی پٹری تک پشتہ باندھے تھے اور ان کے پیچھے جھلسے ہوئے کھیت تھے... وہ اسٹیشن کے اگلے سرے تک چلے اور سگریٹ سلگا کر (جو وہ ہر وقت سلگاتے رہتے تھے) ٹرین کا انتظار کرنے لگے۔ آخر گھنٹی بجی، مگر پھر کافی دیر تک گاڑی کا کوئی نشان نہ تھا۔ وہ ایڈونچر کے اضطراب سے شاداں تھے۔ یہ کیسا عجیب تھا کہ بوڑھا آدمی (جو خود کو تیس سال کا سمجھنے پر مصر تھا) اور اس کا عقیدت کیش نوجوان لڑکا اس اُجاڑ ایک اسٹیشن پر ناگوار موسم میں گاڑی کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ دن پہلے جب وہ اپنی شام کے وقت کی لمبی سیر کے بعد باغ میں چھپے ہوئے پیازہ ریستوران میں ستانے اور چائے پینے بیٹھے تھے (اور ایک خون جیسا سرخ چاند درختوں کے پیچھے سے طلوع ہوتا ہوا) تو سانچو نے فادر سے اپنے دو آرٹسٹ دوستوں (ایک گویّا اور دوسرا پنجابی زبان کا افسانہ نگار) کا قصہ چھیڑا جنھیں اس نے ٹریننگ کالج کے ہوسٹل میں دو روز ٹھہرایا تھا۔

''تم نے مجھے ان سے ملانا تھا سانچو — مجھے ان سے مل کر خوشی ہوتی۔'' فادر نے کہا۔

''مجھے خیال نہیں آیا، اور پھر میں نے سوچا فادر شاید ان کو ملنا پسند نہ کریں۔''

''کیوں؟''

''مگر وہ دونوں آپ کے شہر میں رہتے ہیں۔'' سانچو نے کہا تھا۔ ''کیوں نہ ہم کل دوپہر کی گاڑی سے آپ چلیں؟ شام کو آپ پہنچ جائیں گے اور رات بھر گانا سنیں گے۔ افضل بڑا اچھا گاتا ہے۔''

فادر کونکروٹ پہلے تذبذب میں پڑ گیا مگر پھر سانچو کی طرف دیکھتے ہوئے اور اپنے بچپن کے شہر کو لڑکے کی معیت میں سفر کرنے کے لطف کا خیال کر کے اس نے ہامی بھر لی تھی۔

''ہم افضل کے ہاں ٹھہریں گے۔ وہ بڑے قلندر لوگ ہیں، جن کے ساتھ آپ ایٹ ہوم محسوس کریں گے۔''

اور اس لیے وہ اب یہاں اس گاڑی کی راہ تک رہے تھے جو ان کو سانچو کے آرٹسٹ دوستوں کے پاس لے جائے گی۔ فادر کم وبیش تیس سال کے بعد سنہری بچپن کے پُرافسوں شہر کو جا رہا تھا، جہاں اپنے باپ تحصیلدار کے گھر میں اس کی اولین یادیں شروع ہوئی تھیں جن کے سہارے وہ اب تک جیے جا رہا تھا (کیونکہ جوانی اس پر نہیں آئی تھی اور اس شہر سے تبدیلی کے بعد نئے ماحول میں وہ سہما ہوا مردم بیزار بن گیا تھا)۔

کانٹے والے نے کانٹا بدلا اور پھر دور افق پر دھواں اُگلتا ہوا دکھائی دیا۔ بھاپ کا انجن پف پف کرتا تین چار لوگوں کو اپنے جلو میں لیے پلیٹ فارم پر آ کر رکا۔ یہ ایک دُم کٹی چھوٹی سی گاڑی تھی، جسے عرف عام میں لنڈی کہتے ہیں۔ ان کو پیچھے جانا پڑا اور وہ ایک ڈبے میں چڑھ گئے۔

دروازے کے پاس پلیٹ فارم کی طرف دو آمنے سامنے کی سیٹوں میں سے ایک پر ایک آدمی بیٹھا تھا۔ سانچو نے اسے سیٹ خالی کر کے اگلی سیٹ پر جانے کی درخواست کی تاکہ وہ اور فادر اکٹھے آمنے سامنے بیٹھ سکیں۔ وہ دونوں سنگل سیٹوں کو ترجیح دیتے تھے۔ پہلے تو آدمی نے اپنی سیٹ چھوڑنے میں پس و پیش کی اور دوسری خالی سیٹوں کی خامیوں کو بتاتے ہوئے بحث کا آغاز کیا۔ مگر سانچو کی ذہانت نے کام دکھایا، "پلیز،" اس نے کہا۔ اور گو وہ آدمی انگریزی سے نابلد تھا، وہ بادلِ ناخواستہ اٹھا اور پشت کی دوسری سیٹ پر منتقل ہو گیا۔ سانچو خالی کی گئی سیٹ پر بیٹھ گیا اور فادر اس کے سامنے۔ وہ دونوں بڑے خوش تھے۔ فادر نے سوچا کہ اس سے ایسا کام کبھی نہ ہوتا — وہ لوگوں سے خائف رہتا تھا اور انگریزی محاورے کے مطابق ایک بچّے کو بو کہنے کی بھی ہمت نہیں رکھتا تھا۔

"فادر،" سانچو نے کچھ اتراتے ہوئے کہا، "آپ نے دیکھا، مجھ میں کتنی خود اعتمادی آگئی ہے! میں اب لوگوں سے نہیں جھجکتا۔"

"ہاں، میں نے نوٹ کیا ہے۔ میں نے تمھیں بتایا تھا کہ جنسی تجربہ تمھاری عمر میں بڑا ضروری ہے۔ میں خوش ہوں کہ تم اب ورجن نہیں۔"

انھیں سانچو والی کھڑکی کے ساتھ پرابلم پیش آیا۔ اس کی تختی اوپر تو چڑھ جاتی مگر وہاں اسے تھامے رکھنے کے لیے کوئی روک نہ تھی، اور چڑھائے جانے پر فوراً گلوٹین کے پھل کی طرح نیچے آ گرتی تھی۔ وہ آدمی جس نے یہ سیٹ سانچو کے پھسلانے پر خالی کی تھی، اب سیٹ بدلی پر بڑا خوش تھا۔ وہ چند ایک مشورے دینے لگا، مگر وہ طبعاً چیزوں کا تاریک پہلو لینے والا قنوطیت پسند تھا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ اس کو اوپر رکھنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ فادر نے اسے درزوں میں کوئی لکڑی ٹھونکنے کی صلاح دی اور سانچو نے فرش پر سے ایک چھوٹی سی کھپچی ڈھونڈلی، اسے درز میں ٹھونکا گیا اور دو تین ناکامیاب کوششوں کے بعد کھڑکی کھلنے کے بعد نیچے نہ آئی۔ سیٹ خالی کرنے والے آدمی کو یہ دیکھ کر خوشی نہ ہوئی اور اس نے ان دونوں کے معاملات میں سارے سفر کے دوران کوئی دلچسپی نہ لی۔ جلد اسٹیم انجن نے کوک لگائی اور فوراً بعد گاڑی گڑگڑاتی ہوئی حرکت میں آ گئی...

سفر شروع ہو چکا تھا، اور اس موقعے کی خوشی منانے کے لیے انھوں نے اپنے سگریٹ سلگائے اور بڑے لمبے کش لینے لگے۔ دھوپ میں نہائے ہوئے مناظر ان کے دونوں طرف ہچکولے کھاتے لڑھکتے گئے... درخت اور کھیت ایک نہر کا کنارہ، نئی یونیورسٹی کا نوتعمیر ہوسٹل، نئی میٹلڈ روڈ، ایک آدھ جیپ اور ایک مسافروں سے بھری ہوئی لاری کو اپنے سینے پر لیے جس نے ان کی گاڑی سے دوڑ لگائی۔ پہلے وہ ان کی گاڑی سے آگے نکل گئی اور پھر بھاپ کو، جس میں بڑھاپے کے باوجود

ابھی دم خم باقی تھا، غیرت آئی اور اس نے لاری کو جالیا اور جلد ہی وہ بہت پیچھے رہ گئی۔ فادر گونگروٹ نے اپنی کتاب کھولتے ہوئے کہا، ''ہم نے اسے ہرا دیا ہے سانچو،'' اس کا لہجہ فاتحانہ تھا۔

انھیں گرمی کی حدت کا ڈر رہا تھا مگر ہوا جو کھڑکی میں سے آتی تھی غیر متوقع طور پر ایک ٹھنڈک سی لیے ہوئے تھی۔ یہ انھیں ایک معجزہ لگا — ان کی ایڈونچر کے لیے ایک نیک فال!

فادر نے زور سے پوچھا، ''ہماری گاڑی کے انجن کا نام کیا ہے؟''

''نام؟'' سانچو نے کہا، ''انجنوں کے نام ہوتے ہیں؟''

فادر گونگروٹ اصلی ڈان کوئکروٹ کی طرح اس بات میں یقین رکھتا تھا کہ سب بے جان چیزوں میں روح ہوتی ہے۔ ان کی اپنی خصلتیں، اپنی سیاپ، اپنے ہیرپھیر، اپنے اپنے مزاج ہوتے ہیں۔ ڈان کوئکروٹ بادچکیوں کو دیو گمان کرتا تھا، اور کون کہہ سکتا ہے کہ وہ حقیقت میں دیو نہ تھے؟ ہر ایک نے ایسے گھر دیکھے ہیں جن میں خوف بلند آواز سے بولتا ہے۔ وہ اپنے لڑکپن میں 'ب' کے شہر میں کچھ عرصے ایک مکان میں رہے تھے جس کے کمروں میں خوف کا احساس ہوتا تھا اور جس کے بارے میں انھیں بعد میں بتایا گیا کہ یہاں ایک عورت نے اپنے خاوند کو زہر دے کر ہلاک کر دیا تھا اور پھر اپنے ہیملٹ کے ڈرامے کے طور پر اپنے دیور سے شادی کر لی تھی جس سے اسے محبت تھی۔

فادر کے لیے بچپن ہی سے بھاپ کے انجن زندہ مخلوق تھے اور اس لیے وہ محسوس کرتا تھا کہ انسانوں اور پالتو جانوروں کی طرح ان کے بھی نام ہونے چاہئیں جن سے انھیں بلایا جا سکے۔

''انگلستان میں سب اسٹیم انجنوں کے نام ہوتے تھے۔ ڈیزل انجنوں کے آجانے کے بعد اب وہاں بھی نام رکھنے کا رواج اٹھ گیا ہے۔''

''اب ان کے فیکٹری نمبر وغیرہ تو ہوتے ہیں۔''

''ہم نمبروں کے زمانے میں آ رہے ہیں،'' فادر نے دانائی سے کہا۔ ''اکیسویں صدی میں نام رکھنے کا رواج شاید بالکل اٹھ جائے گا اور کمپیوٹر ایج میں ہم سب کی شناخت نمبروں سے ہوگی... شناختی کارڈ اس کام کی ابتدا ہے۔''

''اس وقت کے آنے تک ہم اگلی دنیا میں ہوں گے۔''

اگلے اسٹیشن پر گاڑی گھسٹتی ہوئی رکی اور سیاہ وردی میں ٹکٹ چیکر ڈبے میں چڑھ آیا... ناٹا سا قد، سیاہ رنگت، مسخرے بندر کا سا چہرہ، وہ آریاؤں کے آنے سے پہلے اصلی باشندوں، دراوڑ، بھیل اور گونڈ وغیرہ کی جھلک دیتا تھا۔ اس کی آنکھیں قدرے حیا پرور تھیں۔

''ٹکٹ میرے پاس ہیں؟'' فادر نے پوچھا۔

"ہاں، میں نے آپ کو دیے تھے۔ آپ کی جیب میں ہیں۔"

فادر نے اپنی جیب میں کچھ نروس ہو کر ٹکٹ ٹٹولے، انھیں نکالا اور ٹکٹ چیکر کے حوالے کیے جس نے دوسرے مسافروں کی طرف جانے سے پہلے ان پر نشان لگائے۔ سانچو نے اس سے اوقات کے بارے میں کچھ گپ شپ کی۔

ٹکٹ چیکر اور سب وردی پوش لوگ فادر کو کس قدر ہراساں کر دیتے تھے اور وہ ان کو دوسرے لوگوں سے مختلف خیال کرتا تھا۔ اسے ان سے بے تکلفی سے آنکھ سے آنکھ ملا کر بات کرنے کی ہمت نہ ہوتی تھی۔ فادر بے حد شرمیلا اور جھینپو انسان تھا۔ وہ اپنی اس عادت پر تعجب کیا کرتا اور اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ ان سے کیا بات کرے۔ گفتگو اس کے لیے کافی کٹھن تھی۔ شاید ایک طویل مدت تک اپنی کتابوں کے ساتھ زندگی بسر کرتے رہنے سے وہ جیتے جاگتے انسانوں کے درمیان خود کو اجنبی سا محسوس کرتا تھا۔ اس نے ٹکٹ چیکر کو دوسرے مسافروں کے ٹکٹ چیک کرتے دیکھا۔ اس نے دو تین مسافروں کو بیچ میں چھوڑ دیا جنھوں نے اسے فری میسنز والا کوئی اشارہ کیا۔ وہ بے ٹکٹ مسافر تھے، اور ظاہراً ٹکٹ چیکر کے دوستوں کے سفارشی۔

گاڑی قدرے کم کاشت کھیتوں میں سے گذرتی رہی۔ ہر پندرہ بیس منٹ کے بعد ایک اسٹیشن آ جاتا تھا اور وہ کراہتی ہوئی وہاں رک جاتی، جہاں سے دو تین دیہاتی مسافر اس میں سوار ہوتے، دو تین اتر جاتے... مگر فادر نے ایک لمحے کے لیے بھی ڈل محسوس نہیں کیا۔ ریل گاڑیاں اسے فیسی نیٹ (fascinate) کرتی تھیں اور وہ بڑی مدت کے بعد اپنے بچپن کے شہر کی طرف سفر کر رہا تھا۔ خوش طبع لڑکے کی صحبت، جو اسے پوجتا تھا اور جو ہر وقت کوئی نہ کوئی بات کرتا رہتا تھا، اس کے لیے گویا دیوتاؤں کا عطیہ تھی۔ ان کے درمیان خاموشی کے وقفے بہت کم آتے اور وہ ایلس کے والرس کی طرح "جہازوں اور جوتوں اور مہر لگانے والی موم" کی ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہتے تھے۔

سانچو نے اوپر رکھے بیگ میں سے پنجابی کا ایک رسالہ نکالا جس میں ان آرٹسٹوں میں سے ایک کی کہانی چھپی تھی جن کو ملنے ہم جا رہے تھے۔ "میں افضل راجپوت کی کہانی تو پڑھ لوں تاکہ اس کے متعلق اس سے بات کر سکوں۔"

اس نے کہانی کا کچھ حصہ پڑھا، مگر پنجابی پڑھنے میں اسے دقت پیش آئی اور اس نے رسالہ فادر کو دے دیا۔ فادر نے بھی اس کا ایک حصہ کچھ دقت سے پڑھا۔ اسے پنجابی ڈکشن پڑھنے کی مشق نہ تھی۔

"افضل راجپوت بھی گاتا ہے؟"

"نہیں، وہ گاتا نہیں۔ وہ پنجابی رائٹر ہے اور پنجابی میں افسانے لکھتا ہے۔"

''کیا افضل اور افضل راجپوت اکٹھے رہتے ہیں؟''

''وہ بڑے گہرے دوست ہیں۔ وہ گریس (یونان) بھی اکٹھے گئے تھے۔ وہاں وہ ایک شپنگ لائن میں تھے... افضل سے میں آپ کو گریس کے قصے سنواؤں گا۔''

''تمھارے دوست کیسے بنے؟''

''کوئی ایک سال ہوا۔ عبداللہ شاہ ابھی زندہ تھے۔ وہ طاہر شاہ کے ساتھ آئے اور ٹوم کے گھر ٹھہرے تھے۔ طاہر شاہ اور عبداللہ شاہ میں بڑی دوستی تھی۔ وہاں وہ دن گانے کی خوب محفلیں تھیں۔ طاہر شاہ ان سب کا استاد ہے۔ شاہ حسین کی کافیاں اس سے بڑھ کر کوئی نہیں گا سکتا۔''

''طاہر شاہ صاحب کیا کرتے ہیں؟'' فادر نے پوچھا۔

''وہ ایک ادویہ ساز کمپنی کے میڈیکل ریپ ہیں اور ساہیوال میں رہتے ہیں۔ مہینے میں ان کا بہاولنگر ضلع میں چار پانچ دن کا دورہ ہوتا ہے اور وہ افضل کے ہاں ہی قیام کرتے ہیں۔''

سانچو سے نچلا نہیں بیٹھا جاتا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس نے کہا ''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔'' اس نے کھڑے ہوکر اوپر رکھے ہوئے بیگ میں بسکٹ کے پیکٹ کے لیے ٹٹولا اور اس عمل میں بیگ نیچے آ رہا۔ سانچو کی طبیعت میں عجلت اور بے صبری بہت تھی۔ وہ ہمیشہ اس پھرتی کی وجہ سے چیزیں گراتا اور توڑتا رہتا۔ گلاس، رکابیاں، اس کے نروس ہاتھوں میں محفوظ نہ تھے۔

''ساری فادر!'' اس نے دو بسکٹ خود کھائے اور دو فادر کو دیے۔ پھر وہ فادر کو آئی بی سنگر کی کہانی سنانے لگا۔ اس کے انجام تک وہ شیخ واہن کے اسٹیشن میں داخل ہوئے۔ سانچو نے باہر دیکھا اور اطلاع دی: ''ٹی اسٹال بند ہے۔'' یہ اس لائن پر واحد ٹی اسٹال تھا۔ وہ کچھ مایوس ہوگئے کیونکہ انھوں نے شیخ واہن چائے پینے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔ گاڑی پلیٹ فارم پر ذرا آگے جا کر رکی، کیونکہ انجن کو یہیں پانی لینا تھا اور واحد اتر سگنل کے پاس تھا۔ وہ یہاں اترے۔ انھوں نے لمبے گلچھے بالوں اور ہنستی ہوئی آنکھوں والے گارڈ کو اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں گپ شپ اور شاید چائے کے پیالے کے لیے جاتے ہوئے دیکھا۔ وہ انجن تک چل کر گئے جو پانی پیتے ہوئے بھاپ کے دوسرے انجنوں کی طرح شاں! شاں! بھاپ چھوڑ رہا تھا۔ یہ انجن شریف آدمیوں کی طرح پانی کیوں نہیں پی سکتے؟ فادر نے سوچا۔ پانی پیتے وقت بھاپ چھوڑنا کیوں ضروری ہے؟ مہندی سے رنگی داڑھی، چشمہ لگائے ڈرائیور سیٹ پر ٹکا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا — کس قسم کی کتاب؟ گاڑی یہاں کافی دیر رکی، اور انجن جب پانی پی کر ستا چکا تو وہ پھر چل پڑے۔

ان کی باتیں کبھی ختم نہیں ہوتی تھیں اور فادر کو لڑکے کی لاابالیانہ، ذہین، جوانی کے ولولے

سے ہلکی شرارت بھری گفتگو میں بڑا لطف آتا تھا۔ سانچو میں ایک سیمابی کیفیت تھی اور اس کے موضوعات ہر گھڑی رنگ بدلتے رہتے تھے۔ فادر کے لیے یہ بے ربطی بڑی مسرت بخش تھی۔ اس نے سوچا، مجھے زندگی میں سانچو سے زیادہ دلچسپ عقیدت کیش نوجوان نہیں ملا۔ ہم ایک ویران جزیرے پر بھی ایک دوسرے کے ساتھ خوش رہ سکتے ہیں۔

"فادر، آج آپ کچھ اداس اداس ہیں،" سانچو نے یکبارگی کہا۔

"تم یہ کیسے کہہ سکتے ہو؟ تم بلاوجہ مجھے اداس بناتے رہتے ہو... میں تو بہت خوش ہوں۔"

"نہیں نہیں... میں صرف بحث کے لیے کہہ رہا تھا۔" سانچو کی آنکھوں میں شرارت تھی۔ وہ اکثر دوسری باتوں کے دوران اچانک فادر سے یہ سوال کر دیتا تھا اور اس کے تعجب اور انکار کا مزہ لیا کرتا تھا۔

دو میلوں تک چھوٹی چھوٹی جھاڑیوں سے پٹے ہوئے ایک لق و دق میدان میں سے گذرتے رہے اور پھر ٹھنڈی مرطوب ہوا آنے لگی۔ حاصل پور سے پیچھے آگے ابر سے گھٹا چڑھتی آئی تھی۔ بارش کے پہلے چھینٹوں نے ان کا استقبال کیا۔ ڈبے کی دوسری سمت بیٹھے لوگوں نے کھڑکیاں چڑھا دیں۔ آگے دھواں دار بارش ہو رہی تھی اور وہ ایک گرم بے راحت سفر کے لیے تیار تھے۔

"فادر، میں نے کہا تھا کہ آپ ولی ہیں۔"

"وہ کیسے؟"

"قدرت نے یہ سب کچھ ہماری خاطر کیا ہے۔"

"قدرت بے پروا ہے،" فادر نے فلسفیانہ انداز میں انگریزی فقرہ دہرایا۔ فادر زیادہ دو اور چنچل آدمی نہ تھا۔

فادر کو کچھ کچھ سردی محسوس ہونے لگی۔ اس نے سوچا کہ وہ سویٹر لے آتا تو اچھا تھا۔ وہ ایک بڑے اسٹیشن پر رکے جہاں فادر تیس سال پہلے وہاں کے نئے بنے ہوئے پاور ہاؤس کا انچارج تھا۔ آگے کھیت اور میدان جل تھل ہو رہے تھے اور کائنات سرسبز و شاداب تھی — قدم قدم پر پانی کے پوکھر۔ پھر بارش کا زور کم ہو گیا۔ گاڑی کی رفتار میں کمی آ گئی تھی اور بھاپ کا انجن شاں شاں کرتا اپنے دوراہے پر پھونک پھونک کر قدم رکھتا تھا۔ وہ ایک چھوٹے سے اسٹیشن پر رکے جس کا نام تخت محل تھا (گو وہاں نہ کوئی تخت تھا نہ محل، مگر اس سے کیا فرق پڑتا ہے)۔

"اس سے اگلا اسٹیشن شاید 'ب' ہے،" فادر نے کہا۔

سانچو نے پشت کی طرف بیٹھے ہوئے مسافر سے اس کی تصدیق چاہی اور اس نے خوش طبعی

سے جواب دیا: ''ہاں آگے بہاولنگر ہے۔'' بارش نے ہمارے خلاف کینے کو دھو ڈالا تھا۔ تخت محل سے گاڑی سہ پہر کی روپہلی سی روشنی میں جھپاک سے 'ب' کے ریلوے اسٹیشن میں داخل ہوئی۔ مگر چوکس اور بے صبر سانچو نے شہر کے پیارے شروع سے پہلے ہی اوپر سامان کے ریک سے بیگ اتار لیا تھا اور اب وہ کتابوں کے لفافے کو ہاتھ میں لیے پہلے موقعے پر چھلانگ لگانے کے لیے تیار کھڑا تھا۔ سانچو کی ہدایت پر فادر نے اپنے موزے چڑھانے شروع کیے۔

ٹرین مین پلیٹ فارم کی بجائے دوسرے پلیٹ فارم پر آ ٹھہری۔ فادر نے اتر کر جنگلے سے پار اسٹیشن کی لمبی سفید محرابی نیچی عمارت پر نظر ڈالی اور اس نے اس میں کوئی زیادہ تبدیلی محسوس نہ کی۔ شاید دو تین کمروں کا اس میں اضافہ کیا گیا تھا۔ اس کے بچپن میں بھی 'ب' ایک اہم جنکشن تھا۔ گاڑی یہاں سے فیروز پور جنکشن اور بھٹنڈہ جنکشن سے ہوتی ہوئی دہلی اور آگے تک جاتی تھی۔ فادر کو افسوس ہوا کہ وہ اب صرف تیس میل تک جاتی ہے۔ اس زمانے میں اسٹیشن پر ایک سپنسر کمپنی کا انگریزی اسٹائل کا طعام خانہ بھی تھا، جہاں اس نے ایک دفعہ اپنے باپ کے ساتھ اسٹیمڈ مچھلی کو اپنے باپ کی تقلید میں چھری کانٹے سے کھانے کی کوشش کی تھی اور اپنے باپ کا کوٹ خراب کر دیا تھا۔ اسے یاد تھا کہ ایک بار وہ بڑے ابا جی یعنی دادا کو لینے اپنے باپ کے ہمراہ اسٹیشن پر گیا تھا اور جب دادا کی گاڑی آئی تھی تو اس کے آگے دو انجن جتے تھے۔ اس نے سوچا تھا کہ بڑے ابا جی اتنے اہم آدمی تھے کہ انھوں نے گاڑی کو کھینچنے کے لیے ایک انجن کی بجائے دو انجن لگا دیے ہیں۔ فادر نے اب برسوں کی کمائی ہوئی دانشمندی سے سوچا: یقیناً ایک انجن میں کوئی خرابی ہو گئی ہوگی۔

سانچو اور وہ گاڑی کے پچھلی طرف اوور ہیڈ برج کی طرف چلنے لگے تو اس نے ریلوے لائن کے پرلی طرف پرانے لوکو شیڈ کو دیکھا اور فوراً پہچان لیا۔ بڑا لوکو شیڈ شکست و ریخت کی حالت میں تھا، چھت غائب، دیوار میں بڑے بڑے رخنے۔ اس کے لیے یہ جگہ کبھی پُراسرار جادو کی جگہ ہوتی تھی جہاں اس کے دوست بھاپ کے انجن دن رات پھنکارے مارتے اور ہف ہف کرتے رہتے تھے۔ وہ اکثر اسکول سے بھاگ کر یہاں آ چھپتا، جہاں ایک بوڑھے چھوٹے اینگلو انڈین ڈرائیور نے اسے دوست بنا لیا تھا اور دو تین بار اسے اپنے انجن میں بٹھا کر سیر بھی کرائی تھی۔

''یہاں سے باہر جانے کا راستہ کون سا ہے؟'' سانچو نے پوچھا۔

''ہمارے سامنے ایک اوور ہیڈ پل ہوا کرتا تھا۔''

اوور ہیڈ برج اب بھی وہاں تھا جہاں سے مسافر اپنے سامان اٹھائے جا رہے تھے۔ (فادر نے کوئی قلی نہ دیکھے۔) انھوں نے ٹکٹ چیکر کو ٹکٹ دیے اور اوپر چڑھنے لگے۔ فادر نے محسوس کیا،

اس کو اب لمبا کر دیا گیا ہے۔

"میں اس پر کھڑے ہو کر گاڑیوں کو نیچے سے گذرتے دیکھا کرتا تھا" فادر نے سانچو کو بتایا۔ "اس وقت یوں لگتا تھا کہ پل چل رہا ہے اور میں جھولے کھا رہا ہوں۔"

پل پار کر کے کچھ کوارٹرز تھے اور ان کو عبور کرتے ہی وہ تقریباً شہر میں آ گئے۔ پہلے شہر اور اسٹیشن کے درمیان ایک ناہموار، کوئلوں سے سیاہ میدان سا ہوا کرتا تھا۔ ایک بازار اور آیا اور فادر کو یاد آیا کہ یہی وہ بازار ہے جس میں اسارت جندو ہومیو پیتھ ڈاکٹر (اس کے باپ کے دوست)، فلیکس کے جوتوں اور شہر کے سب سے بڑے شیر اور مٹھائی فروشوں کی دکانیں ہوا کرتی تھیں۔ کم و بیش سات سال کے بعد وہ جندو شیر اور مٹھائی فروش کی دکان کی نشاندہی کر سکتا تھا جہاں اس نے ایک دن ایک جٹا دھاری سادھو کو دودھ کا ایک پورا مٹکا خالی کرتے دیکھا تھا۔ وہ اس بازار میں چند قدم ہی جا سکے کیونکہ آگے دور تک بارش کے پانی کا جوہڑ تھا۔ وہ وہاں سے پلٹ آئے اور ایک شخص نے انھیں ایک اور طرف سے گذرنے کا راستہ بتایا۔ دائیں طرف ایک ایک بڑی بد وضع مسجد کے پاس سے وہ اینٹوں سے پختہ گلی میں ہو لیے۔ اور پھر کئی ایسے ہی گلی کوچوں میں سے ہوتے ہوئے وہ ایک اور بازار میں آ نکلے اور فادر نے کہا" یہ وہی بازار ہے جس کے پچھلی سرے پر متانی تھیٹر اپنے چبوترے اور اپنے پردوں کے ساتھ ہوا کرتا تھا اور جس میں نیک پروین، خون کا خون اور شیر کی گرج عرف چنگیز خان جیسے کھیل ہوا کرتے تھے۔" اسے اس کا باپ ڈرامے دیکھنے کی اجازت شاذ و نادر ہی دیتا، اور اجازت لینے کے لیے باپ کے ماتحت دوستوں کی منتیں کرنا پڑتیں۔ ان میں کامک پارٹ اسے سب سے اچھے لگتے اور معمولی سے معمولی مذاقوں پر وہ اتنا ہنستا کہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگتے۔ وہ اکثر اس تھیٹر کے گرد و پیش منڈلایا کرتا۔ یہ ایک عجیب سحر انگیز دنیا تھی اور اس کی زندگی کی خواہش بڑے ہو کر ایکٹر بننے کی تھی۔

وہ بازار میں بائیں کو ہو لیے اور چوک میں آ گئے۔ اب شہر کا سارا نقشہ فادر کے ذہن میں واضح ہونے لگا۔ وہ سانچو کو راہ بتانے لگا۔ وہ سیدھے مشرقی بازار میں چلے جس کے شروع میں (فادر نے سوچا) وہ تحصیلدار کا مکان تھا جس میں اس نے اپنی زندگی کے بہترین اور سب سے خوبصورت سال گذارے تھے۔ چلتے چلتے وہ ایک اور چوراہے پر آئے اور دائیں طرف کو ایک بڑی سڑک پر مڑے۔ فادر کو یہ سڑک آشنا لگی۔ یہ وہی کچی سڑک تھی جو ہائی اسکول ہسپتال سے ہوتی ڈگی کو جاتی تھی اور جس پر بارش کے دنوں بیر بہوٹیوں کی رجمنٹیں مارچ کرتی تھیں۔ وہ اب اسے بلدیہ روڈ کہتے تھے۔ بلدیہ روڈ پر نئی حویلیاں اور نئے مکان بن گئے تھے۔ نئے بازار اور نئے کوچے

سڑک سے بلدیہ روڈ سے زاویہ قائمہ بناتے ہوئے پھوٹتے تھے۔ ان کو راستے میں ایک دو موٹر کاریں ملیں۔ فادر نے چند بلڈنگز کے پیچھے پرانے ہائی اسکول کو پہچانا — برآمدوں والی ایک سکڑی سکڑی عمارت جو بچپن میں بڑی وسیع اور شاندار لگتی تھی۔ وہ چبوترہ ابھی تک موجود تھا جہاں اسکول شروع ہونے سے پہلے "... تمنا میری" کی دعا ہیڈ ماسٹر اور استادوں کی موجودگی میں گائی جاتی تھی اور جس کے بعد اخلاقی جرم کے مرتکب طالب علموں کو (مثلاً وہ جو پاخانے کی دیواروں پر فحش تصویریں بناتے یا فحش الفاظ لکھتے تھے) سارے اسکول کے سامنے بید لگائے جاتے تھے۔ ہائی اسکول کا پہلا ہیڈ ماسٹر رگبی کے مشہور ہیڈ ماسٹر ڈاکٹر آرنلڈ کی طرح ایک سخت قواعددان اور کٹر مارلسٹ (moralist) تھا جو "بید کو چھوڑو — بچے کو بگاڑو" کے مقولے پر سختی سے کاربند تھا۔ وہ تھوڑا عرصہ رہا کیونکہ چند بید کھانے والے لڑکوں کے بارسوخ والدین اس کے خلاف ہو گئے اور بعد میں دوسرے ہیڈ ماسٹر کے آنے پر بید لگانے کی رسم اٹھا دی گئی۔ ہائی اسکول کے سامنے گراؤنڈ کے سرے میں جدید طرز کی سیاہ مکعب عمارت کھڑی ہو چکی تھی۔ مگر گراؤنڈ اب بھی وہی تھا — بے آب و گیاہ۔

آگے دور تک بلدیہ روڈ گھٹنوں گھٹنوں پانی میں ڈوبی تھی۔ اسے دیکھ کر سانچو سب چوکڑی بھول گیا۔ وہ یہاں تک اپنے جوتے گیلے کیے بغیر پہنچے تھے، اور اب... سانچو نے فادر کو افضل کا مکان بتایا — دائیں طرف ایک پیلی حویلی جس کے اوپر بخارچہ تھا۔ وہ تقریباً اس نالے کے وسط میں تھا۔ اسے کیسے پار کریں؟ ایک جیپ ہماری طرف آئی۔ سانچو خوشی سے ناچنے لگا۔

"بس فادر، مسئلہ حل! ہم جیپ والے کو کہیں گے کہ ہمیں وہاں تک لے چلے۔"

فادر متامل تھا۔ "خدا جانے وہ راضی ہو یا نہیں... "

"کیوں نہیں؟"

مگر جیپ دائیں طرف بازار میں مڑ گئی۔ سانچو کا چہرہ اتر گیا مگر فادر نے راحت کا سانس لیا۔ اتنے میں ایک چھوٹا لڑکا ایک اونچی گدھا گاڑی ہانکتا ہوا اور کوئی گیت گنگناتا دکھائی دیا۔ وہ اس نالے کو عبور کرنے لگا تھا کہ سانچو نے اسے کہا، وہ ہمیں بٹھا کر پار لے چلے۔ اس نے کہا، "آؤ بیٹھو، سوہنیو، بزرگو! گاڑی کس کی ہے!" انھوں نے اپنے بیگ گاڑی میں پھینکے۔ سانچو پھرتی سے چڑھ گیا۔ فادر کو کچھ مشکل پیش آئی مگر پھر کامیاب ہو گیا۔ گدھا گاڑی تخ تخ چلی اور لڑکے نے ہمیں بالکل بخارچے والے مکان کی سیڑھیوں پر جا اتارا۔

سانچو نے ایک دروازے پر دستک دی اور پکارا، "افضل صاحب! افضل صاحب!" اوپر منڈیر پر سے آدمی نے ہمیں جھانکا۔ پٹے دار سیدھی مانگ نکلے بال، حساس لمبوترا چہرہ، ہونٹوں سے

تھوڑی نیچے آئی ہوئی مونچھیں... فادر کو وہ چہرہ بے حد جانا پہچانا لگا۔ اس نے سوچا، میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں، مگر اس وقت اس کی یاد نے اس کی کوئی مدد نہ کی۔ بعد میں...

ایک آدمی نے دروازہ کھولا اور وہ پختہ زینے سے چڑھتے اوپر ایک پختہ وسیع آنگن میں آئے۔ وسط میں بخار پے والا چھوٹا کمرہ اور ایک کوٹھری اتری دیوار سے ملحق۔ کوٹھری اور کمرے کے درمیان ایک میز اور دو آرام کرسیاں بچھی تھیں۔ آشنا چہرے والے میزبان نے ان کا زینے کی چوٹی پر استقبال کیا۔ وہ ایک قدرے چھوٹے قد کا تیس سالہ شخص تھا اور اس کا جسم چند برس پہلے پھرتیلا اور کسرتی رہا ہوگا۔ چہرے پر قدرے فاصلے پر کی آنکھیں خوش طبعی سے تمتماتی تھیں۔ فادر کو یوں محسوس ہوا کہ وہ لڑکے کے ساتھ ایک بوڑھے آدمی کو دیکھ کر قدرے متعجب ہوا ہے۔ سانچو اور وہ ایک دوسرے سے گلے ملے۔ بوڑھے آدمی کو اس نے اپنا ہاتھ دیا، جو فادر کو کسی قدر رسمی اور ڈھیلا سا لگا — زیادہ گرم جوشی نہیں۔ فادر کا دل ڈوبا — کہیں وہ اس پر بوجھ تو نہیں بنے؟

''ہم پانچ بجے کی گاڑی سے آئے اور بڑے خجل خوار ہو کر یہاں پہنچے ہیں۔ تمھارے گھر کے سامنے سارا پانی تھا۔ ایک گدھا گاڑی والے نے ہمیں تمھاری دہلیز پر اتارا ہے۔ ایلسکیوزمی فادر!'' سانچو نے فادر کا تعارف کراتے ہوئے آگے کہا، ''یہ میرے دوست اور مرشد فادر گیکڑوت ہیں۔ اردو کے بڑے طنز نگار اور رائٹر...''

فادر سانچو کے ان تعارفی فقروں پر بہت خوش ہوا۔

''سانچو نے مجھ سے آپ کا ذکر کیا ہے۔ آپ لکھتے ہیں؟''

''کبھی کبھار۔ میں کتابیں پڑھتا ہوں،'' فادر نے انتہائی شرمساری سے کہا۔ یہ کسر نفسی نہ تھی، کیونکہ فادر جس کی زندگی کا مشغلہ مغربی مصنفوں کے ناول پڑھنا تھا حقیقت میں خود کو صرف آرٹس کا ایک عاجز شیدائی سمجھتا تھا — لکھک اور رائٹر بالکل نہیں؛ گو اپنے لڑکپن اور جوانی میں وہ اس معاملے میں اولوالعزم تھا...

وہ آرام کرسی پر گونگے کناری کی طرح ڈھلتی شام میں بیٹھ گئے۔ سانچو اور افضل ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ فادر نے کہا، ''پرسوں ہمارا آپ سے ملنے کا پروگرام بنا اور ہم چلے آئے۔ سانچو نے آپ کی تعریف کی کہ آپ کمال کے گویے ہیں۔''

افضل نے کہا، ''صبح سے بجلی غائب ہے، اور یہ روز کا معمول ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ یہ کب آئے گی۔ بعض دفعہ ساری ساری رات نہیں آتی۔ میں گھر سے چائے بنوا کر بھیجتا ہوں۔''

''چائے کے دور یہاں چلتے رہتے ہیں۔ افضل کی چائے پینے کی چیز ہے۔ اسٹرانگ اور

ذائقے دار۔ آپ نے ایسی چائے نہیں پی ہوگی۔"

افضل جاتے ہوئے اپنا سونا سانچو کو دے گیا۔ اس نے ایک پیاسے آدمی کی طرح لمبے کش لیے اور پھر اسے فادر کو پیش کیا۔ فادر سانچو کی شاداں صحبت میں ایٹ ہوم محسوس کرنے لگا۔ پھر سانچو نے ایک متولی قسم کے آدمی سے، جو بخار چے میں کھڑا کچھ کر رہا تھا، پوچھا، "طاہر شاہ صاحب یہاں آئے ہیں؟"

"نہیں پر ہیں شاہ صاحب۔ صبح سے فورٹ عباس گئے ہوئے ہیں۔ ابھی آنے والے ہوں گے۔"

سانچو نے فرطِ مسرت سے تالیاں بجائیں۔ "فادر، طاہر شاہ صاحب یہیں ہیں! ہم خوش قسمت ہیں۔"

کوٹھری کے ساتھ ایک نل تھا اور کوٹھری کے اندر صاف پانی کا ایک گھڑا بھی۔ متولی نما آدمی نے انھیں پانی پلایا اور پھر چائے آگئی — سچ مچ اچھی پتی کی چائے، ایک مہک کے ساتھ۔ سانچو کمرے کے اندر سے بسکٹ لے آیا، اور فادر کو تسلیم کرنا پڑا کہ اس نے برسوں سے ایسی چائے نہیں پی۔

"افضل راجپوت یہاں ہے؟" سانچو نے پوچھا۔

"وہ اس وقت یہاں پر ہوتا ہے۔ دو دن سے اس کے گھر چند مہمان اترے ہوئے ہیں۔ وہ ان میں رُجھا ہوا ہے۔ اس کی اگلے ماہ شادی ہونے والی ہے۔" افضل نے جواب دیا۔ "طاہر شاہ صاحب کو اس وقت تک آجانا چاہیے تھا۔ بارشوں کی وجہ سے وہ ہارون آباد اپنے دوست ڈاکٹر کے پاس جم گئے ہیں۔ بادشاہ آدمی ہیں... سائیں بھی نہیں پہنچا۔ صبح شام روز آتا ہے سائیں! کہیں بیچارے کا کوٹھا بارش میں بہہ نہ گیا ہو۔"

"سائیں؟"

"وہ ماہر طبلچی ہے اور ایک زمانے میں بڑے غلام علی خاں کے ساتھ اس کی طبلہ نوازی ریکارڈ ہو چکی ہے۔ وہ اب یہاں شہر کے باہر ایک کچے کوٹھے میں اپنی بڑھی کے ساتھ گمنام پڑا ہے۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ وہ طبلہ نواز ہے۔ اتفاق سے ایک روز مجھے چوک میں مل گیا۔ میں نے پوچھا کہ سائیں، کیا کرتے ہو؟ اس نے ہوا میں طبلہ بجاتے ہوئے کہا، 'تک دھنا دھن تک دھنا دھن کیا کرتا تھا، اب کچھ نہیں کرتا۔' میں اس کو اپنے ساتھ لے آیا۔ اس نے طبلہ بجایا تو ہم سب مان گئے۔ ہم اس کو چوتھے پانچویں روز دس بیس روپے دے دیا کرتے ہیں۔ خوددار آدمی ہے۔"

وہ اندر کمرے سے اخبارِ خواتین کا ایک پرانا پرچہ لے آیا۔ اس میں ایک دو کالمی مقامی

نیشنل سینٹر کے فنکشن کا کوراپ تھا اور ایک تصویر جس میں ہمارے میزبان کو ہارمونیم پر کرسیوں پر بیٹھے ہوئے معززین کے سامنے گاتے دکھایا گیا تھا۔ اس کے ایک طرف چھدری داڑھی والا ایک بوڑھا آدمی بیٹھا تھا، آگے طبلوں کی جوڑی۔

''یہ سائیں ہے،'' افضل نے کہا۔ ''یہاں فن کو کوئی نہیں جانتا۔ دوستوں نے زبردستی یہ فنکشن کروا دیا، ورنہ بھینسوں کے روبرو بین بجانے میں کیا لطف!''

افضل نے پرچے کو سنبھال کر رکھا ہوا تھا، گو اس کے خیال میں مقامی صحافی کا کوراپ اس کے فن سے انصاف نہیں کرتا تھا۔

''مجھے تھوڑی دیر کے لیے چھٹی دیں۔ میں نے ایک مریض کو ہسپتال دیکھنے جانا ہے۔ آج سارا دن نہیں جا سکا۔ ابھی ان کو پوچھ کر لوٹتا ہوں۔''

افضل چلا گیا تو فادر نے سوچا: اس کا چہرہ بے حد آشنا ہے، میں نے اسے کہاں دیکھا ہے؟ اور پھر یکبارگی وہ تقریباً آرام کرسی میں اچھلا — ان کا میزبان فادر کے چہیتے اسکاٹش ناولسٹ رابرٹ لوئی اسٹیونسن سے حیرتناک مشابہت رکھتا تھا۔ اس نے اپنی رانوں پر ہاتھ مارے۔

''کیا بات ہے فادر؟''

''میں تمھیں بتاؤں، میں تذبذب میں پڑا تھا کہ میں نے تمھارے دوست افضل کو کہاں دیکھا ہے... وہ تو رابرٹ لوئی اسٹیونسن کی ڈپلی کیٹ ہے۔''

''یور آر رائٹ فادر، ہو بہو اسٹیونسن!'' سانچو اضطراب میں کھڑا ہو گیا، جیسے انھوں نے کوئی نادر عجوبہ دریافت کر لیا ہو۔

''چہرے کی کٹ وہی ہے، وہی ہیئر اسٹائل، وہی چہرے پر فاصلے پر لگی لمبوتری بھوری آنکھیں، وہی ٹھوڑی... صرف اسٹیونسن کا قد افضل سے بڑا تھا اور وہ زیادہ دبلا پتلا تھا۔''

اس دریافت نے ان دونوں کو بے حد خوش کیا اور اس کے بعد افضل ان کے لیے 'مسٹر اسٹیونسن' ہو گیا۔ بلاشبہ مشابہت بے حد نمایاں تھی۔ مسٹر اسٹیونسن تھوڑی دیر کے بعد لوٹ آیا۔ وہ خود مریض کی عیادت کے لیے ہسپتال نہیں گیا تھا — سڑک پر جانے کی کوئی صورت نہ تھی۔ اس نے اس کام پر اپنے متولی کو ہدایت کے ساتھ روانہ کر دیا تھا جس کو وہاں سے ہو کر ایک خاص آدمی کو ایک خاص مقصد کے لیے ٹٹولنا تھا۔ پھر ایک اور چھوٹی ترچھی مونچھوں اور ذرا بھاری چہرے والا شخص اوپر آیا۔ افضل نے اس کا تعارف کرایا، ''یہ بٹ صاحب ہیں۔ ان کی ریلوے بازار میں اسپیئر پارٹس کی دکان ہے۔''

بٹ صاحب ایک کھاٹ پر نیم دراز ہو گئے۔ ان کی آنکھیں ملائم تھیں، چہرے کے نقوش دلکش اور زبان تقریباً گونگی۔ آتے ہی انھوں نے ضروری رسومات کے بعد نچنت ہو کر سوٹا پینا شروع کر دیا جسے حاضرین کے درمیان ایک سے دوسرے کو پاس آن کیا گیا۔ فادر نے اپنے بچپن کے شہر کے متعلق مسٹر بٹ سے کچھ معلومات حاصل کرنے کی کوشش کی: وہ جو نئی ڈگی تھی اس کا کیا ہوا؟ ہائی اسکول کے گراؤنڈ کے مشرقی کونے میں لال سائیں کا تکیہ اب ہے یا نہیں؟ نیا کالج کس طرف ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ بٹ صاحب نے پرسکون شائستہ انداز میں اسے بتایا، مگر ظاہراً وہ چرب زبان لوگوں میں سے نہ تھے۔ فادر کو وہ ایلس ان ونڈرلینڈ کے نیم خوابیدہ باخبر چوہے لگے۔

شام اب گہری ہو گئی اور بجلی ابھی تک نہیں آئی تھی، سو بخارچے میں موم بتیاں روشن کر دی گئیں۔ (مقتول صورت والا آدمی لوٹ آیا تھا اور اس کے کہنے کے مطابق خاص آدمی خاص وجوہات کی بنا پر روپوش تھا۔) سانچو کے کہنے پر فادر منہ ہاتھ دھونے کے لیے غسل خانے میں گیا جو کمرے کے ساتھ ملحق تھا۔ اور تب اس نے مسٹر اسٹیونسن کے تکیے پر پہلی دفعہ نگاہیں ڈالیں — کوئی بارہ ضرب بارہ کا صاف ستھرا کمرہ، دروازے کے پاس ایک تپائی پر چائے کے برتن اور پیٹن بیلو بیل کا پیکٹ، دری پر بچھے دو گدے دار بچھونے، ایک مہیب کشتی نما ایش ٹرے، اگالدان، کونے میں ہارمونیم، طبلوں کی جوڑی، ایک طاقچے پر چند پنجابی، اردو کی چھپی کتابیں۔ کمرے میں اور کوئی فرنیچر نہ تھا۔

ابھی وہ باتھ روم میں ہاتھ منہ دھو رہا تھا کہ کمرے سے ہارمونیم کی ہم آہنگی کے ساتھ ایک نہایت ہی پرسوز اور مدھر نغمے کے بول اس کے کانوں میں آنے لگے۔ مسٹر اسٹیونسن نے اپنے کمال کا مظاہرہ شروع کر دیا تھا۔ سانچو نے اس کے گانے کی بیجا تعریف نہ کی تھی۔ فادر، جو موسیقی سے زیادہ شغف نہ رکھتا تھا، وجد میں آ گیا۔ اس نے اپنا ہاتھ منہ دھونا دیر تک جاری رکھا۔

نما نما دردو وچھوڑے والے تے بچھٹ جگائی رکھدا

فادر کی نظریں مسٹر اسٹیونسن کے چہرے پر گڑی تھیں جو رنج و الم کی پوری تصویر تھا۔ گاتے ہوئے اس کی آنکھیں بچ جاتیں، پپوٹے انھیں ڈھانپ لیتے اور وہ درد بھرے چہرے پر بے دید دریچے معلوم دیتیں۔ چہرے پر ایسے اتھاہ کرب کی کیفیت طاری ہو جاتی کہ لفظ اسے بیان نہیں کر سکتے۔ فادر کو ایسا لگا کہ وہ آدمی ابھی رو پڑے گا اور آنسوؤں کے تار بند آنکھوں سے رواں ہو جائیں گے۔ فادر نے بہت سے گویوں کو سنا تھا۔ مگر اس نے کم گویوں کو مسٹر اسٹیونسن کی طرح ڈوب کر گاتے سنا تھا۔ جب گانا ختم ہوا تو فادر نے اسے واہ واہ کہہ کر داد دی۔ سانچو چسکڑا مارے سر نیچا کیے بیٹھا رہا۔ بٹ سوٹا لیتے ہوئے ملائم سرمگیں آنکھوں سے پہلے سے بھی زیادہ خاموش ہو جاتا۔

"سائیں آجاتا تو طبلے کے ساتھ اور بھی لطف رہتا۔ بیچارے کی بھی بری ہوئی،" افضل بولا۔

طبلے کے بغیر بھی محفل جاری رہی۔ مسٹر اسٹیونسن نے سولوں اور چھوٹی چھوٹی باتوں کے درمیان شاہ حسین کی کافیاں اس جذب کی کیفیت سے سنائیں۔ وہ "شاہ حسین نمانا" پہ ختم ہو جاتی تھیں — سرکشی اور عاجزی کی انتہا۔ فادر نے سوچا۔ انسان کو اپنے آپ کو اس طرح گرانا صحت مند ذہن کی علامت نہیں ہو سکتا؛ یہ مجھے لگی نہیں۔ اس نے محسوس کیا کہ حقیقت میں شاہ حسین انتہائی مغرور اور انانیت پسند شخص ہوگا جو اس عہد کے بادشاہوں اور امراء کو بے حقیر اور قابلِ نفرت مخلوق گمان کرتا تھا۔

بٹ نے اجازت چاہی۔ ان کے جانے کے بعد مسٹر اسٹیونسن کھانا لے آئے جسے انھوں نے ایک رکابی میں موم بتی کی روشنی میں کھایا۔ کھانے کے بعد بجلی آگئی اور مہتوں نے مہمانوں کی چائے بنائی۔ چائے کے دور کے بعد مسٹر اسٹیونسن نے اور کئی غزلیں اور گیت گائے اور آخر میں وہی پہلے والا گیت۔

"یہ کس کا گیت ہے؟" فادر نے پوچھا۔

"آپ یقین نہیں کریں گے، یہ یہاں کے ایک ایڈووکیٹ کشمیری کا گیت ہے۔ کوئی اجڈ شخص ہے، اس قسم کا شخص جس کا شاعری سے کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیے۔ میں حیران ہوں کہ اس نے یہ گیت کیسے لکھا۔"

"یہ بہت خوبصورت ہے۔ یا آپ نے اسے خوبصورت بنا دیا ہے۔"

مسٹر اسٹیونسن اپنے فن کے اس خراج سے خوش ہو گیا۔ بارہ بجے رات کے بار موسم ختم کر دیا گیا اور مسٹر اسٹیونسن باہر آنگن میں سونے کے لیے چلا گیا۔ فادر اور سانچو ساتھ ساتھ بچھونوں پر لیٹ گئے، مگر ان کو نیند نہ آئی۔ وہ رات کے پچھلے پہر تک باتیں کرتے رہے۔ جب پہلی اذان ہوئی اور پہلے مرغ نے تین دورے اذان دی تو انھوں نے سونے کا فیصلہ کیا۔

جب وہ اٹھے تو دھوپ باہر آنگن میں کھیل رہی تھی۔ بادل چلے گئے تھے۔ چائے کی کیتلی بجلی کے ہیٹر پر سنسنا رہی تھی۔ فادر نے سوچا، آج کے دن کیوں نہ ٹھہر جائیں، جلدی کیا ہے؟ کیا جلدی ہے؟

ناشتے کے بعد اور ان کے بتانے کے بعد کہ وہ باہر جاتے وقت تالے کی چابی کس جگہ رکھیں، ان کے میزبان نے ان سے رخصت چاہی۔ اسے شہر میں چند ایک کام کرنے تھے اور ایک بڈھی مریضہ کو گھر لے آنا تھا۔ سانچو اور فادر شہر کی سیاحت کے لیے نکلنے لگے کہ حامد آ گیا۔ وہ ایک گھٹے ہوئے سفید سر والا چھریرا بوڑھا آدمی تھا۔ عمر تقریباً تریسٹھ پینسٹھ سال۔ آنکھوں میں تمتماہٹ، ایک

عرفانیت لیے جو اکثر پیشہ ور گانے بجانے والوں میں ہوتی ہے۔ سائیں کی آنکھوں میں بھی یہ چیز تھی۔ فادر کے ذہن میں کالرج کی مشہور نظم قبلائی خان کا یہ مصرع آیا:

وہ شبنمی شہد پر پلا ہے اور اس نے جنت کا دودھ پیا ہے

سانچو نے فادر کو بتایا کہ سائیں بڑا داستان گو ہے، اور واقعی سائیں ان لوگوں میں سے لگتا تھا جنھیں جہاں دیدہ کہتے ہیں۔ فادر نے سوچا: سائیں نے اپنے وقتوں میں زندگی کے سب رنج سب نشیب و فراز دیکھے ہیں۔ انھوں نے بتایا کہ افضل ہسپتال گیا ہے اور دو تین گھنٹے کے بعد آئے گا۔ بوڑھا آدمی تھوڑی دیر تک انکار رہا، پھر چلا گیا۔ سانچو نے تالا لگایا، چابی کو کھڑکی کے ہول میں مناسب جگہ رکھا اور وہ سیر سپاٹے کے لیے نکل کھڑے ہوئے۔ شام والا جوہڑ اب راتوں رات ہی خشک ہو گیا تھا، مگر دن گرم تھا۔ دونوں نے دیکھا کہ وہ تھوڑی نیند کی وجہ سے کچھ تھکے ہوئے اور مضمحل ہیں۔ فادر نے عملاً بلدیہ روڈ پر اپنے پاؤں گھسیٹے۔ سانچو کا معدہ پھر اسے تکلیف دے رہا تھا۔ وہ کچھ دوائیاں اور ٹرینکولائزر خریدنا چاہتا تھا۔ ''میرا جی چاہتا ہے کہ دو ویلیم کھا کر سو جاؤں۔'' سانچو نے کہا۔ وہ ہر موقعے پر ٹرینکولائزر رکھتا رہتا تھا۔ فادر نے پرانے ہائی اسکول پر نگاہ ڈالی، مگر وہ اندر نہیں گئے۔ آگے جا کر انھوں نے ایک مقامی شاعر کو کھوجنے اور اس سے ملاقات کرنے کا فیصلہ کیا۔ دونوں بازار کا نام جانتے تھے۔ بلدیہ روڈ کے انت پر سانچو نے ایک دکان پر شاعر کا پتہ دریافت کیا۔ وہاں دو سائیکل سوار لڑکے گدی پر بیٹھے اور ایک پاؤں پیڈل پر رکھے کھڑے تھے۔ دونوں نے (فادر کے خیال میں) خوبصورت سانچو کو الفت بھری نظروں سے دیکھا اور اس کے حسن پر سٹپٹا سے گئے۔ ان میں سے ایک نے انھیں شاعر کے گھر کا پتہ بتایا جو بلدیہ روڈ سے پھوٹتے ہوئے ایک بازار میں تھا۔ وہ چلے تو ان میں سے ایک ان کے پیچھے سائیکل چلاتا آیا۔ اس نے سانچو کو پچھلی سیٹ پر بیٹھنے کی پیشکش کی اور کہا کہ وہ اسے شاعر کے گھر لے جائے گا۔ سانچو نے انکار کیا: ''شکریہ۔ ہم دونوں وہاں پہنچ جائیں گے۔'' شاعر کے گھر کو ڈھونڈنا کچھ مشکل تھا۔ وہ بتائے ہوئے پتے پر وہاں پہنچے۔ دونوں سائیکل سوار لڑکے وہاں پہلے سے موجود تھے۔ ''یہ گھر ہے۔'' ان میں سے ایک نے سانچو کو قدرے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا، جیسے وہ پڈنگ کی ڈش ہو۔ انھوں نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک چھوٹی لڑکی باہر نکلی جس نے بتایا کہ شاعر صاحب ابھی ابھی بلدیہ میں کسی کام سے گئے ہیں۔ لڑکوں میں سے ایک نے کہا کہ آپ بیٹھک کھلوا کر بیٹھ جائیں۔ انھوں نے پھر ان سے بات چیت کیے بغیر بلدیہ کی عمارت کا رخ کیا، جو زیادہ دور نہ تھی۔ جب وہ بلدیہ پہنچے تو دونوں لڑکے بلدیہ کے گیٹ پر منڈلا رہے تھے۔ سانچو اپنے مداحین کی اس توجہ سے گھبرا سا گیا۔ بلدیہ کی

پیلی محرابی برآمدوں کی پتلی عمارتوں میں قادر کے بچپن کا ہسپتال تھا جہاں گروے سیپلے ایک ڈاکٹر مینک کی شکل اس کی آنکھوں کے سامنے آئی۔ اس ڈاکٹر نے ایک دفعہ ٹائیفائیڈ کے مہلک مرض سے اس کی جان بچائی تھی۔ سانچو نے ایک بلاک سے شاعر کا اتا پتہ پوچھا اور کلرک نے بتایا کہ وہ چیئر مین بلدیہ کے کمرے میں ہوں گے۔ یہ ساتھ والے بلاک میں برآمدے کے دائیں جانب تھا۔ دروازہ کھلا تھا۔ تختی چیئر مین بلدیہ کی ڈگری بتاتی تھی کہ اندر بیٹھا افسر پولیٹکل سائنس کا ایم اے ہے۔ قادر ڈگری سے کافی مرعوب ہوا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آئی کہ ایک ایم اے پولیٹکل سائنس بلدیہ کا چیئر مین کیونکر ہو گیا۔

"فادر، آئیں اندر چلیں،" سانچو نے قادر کو آگے دھکیلنے کی کوشش کی۔

"نہیں نہیں، ہم اندر نہیں جارہے۔ سانچو، احمق نہ بنو۔"

سانچو کچھ حیران ہوا۔ "فادر، آپ ڈرتے کیوں جاتے ہیں؟"

"میں ڈرپوک ہوں، سانچو۔"

انھوں نے جلدی سے اندر جھانکا اور ایک موٹے اور پیٹ باہر نکلے افسر کی جھلک دیکھی۔ چار پانچ آدمی وہاں اور تھے، مگر شاعر صاحب وہاں نظر نہ آئے؛ شاید وہ کسی گوشے میں تھے یا چہرہ کسی اخبار کے پیچھے چھپا ہوا تھا۔ ایک اور آدمی نے ان کو اسی بلاک میں شاعر صاحب کے بیٹے کا کمرہ بتایا جو صحت کے شعبے میں ملازم تھا۔ وہ ایک صحت مند نوجوان تھا۔ اس نے انھیں بٹھاتے ہوئے کہا، "والد صاحب واقعی چیئرمین کے کمرے میں بیٹھے ٹیلیفون کر رہے تھے۔ عجب بات ہے کہ وہ آپ کو نظر نہیں آئے۔" اس نے چائے منگوائی اور جلد ہی شاعر صاحب ہاتھ میں ایک نقشہ قسم کی چیز لیے اندر آئے۔ انھوں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ شاعر ان کو 'ب' میں دیکھ کر حیران ہوئے۔ "اخاہ، قبلہ!"

"ہم دراصل چک عبداللہ زمینوں پر آئے تھے۔ میرے کزن کو یہاں 'ب' میں کسی وکیل سے کام تھا، اور ہم بھی ان کے ساتھ گاڑی میں چلے آئے۔ ہم نے ابھی پندرہ منٹ تک واپس جانا ہے۔ وہ ہمارا انتظار کر رہے ہوں گے۔ 'ب' میں آئے تو ہم نے کہا کہ آپ کو مل جانا چاہیے۔ آپ کے گھر گئے تو پتہ چلا، آپ بلدیہ میں ہوں گے۔" قادر نے جھوٹ بولا۔ یہ جانتے ہوئے کہ وہ دنیا میں سب سے نااہل دروغ گو ہے، قادر نے سانچو کے ساتھ طے کر رکھا تھا کہ وہ شاعر کو کیا کہیں گے۔

"میں آج شام کو اپنے داماد ٹی پانگ کے ساتھ بہاولپور جارہا ہوں۔ وہ آج کل آئے ہوئے ہیں۔ میں نے آپ کو بتایا ہے کہ میری بیٹی ٹی پانگ سے بیاہی ہوئی ہے۔ کل کمشنر صاحب کی الوداعی تقریب ہے۔ میں یہاں چیئرمین صاحب کے ٹیلیفون پر تقریب کے متعلق کنفرم کرنے آیا

تھا۔ کل ہی ہے۔"

فادر کوئی پانگ کا نام کچھ چینی خاندان کا لگا۔ شاید شاعر صاحب کی بیٹی پیپلز ریپبلک آف چائنا کے کسی پارٹی افسر سے بیاہی تھی۔

"کمشنر صاحب بڑے نیک، متقی، مجاہد آدمی تھے اور اس ناچیز پر بڑی شفقت فرماتے تھے۔ مجھے الوداعی تقریب میں ان کو ہدیہ عقیدت پیش کرنا ہے۔ یہاں ہفتہ پہلے میں نے تقریب میں یہ نظم پڑھی تھی۔ اسے سن کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ میں نے یہاں ان کی خدمت میں پیش کر دی تھی۔ ان کی خواہش ہے کہ میں بغداد کی تقریب میں یہ نظم پڑھوں..." شاعر صاحب نے نقشہ کھولا اور اسے فادر کی طرف بڑھایا۔ یہ تقریب کی نظم تھی۔

"بہت خوب!" فادر نے داد دی۔ تھوڑی دیر کے بعد فادر نے کہا، "اب اجازت دیجیے۔ آپ سے مل لیے۔ ہمارے کزن کام سے فارغ ہو چکے ہوں گے اور ہمارے منتظر ہوں گے۔"

"وہ آپ کا کہاں انتظار کر رہے ہیں؟"

"وکیل کے پاس۔"

"وہاں سے ان کو بھی ساتھ لے چلتے ہیں۔ آپ غریب خانے پر چلیے اور کھانا..."

"نہیں، تکلف کی ضرورت نہیں... ہمیں اب اجازت دیں۔ میرے کزن..."

"ان کا کیا کام ہے؟ میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتائیے۔ یہاں کے مجسٹریٹ، اسسٹنٹ کمشنر، تحصیلدار، سب میری نہایت عزت کرتے ہیں..."

شاعر صاحب کشاں کشاں ان کو اپنے گھر لے گئے۔ وہ ان کی بیٹھک میں بیٹھے۔ دو صوفہ سیٹ آمنے سامنے۔ ایک کونے میں ایک چھوٹی میز پر ٹی پانگ اور اس نوجوان کے جسے وہ بلدیہ میں ملے تھے، فریم شدہ فوٹو گراف، ایک دیوار پر کپڑے کے اوپر حرم شریف کی رنگی ہوئی تصویر۔ جاتے ہی شاعر صاحب نے ایک لڑکے کو کوکا کولا کی بوتلیں لانے کو کہا۔

"آپ یہاں کافی ہر دلعزیز ہیں۔ ہر کوئی آپ کو جانتا ہے،" فادر نے کہا۔ اس نے اسے سائیکل سوار لڑکوں کا واقعہ سنایا۔

"لوگوں کی قدر دانی ہے،" شاعر بولا۔ اس کے چہرے پر عجیب مسکراہٹ آئی اور آنکھیں قدرے چوکنی ہو گئیں۔ شاید اس نے سوچا کہ فادر اس کی ٹانگ کھینچ رہا ہے۔

کوکا کولا کے بعد اس نے لڑکے کو ایک خاص دکان سے آم لانے کو کہا اور اپنے مہمانوں سے پوچھا کہ سہارنپوری، ثمر بہشت، سندھڑی اور دوسرے آموں میں ان کو آموں کی کون سی قسم

پسند ہے۔

فادر نے کہا، ''تکلف نہ کیجیے۔ میرا کزن ہمارا انتظار کر رہا ہوگا۔''

''کون سے وکیل کے ہاں؟ میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔''

''وہ... ہم نے اسے کام کے بعد اسٹیشن پر انتظار کرنے کے لیے کہا تھا!'' سانچو بھول گیا تھا کہ شاعر کو انھوں نے بتایا تھا کہ ہم کزن کی کار میں آئے تھے اور اب کار میں واپس جائیں گے۔

''اب آپ گاڑی سے واپس جائیں گے؟ گاڑی تو اس وقت نکل گئی ہوگی۔''

فادر اور سانچو صحیح طریق پر جھوٹ نہ بول سکے تھے اور انھوں نے ان گھڑ پن سے سارا معاملہ بگاڑ دیا تھا۔ انھوں نے خود کو کافی احمق محسوس کیا۔

آم کھانے کے بعد شاعر نے ان کو بتایا کہ ایک پیشہ ور سیاستدان کے جلسے کا آغاز اس کی نظم سے ہوتا تھا اور اس نے لاکھوں کے مجمع میں اپنی نظمیں پڑھی ہیں اور داد وصول کی ہے۔ اس کی نظموں اور غزلوں کے چار دیوان طباعت کے لیے تیار رکھے ہیں۔ اس نے حرم شریف کی تصویر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ پریزیڈنٹ صاحب اس کی قدر کرتے ہیں، مگر اس نے ابھی ان سے اسے حج پر بھیجنے کی درخواست نہیں کی۔ چند دنوں تک وہ شاید اس کے سلام کو اسلام آباد جائے۔

''شہر کے ایک مشہور شکاری میرے عزیزوں میں سے ہیں۔ وہ پاکستان کے مشاہیر کی ڈائریکٹری کا نیا ایڈیشن چھاپ رہے ہیں۔ آپ لاہور جا کر ان سے کلب میں ضرور ملیں اور میرا سلام کہیں۔ وہ ڈائریکٹری میں آپ کا اندراج مفت کردیں گے۔ بیشتر حضرات سے وہ کوئی معاوضہ نہیں لیتے۔ ڈائریکٹری کے اندراج کا بڑا فائدہ ہوگا کہ آپ کے خاندانی حالات اور کوائف ریکارڈ پر آجائیں گے۔ اس ریکارڈ کو آپ ضرورت پڑنے پر کورٹ میں پیش کرسکتے ہیں...''

فادر نے دیکھا کہ سانچو اس بے سر پیر کی گفتگو سے بے حد بیزار، منہ بسورے بیٹھا ہے۔ آخر انھوں نے شاعر سے رات کو بغداد میں ملنے کے وعدے پر اجازت چاہی۔ وہ ان کو بیٹھک سے باہر گلی میں چھوڑنے آیا۔ اس نے فادر کو پھر مشورہ دیا کہ وہ فوراً لاہور جا کر اس کے بزرگ شکاری دوست سے ضرور ملے، کیونکہ ڈائریکٹری کی طباعت اب آخری مرحلوں میں ہے۔ انھوں نے شاعر سے ہاتھ ملائے اور پیچھے دیکھے بغیر وہاں سے تیز ہوگئے۔ بلدیہ روڈ کے نکڑ پر انھوں نے پیچھے مڑ کر دیکھا، شاعر گلی سے اپنے گھر میں جا چکا تھا۔ اور انھوں نے اطمینان کا سانس لیا۔ وہ پھر مسٹر اسٹیونسن کے تکیے کی عافیت کی طرف چل پڑے۔

❁

مسٹر اسٹیونسن ابھی نہیں لوٹا تھا مگر چابی کھڑکی میں اپنی اصل جگہ پر تھی (گو سانچو نے پہلے رائے ظاہر کی کہ چابی وہاں نہیں ہے)۔ انھوں نے صبح کے دونوں واقعوں — سائیکل سوار لڑکوں اور شاعر سے ملاقات — کی بابت کچھ بحث کی۔ انھوں نے اقرار کیا کہ انھیں جھوٹ بولنا نہیں آتا۔ پھر تھوڑی دیر کے لیے سونے کی کوشش کی۔ فوراً ہی مسٹر اسٹیونسن بھی آ گیا۔ اس نے کہا کہ وہ مریضہ کو لے آیا ہے اور اس کی بہن ابھی تک ہسپتال میں پڑی ہے، اس کی حالت خطرے سے باہر ہے۔ اتنے میں سائیں بھی نمودار ہو گیا۔ متول چائے بنانے اور چائے کی چیزوں کو ٹھیک سے جمانے میں لگ گیا۔ اس نے بتایا کہ خاص آدمی ابھی روپوش ہے اور اس کی بیوی کو ڈر ہے کہ کہیں وہ سرحد عبور کر کے بھارت نہ چلا گیا ہو۔

گانے کا سیشن پھر شروع ہوا۔ بظاہر ایک ہی چیز تھی جس کے لیے اسٹیونسن جیتا تھا — یا وہ دور سے آئے ہوئے مہمانوں کو اپنے فن سے پوری طرح محظوظ کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ اس کے پاس سے تشنہ نہ جائیں۔ سائیں نے اپنے طبلوں کی جوڑی کو بڑی خوش اعتقادی اور لطافت سے سجایا اور ایک بھی چوک اس سے نہ ہوئی۔ وہ پوری موج میں تھا۔ اس کی آنکھوں میں دیوانگی کی ایک سندرتا ناچتی ہوئی۔ وہ تقریباً خوبصورت ہو گیا تھا — پہلے سا دکھی بوڑھا آدمی نہیں جسے جیون کے دن کسی نہ کسی طرح کاٹنے تھے۔

قادر نے سوچا، برسوں کی لگن! لڑکپن سے ریاض اس کمال کے پیچھے ہوگا۔ ایک آدمی میں کیا چیز ہوتی ہے جو اسے ایک وکیل یا سیاستدان، ایک فرنیچر ساز یا ہر پیشہ سے فن کی طرف لے جاتی ہے، اس طرح کہ ماسوا اپنے فن کے، سب معاش کے طریقے اس کی نظروں میں ہیچ ہو جاتے ہیں اور وہ اس میں کمال حاصل کرنے کی خاطر خون اور آنسوؤں کے دریاؤں میں سے گذرنے کو تیار ہو جاتا ہے؟ عسرت اور تنگدستی کا بھوت اسے اپنا شوق پورا کرنے سے باز نہیں رکھ سکتے۔ شاید یہ خوبصورتی کو پانے کی خواہش ہے۔ مگر پھر یہ چند سرپھروں کو چھوڑ کر دوسروں میں اتنی توانا کیوں نہیں ہوتی؟ پچھلی رات کی ہارمونیم پر موسیقی خوبصورت تھی مگر اب سائیں کی طبلہ نوازی نے اسے ایک نئی جہت عطا کر دی تھی۔

اس دوران میں بٹ صاحب بھی دو تین بار گانا سننے اور سوٹا لگانے آئے۔ قادر نے تعجب کیا کہ ان کی غیر موجودگی میں اسپیئر پارٹس کی رکھوالی کون کرتا ہوگا۔ وہ سوٹا پیتے اور پلاتے اور کوئی بات نہ کرتے؛ کسی قدر قادر کی طرح، وہ گفتگو کو غیر ضروری خیال کرتے تھے۔

سانچو کا ایک دوست آیا۔ لمبے بال، پیلا پتلا، بھاری جنگلی مونچھوں کا چہرہ، بالکل نزار جسم۔

اس کی آنکھیں بڑی بڑی سیاہ اور پُردرد تھیں۔ وہ تھوڑی دیر بیٹھا اور سانچو نے اس سے وعدہ کیا کہ ہم شام کو اس کے ہاں آئیں گے۔ (بعد میں سانچو کے ایک اور دوست نے انھیں بتایا کہ اس کو ایک ایسی بیماری ہے جس کا کوئی علاج نہیں؛ اگر اس کے جسم کے کسی حصے سے خون بہنے لگے تو وہ بہے چلا جاتا ہے۔)

اس سیشن میں کم از کم تین دور چائے کے چلے۔ اسٹیونسن اور اس کے قبیلے کے لوگ بلا کے چائے نوش تھے۔ سانچو باقاعدگی سے آدھ پونے گھنٹے کے بعد کیتلی ونجلی کی انگیٹھی پر رکھ دیتے۔ گانے بجانے کے علاوہ ٹھیے والوں کا بڑا مشغلہ چائے بنانا اور چائے پینا معلوم ہوتا تھا۔

کھانے کے بعد مسٹر اسٹیونسن کا ایک اور نوجوان دوست خان آگیا — تیس پینتیس برس کا دلکش اور باوقار سا جوان، چھیلا، بے پروا۔ فادر کو خان بڑا اچھا لگا۔ اس کی سیاہ چمکیلی آنکھوں میں ایک منچلا پن تھا۔ مسٹر خان، جو کوہاٹ سے تھا، مقامی سول ہسپتال کے پیتھالوجی شعبے میں لیبارٹری اسسٹنٹ تھا۔ یہ لوگ ایک مدت سے اب یہیں آباد ہو چکے تھے۔

سیشن پھر شروع ہوا اور خدا جانے کس وقت بٹ صاحب بھی اپنی انجینئرنگ پارٹس کی دکان کو اللہ کے بھروسے پر چھوڑ کر مستقل آن بیٹھے۔ مسٹر اسٹیونسن نے مختلف گانے سنائے اور خان نے اسٹیونسن کے پاس سے ہارمونیم اپنی طرف کر لیا اور دو تین پنجابی اور پشتو گانے بڑے جوش اور انہماک سے گائے۔ اس کی آواز خوش کن تھی اور وہ ایک شوقیہ گانے والا تھا اور منجھے ہوئے اسٹیونسن کے سامنے طفلِ مکتب۔ مگر فادر حیران ہوا کہ وہ آرٹسٹک مزاج کے لوگوں کو پسند کرتا تھا۔ کامیابی یا ناکامیابی سے قطع نظر، ان میں خوبصورتی کی طلب ہوتی تھی۔ اور وہ جانتا تھا کہ کامیابی یا ناکامی سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ اکثر سانچو کو کہا کرتا کہ کامیابی دراصل دیر سے آنے والی ناکامی ہوتی ہے۔

سیشن کے بعد وہ تکیوں پر سر ٹیکے ادھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے جن کا کوئی سر پیر نہ تھا۔ جب سانچو نے خان سے کہا کہ فادر وہ تحصیلدار والا مکان دیکھنا چاہتا ہے جہاں اس کا بچپن گزرا تھا تو خان بھی ان کے ساتھ چلنے کو تیار ہو گیا۔ ”میں اس جگہ کو جانتا ہوں،“ اس نے کہا۔ وہ تینوں بلدیہ روڈ پر چلتے بازار میں آگئے اور خان ایک گلی میں ہولیا۔ وہ مکان اس میں ہوگا۔ گلی کے دو رویہ اب ٹیڑھے میڑھے مکان بنے ہوئے تھے۔ فادر کے بچپن میں ان کے گھر کے مردانہ نیم پختہ حصے کے مشرقی سمت گارے کی کچی چار ساڑھے چار فٹ اونچی دیوار تھی۔ اس کے دوسری طرف ایک ریتیلے میدان میں مڈل اسکول کی دو عمارتیں تھیں۔ وہاں لڑکے اکثر فٹ بال کھیلتے تھے۔ آگے تکیے کے سامنے ایک اجڑے پجڑے باغیچے میں نظامت کی پراسرار عمارت تھی، اور شہر وہیں ختم

ہو جاتا تھا۔ گلی میں گزرتے ہوئے خان نے کہا، ”یہی آپ کا مکان ہوگا۔“ قادر نے ادھ کھلے پھاٹک میں سے پیلے رنگت کی محرابی دروازوں والی عمارت کو پہچانا جس کے وسطی کمرے میں اس کا باپ اسے روپوں سے آنے اور پیسے بنانا سکھایا کرتا تھا۔ (وہ ہمیشہ روپوں کو سولہ اور پھر چار سے ضرب دینے کے بجائے تقسیم کر دیتا۔) اس کمرے میں ایک دفعہ ایک پراسرار ترکی بوڑھا آدمی آ کر ٹھہرا جو مکان سے باہر قدم نہ دھرتا تھا۔ سارا دن بغیر دودھ کی چائے پیتا رہتا تھا۔ اسے اپنی ماں کا بڑبڑانا یاد آیا۔ وہ تین ماہ وہاں رہا۔ وہ کون تھا؟ — روسی ترکستان کا سیاسی مفرور۔ اور وہ وہاں اس شہر میں کیوں تھا؟ اسے یہ بات اپنے باپ سے اس کی زندگی میں پوچھنی چاہیے تھی۔ اسی کمرے میں ثناءاللہ نے دم توڑا تھا۔ اس سمت کے چھوٹے کمرے میں اس کے استاد ماسٹر ولایت شاہ اپنا حقہ گڑگڑاتے رہتے، اور ایک بار انگریزی میں غلط ترجمہ کرنے پر انھوں نے حقے کی نال نکال کر اسے پیٹا تھا۔ پرانی جگہ دیکھ کر قادر کے دل کی دھڑکن تیز نہ ہوئی۔ وہ اسے خستہ حالت میں پا کر بہت مایوس ہوا۔ ایک عجیب کیفیت اس پر طاری ہوئی۔ اسے یوں لگا جیسے وہ ایک قبر پر فاتحہ پڑھ رہا ہو۔ جب اس گھر کے سامنے کمرے ایک لمبے چھریرے سے آدمی نے انھیں کسی قدر استعجاب سے دیکھا تو وہ جلدی سے آگے چل دیے۔ ریلوے لائن سے متوازی ایک نئے بازار سے ہوتے ہوئے وہ اس بازار میں مڑے جہاں کے راستے پچھلی شام پانی کے پوکھروں سے بھرے ہوئے تھے۔ پوکھر اب وہاں نہ تھے۔ وہ چوک میں سے ہوتے سیدھے اس بازار میں چلے گئے جسے اس نے کبھی بیسیوں بار طے کیا تھا۔ یہاں کوئی دکانیں نہ ہوتی تھیں۔ قادر نے دیکھا کہ شہر کافی بدل اور بڑھ گیا تھا، مگر یہ ایک گندے اور بدصورت انداز میں بڑھا تھا — کسی سلیقے اور ترتیب کے بغیر۔

”اٹ از اے ہارڈ (horrid) سٹی،“ قادر قدرے بلند آواز میں چلایا۔

سانچو نے قادر سے ہارڈ کے ہجے پوچھے اور فیصلہ کیا کہ وہ اسے اپنے اگلے مضمون میں استعمال کرے گا۔

انھوں نے ایک پھیری والے سے کچھ لیموں خریدے اور پھر قادر نے کہا کہ وہ کچھ دوائیں خریدنا چاہتا ہے۔ جب قادر کے دل میں موج آتی، وہ دواسازی کی صنعت کو فروغ دینے کے لیے اوٹ پٹانگ دوائیں خریدتا رہتا، یہ جاننے کے لیے کہ انھوں نے اس پر اثر کرنا چھوڑ دیا ہے۔ بہت سی کئی چیزوں نے اس پر اثر کرنا چھوڑ دیا تھا؛ وہ دنیا میں سب سے زیادہ اثر قبول نہ کرنے والا شخص تھا۔ اسے کیمسٹ کی کوئی دکان نظر نہ آئی۔

”میں آپ کو آگے ایک کیمسٹ کی دکان پر لے چلتا ہوں۔ وہاں سے سب چیزیں مل جائیں

گی،" خان نے کہا۔

جب وہ بازو کے بازار میں بڑے کیمسٹ کی دکان پر پہنچے تو قادر نے میز کے پیچھے شلوار کرتے میں ایک پست قامت توندیل آدمی کو ہاتھ میں مرغی لیے کھڑے دیکھا۔ اس نے اس جیسے کو ایک قصاب اپنے شہر میں دیکھا تھا۔ قادر کو ایسا لگا جیسے وہ چوراس و کمرے کی دنیا میں آ گیا ہے اور مرغی والا آدمی مسٹر بمبل تھا۔ بمبل خاندان کے کئی چھوٹے موٹے افراد مردوں اور عورتوں کو ٹیکے لگانے اور نسخے سمجھانے میں لگے تھے۔ بنچ پر بیٹھی برقعے میں ایک عورت درد سے چیخ رہی تھی۔ بمبل کے ایک بھائی نے، جو اس زبان اور میک اپ کا تھا، اسے ابھی ابھی ٹیکہ لگایا تھا۔ "او میرا بچہ نہ روئے، مار دیا اس!" عورت نے کہا۔ ہر طرف ہڑبونگ مچی تھی، جیسے وہ ریلوے پلیٹ فارم پر آ گئے ہوں۔ خان اور سانچو جدوجہد سے بائیں طرف کاؤنٹر کے پیچھے دوائیں لینے میں کامیاب ہو گئے۔

وہ وہاں سے نکلے تو قادر نے کہا "اس کیمسٹ شاپ میں نے کبھی نہیں دیکھی۔ رش کتنا ہے۔"

خان نے کہا "اس شخص کو روزانہ ہزاروں کی آمدن ہے۔ پانچ چھے مہینے لاہور سے جا کر فارمیسی وغیرہ کا کوئی ڈپلوما وپلوما لے آیا ہے۔ پہلے سول ہسپتال میں کمپاؤنڈر وغیرہ تھا۔"

"یہ کوالیفائیڈ نہیں ہے؟"

"کون پوچھتا ہے! دکان پر کام کرنے والے سب اس کے بیٹے بھتیجے ہیں — سب چور!"

"پھر بھی لوگ اس کے پاس آتے ہیں۔ اتنا رش!؟"

"یہ فیس مشورہ دو روپے لیتا ہے۔ اور اس نے شہر میں بہت سے بندے چھوڑ رکھے ہیں جو لوگوں کو کہتے ہیں کہ اس کے ہاتھ میں شفا ہے۔"

وہ ایک چوڑی سڑک پر آئے، اور خان نے انھیں بتایا کہ یہ چشتیاں جانے کی مین روڈ ہے۔ وہ دائیں طرف مڑے۔ ابھی دن کی روشنی باقی تھی جب وہ مسز اسٹیونسن کے گھر میں پہنچے۔

اندھیرا کافی گہرا ہو گیا تھا۔ وہ آنگن میں بیٹھے لاہور کی رات میں ہلکی پھلکی باتیں کر رہے تھے کہ سانچو نے آ کر قادر کو مضطرب آواز میں خوشخبری دی، "طاہر شاہ صاحب!" سانچو نے شاہ کا بیگ اور پورٹ مینٹو اٹھا رکھا تھا۔ قادر نہیں کہہ سکتا تھا کہ کب سانچو اپنی آرام کرسی سے غائب ہوا۔ اس کی پُراشتیاق آنکھوں نے طاہر شاہ کو زینے سے اوپر نمودار ہوتے دیکھ لیا ہوگا، وہ جھپاک سے اس کا سامان اٹھانے کے لیے بھاگا ہوگا۔ قادر اس شخص سے جس کی بابت اس نے اتنا کچھ سن رکھا تھا، ہاتھ ملانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ شخص جس سے اس کا تعارف کرایا گیا، کوئی چالیس ایک برس کا ہوگا۔ کشیدہ قامت، بھرا بھرا جسم، گول گندمی رنگ چہرہ، مونچھیں ہونٹوں سے نیچے تک آئی

ہوئیں۔ اس کی آنکھیں بڑی پرشفقت تھیں اور جب اس نے بات کی تو اس کی آواز ملائم اور خوشگوار تھی، تقریباً ریشمی۔

شاہ صاحب کے آنے پر کھلبلی سی مچ گئی، جیسے برات کا دولہا آ گیا ہو۔ سب نے کھڑے ہوکر ان سے مصافحہ کیا اور بٹ صاحب نے فوراً صوفا پیش کیا — معمول کے مطابق ایک لفظ کے بغیر۔ فادر مکرم مہمان کے لیے آرام کرسی خالی کرکے کھاٹ پر جا بیٹھا۔

''بزرگوں کی تعریف کیا ہے؟'' شاہ جی نے پوچھا۔ بزرگ کے لفظ نے فادر کو، جو اپنے آپ کو چالیس بیالیس برس کا سمجھتا تھا، تلملا دیا۔

وہ اس لفظ سے کتنی نفرت کرتا تھا!

سانچو نے اپنے خاص عقیدت مندانہ انداز میں فادر کی تعریف کی۔

''شاہ جی،'' فادر نے کچھ جھجکتے ہوئے کہا، ''آپ کے دوست ٹوم اکثر آپ کی باتیں کرتے رہتے ہیں۔ وہ آپ کے بڑے معترف ہیں۔ آپ سے ملنے کا بے حد اشتیاق تھا۔ میں خوش قسمت...''

''مجھے معلوم نہیں کہ میں ٹوم کی تعریف کو اپنی وجہ شہرت خیال کروں یا وجہ رسوائی،'' شاہ نے یہ فقرہ اس بے تکلفی اور اس انداز سے کہا کہ سب ہنس پڑے۔

چند ادھر اُدھر کی باتیں ہوئیں اور پھر اسٹیونسن نے آکر کہا کہ وہ چل کر کھانا کھالیں۔ شاہ جی 'ب' میں آکر ہوٹل سے کھانا کھا کر آئے تھے۔ سانچو اور فادر کھانا کھانے اندر گئے۔ کھانے کے بعد فادر باہر نہیں گیا۔ وہ ابھی شاہ جی سے بے تکلف نہیں ہوا تھا اور اجنبیت کا حجاب محسوس کرتا تھا۔

''شاہ جی آپ کو کیسے لگے فادر؟'' سانچو نے پوچھا۔

''بڑے میٹھے اور سلجھے ہوئے آدمی ہیں۔ ٹوم کی باتوں سے میرا ان کے متعلق امپریشن تھا کہ وہ وائلڈ اور اکسنٹرک (eccentric) قسم کی چیز ہیں جو موسیقی پر ادھار کھائے ہوئے ہیں، فکر معاش سے آزاد۔''

''شاہ جی میڈیکل ریپ ہیں۔ اپنے پیشے میں مقبول۔ اپنی باتوں سے ڈاکٹروں کو اپنے دام میں لے آتے ہیں۔ ان کی فرم ان کو کسی قیمت پر بھی ہاتھ سے جانے دینے پر تیار نہیں۔''

''شاہ جی نے شادی نہیں کی؟''

''نہیں۔''

''اور ان کی زندگی میں کوئی رومانس نہیں؟''

''ایک رومانس تو میں جانتا ہوں...'' سانچو نے کہا۔ ''وہ دریا کے کنارے رہنے والی کوئی جٹی ہے۔''

"شاہ جی کے والدین؟"

"وہ لاہور میں آباد ہیں۔"

"کل شاہ جی شاید ہمیں اپنا گانا سنائیں۔ اس وقت وہ تھکے ہوئے ہیں۔"

"خود ہی موج میں آئے تو سنا دیں گے۔ ہم انہیں خود اس کے لیے نہیں کہیں گے۔"

اتنے میں مسز اسٹیونسن سانچو کو بتانے آ گیا کہ اس کا دوست افضل راجپوت آیا ہے۔ سانچو نے نعرہ بھرا۔ فادر کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔ وہ مسلسل ایک رات اور ایک دن نہیں سویا تھا۔ اس نے لیٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسے گہری نیند آ گئی اور اسے پتہ نہ چلا کہ سانچو کس وقت آیا۔

جب اس کی آنکھ کھلی تو دن چڑھا ہوا تھا اور شاہ جی نماز سے فارغ ہو کر باہر بیٹھے جا رہے تھے۔ ان کا چہرہ مسکراتا ہوا اور مطمئن نہ تھا۔ فادر نے بھی مسکراتے ہوئے اسے السلام علیکم کہا۔ کسی طرح فادر نے محسوس کیا کہ وہ ابھی سے دوست ہو گئے ہیں اور رات کی نیند کے بعد ایک دوسرے کے قریب آ گئے ہیں۔ سانچو ابھی تک گھوڑے بیچ کر سویا ہوا تھا۔

اب وہ سب اکٹھے توسٹ اور ابلے ہوئے انڈوں کا ناشتہ کر رہے تھے — مسز اسٹیونسن، فادر، سانچو اور شاہ جی — کہ یکا یک سائیں جی نے اپنی مرنی اندر داخل کی۔ ایک عاشق کی طرح جس کا محبوب کے در کے سوا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اسے گھر کے ایک فرد کے حقوق حاصل تھے۔

"کیا حال چال ہیں سائیں؟" شاہ جی نے پوچھا۔ "ٹھیک ٹھاک ہو؟"

"او نہیں جی، شاہ جی! ہم نے ٹھیک ٹھاک کیا ہونا ہے۔ بڑھی بستر سے لگی ہے۔ بیٹا کراچی گیا تھا۔ میں نے سمجھا تھا وہ وہاں مزدوری وغیرہ کر رہا ہوگا، مگر اس کے دوست کا خط آیا ہے، وہاں تو اللہ جانے کیا کنجر خانہ بنا ہوا ہے۔ چانڈو کی لت پڑ گئی۔ اب اس کی بڑھی کہتی ہے کہ اس کو جا کر لے آؤ۔ میں وہاں کیونکر جاؤں؟ رقم میرے پاس کہاں..." اس نے جیب سے ایک کھلا خط نکال کر شاہ جی کی طرف بڑھایا۔ شاہ جی اور اسٹیونسن نے خط دیکھا اور سائیں کو لوٹا دیا۔

فادر نے کہا، "شاہ جی، سنا ہے آپ ایم اے نفسیات اور ایم اے فلسفہ میں گولڈ میڈل لے چکے ہیں؟"

شاہ جی ہنسے۔ "یہ آپ سے کس نے کہا؟ دونوں میں ایم اے تو میں نے کیا مگر پھر میں نے تھیسس وغیرہ سب مٹ کرنے کی فکر نہ کی اور نہ اپنی ڈگریاں لیں۔ میں جاہل شخص ہوں۔"

ناشتے کے بعد ہی اپنے آپ ایک محفل جم گئی۔ بٹ صاحب بھی آ کر چپکے سے دیوار کے ساتھ براجمان ہو گئے اور سوٹے گردش میں آئے۔ سانچو کا دوست پنجابی رائٹر افضل راجپوت بھی

آ گیا اور فادر کے ساتھ سرہانے سے ٹیک لگا کر نیم دراز ہو گیا۔ وہ اور اسٹیونسن یونان میں دو تین برس اکٹھے جہاز پر رہے تھے — اوناسس کے جہازوں میں سے ایک پر — اور انگلستان کی ایک بندرگاہ میں ایک ہفتہ دونوں نے اکٹھے جیل کی ہوا کھائی تھی۔ فادر نے ایک رائٹر کی نظروں سے اس کا مطالعہ کیا۔ وہ اکہرے بدن کا نوجوان — تیس بتیس سال کا سن، زرد پچکا ہوا چہرہ، لمبے بال اس کے گلے میں مالا تھی اور اپنی بائیں کلائی میں وہ ایک اسٹیل کا کڑا پہنے تھا — ایچ ایچ پنجابی رائٹر۔ مگر آدمی دوسروں کے متعلق کیا جان سکتا ہے؟ دل دریا سمندروں ڈونگھے، فادر نے سوچا۔

سائیں جو بٹ صاحب کے پاس زانوؤں پر سر رکھے ایک مؤدبانہ انداز سے بیٹھا تھا۔ ان محفلوں میں وہ بٹ صاحب کی مانند منھ میں گھنگھنیاں ڈال کر شامل ہو جاتا۔

پہلے مسٹر اسٹیونسن نے کچھ کافیاں اور گیت گائے۔ پھر، ہمارے کہے بغیر، ہمارے دل کی مراد بر آئی۔ شاہ جی نے ہارمونیم اپنی طرف کھینچ لیا اور شاہ حسین کی ایک کافی کا آغاز کیا۔

''ایک مدت سے اس کاروبار کو ٹھپ کر رکھا ہے،'' شاہ جی نے معذرت کرتے ہوئے کہا، ''کم و بیش چار ماہ کے بعد ہارمونیم کو ہاتھ لگا رہا ہوں۔''

شاہ جی نے شاہ حسین کی دو کافیاں سنائیں۔ ان کی آواز میں ایک استادانہ شادابی اور ملائمت سی تھی اور وہ آواز اٹھائے بغیر نیچے سُر میں گاتے۔ مستقل برانکائٹس کی وجہ سے وہ گلے کے لوچ، اس کی طاقت پر بھروسا نہ کر سکتے تھے۔ سب نے انھیں دھیان اور ادب سے سنا۔ گاتے ہوئے نہ ان کا منھ بگڑا اور نہ ہی وہ احمقانہ کیفیت ان کے چہرے پر چھائی جو اکثر گانے والوں کے چہرے پر آ جاتی ہے۔ وہ ماسٹر تھے! مگر فادر نے سوچا، فن کوئی ہو، موسیقی، ادب یا مصوری، مستقل دلسوزی اور جگر کاوی کا متقاضی ہے۔ یہ فنکار کا پیشہ ہونا چاہیے۔ ہم میں سے اکثر یہ نہیں کر سکتے، اس لیے ہم امیچر رہتے ہیں... اور پھر عمر کے بڑھنے کے ساتھ ساتھ گو فن میں پختگی اور رچاؤ آ جاتا ہے مگر وہ پہلے سی دیوانگی اور تازگی کھوئی جاتی ہے۔ فنکار کے لیے جسمانی اور ذہنی توانائی کو قائم رکھنا ضروری ہے۔

طاقچے پر پڑی چند پھٹی پرانی کتابوں میں سے ہاشم شاہ کے دوہڑوں کی کتاب نکالی گئی اور شاہ جی نے اس میں سے ایک دوہڑا سنانے کا آغاز کیا۔ سائیں طبلے پر رواں ہوا، مگر شاہ جی طبلہ نوازی کی تھاپ سے مطمئن نہ ہوئے۔ انھوں نے ہارمونیم کے ایک طرف پردہ بجا کر سائیں کی طرف دیکھا۔ ''سائیں، یہ تال ہوگی۔'' سائیں نے کوشش کی، مگر پھر بھی وہ تال اس انداز میں پیدا نہ کر سکا جو شاہ جی چاہتے تھے۔

نوم نے فادر کو بتایا تھا کہ شاہ جی نے شاہ حسین کی ایک کافی نہایت خوبصورت انداز میں گائی

ہے اور اسے ٹیپ بھی کیا ہوا تھا۔ فادر نے کہا ''شاہ جی، وہ وقت گیا۔ شاہ حسین چلا گیا جو آیا سو آیا۔''

فادر کو گیت کا بول یا شعر کا مصرع یاد نہیں رہتا تھا؛ سانچو نے فادر کی مدد کی۔ شاہ جی نے چند دوسرے گانوں کے بعد اس پیچھے مرتی وہ کافی سنائی۔ فادر کو بہت زیادہ لطف نہ آیا۔ اتنے میں ایک نوآموز آرٹسٹ آیا — ایک مہاجر سا شخص جو پہلے روز بھی آیا تھا مگر اسٹیونسن کے سامنے چوکڑی بھول گیا تھا۔ اب بار موقع اسے دیا گیا اور استادوں کے درمیان اس نے ایک غزل اچھی گائی۔ کھانے کے وقت پر محفل برخاست ہوئی۔ خان اور افضل اچھوت سے رہے، وہ شام کو آئیں گے۔ فادر نے کچھ روپے سازندوں کو دینے کے لیے دیے۔

شاہ جی، اسٹیونسن، سانچو اور فادر نے اکٹھے کھانا کھایا اور پھر شاہ جی فادر اور سانچو کو ساہیوال آنے اور ان کے ہاں ٹھہرنے کی دعوت دے کر اپنے کاروباری کاموں پر نکل کھڑے ہوئے۔ اسٹیونسن نے انھیں بتایا کہ ان کی کار رات کے ساڑھے سات بجے سے پہلے نہیں پہنچے گی، اور اکثر اپنی مرضی سے چلتی ہے۔ وہ تھوڑی دیر سوئے۔ اٹھے تو کیتی جیز پر حسب معمول موتی کی گرانی میں سنا رہی تھی۔ اس نے کہا ''میاں جی، وہ آگئی ہے۔''

''اب اس کے ملنے کا فائدہ؟'' سانچو اور فادر کو اب اس خبر سے کوئی مسرت نہ ہوئی۔ جلد ہی مسٹر اسٹیونسن اور سائیں آ گئے۔

اسٹیونسن نے اپنے یونان اور شپنگ کی زندگی کے قصے سنائے۔ اس کے پاس وہاں کے چند رنگین فوٹوگراف تھے جن میں وہ ایک فیکٹری بلڈنگ کے سامنے اپنی گرل فرینڈ دارودارا اور ایک اور لڑکی کے ساتھ کھڑا تھا — اپنی بانہیں دارودارا کے گرد حمائل کیے۔ دارودارا اپنی جینز میں ایک بھرے جسم کی دلیر اور شوخ و شنگ لڑکی تھی۔ ''ہمارے جسمانی تعلقات بھی نہیں ہوئے۔ اس کو مجھ سے بڑا پیار تھا۔ ہم شادی نہیں کر سکتے تھے کیونکہ وہ ایک کٹر کیتھولک والدین کی بیٹی تھی۔ اور بہت کچھ۔''
اسٹیونسن نے پھر گانا شروع کیا:

کوئی تو ہو گا میرا ساتھی
کوئی تو پیاس بجھائے گا
اب تک تو سب نے ٹھکرایا
کوئی تو پیاس بجھائے گا
کبھی نہ کبھی کہیں نہ کہیں
کوئی نہ کوئی تو آئے گا

اپنا مجھے بنائے گا
دل میں مجھے بسائے گا

صبح کی ٹولی کے لوگوں میں سے کوئی نہ آیا۔ پونے سات بجے سانچو نے بیگ کندھے پر ڈالا۔ وہ چلنے کے لیے تیار ہو گئے۔ وہ بخار بچہ میں اسٹیونسن سے بھینچ بھینچ کر گلے ملے۔ اس نے کہا، ''میں نے ہسپتال جانا ہے۔ میں اسٹیشن پر آنے کی کوشش کروں گا۔'' اور وہ زینے سے نیچے گلی میں اترے۔ بلدیہ روڈ کے خاتمے پر انھوں نے ایک بیکری سے کچھ بسکٹ اور ایک کیک خریدا اور ہاتھ میں ہاتھ ڈالے بازاروں میں سے اسٹیشن کی طرف چل پڑے۔ اوور ہیڈ برج پر انجن کی کوک سن کر سانچو نے کہا، ''ہماری گاڑی جا رہی ہے...'' اور گھبراہٹ میں کتابوں کا پیکٹ گرا دیا۔ وہ اتی پلیٹ فارم پر کھڑی تھی جس پر وہ اترے تھے — انجن کے بغیر۔ سانچو اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں گاڑی کی روانگی کا وقت پوچھنے گیا اور فادر نے اسے وہاں میز کے ساتھ کھڑے دیکھا۔ جب وہ کافی دیر باہر نہ آیا تو فادر نے اندر جھانکا۔ اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے میں تین چار آدمی تھے، مگر سانچو کا نام و نشان نہ تھا۔ ایک واہمہ سا خیال اس کے ذہن میں آیا کہ سانچو کو اس کے 'مداحین' نے اغوا کر لیا ہے۔ اس نے سانچو کو اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے نکلتے نہیں دیکھا تھا۔ پورچ میں سے اسے باہر ایک عمارت دکھائی دی جس پر ٹکٹ گھر لکھا تھا۔ کھڑکی کے سامنے کوئی کیو نہ تھا۔ فادر ایک پینک (panic) کے عالم میں تھا — پھر وہ ٹکٹ گھر کی طرف گیا (زیادہ امید کے بغیر)، اور اس کے پرلی طرف مسافر خانے کے اندر ٹکٹ گھر کی کھڑکی پر چار آدمی کھڑے تھے۔ اس کی جان میں جان آئی۔

''تم اسسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر کے کمرے سے نکلتے نہیں دیکھے گئے۔''

''میں پچھلے دروازے سے باہر چلا گیا تھا۔ گاڑی ساڑھے سات بجے جائے گی۔''

''میں نے سوچا تھا، تم اغوا ہو گئے ہو۔''

وہ گاڑی میں سوار ہو کر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ فادر نے کہا، ''تمھارا دوست افضل ایک ونڈرفل آدمی ہے اور طاہر شاہ، خان، افضل راجپوت، سائیں، بٹ صاحب... کیسے کیسے لوگ،'' اور اس نے سوچا، میں ان کے بارے میں کتنا کم جان سکا ہوں۔ ان میں ہر کوئی اکیلا ہے اور ان کے درمیان صرف محبت اور انسیت کا واحد رشتہ ہے۔

جب گاڑی حرکت میں آئی تو اسٹیونسن کا چہرہ فادر کی آنکھوں کے سامنے ابھرا۔ وہ حقیقی رابرٹ لوئی اسٹیونسن کا چہرہ تھا، یا سانچو کے دوست افضل کا، وہ متعین نہ کر سکا۔

احمق کی غیر اہم سوانح عمری

(اس فینٹسی کے تمام واقعات، کردار اور نام فرضی ہیں اور حقیقی افراد، مقامات یا واقعات سے ان کی کوئی مطابقت محض اتفاقیہ ہے۔ جس کے لیے مدیر، ناشر یا مصنف پر کوئی ذمے داری عائد نہیں ہوتی۔)

تین چار دن ہوئے، بافوت کے شہر میں ایک حادثہ ہو گیا۔ آزادی کے مجسمے کے سامنے ایک سائیکل رکشے کی ایک موٹر سے ٹکر ہو گئی۔ جیسا کہ ایسے حادثوں میں ہمیشہ ہوتا ہے، قصور رکشا والے کا ہی تھا۔ حسب معمول، موٹر اپنی سمت جا رہی تھی، رکشا بھی اپنی سمت پر جا رہا تھا، مگر وہ موٹر کے راستے میں آ گیا۔ یہ سراسر رکشا چلانے والے کا قصور تھا کہ اس کی دو آنکھیں سر کے پیچھے نہ تھیں اور وہ وقت پر رکشے کو موٹر کے مددگار کی زد سے بچا نہ سکا۔ رکشا تو اس ٹکر کی وجہ سے ٹوٹ پھوٹ گیا۔ اس کے مالک کو اس نقصان کا ابھی تک افسوس ہے۔ آج کل رکشا ہزار آٹھ سو سے کم میں نہیں بنتا۔ رکشا چلانے والا — احمق اس کا نام تھا — موٹر کے پہیے کے نیچے آ کر ہلاک ہو گیا۔ یہ بھی اس کی غلطی تھی۔ لیکن یہ کوئی خاص افسوس کرنے کی بات نہیں۔ آخر وہ رکشا والا ہی تو تھا۔ اور ایسے حادثے بافوت کے شہر میں ہر روز ہوتے ہیں۔ اخباروں نے بھی ان کی خبریں دینا چھوڑ دیا ہے۔ رکشا والوں سے کسی کو کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟

بچارے احمق کا خون میں لتھڑا ہوا جسم سڑک کے ایک طرف پڑا تھا۔ چند آدمی اور ایک آدھ پولیس مین اس کی لاش کے گرد جمع ہو گئے۔ باولر ہیٹ میں ایک چھوٹا سا آدمی وہاں ایک وقفے کے لیے رکا۔ اس نے اپنی سنہری زنجیر والی جیبی گھڑی کو واسکٹ کی جیب میں سے نکالا اور رائے ظاہر کی،

''یہ لوگ بھی دیکھ کر نہیں چلاتے۔'' اس کے بعد وہ وہاں سے فوراً چل پڑا۔ وہ کونسلر آف اسٹیٹ تھا۔ اسے اجلاس کے لیے دیر ہو رہی تھی۔ 'بڑے چچا' کی لمبی چمکیلی مرسیڈیز اپنے موٹر سائیکل اسکورٹ کے ساتھ وہاں سے گذری اور پولیس مین نے اپنی لاٹھی سے فوراً مجمعے کو منتشر کر دیا۔ ممولا مالا کے ملک میں، جس کا دارالسلطنت بافوت کا شہر ہے، پریزیڈنٹ کو تعظیم سے 'بڑا چچا' کہا جاتا ہے۔ بڑا چچا اپنی مارشل کی وردی میں مرسیڈیز کی پچھلی سیٹ پر اکڑا ہوا بیٹھا تھا۔ اس نے احمق کی لاش کو نہیں دیکھا۔ وہ آہنی آدمی نظر آنے کی کوشش میں بہت زیادہ مشغول تھا، اور اس کی بینائی قدرے کمزور تھی۔

کچھ دیر کے بعد ایک پولیس ایمبولینس احمق کی لاش کو مردہ گھر لے گئی۔ احمق کا کوئی والی وارث نہ تھا، نہ اس پتھر اور کنکریٹ کے جنگل میں کوئی دوست۔ اس کا نام و نشان اس طرح مٹ گیا جیسے وہ کبھی پیدا ہی نہ ہوا تھا۔ لیکن اس کی بھی ایک سوانح عمری تھی۔ آپ غالباً سمجھتے ہوں گے کہ صرف بڑے آدمیوں کی ہی سوانح عمریاں ہوتی ہیں — نپولین یا ہنری فورڈ سینئر یا آغا خان کی سوانح عمریاں یقیناً پڑھنے کے لائق ہیں، ہر شخص کو انھیں پڑھنا چاہیے، تاکہ اس میں بڑا بننے کی امنگ پیدا ہو اور مرنے کے بعد وہ وقت کی ریت پر اپنے قدموں کے نشان چھوڑ جائے۔

بہرحال یہ احمق کی سوانح عمری ہے۔ (اسے پڑھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔)

احمق بھوشم کے ملک میں اب سے تیس یا پینتیس سال پہلے پیدا ہوا۔ صحیح سن پیدائش اس کو معلوم نہیں۔ اس کا باپ موضع چھونگ کا ایک غریب کاشتکار تھا۔ احمق تین لڑکوں میں سے سب سے چھوٹا تھا اور اپنے باپ کا سب سے لاڈلا تھا۔ چار سال کی عمر میں اس کے باپ نے اسے گاؤں کے اسکول میں داخل کرا دیا۔ لیکن ابھی احمق نے چوتھی جماعت بھی پاس نہ کی تھی کہ اس کے باپ کا انتقال ہو گیا۔ احمق کو اسکول چھوڑنا پڑا اور وہ گھر پر ہی زمینداری کے کام میں اپنے بھائیوں کا ہاتھ بٹانے لگا۔ احمق کا بچپن اچھا ہی گذر گیا۔ اس کے بھائی اس سے محبت کرتے تھے اور اس کا ہر طرح خیال رکھتے تھے۔ اس کے بھائی ہل چلانے کا کام خود ہی کرتے تھے۔ احمق صبح اپنی دو بھینسوں کو پربت کے بیلوں میں چرانے کے لیے لے جاتا۔ اس کے کئی چھوٹے ہمجولی بھی وہاں مویشی لے کر آ نکلتے۔ بھینسیں چرتی رہتیں اور احمق اور اس کے دوست کسی کیکر کے سائے میں بیٹھ کر کوڑیاں کھیلتے، پہیلیاں بوجھتے یا اس بات پر قیاس آرائی کرتے کہ پربت کے اونچے نیلے پہاڑ کے پیچھے کیا ہے۔ احمق کا ایک دوست گھیاڑو شین بڑی اچھی بانسری بجاتا تھا۔ گھیاڑو نے احمق کو بھی بانسری کے رازوں سے واقف کر دیا اور احمق نے بہت جلد اس میں مہارت پیدا کر لی۔ وہ ایسے میٹھے سُروں سے بانسری کی

تان اٹھاتا کہ راہی راستہ بھول جاتے اور گاؤں کی لڑکیوں کے دل دھک دھک کرنے لگتے۔ احمق ایک فطری شاعر تھا۔ بچپن میں ہی اس نے کئی دوہے اور بیت لکھے جن میں سے بعض اب بھی وہاں کے لوگوں کی زبان پر ہیں۔

احمق اپنے ساتھیوں کے ساتھ آرام سے زندگی بسر کر رہا تھا۔ بیچ میں بکریوں کا ایک جنگل تھا۔ وہاں لاتعداد گلہریاں اور خرگوش رہتے تھے۔ احمق اور اس کے ہمجولی خدا کی اس ننھی مخلوق کو بڑی دلچسپی سے دیکھتے اور بعض اوقات ان کا تعاقب کر کے خوب لطف اٹھاتے۔ یہ علاقہ بڑا خوبصورت اور پرامن تھا۔ ہر موسم میں یہاں کی رنگینی اور تازگی کا حسن نظر آتا، مثلاً خزاں کے موسم میں دھان کے ہرے پتّے درخت، جن سے پہاڑ کا دامن بھرا ہوا تھا، آگ کی طرح دہکنے لگتے۔ گرمیوں میں اور بھی، برساتی نالے گرجتے اور شور مچاتے چلتے اور پربت آسمان کی طرح گہرا نیلا ہو جاتا۔ یہ پہاڑ ایک مستقل عجوبہ تھا اور اس کے رنگ ہمیشہ بدلتے رہتے تھے۔

احمق کے یہ اطمینان اور بے فکری کے دن زیادہ دیر نہ رہے۔ ایک دن ایک فوجی افسر اور چند پولیس کے سپاہی گاؤں میں آئے۔ انھوں نے گاؤں کے سب جوانوں کو اکٹھا کیا اور انھیں پکڑ کر زبردستی ساتھ لے گئے۔ احمق کے دونوں بھائی بھی ان جوانوں میں تھے۔ فوجی افسر نے بتایا کہ ولایت میں ایک بڑی جنگ ہو رہی ہے اور ان جوانوں کو وہاں لڑنے کے لیے بھیجا جائے گا، کیونکہ دشمن کو ہرانا بے حد ضروری ہے۔ وہ احمق اور اس کی ماں کو پیچھے چھوڑ گئے۔

یک لخت گھر کا سارا بوجھ اکیلے احمق کے کمزور کندھوں پر آن پڑا۔ اب سب کام اسے ہی کرنے ہوتے جو پہلے اس کے بھائی کیا کرتے تھے — منہ اندھیرے ہل جوتنا، مویشیوں کے لیے چارا بنانا، جلانے کے لیے جنگل سے لکڑیاں اکٹھی کرنا۔ یہ بڑی مشقت کی زندگی تھی، لیکن احمق طبعاً خوش مزاج انسان تھا، اور جب وہ دن کا تھکا ہارا شام کو چوپال میں اپنے ہمجولیوں میں آن بیٹھتا تو اس کی ساری کوفت دور ہو جاتی۔ آپس کے ہنسی مذاق اور بانسری کی تانوں میں سارے دن کی تھکن تحلیل ہو جاتی۔ اس کے بھائیوں کے خط بھی کبھی کبھار دور دراز جگہوں سے آتے۔ احمق انھیں اپنی ماں کو پڑھ کر سناتا، جنھیں سن کر بوڑھی عورت کے چہرے پر روشنی آ جاتی۔ پھر خط آنے بند ہو گئے۔
ایک دن احمق کی ماں کے نام ایک تار آیا۔ احمق اسے پڑھوانے کے لیے مقامی اسکول ماسٹر کے پاس لے گیا، جو سارے گاؤں میں سب سے سیانا آدمی تھا۔ اسکول ماسٹر نے عینک لگانے کے بعد تار کو دیکھا اور بڑی دیر تک اس پر سر دھنتا رہا۔ آدھ گھنٹے کے بعد تار کا مطلب اس کی سمجھ آ گیا۔ بڑی بری خبر تھی۔ احمق کے دونوں بھائی منگولیا کے محاذ پر مارے گئے تھے۔ احمق کی ماں کو جب اس

کا پتہ چلا تو اسے بے حد صدمہ ہوا، لیکن وہ روئی پیٹی نہیں۔ البتہ کچھ عرصے میں ہی اس کے بال سفید ہو گئے اور وہ ایک اسی سالہ بڑھیا کی طرح کوزہ پشت ہو گئی۔ احمق کو اپنی ماں سے بے پناہ محبت تھی۔ یہ یقین کرتے ہوئے کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہے، اس نے اپنی ماں کی دل و جان سے خدمت کی۔ ہمیشہ وہ اس کا خیال رکھتا اور اس کی دعائیں لیتا۔

اس کی ماں کی بس اب ایک ہی خواہش تھی کہ احمق کا کہیں بیاہ ہو جائے اور وہ مرنے سے پہلے اسے پھولتے پھلتے دیکھ سکے۔ احمق پہلے پہل ماں کی درخواست کو ٹس کر ٹالتا رہا۔ "اماں ابھی کیا جلدی ہے، شادی ہوتی جائے گی۔"

احمق اب ایک اچھا تگڑا گبھرو جوان بن چکا تھا۔ اس کی مونچھیں نکلنی شروع ہو گئی تھیں۔ ایک دن صبح سویرے جب وہ بیلوں کو ہل چلانے لے جا رہا تھا تو اسے گلی میں چاموموچی کی لڑکی زانو سامنے سے گھڑا اٹھائے آتی ہوئی مل گئی۔ بچپن سے زانو اسے بلاناغہ اسی وقت مل جاتی تھی۔ زانو اسے اچھی لگنے لگی تھی اور وہ اکثر اس کے دماغ پر چھائی رہتی۔ آج پھر اسے دیکھ کر احمق کے کان لوؤں تک سرخ ہو گئے، اس کے دل کی حرکت تیز ہو گئی۔ اس نے گذرتی ہوئی شوخ زانو کو ڈرتے ڈرتے کنکھیوں سے دیکھا۔ آگے جا کر اس نے اپنے دل میں فیصلہ کیا کہ زانو دنیا کی سب سے خوبصورت عورت ہے۔ ہل چلاتے ہوئے وہ زانو کے متعلق ہی سوچتا رہا۔ جب اس رات اس کی ماں نے حسب معمول احمق کے بیاہ کا ذکر چھیڑا تو احمق نے کہا:

"ہاں ماں تمھاری مرضی ہے تو مجھے انکار نہیں مجھے چاموموچی کی بیٹی زانو پسند ہے۔"

چاموموچی سے رشتے کی بات کی گئی تو تھوڑی سی رد و قدح کے بعد وہ راضی ہو گیا۔ احمق سے اچھا لڑکا اسے گاؤں بھر میں اور کہاں مل سکتا تھا۔ آخر وہ دن بھی آیا جب احمق گھوڑی پر دولہا بنا زانو کے گھر برات لے کر گیا۔ گھیا دشمن اس کا شہ بالا بنا۔ اس کے دوستوں نے پٹاخے چھوڑے۔ احمق کی ماں آنکھوں میں اس روز آنسو تھے۔ احمق نے شادی کی رات سارے گاؤں کی دعوت کی۔

احمق اور زانو میں آپس میں بڑی محبت تھی۔ وہ ایک دوسرے پر جان دیتے تھے۔ زانو بڑی شگفتہ مزاج اور اتنی ہی سادہ لوح تھی جتنا کہ احمق۔ ویسے وہ دونوں اپنے کو بہت عقلمند سمجھتے تھے۔ گاؤں میں صرف ایک اور شخص ان سے زیادہ عقلمند تھا — اور وہ تھا اسکول ماسٹر جس نے تار پڑھا تھا۔

ایک سال کے بعد احمق اور زانو کو خدا نے چاند سا ایک بچہ عطا کیا۔ ان دونوں کو اس کی بڑی خوشی ہوئی۔ احمق نے مہاجن سے قرض لے کر پھر سارے گاؤں کو دعوت دی۔ زانو کہتی کہ بچہ ہو بہو

اپنے نانا چامو مونچی پر گیا ہے۔ احمق کو یقین تھا کہ اس کی ناک اور آنکھیں ہو بہو احمق کے باپ پر ہیں۔ بچّے کی پیدائش کے دو ماہ بعد احمق کی بوڑھی ماں اللہ کے گھر کو سدھاری۔ اس نے مرتے ہوئے احمق کو بڑی دعائیں دیں اور اس سے کہا کہ "اب اسے کوئی حسرت نہیں رہی۔" آخر میں اس نے دعا کی کہ خدا احمق کو زندگی میں ہر طرح کامیاب کرے۔

اسی طرح ماہ وسال گزرتے گئے۔ احمق کے ہاں پانچ لڑکے لڑکیاں پیدا ہوئے۔ اچھا خاصا کنبہ ہو گیا۔ احمق اپنے بچوں کو بڑھتے پھولتے دیکھ کر باغ باغ ہو جاتا۔ ادھر اس کے دوست گھیارو شین کے بھی چار پانچ بچے ہو گئے۔ ان سب کی آپس میں بڑی دوستی تھی۔ وہ بیلے میں جا کر سارا دن کھیلتے رہتے اور اپنے باپوں کی طرح گلہریوں اور خرگوشوں کا تعاقب کرتے۔ احمق اور گھیارو اپنے بچوں کی اس دوستی کو دیکھ دیکھ کر خوشی سے پھولے نہ سماتے۔ احمق کے بچے گھیارو کو چچا کہتے، اور گھیارو کے بچے احمق کو چچا کہہ کر پکارتے۔ کبھی احمق گھیارو کے بچوں کو دکان سے ریوڑیاں اور گڑ لے دیتا، کبھی گھیارو احمق کے بچوں کو چاند تارے والی رنگین ٹوپیاں لے دیتا۔ احمق اور گھیارو ایک دوسرے کے دکھ درد اور غمی خوشی میں برابر کے شریک تھے۔ جو کچھ کرتے ایک دوسرے کے مشورے سے۔ یہ دوستی اب ان کا بہترین خزانہ تھی، اور وہ اپنی الجھنوں اور تفکرات کے باوجود بھی خوش تھے۔

احمق اور گھیارو کی ذاتیں مختلف تھیں۔ احمق ذات کا مولا تھا اور گھیارو ذات کا شین۔ لیکن اس کی وجہ سے ان کے دل میں ایک دوسرے کے خلاف کبھی میل نہ آیا۔ انھوں نے کبھی اس طرف دھیان بھی نہ دیا تھا کہ ان کی ذاتیں مختلف ہیں۔ مولوں اور شینوں کے علاوہ اس گاؤں میں ایک اور ذات کے لوگ بھی رہتے تھے؛ یہ لنگوپے تھے۔ ذاتوں اور دیوتاؤں میں اختلاف کے باوجود اس گاؤں کے لوگ مل جل کر رہتے اور ایک دوسرے کے میلوں ٹھیلوں میں حصہ لیتے اور جھگڑا ناچتے۔

احمق اور گھیارو کی زندگی اسی طرح گزر رہی تھی۔ ان کے بچے جوان ہو رہے تھے۔ وہ اب ادھیڑ عمر کے تھے لیکن اسی طرح سادہ مزاج، کھلنڈرے اور زندہ دل۔ زندگی کی شام نزدیک آ رہی تھی مگر اپنے بچوں میں اس کے تسلسل کو دیکھ کر وہ خوش اور مغرور تھے۔

لیکن آناً فاناً ایک طوفان آ گیا۔

وہ طوفان کس نوعیت کا تھا، کیسے آیا — اس کو سمجھنے کے لیے جوشم کے ملک کی مذہبی اور سماجی تاریخ سے تھوڑی سی واقفیت ضروری ہے۔ لیکن یہ کام یقیناً وقت طلب ہے، کیونکہ جوشم کی مذہبی اور سماجی تاریخ حیوانیت، درندگی اور قتل عام وغیرہ کی ایک لمبی داستان ہے۔ اس لیے میں بے حد اختصار

سے طوفان سے ایک صدی پہلے کے حالات کا ذکر کروں گا تاکہ اس طوفان کی نوعیت سمجھ میں آ سکے۔

سو سال پہلے جھوشم کے ملک میں چار قومیں آباد تھیں — ایک (جیسا کہ میں نے اوپر ذکر کیا ہے) مموولے تھے۔ یہ مموولے اپنی عبادت گاہوں میں مختلف دیوتاؤں کو پوجتے تھے — دولت کا دیوتا، دنیاوی کامیابی کا دیوتا، عذاب کا دیوتا، وغیرہ وغیرہ۔ ان کے علاوہ ان کا ایک اور دیوتا تھا، دوسرے سب دیوی دیوتاؤں سے زیادہ متبرک اور افضل۔ اس دیوتا کو مموولے ادب سے صرف 'وڈے' کے لقب سے یاد کرتے تھے۔ اس بڑے دیوتا کا اصلی نام 'فوزی ووزی' تھا۔

دوسری قوم لنگوٹیوں کی تھی۔ لنگوٹیے جھوشم کے ملک کے اصلی اور قدیم ترین باشندے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ سورج نے انھیں جنم دیا ہے۔ ان کا دعویٰ تھا کہ جھوشم کا ملک ان کا ہے اور مموولوں یا کسی اور کو وہاں رہنے کا حق نہیں پہنچتا۔ مموولوں کی طرح لنگوٹیوں کے بھی کئی دیوتا تھے۔ ان کے دیوتاؤں کے نام مموولوں کے دیوتاؤں کے ناموں سے مختلف تھے۔ مموولوں کی طرح ان کا بھی ایک مافوق الفطرت دیوتا پر ایمان تھا: اس کا نام 'ہوچی لوچی' تھا۔ لنگوٹیوں کو اس بات پر بڑا ناز تھا کہ جاہل اور اکھڑ مموولوں کے 'فوزی ووزی' کی مانند 'ہوچی لوچی' کے سینگ نہ تھے: سینگوں کے بجائے 'ہوچی لوچی' کے سونڈ تھی — ایک نہایت معصوم اور پیاری سی سونڈ۔

تیسری قوم (شین) یا 'برشے' تھے۔ تعداد میں وہ مموولوں اور لنگوٹیوں سے کہیں کم تھے۔ شین یا برشے تنومند جنگجو لوگ تھے۔ وہ لمبی داڑھیاں رکھتے (بعض برشوں کی داڑھیاں ان کے گھٹنوں تک چلی آتیں) اور اپنے سر کے بالوں کو جوڑے میں باندھتے۔ لڑکیوں کی طرح کنگھیاں لگاتے، ہاتھوں میں کنگن پہنتے۔ چودہ سالہ برشے لڑکے اور لڑکیوں میں تمیز کرنا آسان کام نہ تھا۔ یہ برشے پرجوش اور زود رنج قوم تھے۔ دراصل وہ طبیعت کے برے نہ تھے۔ وہ سادہ لوح اور فراخ دل تھے اور دوستی کے سچے۔

چند سالوں سے ان تینوں قوموں کے لیڈروں میں تیج چل رہی تھی۔ لنگوٹیوں کے لیڈر کہتے تھے کہ جھوشم کا ملک ان کا ہے۔ کیا ہوچی لوچی نے اسے ان کے لیے نہیں بنایا؟ مموولوں کے لیڈر کہتے تھے کہ جھوشم پر ان کا حق ہے۔ کیا ان کے ورثا نے اسے تیر و سناں سے فتح نہیں کیا تھا، اور کیا انھوں نے اس پر ایک ہزار برس حکومت نہ کی تھی؟ برشوں کا دعویٰ تھا کہ ملک دراصل ان کا ہے، یا ان کا ہونا چاہیے۔ کیا وہ شیر ببر کی اولاد نہیں تھے؟ برشوں کی تعداد بے حد کم تھی، اور ان کے دعووں کو کوئی دھیان نہ دیتا تھا۔

اب لطف کی بات یہ ہے کہ جھوشم کا ملک نہ تو مموولوں کا تھا نہ لنگوٹیوں اور نہ ہی جنگجو برشوں کا:

اس وقت جس زمانے کا یہ ذکر ہے، بجوشم پر سنپولیوں کی حکومت تھی۔ سنپولیے چار سو سال پہلے بجوشم میں ہاتھی دانت، صندل اور آہوئے ختن کی سوداگری کی خاطر آئے تھے۔ وہ سانپوں کی طرح چالاک اور چست تھے، چنانچہ رفتہ رفتہ یہ لوگ بجوشم کے مالک ہی بن بیٹھے۔ اس طرح بجوشم کو اپنا ملک کہنے کا انھیں بھی حق پہنچتا تھا۔ وہ سفید فام تھے، اور اپنے آپ کو سفید فام سمجھنے میں دراصل انھیں غلط فہمی ہوئی تھی؛ حقیقتاً ان کی رنگت کچے انڈے کی زردی جیسی تھی اور وہ کسی طرح بھی سفید نہ تھے۔ جب بجوشم کے لوگوں کو اس بات کا پتہ چلا تو بہت تلملائے۔ یہ سنپولیے چار سو سال تک بجوشم میں مچھرے اڑاتے رہے اور مملوں، لنگوٹیوں اور برشوں کی ان کے دشمنوں سے حفاظت کرتے رہے۔ (ان عجیب دشمنوں کا مصرف سنپولیوں ہی کو تھا۔) حلیم، منصف مزاج اور نیک دل ہونے کی وجہ سے وہ ان قوموں کے ایک دوسرے سے ٹکرانے کی خاطر بھی بجوشم میں رہنے پر مجبور تھے۔ جب بجوشم کی سب قوموں نے ایکا کر کے سنپولیوں کے سامنے اس تمنا کا اظہار کیا کہ اب وہ اپنی حفاظت خود کرنا چاہتے ہیں، تو مہذب سنپولیے نہ صرف بجوشم والوں کی اس بیہودگی پر چیں بجبیں ہوئے بلکہ ان کی اس ناشکرگزاری سے سنپولیوں کے دلوں کو ٹھیس بھی پہنچی۔ سنپولیوں نے ایسی بات پہلے کبھی نہ سنی تھی۔ کچھ مدت تک تو سنپولیے سمجھتے رہے کہ بجوشم کے معصوم جنگلی لوگ محض اسکول کے شریر لڑکوں کی طرح شور مچا رہے ہیں؛ انھوں نے اس شور کو نہ سننے کے لیے مزے سے اپنے کانوں میں مکڑی کے ڈاٹ لگا لیے۔ تھوڑے عرصے میں بجوشم کی سب قوموں نے مل جل کر سنپولیوں کے خلاف ایک منظم جماعت بنائی جس کا مقصد انھیں زبردستی بجوشم سے نکالنے کا تھا۔ اب سنپولیوں کو موقعے کی نزاکت کا احساس ہوا۔

سنپولیے کچی گولیاں نہ کھیلے تھے۔ انھوں نے ایک چال چلی۔ انھوں نے بجوشم والوں کی جماعت میں پھوٹ کے بیج بونے کی کوشش کی۔ اس کوشش کو حیرت انگیز کامیابی ہوئی۔ انھوں نے لنگوٹیوں کے لیڈروں کو الگ بلا کر یہ یقین دلایا کہ وہ بجوشم میں صرف اس لیے ہیں تاکہ لنگوٹیوں کو مملوں اور برشوں سے بچا سکیں۔ مملوں کے لیڈروں سے سنپولیوں نے اپنے اس خدشے کا اظہار کیا کہ اگر وہ بجوشم سے چلے گئے تو برشے ان کی بیویوں کو ان سے چھین لیں گے۔ برشوں کے سرداروں سے انھوں کہا کہ وہ ملک میں محض ان کی خاطر پڑے رہنے پر مجبور ہیں، چونکہ انھیں شیر ببر بڑے پسند تھے۔ سنپولیوں کی یہ حکمتِ عملی پھل لائی۔ بجوشم والوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ مملوں نے لنگوٹیوں کے خلاف اپنی جماعت بنائی؛ لنگوٹیے الگ مینار پر چڑھ کر بانگ دینے لگے؛ برشوں نے مملوں اور لنگوٹیوں کے خلاف اپنا جنگی سنکھ بجایا، اور سنپولیے اس غیر متوقع کامیابی پر بغلیں بجانے لگے۔

پھر یکلخت ایک بڑی جنگ شروع ہوگئی۔ یہ جنگ اس جنگ کے بعد ہوئی جس میں احمق کے دو بھائی مارے گئے تھے۔ اس کو شروع کرنے والا اوشینیا کا بادشاہ مسٹر جیٹلر تھا۔ مسٹر جیٹلر نہایت صوفی مشرب شخص تھا۔ وہ گوشت سے پرہیز کرتا تھا اور پھل پھول پر اس کی گذران تھی۔ وہ سگریٹ بھی نہ پیتا تھا۔ راتیں وہ جاگ جاگ کر گذارتا۔ مسٹر جیٹلر بڑا پھرتیلا اور چاق و چوبند انسان تھا۔ اس کے گول معصوم چہرے پر تیتری نما مونچھیں بڑی پیاری لگتی تھیں۔ جیٹلر نے یک لخت اروپا کے ملکوں کو ان کی حکومتوں سے آزاد کرنا شروع کردیا۔ سنپولیوں نے اسے بہتیرا سمجھایا کہ بھئی جیٹلر، آزاد کرنا صرف ہمارا حق ہے، مگر جیٹلر نے ایک نہ سنی بلکہ خود سنپولیوں پر چڑھ دوڑا۔ اب تو سنپولیوں کو بھی آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوا اور انھیں اپنی جان بچانے کے لیے ہتھیار اٹھانے پڑے۔ سنپولیوں نے پھر بھوشم کے ملک میں جبری بھرتی کا حکم جاری کردیا۔ یہ بڑی جنگ کئی برس تک ہوتی رہی۔ سنپولیوں کے سردار جرنیل غارت نے اس میں بڑا نام پیدا کیا اور اس کی فوجوں نے اتحادی ملکوں کو آزاد کرایا۔ آخر مسٹر جیٹلر کو شکست فاش ہوئی اور وہ ایک بدھ لاما کا بھیس بدل کر تبت کو بھاگ گیا جہاں وہ جدید اطلاعات کے بموجب تحریک موسے کی خانقاہ کا بڑا لاما ہے۔

سنپولیوں کو فتح تو ہوگئی تھی لیکن یہ فتح شکست سے بدتر تھی۔ ان کے بے شمار صنعتی شہر مٹی میں مل گئے۔ ان کا دیوالہ پٹ گیا۔ جنگ کے اخراجات کے لیے وہ منگولیا کے پریذیڈنٹ موسیو زولٹو سے بے حساب قرض لیتے رہے تھے۔ موسیو زولٹو نے اب سنپولیوں کو قرض کی ادائگی کے لیے پریشان کرنا شروع کردیا۔ جرنیل غارت اور سنپولیوں کے دوسرے لیڈر کچھ کچھ اس خیال کے ہمنوا ہوگئے کہ سنپولیوں کو اپنے جزیرے کو زولٹو کے پاس گروی رکھ کر قطب شمالی میں آباد ہوجانا چاہیے۔ سنپولیوں کو صرف زولٹو کی مصیبت ہی نہ تھی؛ ادھر بھوشم والوں نے جب دیکھا کہ سنپولیوں کو اپنی پڑی ہوئی ہے تو وہ بھی سر اٹھانے لگے۔ آخر سنپولیے بیچارے اس درجے بددل اور شکستہ خاطر ہوگئے کہ انھوں نے بھوشم کی حفاظت سے ہاتھ اٹھا لینے کا فیصلہ کرلیا۔ انھوں نے اس تاریخ کا بھی اعلان کردیا جب وہ بھوشم سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت ہوجائیں گے۔ جرنیل غارت اس فیصلے پر بڑا بھنایا، مگر دوسرے سنپولی لیڈروں کے سامنے اس کی ایک نہ چلی۔ جرنیل غارت کا خیال تھا کہ اس فیصلے سے بھوشم کے گھر گھر میں صفِ ماتم بچھ جائے گی اور لنگوٹیے، ممولے اور برشے فرداً فرداً سنپولی لیڈروں سے التجا کریں گے کہ وہ انھیں اس طرح چھوڑ کر نہ جائیں۔ مگر ایسی کوئی بات نہ ہوئی، بلکہ بھوشم میں اس اعلان پر خوشی کے شادیانے بجے۔ جرنیل غارت کو بھوشم کی سلطنت چھن جانے کا بڑا صدمہ ہوا۔ وہ سنپولیوں کی سیاست سے کنارہ کش ہوکر دس ضخیم جلدوں میں بڑی جنگ کی تاریخ

مکمل کرنے میں مصروف ہوگیا۔ (تازہ اطلاعات کے مطابق اس نے سات جلدیں مکمل کرلی ہیں)۔

جبوشم کی قوموں کے سردار صرف یہی نہیں چاہتے تھے کہ سنبولیے جبوشم سے چلے جائیں۔ ان کا مطالبہ یہ بھی تھا کہ سنبولیے ملک کو تینوں قوموں میں بانٹ کر جائیں۔ لنگوٹیوں اور مولوں نے ہزاروں سال اکٹھا رہنے کے بعد یہ نئی دریافت کی تھی کہ وہ اب اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ مولوں کے لیڈر مسٹر ٹام کن (Tom Kin) نے، جو بافوت کے گورنمنٹ کالج میں تاریخ کا پروفیسر تھا، بے حد تحقیق کے بعد مولوں کی آواز اخبار میں ایک معرکہ آرا مضمون لکھا۔ اس میں پروفیسر نے مولوں پر قطعی طور پر یہ ثابت کردیا کہ لنگوٹیے اور مولے بھی اکٹھے نہیں رہ سکتے — فوزی دوزی اور ہوچی کوچی میں مفاہمت ناممکن ہے۔ اس مضمون پر بڑی واہ واہ ہوئی۔ مضمون کی اشاعت کے ایک ماہ بعد ٹام کن پاگل ہوگیا۔

سنبولیوں نے اپنی رخصتی کی تاریخ سے ایک دن پہلے ملک کو لنگوٹیوں، مولوں اور برشوں میں تقسیم کردیا۔ کون سا حصہ کس کو ملے گا، اس کا فیصلہ قرعہ اندازی سے کیا گیا۔ تقسیم کرنے کے چند دن بعد ہی سنبولیے جبوشم کے ملک سے ایسے غائب ہوئے جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔

ان کے جاتے ہی آنا فانا ایک طوفان آگیا، اور اب ہم پھر احمق کی کہانی کی طرف لوٹتے ہیں۔

احمق کا گاؤں ملک کے اس خطے میں آیا جو برشوں کو حصے میں ملا تھا۔ سنبولیوں کے جاتے ہی سارے ملک میں فساد اور خون خرابے ہونے لگے۔ مولوں نے ان لنگوٹیوں اور برشوں کا صفایا کرنا شروع کردیا جو ان کے خطے میں تھے۔ لنگوٹیوں نے اپنے خطے میں کئی مولوں کو لنگوٹیے بننے پر مجبور کیا، برشوں نے اپنے علاقے میں مولوں اور لنگوٹیوں کی اچھی طرح خبر لی۔ جبوشم کے شہروں قصبوں اور کھلیانوں میں تعصب اور نفرت کی آگ بھڑک اٹھی۔ فوزی دوزی، ہوچی کوچی اور گھشوشین کے نام پر لاکھوں انسانوں کو قتل کیا گیا۔ ہزاروں عورتوں کی عصمتیں لوٹی گئیں۔ کیا مولے، کیا لنگوٹیے اور کیا برشے، سب پاگل ہوگئے۔ احمق کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

گاؤں کے مولے خوف اور ہراس کی حالت میں رہنے لگے۔ انھوں نے کام پر جانا اور اپنے دوستوں سے ملنا جلنا چھوڑ دیا۔ ان کا اپنے برشے اور لنگوٹیے دوستوں پر اعتماد ختم ہوگیا تھا، اور سچی بات تو یہ ہے کہ ان دوستوں کی آنکھیں بھی بدل گئی تھیں۔ پھر بھی گاؤں میں کچھ عرصہ امن رہا۔ ایک دن خبر آئی کہ مسلح برشوں کا ایک جتھا گاؤں پر حملہ کرنے کے لیے آرہا ہے۔ گھیاژوشین نے خوفزدہ

احمق کو تسلی دی، ''تم فکر نہ کرو۔ گھیاڑو شین زندہ ہے تو تم پر اور تمھارے بیوی بچوں پر کوئی آنچ نہ آئے گی۔'' گھیاڑو کی باتوں سے احمق کو کچھ حوصلہ ہوا۔ گھیاڑو شین احمق اور اس کے بیوی بچوں کو اپنے مکان میں چوری چھپے لے گیا اور انھیں عقب کی ایک کوٹھڑی میں چھپا دیا۔

اس رات برشوں کے جتھے نے گاؤں پر ہلہ بول دیا اور مولوں کو پکڑ پکڑ کر تہ تیغ کرنے لگے۔ احمق کے مکان میں بلوائیوں نے آگ لگا دی۔ گاؤں کے ایک برشے کو کسی طرح پتہ چل گیا تھا کہ گھیاڑو نے احمق اور اس کے کنبے کو اپنے گھر میں پناہ دے رکھی ہے۔ اس نے بلوائیوں کو اس بات کی مخبری کر دی۔ ہوائی بھالے لہراتے اور ''شنگھو شین!'' کے ہولناک نعرے بلند کرتے گھیاڑو کی حویلی پر پہنچے۔ انھوں نے گھیاڑو سے کہا کہ وہ چپ چاپ ان مولوں کو ان کے حوالے کر دے جنھیں اس نے چھپا رکھا ہے، ورنہ اس کی خیر نہیں۔ گھیاڑو کے یہ کہتے کہتے کہ اس کی حویلی میں مولے نہیں ہیں، چھ سات برشے اس کے مکان میں گھس گئے۔ باقی برشوں نے گھیاڑو کو پکڑ کر زدوکوب کیا اور اسے طعنے دیے کہ وہ دشمن کو پناہ دے کر برشا کہلانے کا ہرگز مستحق نہیں ہے۔

وہ برشے جو اندر گھس گئے تھے، اپنے شکار کی تلاش کرنے لگے۔ احمق، اس کی بیوی، دو گبھرو لڑکے اور تین کم عمر لڑکیاں، سہمے ہوئے اناج کے گوداموں کے پیچھے چھپے ہوئے تھے لیکن برشوں نے انھیں فوراً ڈھونڈ لیا۔ احمق کے سامنے اس کے جوان لڑکوں کو تلواروں سے بیدردی سے ذبح کیا گیا۔ اس کی بیوی اور بیٹیوں کی عصمت دری کی گئی اور بھالوں سے ان کے جسموں کو چھید کر تڑپنے کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ احمق کو دو تین برشوں نے پکڑے رکھا تاکہ وہ سب کچھ اپنے سامنے دیکھ سکے۔

لیکن اسی دوران گھیاڑو موقع پا کر بھاگ نکلا اور فسادی احمق کو مارنے کا ارادہ کر ہی رہے تھے کہ اتنے میں گھیاڑو شین بھری رائفل اٹھائے اس کی مدد کو آن پہنچا۔ یہ رائفل وہ اپنے چچا نچر شین سے مانگ کر لایا تھا جو فوج میں تھا۔ افسوس کہ گھیاڑو کچھ دیر سے پہنچا اور اپنے دوست کے بیوی بچوں کو نہ بچا سکا۔ رائفل کو دیکھ کر بزدل برشے احمق کو چھوڑ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس طرح احمق کی جان بچ گئی، اگرچہ اس کی حالت مُردوں سے بدتر تھی۔

احمق بیچارے کا دماغ ان ہولناک واقعات سے بالکل مختل ہو گیا تھا۔ گھیاڑو شین اپنے دوست کو اس جگہ سے کافی دور لے گیا اور کئی دن تک اس کی دلداری اور تیمارداری کرتا رہا۔ مسلسل ایک ہفتے تک احمق پر ہذیانی کیفیت طاری رہی۔ اکثر وہ لیٹے لیٹے اٹھ بیٹھتا اور چلّانے لگتا:

''برشے آ گئے، برشے آ گئے۔''

ایک ماہ بعد اس کی طبیعت کچھ بحال ہوئی۔ گھیاڑو نے اپنے دوست کو دو سو روپے دیے اور اسے

چھکڑے میں تیس میل دور موولے پناہ گزینوں کے کیمپ میں چھوڑ آیا۔ ایک دوسرے سے رخصت ہوتے وقت گھیازو اور احمق گلے مل کر خوب روئے۔ گھیازو نے احمق کو حوصلہ نہ ہارنے کا مشورہ دیا۔

پناہ گیروں کے کیمپ میں ہزاروں دوسرے لٹے پٹے اور بدحال موولے تھے۔ قیامت کا سماں تھا۔ لاکھوں مکھیاں جھنڈوں میں زخمی اور غلیظ جسموں پر بھنبھناتی تھیں۔ لاتعداد چیلیں اور گدھ جھورے غبار آلے آسمان پر منڈلاتے۔ کیمپ میں پانی کا کوئی انتظام نہ تھا۔ لوگ باہر اردگرد کے کنووں اور جوہڑوں سے پینے کا پانی حاصل کرتے۔ لنگوٹیوں اور برشوں نے کنووں میں بھی زہر ڈال دیا تھا اور کئی موولے یہ پانی پی کر اگلے جہاں کو سدھار گئے تھے۔

ایک مہینے کے بعد موولا مالا سے (جو موولوں کے نئے ملک کا نام تھا) فوجی امداد پناہ گزینوں کو ان کے نئے وطن میں پہنچانے کے لیے پہنچی۔ جب احمق کسی ٹرک میں چڑھنے کی کوشش کرتا تو فوجی اسے کھینچ کر نیچے اتار دیتے کیونکہ انھیں یہ احکام ملے تھے کہ پہلے صرف بیواؤں اور بچوں کو نکالا جائے۔ وہ احمق سے کہتے، "صبر کرو بڑے میاں، تمھارا نمبر بھی آ جائے گا۔"

احمق دو مہینے تک اپنے نمبر کا انتظار کرتا رہا۔ اسی اثنا میں کیمپ میں ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی اور سو سو موولے ہر روز مرنے لگے۔ احمق کو ہیضے سے بھی موت نہ آئی۔ فوزی دوزی نے اس کی قسمت میں اس کے نئے وطن موولا مالا کی حسین سرزمین کا دیکھنا لکھ رکھا تھا۔ ایک دن احمق کو پتہ لگا کہ فوجی ٹرکوں والے پناہ گزینوں کو لے جانے کے لیے پیسے لیتے ہیں۔ اس نے ایک ٹرک کے ڈرائیور کو سو روپے دیے۔ اب اس کا نمبر فوراً آ گیا اور اسے ٹرک میں جگہ مل گئی اور چوتھے روز وہ دریائے تمار کے پل کو عبور کر کے موولا مالا کی مقدس سرزمین میں پہنچ گیا۔ ہر ایک نے اطمینان کا سانس لیا۔ کئی موولوں نے مسرت سے "موولا مالا زندہ باد!" کے نعرے بلند کیے۔ احمق بھی ان کے ساتھ مری ہوئی آواز میں چلایا۔ اس کا دماغ تقریباً ماؤف ہو چکا تھا، لیکن اس میں ابھی تک زندہ رہنے کی وہ خواہش باقی تھی جو سب نیم پاگلوں میں ہوتی ہے۔

مقدس سرزمین میں پہنچ کر احمق دو تین مہینے بافوت کے پناہ گیروں کے کیمپ میں رہا۔ یہاں کوئی چار لاکھ موولے پہلے ہی سے آئے ہوئے تھے۔ ہیضہ زوروں پر پھیلا ہوا تھا۔ موولے دھڑا دھڑ فوزی دوزی کو پیارے ہو رہے تھے۔ موولا مالا کی مستعد حکومت نے نہر کھودنے کی بڑی مشین قبریں کھودنے پر لگا رکھی تھی اور موولے مرتے ہی دفنا دیے جاتے تھے۔ ہزاروں موولوں کو اس کیمپ میں زندگی کی الجھنوں سے نجات مل گئی۔ مگر احمق کو پھر بھی کچھ نہ ہوا۔ اسے وہم ہوا کہ شاید وہ لافانی ہے۔

بافوت کے اس کیمپ کا ڈائریکٹر ایک شخص پھوان ڈانگ نامی تھا۔ وہ موولا مالا کے بڑے چچا

ڈاکٹر چکریا موریتی کے سگے پھوپھی زاد بھائی کا کلاس فیلو رہ چکا تھا۔ ڈاکٹر چکریا موریتی کی حکومت نے کیمپ میں حفظان صحت کو بہتر بنانے کے لیے پھوواں ڈانگ کو بہت سا روپیہ دیا تھا۔ پھوواں ڈانگ کافی سمجھدار آدمی تھا۔ اس نے تھوڑا سا روپیہ تو کیمپ کی ڈسپنسریوں پر خرچ کیا اور بقیہ روپے سے اس نے مقامی بس ٹرانسپورٹ کمپنی میں دولاکھ کے حصے خرید لیے۔ (ڈاکٹر چکریا موریتی کا داماد اس ٹرانسپورٹ کمپنی کا مینجنگ ڈائریکٹر تھا۔) غبن کا اسکینڈل ہونے سے پیشتر ہی مسٹر پھوواں ڈانگ ملازمت سے مستعفی ہوگیا۔ اس کے دو دن بعد ڈاکٹر چکریا موریتی کی حکومت نے مسٹر ڈانگ کو کالا مالا میں مومولا مالا کا سفیر مقرر کردیا۔ ڈاکٹر چکریا موریتی نے برسر اقتدار ہوتے ہی پہلی توجہ سفیروں کی تعیناتی کے اہم مسئلے کی طرف دی۔ وہ کہا کرتا تھا، ''مومولا مالا کا سفیر دنیا کے ہر چھوٹے سے چھوٹے ملک میں ہونا چاہیے۔'' ڈاکٹر چکریا موریتی کے کئی چچیرے بھائی، بھتیجے، نواسے پہلے ہی ہلے میں سفیر بن گئے۔

لیکن ٹھہریے... ہم احمق کی کہانی سے بھٹک رہے ہیں۔

ہاں تو جیسا کہ میں نے اوپر بیان کیا، احمق اس کیمپ میں دو ماہ رہا، لیکن وبائی امراض کے باوجود اسے موت نہ آئی۔ دو مہینے کے بعد کیمپ کو ختم کردیا گیا۔ احمق اب بالکل قلاش تھا۔ دو سو روپے جو اس کے دوست گھیاڑو نے چلتے وقت اسے دیے تھے، عرصہ ہوا ختم ہو چکے تھے۔ اب احمق کے پاس پھوٹی کوڑی بھی نہ تھی۔

احمق تین دن تک مسلسل بافوت کے اس شہر کے شاندار بازاروں اور گلی کوچوں میں بے مقصد بھٹکتا رہتا۔ رات ہونے پر وہ سر کے صافے سے فٹ پاتھ کو صاف کرکے دراز ہو جاتا۔ اس عرصے میں ایک کھیل بھی اڑ کر اس کے منھ میں نہ گئی۔ مبہم سی یادیں اس کے ماؤف دماغ میں ابھرتیں — نیلے پہاڑ، لہلہاتے وسیع کھیت اور چرتی ہوئی بھینسوں کی یادیں۔ سوتے جاگتے وہ عجیب اوٹ پٹانگ سپنے دیکھتا۔ ایک دفعہ اسے زانو جاتی ہوئی ملی۔ ''زانو! زانو!'' وہ چلایا۔ زانو نے مڑکر اسے دیکھا۔ ''احمق، تم یہاں کیا کر رہے ہو؟ جلدی بھاگو۔ خرگوش اور گلہری بھالے لیے ہمیں مارنے کے لیے آ رہے ہیں۔''

''زانو، وہ ہمیں کیوں مارنا چاہتے ہیں؟''

''وہ بر شے ہوگئے ہیں۔ وہ سب مومولوں کو مارنا چاہتے ہیں۔''

اور زانو گھیاڑو شین میں تبدیل ہوگئی۔

گھیاڑو شین نے کہا، ''تم نے میری بھینس دیکھی ہے؟'' احمق پر ہذیانی کیفیت طاری تھی۔

چوتھے دن وہ تھکا ہارا ہوٹل ڈی پمپاڈار کی دیوار سے ٹیک لگائے ہوئے بیٹھا تھا کہ ایک دبلا سا گنجا آدمی اس کے پاس آ کھڑا ہوا۔

''بھوکے ہو؟'' گنجے آدمی نے کہا۔

احمق نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر اپنے مربی کو دیکھا۔

''ہاں۔''

''میرے ساتھ آؤ،'' گنجے آدمی نے کہا، ''میں تمھیں کام دوں گا۔''

احمق گنجے آدمی کے ساتھ چل پڑا۔ گنجا آدمی اسے ایک چھوٹے سے مکان میں لے گیا جس کے صحن میں دو تین سائیکل رکشے کھڑے تھے۔

''میں تمھیں سائیکل رکشا چلانے پر ملازم رکھ لوں گا۔ لائسنس تمھارے نام ہوگا۔ میں شام کی شام تم سے سات فرانک لے لیا کروں گا۔ باقی جو بچے وہ تمھارا۔''

''میں بھوکا ہوں،'' احمق نے کہا۔

''اسی لیے تو میں تمھیں کام پر لگا رہا ہوں۔ یہ لو ایک فرانک۔''

رحم دل گنجے آدمی کا نام پی بچریرا تھا۔ بچریرا ایک سینٹرل ریفریجریٹر کمپنی کے دفتر میں اکاؤنٹنٹ تھا جہاں سے اسے تین سو فرانک ماہوار تنخواہ ملتی تھی۔ مسٹر پی بچریرا کے آٹھ بچے تھے اور نواں دو مہینے تک وارد ہونے والا تھا۔ شہر کے وسیع اخراجات — مسٹر بچریرا کا گزارہ اس تنخواہ میں مشکل سے ہوتا تھا۔ آدمی تیز اور دور اندیش تھا۔ اپنی آمدنی کو بڑھانے کے لیے اس نے سائیکل رکشے کا دھندا شروع کر دیا۔ اس نے پہلے دو رکشے خرید کیے اور انھیں روزانہ ٹھیکے پر چلانا شروع کیا۔ رکشا چلانے والے مزدوروں کی کمی نہ تھی — سارا بافوت ان سے بھرا ہوا تھا۔ اس کام کو اس قدر منفعت بخش پاتے ہوئے اس نے اسے اور بڑھایا۔ چار پانچ مہینے کے اندر اندر اس کے چالیس رکشے شہر میں چل رہے تھے۔ بچریرا کوڑی کوڑی پر جان دینے والا آدمی تھا اور رکشا چلانے کے لیے ایسے آدمیوں کو ڈھونڈتا جو اسے زیادہ سے زیادہ روزانہ دے سکیں اور اس کے احسان کے بوجھ تلے دبے بھی رہیں۔

احمق نے سائیکل کبھی نہ چلایا تھا۔ بچریرا نے اسے دو تین دن رکشا چلانے کی مشق کرائی۔ احمق نے رکشا چلانا شروع کر دیا۔ پہلے تو اس نے بڑا عجیب محسوس کیا۔ وہ زیادہ ٹریفک دیکھ کر اپنی سٹی بھول جاتا۔ کئی بار وہ مرتے مرتے بچا۔ پہلے کئی دن تو وہ چار پانچ فرانک روز سے زیادہ نہ کما سکا۔ بچریرا نے اس کی بالکل پروا نہ کی۔ وہ چپکے سے احمق کی روزانہ کی کمائی اس سے لے لیتا، اور

کھانے کے لیے ایک دو سینٹ اسے دے دیتا۔ ایک دو مہینے میں احمق رکشا چلانے میں کچھ طاق ہو گیا۔ اب پھریرا کے سات فرانک نکالنے کے بعد اسے تین چار سینٹ بچ جاتے تھے۔ لیکن پھر بھی ایک مصیبت یہ تھی کہ کئی دفعہ رکشا چلاتے چلاتے اسے بازار میں زانو یا گنجیا زوشین نظر آ جاتے تھے۔

ایک دن آزادی کے مجسمے کے پاس وہ خالی رکشا چلا رہا تھا کہ یک لخت اسے زانو نظر آ گئی۔ وہ غرارہ پہنے ہوئے تھی اور سر پر ایک انگریزی لیڈیز ہیٹ تھا۔

''زانو! زانو!'' احمق چلایا۔

اس نے رکشے کو زانو کی طرف لے جانے کے لیے موڑا۔ پیچھے سے ایک موٹر ساٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے آ رہی تھی۔ رکشا اس کی جھپیٹ میں آ گیا۔ احمق کا کچلا ہوا جسم کچھ دور تک موٹر کے مڈگارڈ کے ساتھ گھسٹتا ہوا گیا اور موٹر رکنے سے پہلے ہی احمق ٹھنڈا ہو چکا تھا۔

یہ ایک المناک حادثہ تھا—

اور ایسے حادثے بافوت کے شہر میں ہر روز ہوتے ہیں۔

ہونے والا بادشاہ

عظمت اللہ خان انچزئی کو میں نے پہلی بار برٹش کونسل لائبریری میں دیکھا۔ جس کا میں پچھلے اٹھارہ سال سے ممبر چلا آرہا ہوں۔ (میں کسی زمانے میں وہاں دوسرے تیسرے روز سنڈے آبزرور، سنڈے ٹائم، نیو اسٹیٹسمین اینڈ نیشن کا پیروں مطالعہ کرنے اور کتابوں کی رفاقت میں خود کو بھولنے کی خاطر جایا کرتا تھا، مگر اب کبھی کبھار ہی جاتا ہوں۔) ستمبر ۱۹۷۹ء کے دن ہوں گے۔ اس مہتم بالشان واقعے کی تاریخ یاد نہیں۔ ہم (یعنی عربی کا عالم اور سفرنامہ نگار اور ناکام موسیقی اور محقق) لائبریری میں اپنی ہفتوں کی زاد امید، کتابیں لوٹانے گئے تھے۔ میں بیٹھا سنڈے آبزرور کے کتابوں کے صفحوں کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ اچانک اس کی موجودگی سے آگاہ ہوا۔ وہ میز کی دوسری طرف میرے سامنے کھڑا اخباروں کو الٹ پلٹ کر دیکھ رہا تھا جیسے اپنے مطلب کی چیز ڈھونڈ رہا ہو۔ اگلے لمحے اسے وہاں نہ پا کر وہ دوسری میز کی طرف لپکا۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھوں میں ایک بے چین اشتیاق، ایک حریصانہ دریافت کی چاہ سی تھی۔ دوسری میز پر بھی اس نے کچھ رسائل الٹ پلٹ کیے اور پھر لمبے ڈگ بھرتا ہوا وہ تیسری میز پر تھا۔ اس کی غیر معمولی وضع قطع، مستعد حرکات اور عام ہیئت نے میری نگاہوں کو مسخر کر لیا۔ میں نے پہلے سوچا، وہ کوئی افریقی مغربی خطوں کا باشندہ ہے۔ اس کے ذرا بھاری چہرے کی گندمی رنگت میں دودھیا چاکلیٹ کی لاکھی جھلک تھی جو مغربی خطوں کے لوگوں میں ہوتی ہے۔ وہ لمبا تھا اور کسی قدر گٹھیلا۔ سر پر میلی سی رنگین کاڑھے ہوئے کپڑے کی گول ٹوپی، سلیٹی رنگ کا کمبل کاندھوں پر، بسنتی انگرکھا نما کرتا اور پاجامہ، پاؤں میں کھڑاؤں۔ اس کا چوڑا چہرہ ایک پریشان نوکیلی مخروطی داڑھی سے سجا ہوا تھا۔ ہونٹ موٹے، بھرے بھرے اور نرم تھے — افریقی ہونٹ۔ میں نے اسے پہلے کبھی دیکھا تھا؟ اور کینیا کے نجات دہندہ اور پیشوا جوموکنیاٹا کی تصویر میرے ذہن میں آئی۔ وہ جوموکنیاٹا سے انتہائی طور پر مشابہت رکھتا

تھا۔ اس کے افریقی نژاد ہونے کا مجھے تقریباً یقین سا ہو گیا۔ اس حلیے اور ہیئت کے ساتھ وہ برٹش کاؤنسل میں کیا کر رہا ہے؟ کس خاص میگزین یا آرٹیکل کی تلاش میں وہ سرگرداں ہے جو اسے مل نہیں رہا؟

میں اس کی عجیب حرکات کو دیکھتا رہا اور اس کی شخصیت نے مجھے رجھا لیا۔ یہ نہیں کہ عجیب الخلقت لوگ برٹش کاؤنسل میں نہیں آتے: اس عمدہ کتاب خانے میں ہر وضع اور طرز کے لوگ آتے ہیں، اور ایک بار، مجھے یاد ہے، میں نے وہاں گیروے کپڑوں میں ملبوس ایک ہندوستانی سادھو کو دیکھا تھا جو ایک صحرائی جانور لگتا تھا، یا ایک تپسوی جو شاید اپنی اصل زندگی میں ہمالیہ کی چوٹی پر بھبھوت ملے، دھونی رمائے، شیش آسن جمائے، جھگنے منکے سے درست، پر میشور سے لو لگاتا ہوگا۔ (وہ پنچ کے کسی مضمون میں غرق تھا اور دو تین بار فقرے کی مزاحیہ بندش پر اس کے کھلکنے کی آواز بھی سنائی دی۔ جب میں برٹش کاؤنسل میں جاتا، وہ وہاں پنچ یا سنڈے آبزرور یا سنڈے ٹائمز پڑھتا ہوا موجود ہوتا — اور پھر وہ اچانک غائب ہو گیا، شاید واپس اپنی ہمالیہ کی چوٹی پر ڈیرہ جمانے کے لیے۔) ایسے لوگ وہاں آتے ہیں، مگر انسان اپنی تجسس کی حس اور اپنے ہم نفسوں سے تعلق سے اس درجے عاری ہو چکا ہے کہ ان کی طرف دھیان نہیں دیتا، جو میری نظر میں قابلِ افسوس بات ہے۔ اگر ہم دوسروں سے مطلب نہیں رکھتے، ہر ڈگر اور ہر ہیئت کے آدمی سے رفاقت اور دوستی سے بات نہیں کرتے، تو کیا ہم دھتکارے ہوئے بدنصیب نہیں، سب سے تاریک زندان میں قیدی — زندان جو ہماری اپنی ذات کا ہے۔

میں اس آدمی میں مگن تھا۔ میں اس سے پوچھ گچھ کرنے اور یہ جاننے کے لیے کہ وہ کون اور کیا ہے، مر رہا تھا۔ اپنی روح پر پڑے ہوئے جالوں کی وجہ سے یہ میرے لیے آسان بات نہیں تھی۔ میں ایک بے حد شرمیلا، جھینپو اور ڈرپوک سا شخص ہوں اور اجنبیوں سے بات کرنے کے خیال ہی سے میرے دل کی دھڑکن تیز ہو جاتی ہے، ہاتھ پاؤں پسینے پسینے ہو جاتے ہیں۔ اس بار افریقی کو جاننے اور اس سے بات کرنے کی خواہش میری قدرتی جھینپ پر غالب آ گئی۔ اگلی بار جب وہ میری میز پر اپنی میگزین کی تلاش میں آیا اور اس پر پڑے اخباروں کو الٹ پلٹ کرنے لگا تو مجھ سے رہا نہ گیا۔ اپنے میں جرأت پیدا کر کے میں میز کے دوسری طرف گیا، جہاں وہ کھڑا تھا۔ یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ میں بھی کوئی اخبار ڈھونڈ رہا ہوں، میں نے سرسری سے انداز میں اس سے پوچھ ہی لیا، ''ایکسکیوز می، کیا آپ کا تعلق افریقہ یا مغرب سے نہیں؟''

ایک میٹھی رفیقانہ مسکراہٹ اس کے خوشگوار، مطمئن چہرے پر آئی اور اس نے بڑے لطف و کرم سے جواب دیا، ''نہیں، میں افریقہ یا مغربی خطوں کا نہیں۔ پاکستان میرا وطن ہے۔''

میں نے امید کی کہ اپنے سوال سے میں اس کی نظروں میں احمق نہیں بنا۔ اس کے افریقی ہونے کے بارے میں میری تھیوری پر خاک پڑ گئی۔

وہ اپنے بارے میں باتیں کرنے کے لیے تیار تھا، گو وہ ان باتونی اجنبیوں میں سے نہیں تھا جن کی زبان پہلے کھلنے کے بعد قینچی کی طرح چلتی ہے اور جو پہلے ہی جلے میں تمھیں اپنے اور اپنے موروثوں کے کارناموں کی مفصل تاریخ بتا کر دم لیتے ہیں۔ وہ گپی اور فضول گو نہیں تھا۔

اس نے مجھے بتایا کہ اس کا نام عظمت اللہ اچکزئی ہے۔ قیام پاکستان کے وقت وہ سات آٹھ سال کا تھا۔ اصل مولد امروہہ تھا جہاں سے ہجرت کر کے اس کے خاندان کے لوگ کراچی میں آن بسے۔ چند سال پہلے اس نے کراچی یونیورسٹی سے پولیٹکل سائنس میں ایم اے کیا اور اسے ایک اچھی خاصی ملازمت ملی۔ مگر کچھ مدت کے بعد اس کا جی ملازمت سے بھر گیا۔ اس نے استعفیٰ دے دیا۔

''میں تین ماہ سے لاہور میں ہوں۔ یہاں میرا ایک بھائی مغل پورہ ریلوے ورکشاپ میں فورمین ہے۔'' اس نے کہا۔ ''میں اس کے پاس ٹھہرا ہوں۔''

میں نے پوچھا کہ اس نے استعفیٰ کیوں دیا اور اب اپنی معاش کے لیے اس کا کیا کرنے کا ارادہ ہے۔ اس نے کہا کہ اس کی ملازمت اس کے مزاج کے مطابق نہیں تھی اور وہ غلط طریقوں سے روپیہ کمانا نہیں چاہتا تھا۔ پھر ایک پنہاں پراسرار سی مسکراہٹ اس کے چہرے پر کھلی۔ ''وہاں میری زندگی ضائع ہو رہی تھی۔ میں ایک ایمان دار شخص ہوں... ایک اور بات بھی تھی، جسے آپ جلد ہی جان جائیں گے۔ قدرت نے مجھے ایک اور بڑے کام کے لیے بنایا ہے۔''

اس نے یہ بات ایسے بھولپن سے کہی کہ مجھے اس پر ہنسنے کا خیال تک نہ آیا۔ میں نے اپنا سر اثبات میں ہلایا، تعجب کرتے ہوئے کہ اس فقرے سے اس کی مراد کیا تھی۔ تقدیر اس سے کیا کام لینا چاہتی تھی؟ کون سے دور کے افق اس کی حد نظر میں تھے؟ میں خود کو بے جا طور پر متجسس ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔ ہر ایک کے اپنے خواب ہوتے ہیں؛ چند ایک ان کی باتیں کرتے ہیں اور بہت سے ان کو اپنے سینے میں قبر تک لے جاتے ہیں۔

ہم کسی ارادے کے بغیر میز سے ہٹ کر کتابوں کے شیلفوں کے پرسکون خانے میں آ کھڑے ہوئے — دو اجنبیوں کی دوستانہ گفتگو جن کے ستارے ایک دو گھڑی کے لیے آن ملے ہوں، جو ایک دوسرے کے گیان کو جانچ رہے ہوں۔ وہ اپنی عجیب البیئتی کے باوجود پرشفقت، نرم طبیعت، نرم گفتار شخص تھا۔ میں نے نوٹ کیا کہ اس کے گلے میں چاندی کا تعویذ ہے اور بائیں کلائی میں ایک کڑا جس کے سرے سانپ کے منھ کی صورت کوٹے ہوئے تھے۔ دونوں ہاتھوں کی انگلیوں

میں (وہ کھردرے دہقانی ہاتھ نہیں تھے بلکہ نازک اور نفیس، ایک آرٹسٹ اور سوچنے والے کے ہاتھوں کی طرح) پور پور چھلے پہنے، جن میں رنگ برنگے پتھروں کے نگینے جڑے تھے، وہ فی الواقع ایک افریقی چیف کی طرح پر تجمل لگتا تھا، رائیڈر ہیگرڈ کا کوئی کردار۔ کئی ان کہے سوال میرے ہونٹوں پر تھے، جن کا پوچھنا میں نے مناسب نہیں جانا۔

میں نے کہا: ''آپ کو انگریزی ادب سے بڑا لگاؤ معلوم ہوتا ہے۔''

''ہاں، پڑھنا مفید ہے۔''

وہ انگریزی زبان، جس میں ہم گفتگو کر رہے تھے، ہچک ہچک کر بولتا تھا مگر وضاحت کے ساتھ، بناوٹی لہجے کے ہلکے سے شائبے کے بغیر، کیونکہ وہ ایک سادہ اور بے میل آدمی تھا۔

''ادب سے اگر آپ کا مطلب فکشن وغیرہ سے ہے تو مجھے اس کا قطعی شوق نہیں۔ فکشن کا مطالعہ تضیع اوقات نہیں تو اور کیا ہے؟ جب میں لاہور میں ہوں، میں برٹش کونسل تقریباً روزانہ آتا ہوں۔ میں ٹائمز، آبزرور کے سیاسی صفحات، نیو اسٹیٹسمین اینڈ نیشن، اسپیکٹیٹر، اکانومسٹ اور دوسرے انگریزی رسائل بغور دیکھتا ہوں۔ وقت گزاری کے لیے نہیں بلکہ اس لیے کہ میں کم سے کم وقت میں سیاسیات پر عبور حاصل کر لوں۔ ان رسائل میں بڑے کام کی باتیں ہوتی ہیں، اور لیڈروں کی سیاسی غلطیوں اور فروگزاشتوں کا پتا چلتا ہے جن کی وجہ سے وہ مار کھا گئے اور طاقت ان کے ہاتھ سے چلی گئی — جب میں سمجھوں گا کہ مجھے سیاسی علم پر مکمل ماسٹری ہو گئی ہے تو ایک مملکت کا راج پاٹ مجھے مل جائے گا۔ (I will get a country.) ابھی میں نے سیاسیات کو پوری طرح قابو میں نہیں کیا لیکن وہ وقت اب دور نہیں۔''

میں اس غیر متوقع انکشاف پر ایک بار ہل گیا۔ کیا عظمت اللہ اچکزئی کا دماغ درست حالت میں تھا؟ پھر میں نے سوچا کہ اگر وہ سودائی ہے تو کیا دنیا کے ممالک کے رہنما پریزیڈنٹ اور بادشاہ سب ہوش مند اور صحیح الدماغ تھے؟ ہوش مندی مختلف لوگوں میں مختلف نوعیت اور ڈھنگ کی ہوتی ہے۔

سو میں نے اپنا چہرہ سیدھا رکھا اور اس کی بات پر حیران ہوئے بغیر متانت سے پوچھا: ''کیا آپ پاکستان کا نظم و نسق سنبھالنے والے ہیں؟''

میں اس کے کھیل میں پورے خلوص اور دردمندی سے شریک ہو گیا (وہ اتنا شفیق، حلیم اور نرم مزاج تھا!) اور اگر تم سمجھتے ہو کہ میں دل ہی دل میں ہنس رہا تھا اور اس کی ٹانگ کھینچ رہا تھا تو تم غلطی پر ہو۔ میں نے اسے گوف (goof) نہیں سمجھا۔ اس نے شاید ایسے احمقانہ سوال پوچھنے پر مجھے گوف جانا، کیونکہ ایک عیارانہ سیاسی سی مسکراہٹ اس کے بھرے گیلے ہونٹوں میں نمودار ہوئی۔ اس کے

بھولے متین چہرے پر ہوشیاری کا سایہ سا گزرا (میں نے سوچا)۔ ایک سیاسی سوجھ بوجھ رکھنے والے شخص کی مانند اس نے اس سوال کا صاف اور واضح جواب دینے سے گریز کیا۔

''اس سوال کا جواب اس مرحلے پر دینے کی مجھے اجازت نہیں۔'' اچھڑی نے ہائی لاٹ کا سگرٹ سلگایا۔ وہ ایک چین اسموکر تھا۔

''پاکستان کی تخصیص نہیں، کوئی بھی مملکت مجھے مل سکتی ہے۔ ابھی یہ طے نہیں ہوا۔ اس کا فیصلہ تب ہوگا جب میری سیاسی بصیرت مکمل ہو جائے گی — یعنی دنیا کے موجودہ سربراہوں سے بڑھ چڑھ کر۔ میں ان کی سیاسی غلطیاں کبھی نہیں کروں گا اور اس لیے لوگ مجھے ہمیشہ اقتدار کی کرسی پر رکھیں گے۔''

اس نے مجھے سمجھایا کہ اس وقت دنیا کے ملکوں کے سربراہوں میں سیاست کے علم کا فقدان ہے۔ ان کو اتنی دسترس نہیں جو اسے اس وقت بھی حاصل ہے۔ اسی لیے وہ ایسی فاش سیاسی غلطیاں کر بیٹھتے ہیں کہ ان کی مملکتوں میں گڑھوں کے جال بچھ جاتے ہیں اور اقتدار کی کرسی ان کے تلے سے کھنچ جاتی ہے۔ اس کی سیاسی بصیرت اتنی بے عیب ہوگی کہ لوگ اس کی حکومت سے روگردانی نہیں کریں گے۔ دوسری مملکتیں بھی اس کو اپنا سربراہ بننے کی دعوت دیں گی۔ میں نے پوچھا کہ آیا اس نے اقتدار حاصل کرنے کے لیے کوئی سیاسی پارٹی بنائی ہے۔ اس نے بھولپن اور اعتماد سے جواب دیا کہ جب وہ سیاسی مسائل پر مکمل طور پر حاوی ہو جائے گا تو لوگ جان لیں گے کہ ملکی امور کو سلجھانے کے لیے اس سے بہتر آدمی موجود نہیں۔ وہ خود ہی اسے اقتدار سونپ دیں گے اور اپنا حکمراں منتخب کرلیں گے۔ وہ اس کا ہر معاملے، ہر کڑے وقت میں ساتھ دیں گے، کیونکہ ان کو اس کے فرمانروا ہونے کی اہلیت کا علم ہوگا۔ میں نے اس سے اسلامی نظام، جمہوریت، سوشلزم کے متعلق کچھ بحث کرنے کی کوشش کی مگر میں نے بھانپ لیا کہ انگریزی رسائل اور مجلوں کے بغور مطالعے کے باوجود اس کا سیاسی اور معاشی نظریات کا علم ایک بچے کا سا ہے۔ اس کو ان نظریات میں قطعی دلچسپی نہیں تھی، اور وہ معصومیت سے یہ سمجھتا تھا کہ سیاسیات پر عبور کے بعد لوگ خود اس کے پاس چل کر آئیں گے اور اس سے حاکم بننے کی درخواست کریں گے۔ پارٹی سسٹم کو شاید وہ سمجھتا ہی نہ تھا۔ اس کی اسے پروا نہیں تھی اور اس کا فرمانروائی کا concept منتخب جمہوری صدر یا پرائم منسٹر بننے سے کہیں آگے کا تھا — وہ بادشاہ بنے گا: اپنے ملک کے سیاہ و سفید کا مختار، زربفت کے فرغل، ہیروں کے تاج اور عصائے شاہی کے ساتھ ایک اصلی بادشاہ، جسے لوگ خود جڑاؤ تخت پر لاکر بٹھائیں گے کیونکہ اس کا علم سیاست و جہاں بانی سب ملکوں کے فرمانرواؤں سے کہیں زیادہ صائب اور اعلیٰ مرتبے کا

ہوگا۔ عظمت اللہ اچکزئی، میں نے سوچا، فی الواقع ایک افریقی چیف ہے! اس میں کوئی کلام نہیں کہ سر سے پیر تک وہ رائل لگتا تھا — سنجیدہ، پروقار، انگلیوں کے پور پور چھلّے — کیا یہ چھلّے رائلٹی کا نشان تھے؟

"جب مجھے کوئی ملک ملنے کا وقت آیا،" اس نے ہائی لائٹ چھوکتے ہوئے کہا، "میں آپ کو اطلاع دوں گا۔ دعا کریں کہ میں جلد سیاسیات پر عبور پالوں۔ بس یہی دیر ہے۔"

مجھے ہائی لائٹ پیش کرتے ہوئے اس ہونے والے بادشاہ نے شفقت اور گرمی کے انداز میں مجھ سے میرے بارے میں پوچھا۔ میں کون تھا اور کس پیشے میں کیا کام کرتا تھا۔ میرے بچے کتنے تھے اور ان کی عمریں کتنی تھیں۔ میں نے اسے بتایا۔ اور جب میں نے اسے کہا کہ میں اب پنشن سے پہلے کی لمبی چھٹی پر ہوں، اور میرے بچے ابھی اسکول میں ہیں اور ان میں سے کوئی فارغ التحصیل ہوکر اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوا، تو مجھے کچھ کچھ امید تھی کہ میری آنے والی مشکلات کو دیکھتے ہوئے وہ مجھے اپنی مملکت میں پرائم منسٹر یا منسٹر آف ٹیلنا لوجی کے عہدے کی پیشکش کرے گا۔ (تم جانو، میں یہ کھیل پوری سنجیدگی سے کھیل رہا تھا۔) اس نے اس قسم کی کوئی پیشکش نہیں کی، مگر چند اچھے دنیاداری کے مشورے دیے جو اس کی میرے معاملات میں دلچسپی کو ظاہر کرتے تھے۔ میں یہ جان کر حیران ہوا کہ یہ بظاہر معصوم سا آدمی ان مشکلات سے پوری طرح واقف تھا جو ایک حکومت کے ملازم کو پنشن کے بعد پیش آتی ہیں۔ وہ جانتا تھا کہ سرکاری خزانے سے پنشن وصول کرنا خالہ جی کا گھر نہیں ہے۔ اس نے مجھے نصیحت کی کہ میں ابھی سے اپنی پنشن کے کاغذات مکمل کرالوں ورنہ بعد میں بڑی مشکل ہوگی اور در در کی ٹھوکریں کھانا پڑیں گی۔ گریجویٹی کی رقم کے بارے میں اس کا مشورہ تھا کہ میں اس میں سے ایک پائی بھی خرچ نہ کروں اور ساری کی ساری رقم کسی بینک میں فکسڈ ڈپازٹ کے کھاتے میں جمع کرادوں — منسٹر آف ٹیلنا لوجی کے عہدے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں، جس سے مجھے کچھ مایوسی ہوئی۔ میرے اس سوال کے جواب میں کہ کس قسم کی حکومت اپنی نئی مملکت میں قائم کرنے کا ارادہ اس کے ذہن میں تھا، اس نے مسکراتے ہوئے مبہم طریق سے کہا، "میں اپنے منصوبے کو آخری شکل دے رہا ہوں۔ یہ ایک حقیقی یوٹوپیا ہوگا اس میں کوئی بھوکا نہیں سوئے گا، سب کے لیے عدل و انصاف ہوگا اور سب ایک دوسرے سے محبت کریں گے۔ میں پولیس رکھنے کے حق میں نہیں۔ جب کوئی کسی پر ظلم نہیں توڑے گا، کسی کے حق کو نہیں مارے گا، تو پولیس کیوں؟"

میں کئی اور دوسرے سوالات اس سے اس کی نئی مملکت اور خود اس کے بارے میں پوچھنے کا آرزومند تھا۔ (کیا اس کی کوئی جنسی زندگی تھی اور کس قسم کی؟!) مگر میرے دوست کاؤنٹر پر اپنی نئی

کتابیں اشوکر کے میرا انتظار کر رہے تھے — مجھے حیران کہ میں ایک عجیب البیت مخلوق سے کیا باتیں کر رہا ہوں۔ میں نے عظمت اللہ اچکزئی سے دوبارہ ملاقات کی تمنا کا اظہار کر کے رخصت چاہی، اس سے ہاتھ ملایا — ایک چکنا ڈھیلا ہاتھ! (میرے خیال میں بادشاہوں اور سربراہان مملکت تاجداروں کے ہاتھ اپنے وزیروں اور درباریوں سے مصافحہ کرتے وقت ایسے ہی ڈھیلے ہوتے ہیں۔) میں جانے لگا تو اس نے کہا۔ "آپ ابھی اس بات کا کسی سے ذکر نہ کریں۔ وقت آنے پر سب جان لیں گے..."

"بہت اچھا۔"

میں نے اپنا قول نبھایا اور جب میرے ساتھیوں نے پوچھا کہ میں اس آدمی سے گھل مل کر کیا باتیں کر رہا تھا تو میں نے بات کا رخ بدل دیا۔ انھوں نے بھی تقاضا نہیں کیا، کیونکہ عظمت اللہ اچکزئی کی ذات میں ان کی دلچسپی اتنی ہی تھی جتنی ایک آوارہ کتے میں۔

*

عظمت اللہ اچکزئی بھول جانے کی چیز نہ تھا۔ اس کی پرکشش، اٹل شخصیت میرے خیالوں میں رہی۔ جب کبھی میں برٹش کاؤنسل لائبریری میں جاتا، میری آنکھیں اسے ضرور ڈھونڈتیں۔ اور ایک دن وہ مجھے وہاں بیٹھا مل گیا۔ وہ کتابوں کے طاقوں کے خانے میں ایک میز پر بیٹھا، اپنے بائیں لاٹ کا دھواں اڑاتا، سنڈے آبزرور پڑھنے میں منہمک تھا — شانت اور مطمئن۔ اس کی انگلیوں کے چھلوں کے بڑے بڑے پتھر پنکھے پن سے دمک رہے تھے۔ میں اس کی طرف گیا۔ اس نے مجھے دیکھا اور ایک تپاک کی میٹھی مسکراہٹ مجھے دی۔ ہونے والا بادشاہ دو مہینے بعد بھی مجھے نہیں بھولا تھا۔ بیٹھے بیٹھے اس نے میری طرف اپنا ڈھیلا ہاتھ بڑھایا۔

میں اس کے ساتھ کی کرسی پر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کی خیریت دریافت کی اور اس سے پوچھا کہ اس کی سیاسیات پر کامل ماسٹری اب کتنی دور ہے؟ اور اس کے حصول میں اب مزید کتنا وقت لگے گا۔ اس نے سیدھا جواب نہ دیا۔ اس کی بڑی سیاہ آنکھوں میں ایک ظفریابی کی چمک تھی اور چہرے پر شادمانی کی کیفیت۔

"دوست! بس کام ہو گیا ہے۔ آپ جلد ہی خوشخبری سنیں گے..."

"سچ مچ، عظمت اللہ صاحب؟"

"ہاں دس دسمبر اور پندرہ دسمبر کے درمیان کسی دن مجھے ملک مل جائے گا — یہ یقینی ہے اور اس کا فیصلہ ہو چکا ہے — میرے حامی جمع ہونے والے ہیں۔"

"کانگریچولیشنز! بہت بہت مبارکباد۔"

مملکت میں میرے نئے عہدے کے بارے میں ایک لفظ بھی نہیں! کیا عظمت اللہ اچکزئی کو پتا نہیں تھا کہ میں ریٹائر ہو رہا ہوں اور میرے پاس رہنے کو گھر نہیں؟ میں نے خود کو اس قسم کا کوئی اشارہ دینے سے روکا۔ بادشاہ متلون مزاج ہوتے ہیں؛ ان کے منھ آنا اچھا نہیں ہوتا۔

ہم نے پانچ دس منٹ اودھر اُدھر کی باتیں کیں اور پھر میں نے اس سے رخصت لی۔

☆

وہ عظمت اللہ اچکزئی سے میری آخری ملاقات تھی۔ اس کے بعد میں اسے نہیں ملا۔ میں نہیں جانتا کہ آیا اسے اپنی مملکت کی فرمانروائی، جس کی دھن وہ باندھے تھا، ماہ دسمبر کے موعودہ دنوں میں ملی یا نہیں۔ (میں ایک مدت سے اخبار نہیں پڑھتا، نہ ٹیلی وژن دیکھتا ہوں۔) میں دل سے یقین کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ماورائی مملکت، جو اس زمین پر غالباً نہیں، اس کو آخرکار مل گئی ہے اور وہ مسرور اور مطمئن مردوں اور عورتوں کی کسی نسل پر (جو اس مملکت کے باسی ہیں) عدل و انصاف اور کشادہ دلی سے حکومت کر رہا ہے۔ اس کے یوٹوپیا میں رعایا پر گھٹن اور دکھ کے بادل نہیں چھاتے۔ وہ فکر سے آزاد گلی کوچوں میں گاتے اور ناچتے ہیں اور دنیا کے سارے فرمانرواؤں اور شہنشاہوں کو اپنے بادشاہ ہز میجسٹی عظمت اللہ اچکزئی کے سامنے سیاسی بصیرت اور جہاں بانی کے آداب میں ہیچ جانتے ہیں۔ ہاں، اچکزئی کو مملکت ضرور مل گئی ہے کیونکہ وہ بہت سوں سے زیادہ اپنی وضع اور طریقے میں 'راُئل' تھا۔

کیا عظمت اللہ اچکزئی اپنی حکومت کا پرشکوہ وژن دیکھنے کی بنا پر پاگل تھا؟ میں نہیں جانتا۔ وہ ہوتا بھی تو کیا؟ ان میں سے تقریباً سب کے سب پاگل ہیں۔

فلاریزل

(بوہیمیا کا شاہزادہ)

زندگی کی شاہراہ پر بعض وقت ایک ایسا آدمی ہمارا راستہ کاٹتا ہے جو چند منٹ کی بات چیت میں اپنی آنکھوں یا اپنے انداز کی کسی عجیب طاقت سے ہمیں مسخر کر لیتا ہے اور ہم اسے مدتوں نہیں بھولتے۔ ہم اس کی گویا ایک جھلک دیکھتے ہیں اور اس سرسری اور وقتی ملاقات کے باوجود اس کی صورت ہمارے ذہن میں ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جاتی ہے۔ وہ ہماری زندگی کا ایک جزو بن جاتا ہے۔ ایسے ہی ایک آدمی سے ایک دفعہ میری ملاقات ہوئی۔

مہینہ مجھے یاد نہیں۔ سال برکت کا سال ۱۹۵۲ء تھا۔ میرا ایک دوست اور میں آدھی رات کے وقت غالباً کسی پکچر کا سیکنڈ شو دیکھ کر گھر لوٹ رہے تھے۔ رات کافی جا چکی تھی۔ بندر روڈ کی گہما گہمی سرد پڑ چکی تھی اور دکانیں کبھی کی بند ہو چکی تھیں۔ سڑک پر بہت کم لوگ چل پھر رہے تھے۔ لکشمی انشورنس بلڈنگ سے چند قدم آگے ہم ایک کیفے کے سامنے پہنچے جو ابھی تک کھلا تھا۔ ہم چائے پینے اس میں جا بیٹھے۔ یہ پتھر کے تختوں کی چھوٹی میزوں اور نئی سرخ گدے والی کرسیوں سے آراستہ تھا، نیون کی سفید بھڑک سے دن کی طرح روشن۔ دیواروں پر جڑے ہوئے چوکھٹوں میں کسی افسانوی دیس کے شاہزادوں اور شاہزادیوں کی تصویریں تھیں، جو اس کیفے میں ایک خوشگوار غیر حقیقی سا تاثر پیدا کر رہی تھیں۔ کاؤنٹر کے پیچھے کیفے کا ایرانی مالک میدے کی رنگت کا ایک نرم رو نوجوان تھا — آسودہ خاطر، مطمئن! سب ایرانی کیفے والے ایک ہی کنبے کے افراد معلوم ہوتے ہیں، ایک ہی ٹکسال کے ڈھلے ہوئے، زنانہ، پلپلے، سفید آدمی جن کی دل جمعی اور لاتعلقی پر حیرت ہوتی ہے اور جھنجھلاہٹ بھی۔ شاید اس سکون کی وجہ ان کے کیفوں کی مستقل آمدنی ہے یا شاید دیواروں پر لگے

شاہزادے اور شاہزادیاں اس کا سبب ہیں، یا یہ ان کے آتش پرست خون میں کسی خلقی شے کا اثر ہے۔ مجھے یہ ایرانی کیفے والے ہمیشہ کچھ غیر حقیقی سے لگتے ہیں، جیسے ان کا اس دنیا سے کچھ واسطہ نہ ہو جس میں ہم آپ رہتے ہیں — جدوجہد، تلخ کلامی اور چھینا جھپٹی کی بخار زدہ دنیا۔

ٹیبل والے نے ہمارے سامنے چائے کے دو پیالے اور پانی کے دو گلاس لا کر رکھ دیے اور ہم چائے کو — یا اس گاڑھی، میٹھی اور کڑوی سیال شے کو جو ان ایرانی کیفوں میں چائے کے نام سے چلتی ہے — سڑکنے لگے۔ اتنے میں کھلے دروازے میں سے تین غیر ملکی ملاح کیفے میں داخل ہوئے۔ وہ نیوی کے گہرے نیلے سوٹ پہنے ہوئے تھے جو ساری دنیا کے ملاحوں کا پہناوا ہے۔ ان میں سے ایک نے آتے ہی سب کی توجہ اپنی طرف منعطف کر لی۔ وہ مردانہ وجاہت و حسن کا مکمل نمونہ تھا — گورا چٹا، مناسب خدوخال اور نیلی پُرحرارت آنکھیں۔ اس کے بال شہد کی رنگت کے گھنگھریالے تھے اور پیشانی کشادہ اور روشن۔ کئی ملاحوں کی طرح اس کی داڑھی بھی تھی، ریشم کی سی ملائم، خوش قطع، سنہری داڑھی، جو اس کے چوڑے خوبصورت چہرے پر خوب پھبتی تھی اور اس کے حسن میں اضافہ کرتی تھی۔ اسے دیکھ کر ایسا لگتا تھا جیسے کسی یونانی ماہر الاصنام کا تراشا ہوا دیوتا کیفے میں آ گیا ہو۔ اس کی نیلی دمکتی آنکھوں سے ایسی صحت، شادمانی اور دوستی کی کرنیں پھوٹ رہی تھیں کہ کیفے میں ہر اداس اور بجھا ہوا دل خوشی اور امید سے اچھلنے لگا۔

اس دنیا میں ابھی ایسے آدمی بھی ہیں! — میں نے اپنے آپ سے کہا۔

اس کے دو ساتھیوں میں کوئی خاص بات مائل کرنے والی نہ تھی۔ وہ بالکل عام غیر ملکی ملاحوں کی مانند تھے — گھٹے ہوئے، قدرے وحشیانہ، ٹیڑھے میڑھے چہرے۔ وہ پورے آدمیوں کے بجائے لڑکے لگتے تھے۔

تینوں درمیانی قطار میں ہمارے نزدیک کی میز پر آ بیٹھے۔ ایسے غیر معمولی گاہک ایرانی کیفوں میں شاذ و نادر ہی ٹپکتے ہیں۔ کچھ تو اس وجہ سے اور کچھ اس لیے کہ سنہری داڑھی والا شخص ایک شاہانہ وقار لیے ہوئے تھا، کیفے کا مالک خود کاؤنٹر کے پیچھے سے نکل کر انھیں بٹھانے کے لیے آیا۔ اس نے خود ان کا آرڈر لیا جو سنہری داڑھی والے نے دیا۔ اس کی آواز گونجیلی اور جاندار تھی، مگر اس میں رس اور لوچ بھی تھا۔

اس نے آملیٹ اور تلے ہوئے آلوؤں اور چائے کا آرڈر رکتی ہوئی انگریزی میں اور کئی اونچے اونچے قہقہوں کے ساتھ دیا۔ اکثر وہ اپنے ساتھیوں سے کسی اجنبی زبان میں مشورہ کرتا۔ اسے ایرانی کو اپنا مطلب سمجھانے میں کچھ دقت محسوس ہو رہی تھی اور اس نے دو تین بار مسکراتی آنکھوں

سے میری طرف مدد کے لیے دیکھا۔ میں نے آخر ایرانی کو سمجھایا کہ اس کے مہمان کیا چاہتے ہیں اور سنہری داڑھی والے نے میرا شکریہ ادا کیا۔

اچانک مجھے اس خوبصورت ملاح کا چہرہ جانا پہچانا محسوس ہونے لگا، جیسے میں اسے ایک مدت سے جانتا ہوں۔ میں اس سے کہاں ملا تھا؟ مجھے یاد آیا۔ میں اسے گوشت پوست میں تو پہلے کبھی نہ ملا تھا مگر اسٹیونسن کی نئی الف لیلہ کے صفحوں میں بوہیمیا کے شاہزادے فلاریزل کی حیثیت سے میں اس سے بڑی اچھی طرح متعارف ہو چکا تھا۔ فلاریزل میرا ایک پیارا اور دیرینہ دوست تھا — وہ فیاض اور عادل شاہزادہ جس کے حسن و جمال اور پرکشش انداز نے بھی سارے لندن کا دل جیت لیا تھا۔ تو فلاریزل اب کراچی میں ہے — ایک عام ملاح کا بھیس بدلے ہوئے، مگر خاندانی نجابت اور شائستگی کیسے چھپی رہ سکتی ہے۔

اب خدا جانے کس مطلب سے اس نے یہ دھج بنا رکھی ہے اور کون سی انوکھی اور خطرناک ایڈونچر کے اسرار کی عقدہ کشائی اس کی مہذب نظر کے سامنے ہے۔ ممکن ہے اس کے ساتھیوں میں سے ایک سمندری آدمی کے روپ میں اس کا سردار اسپ خانہ، بہادر اور مستعد کرنل جیرالڈین ہو — سنسنی اور مسرت کی ایک لہر میرے بدن میں دوڑ گئی۔ میں ان کم ہمت، دو ٹکے کے، بزدل شہریوں میں سے ہوں جو اپنی پرسکون، قدرے بے رنگ زندگی میں ہر لحظہ گھر کے پاس کسی ہوشربا رومانس اور ایڈونچر کے متوقع رہتے ہیں۔

وہ کھانے کا انتظار کرنے لگے۔

شاہزادہ فلاریزل کیفے میں ہر چیز کو حیرت و مسرت سے دیکھ رہا تھا، جیسے میلے میں کوئی مسرور اور شریر لڑکا، وہ کبھی میز کو اپنی انگلیوں سے بجاتا، کبھی سیٹی کی تال پر گیت گانے لگتا اور اپنے ساتھیوں سے دل لگی کرتا۔

کیفے کے اداس اونگھتے ماحول میں زندگی کی حرارت اور تابناکی پیدا ہوگئی اور کیفے ایک مختلف جگہ بن گئی۔ نیون کی چکا چوند پہلے سے کئی گنا بڑھ گئی۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ ایک مسرور دل ایک سلطنت سے بہتر ہے — اور فلاریزل میں کس قدر زندگی تھی!

میری بڑی خواہش تھی کہ اس سے بات کا کوئی بہانہ نکلے مگر اس تقریب کے لیے موزوں الفاظ نہ ملتے تھے۔ شرمیلے آدمیوں کی طرح میں کئی بار اس سے کچھ پوچھتے پوچھتے رہ گیا۔ آخر فلاریزل نے خود ہی پہل کی۔ اس نے مجھے اپنی چھلکتی ہوئی مسرت میں شریک کرنے کے لیے ایک آنکھ میچی اور سر کا ہلکا سا اشارہ کیا۔ ان حرکات کو الفاظ میں اس طرح ادا کر سکتے ہیں:

''ہیلو چم! ڈوئنگ ویل؟'' (Hello chum, doing well?)

''نائس کینٹے!'' اس نے کہا۔

''نائس!'' میں نے کہا۔

''یہ شاہزادے اور شاہزادیاں کون ہیں؟'' اس نے دیواروں پر چاروں طرف نظریں دوڑاتے ہوئے انگریزی زبان میں کہا۔ ''کیفے کا پروپرائٹر شہنشاہیت کا بڑا شوقین معلوم ہوتا ہے۔''

''ہاں!'' میں نے کہا، ''سابق معزول شاہ اور مرحوم شہنشاہیت کا! وہ تصویر افغانستان کے سابق شہنشاہ امان اللہ خاں کی ہے، جو اب اٹلی میں غالباً ہوٹل چلاتے ہیں۔ اور وہ مصر کا سابق بادشاہ فاروق ہے، جب وہ نیا نیا تخت نشین ہوا تھا۔ وہ بھی اب اٹلی میں ہے، اور نائٹ کلبوں کی ایک آشنا صورت۔ وہ رضا شاہ پہلوی ہے۔ وہ مر چکا ہے۔ وہ ملکہ وکٹوریہ ہے، جب وہ نئی نئی تخت پر بیٹھی تھی اور ایک جوان لڑکی تھی۔ وہ بوڑھی ہو کر انیسویں صدی کے آخیر میں فوت ہوئی مگر اس کیفے میں وہ ہمیشہ خوبصورت اور معصوم اور جوان رہے گی۔''

اس نے ایک بھرپور پرمسرت قہقہہ لگایا — اس کے دانت مضبوط اور ہموار تھے، اور موتیوں کی طرح آبدار۔

''یہ کیفے کے پروپرائٹر کا عجیب مذاق ہے!'' اس نے کہا۔ ''مگر ایک لحاظ سے وہ سچا ہے۔ مرے ہوئے اور زندہ بادشاہوں میں اول تو کوئی فرق نہیں اور پھر اب بادشاہوں کا زمانہ ختم ہو چکا ہے۔ دنیا میں کل چار پانچ بادشاہ لے دے کے رہ گئے ہیں۔ اگر ایک شخص بادشاہت سے محبت کرتا ہے تو یہ بہتر ہے کہ وہ پرانے بادشاہوں کی تصویروں سے دیواروں کو سجائے۔ ان میں تمھارے نئے بادشاہوں سے زیادہ گلیمر (glamour) ہے۔''

''تم انگریز ہو؟'' میں نے پوچھا۔

''نہیں!'' وہ بولا۔ ''میرا وطن ناروے ہے — یعنی یہ کہ ناروے میں پیدا ہوا اور وہیں بڑھا پلا — مگر میں اپنے کو دنیا کا شہری بتانا زیادہ پسند کرتا ہوں۔ سارے ملک میرے ملک ہیں اور میں سب نسلوں اور قوموں کو بیلانگ (belong) کرتا ہوں۔ میں انگلش ہوں اور امریکن، میں فرانسیسی ہوں اور چینی، اور تم مجھے نیگرو بھی کہہ سکتے ہو۔ میں تنگ اور محدود قومیت پسندی اور حب الوطنی میں یقین نہیں رکھتا جس نے انسانوں کو مختلف گروہوں اور خانوں میں بانٹ رکھا ہے۔ سب انسان بھائی ہیں، سب ایک ہی کنبے کے افراد ہیں اور ساری زمین کی دولت ان کی میراث ہے۔''

''کیا تم یہ نہیں سمجھتے کہ دنیا کو اس منزل پر پہنچنے کے لیے جس کا تصور تمھارے ذہن میں ہے،

ابھی بڑی مدت درکار ہے؟"

"نہیں،" اس نے بڑی سنجیدگی سے کہا، "وہ وقت اب نزدیک ہے جب قوم، نسل اور ملک کا امتیاز مٹ جائے گا اور سب لوگ بھائی بھائی بن جائیں گے۔ ہم سب جرمن، امریکن یا روسی کہلانے کے بجائے انسان کہلانا زیادہ پسند کریں گے۔ ملکوں اور قوموں میں تباہ کن جنگیں نہ ہوں گی اور زمین پر امن اور خوشحالی کی حکمرانی ہوگی۔ میں تمھیں یقین دلاتا ہوں، وہ وقت اب آ رہا ہے۔ قومیت اور ملک کا تصور اب اتنا پرانا اور فرسودہ نظر آتا ہے جیسے یہ دیواروں پر ٹنگے ہوئے بادشاہوں کے پورٹریٹ۔" اس کے چہرے پر یہ کہتے ہوئے کسی یوٹوپیا کے جنونی کا تناؤ نہ تھا بلکہ ایک نہایت دل آویز شگفتہ تبسم۔ اس کی نیلی آنکھوں میں خوشی، محبت اور رفاقت کی تابندگی تھی اور وہ آنے والے یوٹوپیا کے بارے میں اس قدر پر یقین تھا کہ میں اپنے وسوسوں کو بالائے طاق رکھ کر اس کی ہم نوائی کا دم بھرے بغیر نہ رہ سکا۔

ان کا کھانا اب ان کے سامنے رکھا جا چکا تھا — آملیٹ اور تلے ہوئے آلوؤں کے قتلوں کی چکنی پلیٹیں، کسی قدر میلے چھری اور کانٹے اور ایش کی چائے کا ایک بڑا پاٹ۔ وہ کھانے لگے۔ یا تو وہ زیادہ بھوکے نہ تھے اور یا چکنا، تیز مصالحے دار کھانا ان کی طبیعت اور ذائقے کو نہ بھایا۔ فاریزل کے ساتھیوں نے دو تین لقمے زہر مار کر کے چھری کانٹے رکھ دیے اور پلیٹیں ایک طرف سرکا دیں۔ فاریزل بظاہر چاؤ اور رغبت سے بڑے لقموں میں کھاتا رہا؛ اس کا دل اتنا بڑا تھا کہ وہ کیفے والوں کی دل شکنی نہ کرنا چاہتا تھا۔

"میں یہ کھا سکتا ہوں،" اس نے مجھے آنکھ ماری۔ "میں دنیا کا شہری ہوں۔ آہ، مشرقی خطوں کے گرم خوشبودار مسالے! میں ان سے کس قدر محبت کرتا ہوں۔"

"تمھارے ساتھیوں کو یہ کھانا پسند نہیں آیا،" میں نے معذرت کی، جیسے میں اس کا کسی حد تک ذمے دار ہوں۔ "غالباً یہ بہت گرم، مسالے دار اور چٹ پٹا ہے — اور ہم اتنے صاف ستھرے بھی نہیں۔"

"نہیں،" اس نے ایک چمکیلی دوستانہ مسکراہٹ سے کہا، "یہ بات نہیں۔ لوگ ہر جگہ اور ہر ملک میں ایک سے ہیں۔ میں نے یورپ میں اس کیفے سے کہیں زیادہ غلیظ جگہوں میں کھانا کھایا ہے اور اس سے کہیں برا کھانا — یہ کیفے ان کے مقابلے میں جنت ہے۔ تم ایک ایسے ملک میں جہاں حد درجہ غربت، فلاکت اور بھوک ہو، جیسا کہ یہ خطہ ہے، وہاں صفائی اور صحت کے اصولوں کی پابندی کی کیسے توقع کر سکتے ہو؟ چیانگ کائی شک کے چین میں، چین کے شہروں کے بازار اور کوچے غلاظت

اور تعفن سے اٹے ہوتے تھے۔ کوڑے کے انبار اور مرے ہوئے کتے ہر جگہ ملتے تھے۔ اب ماؤزے تنگ کے چین میں جاؤ — تم لوگوں میں صفائی اور ستھرے پن کا ایک نیا احساس پاؤ گے۔ وہی بازار اب شیشے کی طرح دمکتے ہیں؛ نہ کوڑے کے انبار ہیں نہ مردہ کتے۔ تم لوگوں کو الزام نہیں دے سکتے۔ جب تک لوگ غربت اور جہالت کے بوجھ تلے دبے ہیں اور ایک نامنصفانہ نظام انھیں مفلوج کیے ہوئے ہے اور ان کا ملک ان کا ملک نہیں ہے، اس وقت تک ان سے اس قسم کی باتوں کی توقع عبث ہے۔ وہ اپنے کو صفائی اور حفظانِ صحت کے متعلق کیوں پریشان کریں؟ کیا ان کے پاس اس کے لیے وقت ہے؟''

''کیا تم کمیونسٹ ہو؟'' میں نے بے اختیار پوچھا۔ میں نے یہ سوال کیوں کیا؟ شاید اس لیے کہ اس نے ماؤزے تنگ کے چین کا ذکر کیا تھا اور موجودہ استعمار پسندانہ نظام کو نامنصفانہ کہا تھا۔ میں نے اندازہ لگا لیا کہ ہو نہ ہو وہ ضرور کمیونسٹ ہے۔ اس سے زیادہ احمقانہ سوال اور کوئی نہیں ہو سکتا تھا!

لیکن میرے اس سوال پر برا ماننے کی بجائے اس نے صرف ایک قہقہہ لگایا۔

''میرے دوست، میں ایک انسان ہوں اور بس۔ اگر تم جنگ، بیماری اور افلاس کا تذکرہ کرنے والوں کو کمیونسٹ کہہ کر خوش ہو سکتے ہو تو تمھیں اختیار ہے۔''

''مگر یہ رجمنٹیشن (regimentation) یہ آزادیِ خیال و فکر پر کڑا احتساب، جو کمیونسٹ ملکوں میں ہے، کیا تم سمجھتے ہو یہ اچھی بات ہے؟'' اس خیال نے مجھے بے حد محظوظ کیا کہ میرا شاہزادہ فلاریزل اب بیسویں صدی میں اشتراکی بن گیا ہے۔

فلاریزل پھر اپنی دلآویز، مشفق ہنسی ہنسا۔

''ہا ہا ہا۔ میرے دوست! میں شرط باندھتا ہوں کہ بڑے عرصے سے امریکن رسالے اور اخبار تمھارے زیرِ مطالعہ رہے ہیں۔ ان میں ہمیشہ کمیونسٹ ملکوں میں اس آہنی پردے اور اس خیال کی رجمنٹیشن کے چرچے ہوتے ہیں۔ ان کو یہ باتیں خوب جچتی ہیں! لیکن وہ اس آہنی پردے کا ذکر کیوں بھول جاتے ہیں جو انھوں نے اپنے اور ایک کروڑ حبشیوں کے درمیان کھڑا کر رکھا ہے؟ وہاں نہ نیگرو سفید اسکولوں میں پڑھ سکتے ہیں نہ شہر کے سفید حصوں میں مکان بنا سکتے ہیں اور نہ ایک نیگرو ڈاکٹر کو سفید مریضوں میں پریکٹس کرنے کی اجازت ہے۔ اسٹیشنوں پر سفید اور کالے ویٹنگ روم بھی جداگانہ ہیں۔ روس اور چین کے آہنی پردوں کے پیچھے جھانکنے کی بجائے وہ اپنے آہنی پردے کے پیچھے کیوں نہیں جھانکتے؟ اور آزادیِ خیال پر احتساب! وہ اپنے میکارتھی اور اس کی احتسابی کمیٹیوں کو

بھول جاتے ہیں۔ چارلی چپلن سے پوچھو کہ وہ یو ایس اے سے کیوں چلا آیا؟ تم کہو گے، برطانیہ میں آزادیٔ خیال پر پابندی نہیں، وہاں پریس آزاد ہے۔ مگر کون سا پریس؟ بڑے بڑے چند لارڈوں کا پریس جو اپنے کثیر الاشاعت اخباروں کے ذریعے رائے عامہ کا ایسا مکمل احتساب کرتے ہیں کہ وہاں کے لوگ خون اور قتل کی سنسنی خیز خبروں اور فٹ بال پولز کے علاوہ دوسری باتیں بہت کم سوچتے ہیں۔''

اس کا استدلال بڑی حد تک وزنی تھا۔ اس کی باتوں میں بلا کی جاذبیت اور کشش تھی۔ آدمی کا دل خواہ مخواہ اس کی طرف کھنچتا تھا۔ وہ انسان کی بڑائی اور عظمت کا سچا قدر دان تھا اور کچلی ہوئی انسانیت کے لیے اس کے وسیع قلب میں حقیقی تڑپ تھی۔

''میرے دوست!'' اس کی آواز کچھ دھیمی ہوگئی، اور میرا خیال ہے ایک سایہ اس کے چہرے پر پھیل گیا۔ ''میرا باپ آسلو میں ڈیزل انجنوں کے ایک کارخانے میں کام کرتا تھا۔ ہمارا کنبہ کافی بڑا تھا— میری دادی، میری ماں اور ہم سات بہن بھائی۔ ہم بے حد غریب تھے۔ آسلو سے باہر ایک فلیٹ کے دو کمروں میں رہتے تھے۔ جو کچھ میرے باپ کو ملتا، اس سے بڑی مشکل سے ہماری گذر ہو رہی تھی۔ ہر چیز بہت مہنگی تھی اور میرے باپ کی تنخواہ بہت کم۔ ایک دن میرا باپ —وہ ایک چوڑا چکلا، وجیہہ انسان تھا— بجھا ہوا اور افسردہ گھر آیا۔ اس نے ہمیں بتایا کہ فیکٹری میں تخفیف کی وجہ سے اسے نوٹس دے دیا گیا ہے۔ اس کی ملازمت چھٹ جانے کے بعد ہم پر جو گذری وہ میں بیان نہیں کر سکتا —میرا باپ اس غم میں بیمار ہو گیا اور دو تین مہینے کے اندر وہ پہلا سا آدمی ہی نہ رہا۔ ہم اس کا علاج معالجہ بھی نہ کر سکے۔ ہماری مصیبت کو دیکھتے ہوئے اس نے آخر ایک دن گلے میں پھندا لگا کر خود اپنی زندگی ختم کر لی... میں یہ کیا باتیں لے بیٹھا... میرے دوست! ہمیں اس دنیا کو ایسی جگہ بنانا ہے جہاں اس قسم کی باتیں نہ ہو سکیں، جہاں ہر انسان کے لیے اطمینان، آسودگی، محبت اور عزت ہو۔''

''وہ وقت کب آئے گا؟'' میں نے پوچھا، ''دنیا کئی قرنوں سے اس کی راہ تک رہی ہے۔''

''میں تمھیں صحیح دن یا تاریخ تو نہیں بتا سکتا!'' اس کے ہونٹوں پر ایک میٹھا سا تبسم تھا اور اس کی نیلی آنکھوں میں پہلی سی شرارت، ''مگر وہ وقت اب نزدیک ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ ہم اس گھڑی کو لانے کے لیے جدوجہد نہ کریں اور ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ رہیں۔ خونخوار بھیڑیے اور گاؤخر انسان کی گھات میں لگے ہیں اور ہمیں ان کے ارادوں اور سازشوں کو ختم کرنے کے لیے چوکنا رہنا ہوگا— لیکن آج ساری دنیا میں عوام بیدار ہو چکے ہیں اور عوام دشمن طاقتیں شکست پر شکست کھا

رہی ہیں۔ مجھے یقین ہے کہ آج امن، آزادی اور انصاف کا جو طوفان اٹھا ہے، وہ اب کسی کے روکے نہیں رک سکتا۔ اندھیرا چھٹ رہا ہے اور صبح کا اجالا آرہا ہے۔ یہ اجالا نور بن کر زمین کی وسعتوں میں پھیل جائے گا۔''

ٹیبل بوائے ان کا بل لایا۔ فلاریزل نے دس روپے کا نوٹ پلیٹ میں رکھ دیا اور جب وہ باقی نقدی لایا تو فلاریزل نے ہنستے ہوئے اسے چینج رکھنے کے لیے کہا۔ وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس کے ساتھی اپنے جہاز پر پہنچنے کے لیے بیتاب تھے اور اب منوار کیفے کے بند ہونے کا وقت بھی تھا۔ ہم سب اکٹھے کیفے سے باہر آئے۔ جہاں فلاریزل اور اس کے ساتھیوں کے لیے ایک سیاہ چمکیلی وکٹوریہ منتظر تھی۔ میں نے اور میرے دوست نے فلاریزل کو خیر باد کہا اور میری ویدر کلاک ٹاور کی طرف چل پڑے۔

مارکیٹ کے پاس جا کر ہم نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو فلاریزل اب تک منوار کیفے کے دروازے پر کھڑا تھا اور کراچی کے سارے بھکاری اور ہجبرے، میلے سروں والے لڑکے اس پر ٹوٹ پڑے تھے۔ فلاریزل، معلوم ہوتا تھا، ان میں نقدی تقسیم کر رہا ہے۔ جیسا کہ ہر ایک جانتا ہے، بوہیمیا کے شاہزادے فلاریزل کی ذاتی دولت بے اندازہ ہے۔ ایک چھوٹا لڑکا فلاریزل کی ٹانگوں کی طرف لپکا اور بڑی پھرتی سے اس کے بوٹوں پر پالش کرنے لگا۔ اس وقت مجھے وہ بالکل میرے تصور کا اور اسٹیونسن کے تخیل کا بوہیمیا کا شاہزادہ لگا۔۔۔ حسین، رفیع الشان اور سخی دل۔ (کیفے میں کچھ عرصے کے لیے اس کا کردار بدلا تھا۔) معلوم ہوتا تھا وہ اپنی دولت لٹانے کے عمل سے بے حد لطف اندوز ہو رہا ہے!

ہم میری ویدر کلاک ٹاور کے پاس اس گلی میں جس کے ایک فلیٹ میں اُن دنوں میں رہتا تھا، جانے کے لیے مڑے ہی تھے کہ فلاریزل اور اس کے ساتھیوں کی وکٹوریہ سڑک سے گذری۔ فلاریزل اپنے دو ساتھیوں کے گرد بانہیں ڈال کر بیٹھا تھا اور اپنے دیس کا کوئی غیر ملکی گیت گا رہا تھا۔ اس نے ہمیں نہیں دیکھا کیونکہ ہم گلی کے نکڑ پر سائے میں تھے اور وہ گانے میں مشغول تھا۔

اب وہ پھر بوہیمیا کے شاہزادے کے بجائے ایک وجیہہ و غیر معمولی اور خوش شکل ملاح نظر آرہا تھا۔

وکٹوریہ فلاریزل اور اس کے ساتھیوں کو ان کے تاروں سے چھلکے ہوئے پانیوں میں لنگر انداز نارویجین جہاز کی طرف لے گئی۔

''کاش!'' میں نے سوچا، ''ہم سب اس سنہری ڈاڑھی والے ملاح کی طرح زندگی اور حرارت سے معمور ہو سکتے۔ کاش ہم سب اسی فیاضی اور دم سازی کے ساتھ اپنے ہم جنسوں سے محبت

کر سکتے جس طرح فلاریزل محبت کرتا تھا۔ پھر وہ خوبصورت اور مسرور دنیا جس کی اس نے کیفے میں پیش گوئی کی تھی، وجود میں آنے میں اتنی دیر نہ لگتی۔''

رات کے سناٹے میں دیر تک ایک میٹھا اور رسیلا گیت گونجتا رہا۔

کراچی ہاربر

''ابھی زیرو زیرو سیون'' ڈیوک نے پچھ ٹھاٹھ کے لہجے میں کہا'' کار سے میرا پورٹ مینٹو نکال لو۔ ڈاکٹر نے مجھے بوجھ اٹھانے سے منع کیا ہے۔''

'زیرو زیرو سیون' یعنی افضل نے ڈیوک کا پورٹ مینٹو پہلے ہی ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ وہ اور اس کا دوست ہر قاسم اس بات کو قبول کر چکے تھے کہ ڈیوک کی معیت میں اس کے پورٹ مینٹو یا بریف کیس کو سنبھالنا اور اٹھائے ہوئے چلنا ان میں سے ایک کا اہم فرض ہے۔ وہ دونوں ڈیوک کے جلو میں کیماڑی کی جیٹی پر چلنے لگے اور ڈیوک انھیں متموج پانی اور بادبانی کشتیوں کا یہ دلفریب منظر اس اہم انداز میں دکھانے لگا جیسے انھیں خود اس نے اپنے دو مہمانوں کے فائدے کے لیے ایجاد کیا ہو۔

وہ تینوں کیماڑی پر ہر قاسم کی براند نیو بل مین ہنٹر میں آئے تھے۔ ہنٹر چند روز پہلے کسٹم کے چنگل سے رہا ہوئی تھی اور ہر قاسم اور افضل اسے بائی روڈ لے جانے کے لیے کراچی پہنچے تھے۔ ڈیوک انھیں بار بار جتاتا کہ ہنٹر کو چھڑانے میں اسے بڑی دوڑ دھوپ کرنا پڑی تھی۔ وہ انھیں ذہن نشین کراتا رہتا کہ اس نے یہ کارنامہ اپنی زندگی کو خطرے میں ڈال کر سرانجام دیا تھا اور اگر وہ اسے بروقت وہارف سے کلیئر نہ کراتا تو ہنٹر یا تو انڈین نیوی کے میزائل حملے میں چُرمُر ہو جاتی یا فوجی افسر ریکویزیشن کر کے اڑا لے جاتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ڈیوک نے ہنٹر کو کلیئر کرانے میں تھوڑی بہت تگ و دو ضرور کی تھی مگر وہ اس سارے واقعے کو کچھ اس طرح نمک مرچ لگا کر سناتا جیسے دنیا میں وہ واحد انسان ہو جو اس ہنٹر کو کلیئر کرا سکتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اس کے دوست اس کے لیے مناسب طور پر اس کے احسان مند ہوں، اس کی شخصیت، کام کرنے کی صلاحیت اور خلوص پر داد کے ڈونگرے برسائیں، مگر اس کے دوست داد کے معاملے میں کچھ بخیل ہی رہے، حالانکہ ڈیوک نے یہ قصہ ان کو مختلف موقعوں پر اس غرض سے کوئی درجن بار سنایا۔ اپنے دوستوں کی طرف سے تعریف

ڈیوک کے لیے شہد تھی۔ ڈیوک نے ہنٹر کو اپنے دوستوں کے آنے سے کئی روز پہلے ہی چھڑا لیا تھا اور تب سے اپنی تین سال پہلے کی چھڑائی گاڑی کو گیراج میں بند کر دیا تھا۔ نئی ہنٹر کو سڑک کے قابل بنانے کے لیے اس نے اسے تین چار روز میں پانچ سو میل تک چلایا اور پٹرول، آئل وغیرہ کے بل گوہر قائم کے حساب میں ڈالا۔ ان کے آنے کے بعد بھی ڈیوک نے وہیل پر اپنا تصرف قائم رکھا اور ہنٹر میں انھیں سارے کراچی میں گھما تا پھرا تا رہا۔ اس سہ پہر کو وہ انھیں کیماڑی لے کر آیا تھا۔ یہ دن ان دنوں میں سے تھا جب سورج کی روشنی ایک جالے میں سے چھن کر لوگوں اور چیزوں پر پڑتی ہے۔ آسمان پر گہرے بادل تھے اور ایک سرد پچھمی ہوا ناپو کے پانیوں کو چمکدار بنا رہی تھی۔ جیٹی پر موسم کی وجہ سے رونق کم تھی۔

"دیکھو بھئی،" ڈیوک نے کہا، "تم کو ماننا پڑے گا کہ کراچی میں تم کو اتنے تھوڑے دنوں میں اتنی سیر اور کوئی نہیں کرا سکتا تھا۔ ڈاجن پارک، ڈرائیو ان سینما، کلفٹن، منگھوپیر، کوئی جگہ بھی تو چھوڑی نہیں۔ اب بتاؤ، تم سمندر کی سیر لانچ میں کرنا چاہوگے یا سیل بوٹ میں؟ مجھ سے پوچھو تو اصل سیر سیل بوٹ ہی میں ہوتی ہے۔"

ان سب نے اتفاق کیا کہ لطف سیل بوٹ ہی میں آئے گا اور ڈیوک ایک ستون پر نصب بوٹ اور لانچ کے کرایہ نامہ کا مطالعہ کرنے کے بعد سیل بوٹ والوں سے معاملہ کرنے کے لیے بڑھا۔ ڈیوک اپنے دھاری دار گہرے سوٹ میں، بال پٹی جمائے کافی رعب دار تھا۔ وہ ایک دوہرے بدن کا وجیہہ شخص تھا اور وضع قطع میں کچھ کچھ ایک الحاق شدہ ہندوستانی ریاست کا ایکس مہاراجہ اور کچھ کچھ ایک ڈھلی عمر کا فلم ایکٹر لگتا تھا۔ اس کی حرکات وسکنات سچ مچ ایک 'ٹائکون' کی سی تھیں۔ لوگ فوراً اس کے رعب میں آجاتے اور دوڑ دوڑ کر اس کے حکم کی تعمیل کرتے۔ وہ ان لوگوں میں سے تھا جو دنیا میں خود کو ہمیشہ ایٹ ہوم محسوس کرتے ہیں۔ افضل اور ہر قائم دونوں شرمیلے اور نان ایسرٹو (non-assertive) تھے۔ وہ کرایہ نامے کے بورڈ کے پاس کھڑے رہے۔ تھوڑی دیر میں ڈیوک بوٹ مینوں سے گفت وشنید کرکے ان کی طرف آیا۔

"بھائی، میں نے سیل بوٹ ہائر کر لی ہے۔ ایک دو گھنٹے وہ بوٹ والا ہمیں سمندر کی سیر کرائے گا۔" اس نے اپنے دوستوں کو اس انداز سے بتایا جیسے اس نے جنوبی سمندروں کو جانے والا کوئی اسٹیم شپ چارٹر کیا ہو۔

انھوں نے ڈیوک کی ہدایت کے بموجب جیٹی کی موتری میں اپنے مثانوں کو ہلکا کیا کیونکہ کھلے سمندر میں ایک سیل بوٹ پر سے پیشاب کرنا نہایت ناشائستہ ہوتا۔ جیٹی کو چھوتی ہوئی بے سکون

سیل بوٹ میں اترنے سے پہلے ڈیوک نے دو چھوٹے لڑکوں کو راجرز سوڈا کی تین بوتلیں لانے کے لیے دوڑایا۔ ڈیوک کے پاس چینج نہیں تھا اور اس لیے افضل نے انھیں سوڈے کے پیسے دیے۔ وہ خالی ہاتھ لوٹے: جن دکانوں کو وہ گئے تھے، وہاں راجرز ختم ہو چکا تھا۔ ڈیوک نے پھر راجرز کی بجائے کوکا کولا تین بوتلوں کا آرڈر دیا اور لڑکوں کو کہا "دیکھو، اس کو باوا، برف میں لگی ہوا — ایک دم ٹھنڈی۔"

جب بوتلیں آ گئیں اور افضل اور ہرقاسم نے انھیں اپنے ہاتھوں میں سنبھال لیا تو وہ سیڑھی پر سے سیل بوٹ میں اترے۔ آگے آگے ڈیوک، اس کے پیچھے ڈیوک کا پورٹ مینٹو اور کوکا کولا کی بوتلیں اٹھائے افضل، اور ہرقاسم۔

ڈیوک نے اہم انداز میں وہیل کدے وار سیٹ سنبھالی اور اپنے دوستوں کو جانب کی سیٹوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ ابھی سیل بوٹ نے جیٹی کو نہ چھوڑا تھا کہ اس نے پورٹ مینٹو افضل کے پاس سے اٹھا لیا اور اسے بیچ تختے پر رکھ کر وہ حرکتیں عمل میں لانے لگا جو ایک اجنبی کے لیے پراسرار تھیں مگر جن سے اس کے دوست اب اچھی طرح واقف ہو چکے تھے۔ ڈیوک کا پورٹ مینٹو اپنے سامان کے لحاظ سے دنیا کے سب پورٹ مینٹوز سے الگ تھا۔ دیکھنے میں تو یہ عام چمڑے کا بریف کیس تھا، جیسا سرکاری افسر یا فرموں کے سیلز ایگزیکٹو بڑے طمطراق سے لے کر چلتے ہیں، مگر ڈیوک اسے غیر معمولی مقاصد کے لیے استعمال کرتا تھا۔ بلاشبہ اس میں ایک آدھ فائل، فرم کے لیٹر پیڈ، نیم کارڈ وغیرہ بھی جگہ پاتے لیکن ان کے علاوہ اور بھی بہت کچھ الم غلم اس میں بھرا ہوتا — ڈیوک کا آفٹر شیو لوشن جسے وہ وقتاً فوقتاً عطر کے طور پر اور اپنے چہرے کو چمکانے کے لیے بیندی رکھتا: کنگھی اور دیگر آرائش گیسو کی انوکھی چیزیں: کار کی چابیاں: چشمے — مگر اس کا اصل ضروری سامان قدرے اور نوعیت کا تھا: بلیک اینڈ وہائٹ کے لیبل کی نصف بوتل، جسے وہ ہر شام اگلے روز کے لیے جمخانہ وسکی سے بھر لیتا تھا، راجرز کی ایک خالی بوتل، اور ایک چھوٹا بلور کا گلاس۔ یہ پورٹ مینٹو حقیقت میں ایک متحرک سفری بار تھا اور خود ڈیوک کے مطابق اس نے ڈرنک کو مکس کرنے اور اسے بے دھڑک پینے کا ایک ایسا نادر، فقید المثال طریقہ ایجاد کیا تھا کہ کھلے بازار پیو اور کسی کو شراب کا گمان بھی نہ ہو۔

وہ جیٹی سے دور نکل آئے۔ ناپو کی چھوٹی سرمئی لہروں میں سیل بوٹ سر کے بل بری طرح غوطے لگاتی مگر ان کے "کریو" (crew) کے دولڑکے بڑے چست و چالاک تھے۔ وہ رسے کھینچتے، بادبان کو درست کرتے اور جب سیل بوٹ ہوا کے دباؤ سے خطرناک طور پر ایک سمت جھکاؤ کرتی تو وہ بڑی پھرتی سے دوسری طرف ایک تختہ جوڑ کر اس پر چڑھ دوڑتے اور اسے متوازن کر دیتے۔

انھیں ایک طرح پہلے ہی یہ علم ہوتا کہ اب ایسا ہونے والا ہے۔ افضل ان کی باتوں کو رشک اور تعریف کے جذبے سے دیکھنے لگا۔ اس کی بچپن کی ایک دبی ہوئی تمنا جہازراں بننے کی تھی اور وہ اب خواہش کرنے لگا کہ کاش میں بھی ان لڑکوں کی طرح سیل بوٹ کو سنبھالنے یا چلانے کا فن جانتا۔ ان دو لڑکوں کے علاوہ کریو میں تیسرا آدمی خود اس کا کپتان عارف تھا۔ وہ ڈیوک کے پاس پیچھے بیٹھا پتوار کے ہتھے سے سیل بوٹ کا رخ بدلتا اور سمت متعین کرتا تھا۔ اسے بہت کم بولنے کی ضرورت پیش آتی کیونکہ لڑکے ہوا اور موج کے تیوروں کو سمجھتے اور پہچانتے تھے اور اپنے کام میں پوری طرح مشاق تھے۔ "کپتان عارف" — یہ نام اس کی اس اٹھی ہوئی کشتی کے دائیں سمت کی اندرونی دیوار پر انگریزی حروف میں لکھا ہوا تھا — لیکن وہ سیدھے پٹھوں میں وہ ایک سخت جسم، بالشتیہ سا آدمی تھا۔ استخوانی چہرہ، پوپلا منھ، روکھے پھیکے بال۔ وہ زیادہ تر ایک ریٹائرڈ جاپانی لگتا تھا اور بہت کم ایک ایسا آدمی جو سمندر سے وابستہ ہو۔ مگر بہت کم ہی اس کے جسم سے وہ دونوں کو نہ چھوڑتا، نہ ہی پتوار کے ہتھے کی گرفت سے اس کا ہاتھ ایک لمحے کے لیے خالی ہوتا۔

کپتان عارف (اس سیل بوٹ کا نام بھی اپنے مالک پر تھا) آتی ہوئی لہروں کو اپنے پیش میں لیتی اور دھکیلیاں لگاتی ایک زندہ چیز معلوم ہوتی تھی۔ ایک شہ زور اور باشعور حیوان، وہ جیسے اپنے جہازراں کی طرح جانتی تھی کہ سمندر بدفریب دشمن ہے اور اس پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ سمندر ہمیشہ گھات میں رہتا ہے، وہ سیل بوٹوں اور آدمیوں کو نگلنے کے انتظار میں رہتا ہے۔

"کشتی کی اس موومنٹ کو انگریزی میں کیا کہتے ہیں؟" ڈیوک سمندر اور کشتیوں کی روایات میں سیانا بنا، اپنے دوستوں کے علم کو آزمانے لگا۔ اسے یقین تھا کہ اس کے دوست انگریزی کا وہ لفظ نہیں بتا سکیں گے۔

افضل، جس نے سمندر کی بیسیوں کہانیاں پڑھی تھیں، سوچ کر بولا، "رولنگ..." اسے یقین تھا کہ یہ صحیح لفظ نہیں۔

"اور تم، ہر قاسم؟" ڈیوک نے فاتحانہ نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

ہر قاسم بھی وہ لفظ مہیا نہ کر سکا۔ پھر ڈیوک نے بڑی اہمیت سے وہ لفظ بتایا، "جاہل لوگو، اسے پچنگ (pitching) کہتے ہیں۔"

"ہاں ڈیوک، پچنگ صحیح لفظ ہے،" افضل بولا۔

"مان لو — ہمارے ساتھ رہو گے تو ہر منٹ تمھارے مبلغ علم میں اضافہ ہوگا۔"

انھوں نے ٹاپو کا پورا چکر کاٹا۔ پھر سیل بوٹ نے ۱۲۰ درجے زاویے کا موڑ گھوما اور ٹاپو کے

دہانے کی طرف شپ شپانے لگی۔ ڈیوک اس مدت میں اپنے کام میں مصروف رہا اور دہانے تک پہنچتے پہنچتے اس نے اسے تقریباً مکمل کر لیا۔ اس کا خیال تھا کہ کوئی نہیں دیکھ رہا کہ وہ کیا کر رہا ہے اور اس کی پُراسرار حرکات بالائے فہم ہیں، لیکن پتوار کے ہتھے کو تھامے بوڑھے عارف کی حیران آنکھیں مستقل اس کی طرف لگی تھیں۔ وہ اس ریچوئل (ritual) کو بھانپ گیا اور ایک دفعہ مسکراہٹ کا سایہ سا اس کے پوپلے چہرے پر گزرا۔ جہاں تک اس کے دوستوں کا تعلق ہے، انھیں پوری طرح علم تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ وہ اس ریچوئل کے مرحلوں سے بخوبی آشنا تھے اور اس لیے اسے بیسویں بار دیکھنے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔

ڈیوک نے جھک کر اپنا پورٹ مینٹو کھولا اور ڈھکنے کی آڑ میں کوکا کولا کی ایک بوتل کو راجرز کی ایک خالی بوتل میں ڈالا تھا پھر اس نے جھٹ سے وسکی سے بھری ہوئی بلیک اینڈ وہائٹ بوتل کے ڈھکنے کو کھول کر اس میں سے ایک پیگ کے پیمانے کے مطابق کوکا کولا کی خالی بوتل میں انڈیلا تھا اور دوسری کوکا کولا کی بوتل میں سے وسکی کو پتلا کیا تھا۔ اس عمل کے تین فائدے تھے اور ڈیوک اکثر انھیں اپنے دوستوں کے ذہن نشین کراتا رہتا: ایک تو یہ کہ وسکی ٹھنڈے کوکا کولا کی خالی بوتل میں جا کر برف کے بغیر ٹھنڈی ہو جاتی تھی اور پھر ٹھنڈے کوکا کولا میں آمیزش سے پوری ٹھنڈی؛ اس رنگ کا بھی بدل جاتا اور کوکا کولا کی طرح سیاہ عنابی ہو جاتا؛ اور چونکہ وسکی کوکا کولا کی بوتل میں ہوتی، سب یہی سمجھتے کہ پینے والا کوکا کولا پی رہا ہے۔

ٹاپو کے دہانے سے نکلتے ہی یہ کوکا کولا بوتل اس کے ہاتھ میں تھی۔ کوکا کولا کی دوسری نصف بوتل جس میں خالی کوکا کولا تھا، اس نے ایک شاہانہ فیاضی سے افضل کو عنایت کی۔ ریچوئل کے اطمینان کے مطابق انجام پا جانے کے بعد ڈیوک کا چہرہ قطعی بشاشت اور بے فکری سے دمک اٹھا۔ وہ حسب دستور چہکنے اور ادھر اُدھر کی واہی تباہی بکنے لگا۔ اس کے رومان اور قصے ان گنت تھے — ایک ہی نمونے پر — اور وہ ان کو دہرانے کا بڑا شوقین تھا۔ اس کے دونوں دوست اسے ہمیشہ بے یقینی اور تمسخر کے ملے جلے انداز سے سنتے کیونکہ ان میں کافی غپ بازی بھی ہوتی تھی۔

''بھئی ہرقاسم، بھئی زیرو زیرو سیون'' وہ بولا، ''لو، ایک دلچسپ بات سنو۔ ایک فرانسیسی یہاں آیا ہوا ہے — ڈومینک، ڈومانک کچھ ایسا ہی نام ہے سالے کا۔ اس کی فرم نے اسے ٹیکسٹائل پرنٹنگ کے پرانے لکڑی کے بلاک حاصل کرنے بھیجا ہے۔ ہمارے متعلق تو تم جانتے ہو، ہم ٹیکسٹائل ٹیکنالوجی کے بادشاہ ہیں۔ اس ملک میں ٹیکسٹائل انجینئرنگ ہم سے زیادہ کون مائی کا لال جانے گا۔ جرمنی، جاپان سے ٹیکسٹائل فرموں کے نمائندے ہم سے مشورہ کرنے آتے ہیں۔''

''تم ڈومینک کا ذکر کر رہے تھے،'' قاسم نے کہا۔

''ڈومانک کا،'' افضل بولا۔

''ارے یار، تم لوگ بات نہیں کرنے دیتے!'' ڈیوک نے کہا۔ ''ہاں، اس شخص ڈومانک سے ہماری ملاقات بزنس کے چکر میں ہوئی۔ اس نے ہم کو اپنی گرل فرینڈ — ایک کینیڈین خوشنما، روح افزا سے ملایا۔ بجتی، بغیر میک اپ کے، نیم ننگی، نیم سستی قسم کی چیز تھی، ییری نام۔ ہم کو تم جانتے ہو، نازنینوں کے لیے ہم قاتل ہیں۔ ہم ییری سے خوب کھل مل گئے۔ ییری نے خواہش ظاہر کی کہ اسے ہارس ریس دکھاؤں۔ چنانچہ ہم اسے ریس کلب لے گئے۔ ہم نے بتایا تھا تمھیں کہ ہم کراچی ریس کلب کے فاؤنڈر ممبروں میں سے ہیں۔ وہاں سب ہمیں جانتے ہیں، ہیرے وغیرہ ویٹ کرتے ہیں۔ ہم لان میں بیٹھ گئے۔ ساتھ فرسٹ کلاس انکلوژر کا کٹہرا تھا اور کٹہرے سے لگی ہوئی ایک پاکستانی، زبردست سکس اپیل رکھنے والی لڑکی نے ہم سے اشاروں میں باتیں کرنا شروع کیں۔ ہم ان اشاروں سے یہ سمجھے کہ محترمہ یہ کہتی ہیں کہ تم ذہنی طور پہ افرنگ زدہ، پرستار حسینان یورپ ہو۔ بھلا ان دساورگی بلیوں میں وہ بات کہاں جو ہم دیسی بلیوں میں ہے۔ جب اس دیسی کنیا کے اشارے بالکل واضح ہونے لگے تو ہمیں خیال آیا کہ لوگ نہ جانے کیا سمجھیں گے۔ ییری نے پوچھا، 'اولڈ فرینڈ؟' ہم نے کہا، 'ییری، اور اٹھ کر فرسٹ کلاس انکلوژر میں چلے گئے۔ لان ممبرز انکلوژر میں تھا اور فرسٹ والے ممبرز انکلوژر میں نہیں گھس سکتے۔ ہم نے اس دیوی کو ریسٹورنٹ میں لے جا کر استدعا کی کہ محترمہ یوں اشارے نہ کرو۔ ہم نے اسے خوب پپ اپ کیا۔ ہم نے کہا کہ ہماری نظر میں تو وہ اس کینیڈین لڑکی سے کہیں بڑھ چڑھ کر ہے۔ ہم نے یہ بھی درخواست کی کہ کسی وقت فرصت میں ملیے گا، ہم اپنا مطلب و مدعا زیادہ وضاحت سے سمجھا دیں گے۔ ارے یار برقاسم، اس نے پھر وہی اشاروں میں باتیں شروع کر دیں۔ تب پتہ چلا کہ وہ گونگی تھی۔ ہماری طبیعت باغ باغ ہوگئی۔ ایک محبت کرنے والی لڑکی اور گونگی — آدمی کو اور کیا چاہیے! اور یار زیرو زیرو سیون، وہ کون سی مثل ہے ہندی کی؟ چپڑی اور پھر دو دو... جب ہم وہاں سے لوٹے تو غالب کا وہ مصرع دماغ میں گونجنے لگا:

یار لائے اسے بالیں پہ مری پر کس وقت

''ہا ہا ڈیوک، اٹ از ٹولیٹ!'' برقاسم نے کہا۔ ''پھر وہ کینیڈین سے تمھارا رومانس سرے چڑھا یا تمھارے سب رومانسوں کی طرح بیچ ہی میں رہ گیا؟''

وہ اب ٹاپو سے باہر ہاربر میں نکل آئے تھے۔ دو سفید اور نیلے رنگے ہوئے غیر ملکی مال بردار جہاز پتن کے ساتھ لنگر انداز تھے۔ ان کے دود کشوں سے دھواں نہیں اٹھ رہا تھا اور ان کے عرشوں پر

کوئی روح نظر نہ آتی تھی۔ سمندری حواصل برف کے گالوں کی طرح ان کے گرد پھر رہے تھے۔ سامنے منوڑا کا جزیرہ اپنے لکڑی کے شہتیروں پر جمے چبوتروں، لائٹ ہاؤس، پتھریلی سرخ بیرکوں جیسی عمارتوں سے ان پر امڈتا آیا۔ افضل کا دل اچھلا۔ اسے جہازوں، مندروں اور جزیروں سے محبت تھی اور اسے یہ منظر اتنا آشنا لگا جتنا بار بار پڑھی ہوئی تصویروں والی کتاب۔ وہ اسے اب تقریباً پچیس برس کے بعد دیکھ رہا تھا۔ اسے ایسا لگا جیسے وہ یہاں ہر روز آتا رہا ہو۔ اس نظارے میں اس کے لیے کچھ بھی اجنبی نہ تھا۔

ڈیوک بابا آئی لینڈ اور سینڈز پٹ کی طرف جانا چاہتا تھا لیکن کپتان عارف نے کہا کہ نیوی کی دفاعی تنصیبات کی وجہ سے اب سیل بوٹس کے ادھر جانے کی ممانعت ہے۔ کپتان عارف نے سیل بوٹ کا رخ منوڑا اور وہ چبوتروں کے پاس سے ہاربر کے دہانے کی طرف جانے لگے۔ یہاں ناپو سے زیادہ تموج تھا اور چھوٹی سرمئی آبدار لہریں ہوا کے ساتھ بھاگی آتی تھیں۔ اس تموج میں تندی تو نہ تھی مگر ان کی سیل بوٹ کو لہروں کو روندنے میں اب زیادہ زور مارنا پڑ رہا تھا۔ اس کے مستول اور دوسرے حصے کراہنے لگے اور اس کے پیش پر دھاوا کرتے ہوئے پانیوں کی آواز اونچی تھی۔ اس سکوت میں ایک لمبی کوک سنائی دی۔ ہاربر کے دہانے پر ایک جہاز اپنے عقب میں ایک سفید سا راستہ چھوڑتا ہوا باہر کھلے سمندر میں داخل ہو رہا تھا۔

ڈیوک اب اپنا دوسرا پیگ شروع کر چکا تھا۔ کوکا کولا کی دوسری نصف بھری بوتل اس نے ہرقاسم کو دی۔ افضل اپنا حصہ پہلے لے چکا تھا۔ ڈیوک کا بولنا جاری رہا۔ اس نے بحری گدھا مچھلی کی عادات، لائٹ ہاؤس کے طریق عمل، افق کی مسافت اور دوسرے بہت سے موضوعات پر اپنے خیالات سے اپنے دو سامعین کو محظوظ کیا تھا۔ افضل اور ہرقاسم بیچ بیچ میں اسے ٹوکتے، اس کی ہنسی اڑاتے، اس کے غبارے میں سے ہوا نکالتے مگر ڈیوک اپنے دوستوں کی اس 'لیگ پلنگ' (leg-pulling) کا عادی ہو چکا تھا اور اس کا برا نہ مانتا بلکہ وہ ایک طرح اسے پسند کرتا۔ اس لیگ پلنگ کا اس پر کچھ اثر نہ ہوتا۔ اب وہ بحری معلومات کو چھوڑ کر اس مسئلے کو زیر بحث لا رہا تھا کہ شادی کرنے کے لیے آدمی کو کیسی بیوی درکار ہے۔ ''ہم کو اگر شادی کرنے کا اور موقع ملے تو ہم تو گاؤں کی ان پڑھ گنوار لڑکی کو بیاہ کے لائیں گے۔ پڑھی لکھی لڑکیاں سر پر سوار ہو جاتی ہیں۔ بیوی ایسی ہونی چاہیے جو خاوند کے معاملات میں اور اس کی آزادی میں دخل نہ دے۔ ان پڑھ لڑکی ہو گی تو وہ اپنی قسمت پر شاکر رہے گی، اپنے میاں کی توجہ کو احسان مندی سے مانے گی، اس کی خدمت کرے گی، اس کی جرابیں دھوئے گی، جوتوں کے تسمے باندھے گی، آئے دن بیجا فرمائشوں کے

مارے ناک میں دم نہ کرے گی۔ بھائی، ہم کو تو اس پروفیسر منیر شوق کی بات دل کو لگی۔ وہ ہمارے مراق میاں کے ہاں ٹھہرے ہیں۔ آج کل مراق میاں اور ہماری بھابھی پروفیسر کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہے ہیں۔ ہم ان کے ہاں گئے تو بھابھی کہنے لگیں، 'پروفیسر کے لیے بہتیری ایک سے ایک اچھی پڑھی لکھی لڑکیاں دیکھیں مگر پروفیسر کو پسند نہیں آتیں۔ وہ کہتا ہے کہ لڑکی جو بھی ہو، بےحد خوبصورت ہو، دماغ بے شک خالی ہو۔ عجیب مخمصے میں پڑے ہیں۔' ہم نے جھٹ کہا کہ یہ بات ہے تو ایک پروفیسر کے مطلب کی لڑکی ہماری نظر میں ہے۔ مراق میاں بولے، 'کہیے کہیے۔' ہم نے کہا، 'پروفیسر صاحب کا بیاہ وینس کے مجسمے سے کرا دو۔ خوبصورتی میں بے مثل لڑکی ہے اور دماغ بالکل ہے ہی نہیں۔' خوب قہقہہ پڑا۔ پروفیسر بھی وہاں بیٹھا تھا۔ بولا، 'لیکن صاحب، اس کے تو ہاتھ بھی نہیں ہیں۔' ہم نے کہا، بھائی یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ آپ کی چندیا محفوظ رہے گی، بال پہلے ہی خال خال ہیں۔"

افضل اور ہرقاسم اس قصے سے لطف اندوز ہوکر ہنسے۔ افضل نے کہا، "ڈیوک، تم نے تو پروفیسر کو چھیڑنے کے لیے کہا۔ میں سنجیدگی سے پروفیسر کو مشورہ دوں گا کہ وہ وینس سے شادی کرلے۔ اس کی اسی میں عافیت ہے۔ یہ وہی پروفیسر شوق تو نہیں جو منزل راہ میں نہایت ٹھوس تحقیقی مقالے لکھتا ہے؟"

"وہی،" ہرقاسم بولا، "تم اس کو ایک بار مل تو چکے افضل۔"

"ایمانداری سے، میں سوچتا ہوں، لوگ شادی کو اہم فریضہ کیوں سمجھتے ہیں؟! اس کے بغیر بھی تو رہ سکتے ہیں۔ یہ فرسودہ انسٹی ٹیوشن ہے۔ اور برٹرینڈ رسل کہتا ہے کہ اور دس بیس سال تک یہ انسٹی ٹیوشن آؤٹ آف ڈیٹ ہوجائے گی۔ ٹھوس مقالے لکھنے والوں کو تو کبھی شادی نہیں کرنی چاہیے۔"

ہرقاسم بولا، "اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر کوئی آدمی دنیا میں کوئی قابل قدر کام کرنا چاہتا ہے جس کا آرٹ یا ادب یا سائنس سے تعلق ہے، تو اسے کبھی شادی نہیں کرنی چاہیے۔ ہر کام میں کمال حاصل کرنے کے لیے یکسوئی اور بے اندازہ لگن کی ضرورت ہے۔ اس قسم کی کلی ڈیڈیکیشن جو مائیکل انجیلو میں تھی۔ شادی میں آدمی سو جھنجھٹ میں پھنس جاتا ہے۔ اس کی آزادی سلب ہوجاتی ہے۔"

ان کے درمیان یہ بحث اکثر چلتی تھی۔ افضل اور ہرقاسم پیشے سے انجینئر تھے مگر ان کو ادب سے گہرا لگاؤ تھا۔ وہ دونوں انگریزی ادب کے رسیا تھے اور ان کے سینوں میں یہ دبی ہوئی خواہش سلگتی تھی کہ وہ ایسی چیزیں لکھیں جو ہمیشہ زندہ رہیں۔ ڈیوک اس حد تک لٹریری نہ تھا۔ وہ زیادہ تر انگریزی کے ترلیش ناول پڑھتا اور پھر ان کو مکمل طور پر بھول جاتا۔ لگن اور تخلیقی آگ میں جلنے کا عمل

وغیرہ اس کے لیے بے معنی اور ناقابل فہم الفاظ تھے۔ وہ انگریزی کے ایک ایوننگ پیپر میں کسی زمانے میں مختلف موضوعات پر مزاحیہ کالم لکھا کرتا تھا۔ اس کی تین چار اسی رنگ کی تحریریں ایک دو اردو کے رسالوں میں چھپی تھیں اور ان کے بل پر اس نے یہ فیصلہ کرلیا تھا کہ وہ اردو اور انگریزی کا شہرۂ آفاق ادیب ہے۔ وہ یہ شکایت کیا کرتا کہ اس کے ایوننگ پیپر والے اسے ایک آرٹیکل کے صرف پچاس یا سو روپے معاوضہ دیتے تھے جبکہ امریکہ میں نیویارک کے میگزین والے ڈیمن رنیان (Damon Runyan) مزاح نگار کو ایک کہانی کا تین چار ہزار ڈالر ادا کرتے تھے۔ اس ملک میں سخت ناقدری تھی۔

کپتان عارف اب طرارے بھرتی ہاربر کے دہانے کی سمت جانے لگی۔ ان کے دائیں طرف منوڑا کا بے شجر چٹانی جزیرہ تھا اور بائیں طرف ایک بڑا اسلیٹی پتھریلا ٹیلہ، ماقبل تاریخ کے ایک عفریت کی طرح پانیوں میں پڑا ہوا۔ اس سے پرے دھندلے جھپٹے میں پانی کے قطعے کے سرے پر کلفٹن کی سفید عمارتیں دبکی ہوئی دکھائی دے رہی تھیں۔ ان کی پشت پر ہاربر کے ایک پتن پر پاکستان آئل ریفائنری کے تیل کے ٹینک گویا کسی مہیب عورت کی چھاتیاں تھے۔

''ہندوستانی حملے میں میزائل کہاں آ کر پڑے تھے؟'' ہرقاسم نے پوچھا۔

''میزائل یہیں پڑے تھے،'' ڈیوک بولا، ''اور ایک دو ٹینک تباہ ہوگئے تھے۔ تمھاری جنت بھی پاس کے دہارف پر تھی، بال بال بچ گئی۔ میاں، اشکرانے کے نفل ادا کرو اور ڈیوک کو دعائیں دو۔''

کپتان عارف اب بولا۔ اس نے ڈیوک کی تردید کی اور اس جگہ کی طرف اشارہ کیا جہاں میزائل آ کر پڑے تھے۔ ڈیوک نے اس میں جھینپنے کی ذرا بھی وجہ محسوس نہ کی۔ اس نے انگریزی میں کہا، ''اس بلیڈی فول کو معلوم نہیں۔''

ہاربر کے دہانے کے پاس بڑے بڑے بوائے لہروں میں جھول رہے تھے۔ دور کھلے سمندر میں ایک دو ڈریجر سمندر کی تہہ سے کیچڑ نکالنے والے جہاز لنگر ڈالے تھے اور ان کے قریب ہی ایک تباہ شدہ جہاز کا شکستہ ڈھانچہ ابھرا ہوا تھا۔ کپتان عارف نے ان کو بتایا کہ یہ ایک ہسپانوی کارگو جہاز تھا جو دو سال پہلے طوفان میں بندرگاہ میں داخل ہونے کی کوشش میں زمین پر چڑھ کر تباہ ہوا تھا۔ سوائے ایک دو کے اس کے کل آدمی ڈوب گئے تھے۔ تب سے انھوں نے بائیں سمت کے پتھریلے ٹیلے پر آنے والے جہازوں کو خطرے کا سگنل دینے کے لیے ایک سرچ لائٹ نصب کردی تھی۔ تینوں دوستوں کے لیے یہ ایک حسرت آسا تصویر تھی، اور حساس اور پرتخیل۔ افضل کے دل میں تو ان مرے ہوئے آدمیوں کا سوچ کر ایک سرد سی لہر دوڑ گئی۔ انسانوں کی غریب الوطنی، اور ان غیر

ذی روح جہازوں کی بھی جو اجنبی ساحلوں پر اپنے پنجر چھوڑ کر ختم ہو جاتے ہیں، اس کو کلپانے لگی۔ انسان حقیقتاً تنہا اور بے گھر تھا۔ وہ پھر کیوں اس دنیا میں گھر بسانے اور وطن اپنانے اور اس کے گیت گانے میں اپنی عمر صرف کرتا تھا؟ سمندر کی بے رنگی اور سفاکی اب اس پر عیاں ہونے لگی۔ سمندر آدمی کا دوست نہیں تھا۔ کائنات میں کوئی شے آدمی کی دوست نہ تھی۔ اسے دوڑتی ہوئی بکتی لہروں میں ایک دبی ہوئی دھمکی کا احساس ہونے لگا۔

ڈیوک کوکا کولا بوتل کو ہاتھ میں پکڑے، اپنی داخلی دنیا میں پہنچا ہوا تھا۔ وہ بھی اس سے نہیں نکلتا تھا۔

''بھائی سنو،'' ڈیوک نے کہا، ''تم دونوں مجھے مشورہ دو۔ تم جانتے ہو، ہمارے جیسا ٹیکسٹائل ایکسپرٹ اس ملک میں نہیں ہے۔ جب ہمارا کاروبار زوروں پر تھا، میرے پاس تیس چالیس لاکھ روپے تھے۔ پانچ لمبی کاریں تھیں۔ اسپینش ایمبیسیڈر کی بلانڈ لڑکی میرے جوتے پالش کرتی تھی۔ مت مسکراؤ، تمھاری بھابھی اس کی گواہی دیں گی۔ اس زمانے میں ایک شخص حفیظ سیٹھ ہمارے پاس دو ہزار روپے ماہوار پر ملازم تھا۔ وہ ہمارے ریس کے گھوڑوں کا انچارج تھا۔ اس رذیل نے مجھ سے بڑا دھوکا کیا۔ میرے گیارہ لاکھ روپے ختم کر گیا۔ خیر، وہ اور کہانی ہے، پھر کبھی بتاؤں گا۔ ایک لڑکی کا معاملہ تھا۔ اب ہمارا کاروبار تو تم جانتے ہو، یاروں کی نذر ہو گیا۔ وہ حفیظ سیٹھ اب سالا ہمارے پیسے سے دبئی میں ایک ٹیکسٹائل مل کا مالک بنا بیٹھا ہے۔ چند روز ہوئے اس سے سرِ راہ ملاقات ہوئی۔ اس نے ہمیں اپنی ٹیکسٹائل مل کی مینجری کا آفر دیا ہے بلکہ پیچھے پڑ گیا ہے۔ تنخواہ پانچ ہزار روپیہ اور فری ایئر کنڈیشنڈ بنگلہ، کار، وغیرہ۔ ہم نے سات ہزار سے کم ایک پائی منظور کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے کنفرم نہیں کیا۔ پھر ایک یہ خیال ہے کہ اس آدمی کے اندر کام کرنا پڑے گا جو میرا ملازم تھا۔ یہ بھی وجہ ہے کہ مجھے ہارٹ ٹربل ہے۔ وہاں تنہا رہنا پڑے گا۔ ڈاکٹر نے ایگزرشن سے منع کر رکھا ہے۔ تمھارا کیا مشورہ ہے، منظور کر لوں؟''

''ضرور منظور کر لو،'' افضل اور برقاسم نے ہنسی دباتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ پیتے وقت ڈیوک بڑا اونچا اڑتا تھا اور اپنے دوستوں سے اس قسم کے مشورے طلب کیا کرتا۔ یہ مشورہ طلبی صرف اپنے دوستوں کو اپنی اہمیت سے مرعوب کرنے کے لیے ہوتی اور اگرچہ اس کے دوست وقتاً فوقتاً مل کر اس کے بخیے ادھیڑتے، یہ عادت اس کی فطرت میں پختہ ہو چکی تھی۔ بعض وقت اس کے دوست حقیقت کو بھانپتے ہوئے بھی اسے ہیومر کرتے۔

''بھائی زیرو زیرو سیون، لاہور کا آفر ہوتا تو معاملہ ہی دیگر ہوتا،'' ڈیوک بولا۔ ''وہاں تم اور

برقاسم، ہنسوں کا جوڑا موجود تھا۔ تیسرا تم لوگوں میں میں آن ملتا۔ ایسی ناقابلِ اطمینان صحت کے ساتھ 'ج' میں اکیلے رہنے سے میری زندگی کو خطرہ ہے۔"

ڈیوک کی صحت کے لیے "ناقابلِ اطمینان" کا لفظ صریح مبالغہ تھا۔ وہ چوڑا چکلا، تن و توش والا آدمی تھا مگر جہاں کہیں بھی وہ جاتا یا جس صحبت میں وہ بیٹھتا تو کسی نہ کسی ڈھنگ سے اپنی ناقابلِ اطمینان صحت کی شیخی ضرور بگھارتا۔ اپنے تین بارٹ اٹیکس اور شانے کے درد کا ذکر فخریہ کرتا۔ اپنے ملنے والوں کی توجہ اور ہمدردی کے الفاظ سن کر اسے گونہ تسکین ہوتی۔ اس کے ان دو دوستوں کو اکثر شک گذرتا کہ ڈیوک کے بارٹ اٹیکس فرضی ہیں اور اس نے انھیں صحیح معنوں میں 'ڈسٹنگوشڈ' (distinguished) لگنے کے لیے گھڑ رکھا ہے۔

تھوڑی بحث کے بعد افضل اور برقاسم نے صاد کیا کہ صحت کی اس غیر تشفی بخش حالت میں ڈیوک کے لیے حفیظ سیٹھ کے آفر کو منظور کرنا موت کو دعوت دینا ہوگا۔ اس مسئلے کے طے پانے کے بعد ڈیوک بائیں طرف کی بڑی چٹان کی جانب اشارہ کر کے ان کو راک فارمیشن کے بارے میں معلومات دینے لگا۔ اس کے دوست راک فارمیشن کے متعلق بالکل کورے تھے، اس لیے وہ جو چاہتا کہہ سکتا تھا۔

"بھئی راج ہنسوں کا جوڑا، سنو!" ڈیوک چہکا۔ "سمندر نے اس چٹان میں اس طور سے دندانے ڈالے ہیں، آرد گردش کی ہے کہ کوئی بڑے سے بڑا سنگتراش تمھارے مائیکل انجیلو کا باوا بھی کیا کرے گا۔ ایسے ایسے ایبسٹریکٹ آرٹ کے نمونے بنائے ہیں کہ تمھارا پکاسو بھی انھیں دیکھنے کے بعد تائب ہو جائے۔ آؤ تمھیں دکھلائیں۔ تم بھی کیا یاد کرو گے کہ ڈیوک نے کراچی بار بڑی سیر کرائی تھی۔"

اس نے کپتان عارف کو سیل بوٹ چٹان کی طرف لے جانے کے لیے کہا۔ رخ تبدیل ہو جانے سے بادبان ڈھیلا ہو گیا۔ لڑکوں نے بھاگ بھاگ کر چند رسے کھولے اور باندھے اور سیل بوٹ چٹان کی طرف کج کج اٹھکیلیاں کرتی ہوئی جانے لگی۔ اس کی پیشانی پر پانی کی آواز اب دھیمی اور خوشگوار تھی اور وہ ایک سہل حرکت سے پرلی طرف سے چٹان کا موڑ گھومی۔ وہ چٹان کو تقریباً چھوتے ہوئے گذرے کیونکہ اس طرف چٹان سمندر کی باڑھ سے محفوظ تھی اور چھوٹی چھوٹی لہریں اس کے نچلے حصے کو اچھل اچھل کر چاٹتی تھیں۔ انھوں نے ان نقش و نگار، بیل بوٹوں کا سروے کیا جو سمندر نے کئی صدیوں میں چٹان کی دیوار پر بنائے تھے۔ ڈیوک نے جو دعویٰ کیا تھا وہ خلافِ توقع بالکل درست نکلا۔ ڈیوک ایک ڈھونگیا تھا، کچھ کچھ ایک 'ہمبگ' (humbug) مگر اس کا ان کو یہ منبت کاری دکھانے کے لیے یہاں لے آنا ثابت کرتا تھا کہ اس کے وجود میں شعریت کی حس تھی۔ وہ

اسے اس شعور کے لیے اور مثبت زندہ دلی کے لیے بھی پسند کرتے تھے۔

''میرا دل چاہتا ہے،'' افضل بولا ''میں چٹان کے اوپر اس چھوٹے مکان میں رہوں۔ شور و شغب اور دنیا کے غولوں سے دور۔ میرے لیے لائٹ ہاؤس کیپر کی زندگی آئیڈیل ہے۔''

''یہ کون سا مشکل ہے!'' ڈیوک نے کہا۔ ''ہم ابھی انتظام کیے دیتے ہیں۔ کھانے کے لیے یہاں پر کیکڑے اچھی خاصی مقدار میں ہیں۔ ہاں، سیکس کے لیے کیا کروگے؟''

''مجھ میں ہارمونز کی کمی ہے۔''

''یہ تو کچھ کچھ مجھ میں بھی ہو چلی ہے،'' ڈیوک نے کہا۔ ''پہلے تو ہر رات کا قصہ تھا۔ اب مہینوں ادھر دھیان نہیں جاتا۔ ہارٹ اٹیک کے مریض کو ویسے بھی احتیاط کرنی چاہیے۔''

انھوں نے چٹان کے چہرے پر ان لوگوں کے کندہ نام پڑھے جو بھی یہاں آئے تھے۔ ڈیوک نے ان کو بھی اکسایا کہ وہ سب چٹان پر جا کر اپنے اپنے نام لکھیں۔ اس میں ایسی حرکتیں کرنے کا اب بھی ایک لڑکے کا سا اشتیاق اور ذوق وشوق تھا۔ ہر قسم نے اسے مسترد کر دیا۔

اس چٹان پر زندگی کا نشان ایک چھوٹا کیکڑا تھا۔ چٹان کی چوٹی پر کوٹھری خالی تھی اور کپتان عارف نے ان کو بتایا کہ کیپر ہر شام صرف لائٹ کو جلانے کے لیے آتا ہے اور پھر لوٹ جاتا ہے۔ چٹان کے آخر میں ایک درہ تھا — سمندر کا بنایا ہوا۔ ایک چھوٹی کشتی اس میں سے دوسری طرف جا سکتی تھی مگر ان کی سیل بوٹ نہیں۔ چٹان کے سروے کے بعد وہ پھر اس کا چکر کاٹ کر کھلے سمندر کی طرف جانے لگے۔ اگرچہ ڈیوک ابھی لوٹنا نہیں چاہتا تھا۔

''اب بتاؤ،'' اس نے فاتحانہ کہا، ''امریکن گورنمنٹ کا پورا بجٹ — کیوں یار کتنا ہوگا امریکن گورنمنٹ کا سالانہ بجٹ؟''

''ابے سالے،'' افضل بولا، ''تو نے ہمیں امریکن گورنمنٹ کا فنانس سیکریٹری سمجھ رکھا ہے؟ کچھ ہزار ڈالر ہوگا۔''

''ہزار نہیں، بوجھ بجھکڑ! اربوں ڈالر۔ ہم یہ کہنا چاہتے تھے کہ اربوں ڈالر خرچ آ جائیں تو امریکہ والے ایسے نقوش نہیں بنا سکتے جو قدرت نے اس چٹان پر بنائے ہیں۔''

''انھیں بنانے کی کیا ضرورت ہے؟ یہ روپے کا ضیاع ہے۔''

''ہم کو تو ان کے چاند پر جانے کی تک بھی سمجھ میں نہیں آتی۔ اربوں ڈالر اپالو مشن پر خرچ کرتے ہیں۔ ہم کو دیں۔ ہم لوگوں کا اسٹینڈرڈ آف لونگ اونچا کریں۔''

''تم پریذیڈنٹ نکسن کو خط لکھو کہ وہ کیا کر رہا ہے۔''

''ہم اب جا کر لکھیں گے۔ مجھے ان دنوں انسومنیا (insomnia) ہے۔ غالب کی طرح نیند رات بھر نہیں آتی۔ خود لکھنے میں کوفت ہوتی ہے۔ ڈکٹیٹ کرا سکتا ہوں۔ جب ہماری سیکرٹری تھی تو ہم نے بیٹھے بیٹھے کئی ایسے آرٹیکل ڈکٹیٹ کرائے۔ خود لکھنے میں ہمیں یہ مصیبت ہے کہ خیالات اتنی تیزی سے آتے ہیں کہ قلم سے آگے نکل جاتے ہیں۔ ہاں بھائی، وہ حفیظ سیٹھ والا آفر منظور کرلوں تو سالا لیڈی سیکرٹری تو دے ہی گا۔ اس کے نہ ہونے سے میرے کئی قیمتی خیالات ضائع ہو جاتے ہیں۔''

''تم کافی معقول باتیں کر رہے ہو۔'' افضل نے کہا۔ دراصل کوکا کولا سے حل شدہ وہسکی کے تین پیگ اب ڈیوک پر اپنا اثر کر رہے تھے اور وہ انٹ شنٹ مار رہا تھا۔

ایک مہین دودھیا سی لکیر ہاربر کے دہانے کے پانی کو کھلے سمندر سے جدا کرتی تھی۔ وہ اب منوڑا آئی لینڈ کے آخری سرے سے آگے بڑھ کر بیچ کھلے سمندر میں پہنچ گئے اور سیل بوٹ کیچڑ نکالنے والے ساکن جہاز کی سمت جانے کے لیے جدوجہد کرنے لگی۔ شام اب گہری ہو چلی تھی اور ہوا میں ایک سرد کاٹ آ گئی تھی۔ افضل، جو بے حد دبلا پتلا تھا اور کھیت کے نقلی چوکیدار سے مشابہ تھا، کچھ کچھ کپکپانے لگا۔ ہرقاسم نے اپنا سویٹر پہن لیا۔ ڈیوک، جو اپنے سوٹ میں تھا، ٹھنڈ سے متاثر نہ ہوا۔ ویسے بھی وہ خود کو سرد ملکوں کے باشندوں میں شمار کرتا تھا اور ان لوگوں میں سے تھا جو سرما کے موسم میں بھی چھت کا برقی پنکھا چلانے پر اصرار کرتے ہیں۔ سمندر کے تموج میں اب تندی اور غضب کا عنصر نمودار ہونے لگا۔ تا حدِ نظر بحیرۂ عرب اپنی دکتی سلیٹی موجوں سے ان کی طرف وار کرتا ہوا آیا۔ یہ ایک پُرتجمل منظر تھا — کسی قدر ہیبت ناک۔

''چار روز تک ہم عدن پہنچ جائیں گے۔'' افضل نے کہا۔

''بھئی، ہم تم کو بتانا بھول گئے، زیرو زیرو سیون —شاید ہرقاسم کو بتایا تھا۔ ابوظہبی کا سلطان ہمارا دوست ہے۔ ہماری اس سے یہیں ملاقات ہوگئی۔ دوست بن گیا۔ اس نے پچھلے دنوں ہمیں ابوظہبی آنے کی دعوت بھی دی تھی۔ اس کے محل میں ٹھہریں گے۔''

''غالباً ٹیکسٹائل مل لگانا چاہتا ہوگا۔''

''نہیں، اس کو ٹیکسٹائل مل لگانے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' ڈیوک نے افضل کے ریمارک کو سنجیدہ جانتے ہوئے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ''بھئی ان تیل والے شیخوں کے پاس دھن دولت کی ریل پیل ہے۔''

''ڈیوک تم وہاں کیوں نہیں چلے جاتے؟ ممکن ہے وہ تمھیں آٹھ ہزار ماہوار پر اپنا چیف شکرا بردار تعینات کرلے۔''

’’زیرو زیرو سیون، تم کافی نامعقول ہو۔‘‘

کپتان عارف خلیج عدن کی طرف چلتی رہی اور افضل کو ایک احساس سا ہوا کہ وہ ایک نامعلوم بندرگاہ کی طرف جا رہے ہیں، کسی دورافتادہ ساحل کے پاس جس کی اسے اپنے ہر سفر میں جستجو رہی۔ اسی قسم کا احساس غالباً اس کے ساتھیوں کو بھی ہوا کیونکہ کچھ ایسے احساسات و جذبات ہوتے ہیں جو ہم اپنے آپ کو بھی سمجھا یا بیان نہیں کر سکتے جنھیں آدمی کی تنہا روح ہی جانتی ہے۔

’’یہ بڑا اچھا دن رہا۔‘‘ ہرقاسم نے سادگی سے کہا۔ ’’میری زندگی کے خوبصورت ترین دنوں میں سے ایک۔ ڈیوک، تھینک یو!‘‘

ڈیوک مسرت سے مُسکرایا، ’’تم لوگ ناشکر گذار یا سرد ہو۔ آج تم دو بجے تک غائب رہے۔ میں اکیلا بور ہوتا رہا۔‘‘

صبح نو بجے جب ڈیوک نے انھیں اپنے کشمی چیمبرز کی فرم کے پاس چھوڑا تھا، اس نے انھیں خصوصی ہدایت دی تھی کہ وہ دادا بھائی کمیرنگ ایجنٹ سے بینک گارنٹی کے بارے میں پتہ کر کے سیدھے اس کے پاس آجائیں۔ وہ دادا بھائی کے ہاں ضرور گئے مگر وہاں ان کو معلومات لینے میں پندرہ منٹ لگے۔ پھر اصولاً انھیں فوراً ڈیوک کے پاس فرید چیمبر والے دفتر میں پہنچ جانا چاہیے تھا کیونکہ ڈیوک نے اپنے دل میں یہ مان رکھا تھا کہ اس کے دوست اس کی صحبت کے بغیر ایک پل بھی نہیں رہ سکتے۔ یہ خوش خیالی مطلق درست نہ تھی۔ دادا بھائی سے نکل کر افضل اور ہرقاسم نے کھلنڈرے بے پرواہ لڑکوں کی طرح ڈیوک سے کچھ گھنٹے دور رہ کر گذارنے کی ٹھانی۔ ڈیوک نے ان کا کھوج لگانے کی خاطر دادا بھائی اور دوسری جگہوں پر متعدد فون کیے اور ان کے نہ آنے پر دہکتے انگاروں کے بستر پر رہا۔ اِدھر افضل اور ہرقاسم بندر روڈ پر نکل کھڑے ہوئے — ڈیوک کے بغیر کراچی کے نظارے دیکھتے ہوئے وہ کشمی بلڈنگ کے پاس سے گذرے جہاں ڈیوک اپنی فرم کے چوتھی منزل کے دفتر میں بیزار اور برہم ان کا انتظار کر رہا تھا۔ انھوں نے اپنے منھ دوسری طرف پھیر لیے۔ آگے ایک کونے پر انھوں نے ایک دو منزلہ عمارت پر ’’فیضی رحمین آرٹ سینٹر‘‘ لکھا ہوا پڑھا۔ ہرقاسم نے کہا، ’’اسے کیوں نہ دیکھیں۔ تم عطیہ بیگم کو جانتے ہو۔ شبلی اور اقبال اور بہت سے اس سے متاثر تھے۔ فیضی رحمین اس کا شوہر تھا اور ایک یہودی پینٹر تھا۔‘‘ چنانچہ وہ چار آنے کے ٹکٹ لے کر اوپر فیضی رحمین اسٹوڈیو کی عزلت گزیدہ متبرک فضا میں داخل ہوئے۔ وہ تقریباً ایک نئی دنیا میں تھے۔ دو گھنٹے تک فیضی رحمین کی پینٹنگز اور مخطوطات، خاندانی heirlooms کی دنیا میں کھوئے رہے۔ یہ ایک پرائیویٹ میوزیم تھا مگر ان پینٹنگز میں اور خطوں میں اس زمانے کی تاریخ اور اس

عجیب کنبے کے افراد کی رسی اور ذہنی زندگی بھری پڑی تھی۔ عطیہ اور فیضی رحمین کے متعلق زیادہ جاننے کے لیے وہ اپنے شرمیلے پن کے باوجود جرأت کرکے میوزیم کی لیڈی کیوریٹر سے جا ملے۔ وہ جنوبی ہند کی ایک سلجھی ہوئی ماڈیسٹ عورت تھی اور اس نے ان کو اس فیملی کی بہت سی باتیں بتائیں۔ (بعد میں ڈیوک ان پر برسا کہ وہ اس کے بغیر لیڈی کیوریٹر سے کیوں ملے اور اسے ساتھ کیوں نہ لے گئے۔) اسٹوڈیو کے بعد وہ اردو کالج میں 'م' سے ملنے گئے۔ افضل اسے جانتا تھا۔ 'م' ان نادر تربیت یافتہ لوگوں میں سے تھا جن کے لیے ان کا کام عبادت ہوتا ہے اور جنھیں اس میں بے پناہ مسرت اور انعام مل جاتا ہے۔ وہ ایک بہترین اور پرلطف باتیں کرنے والا تھا۔ کتابوں اور مصنفوں کے بارے میں اسے بیسیوں کہانیاں معلوم تھیں۔ اس کی صحبت میں وقت اڑتا گیا اور جب وہ بادل ناخواستہ اس سے رخصت ہونے کے لیے اٹھے تو ابھی سے ساڑھے تین بج چکے تھے۔ ''آج ڈیوک ہمیں معاف نہیں کرے گا،'' ہرقاسم نے کہا۔ اور وہ اسکول کے بھگوڑے چھوٹے لڑکوں کی طرح بہانے سوچنے لگے جو وہ ڈیوک کے سامنے اپنی طویل غیر حاضری کے جواز میں پیش کرسکتے تھے — اور جب ڈیوک کے پاس پہنچے تو وہ سخت روٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا، ''بھئی، تم لوگوں کی وجہ سے میں نے لنچ بھی نہیں کھایا۔'' انھوں نے کہا کہ کینٹین چیمبرز کے نیچے تھی اور انھوں نے اسے لنچ کھانے سے روکا تو نہ تھا۔

ڈیوک نے اب انھیں پھر جتایا، ''بھئی تم لوگوں کی وجہ سے میں نے آج دوپہر کا لنچ نہیں کھایا۔''

افضل نہ چوکا، ''سالے، لنچ تو ڈاکٹر نے تمھیں منع کر رکھا ہے!'' یہ بھی ڈیوک کی ایک منتر تھی۔ وہ ہر ایک کو بتاتا کہ وہ ڈاکٹر کے کہنے پر لنچ نہیں کھاتا اور صرف ایک کافی کی پیالی اور ٹوسٹ پر گذر کرتا ہے۔ انھوں نے ڈیوک کو اپنا لنچ ایک بار بھی مس کرتے نہ دیکھا تھا۔ وہ ہر چیز کھاتا تھا اور بڑے relish سے، ایک اصل کھاؤ کی طرح۔

ہرقاسم نے اب یکلخت ڈیوک کو آڑے ہاتھوں لیا۔ ''تم وہاں میوزیم میں ہمارے ساتھ لیڈی کیوریٹر کے پاس جاتے تو خواہ مخواہ اسے مرعوب کرنے کے لیے انٹ شنٹ مارتے۔ ارے، تو جاہل آدمی ہے! میری سمجھ میں یہ نہیں آتا کہ آخر تم ایک منٹ تنہا کیوں نہیں رہ سکتے۔ تمھاری اپنی کوئی دنیا نہیں؟ میں اپنے متعلق کہہ سکتا ہوں، مجھے ایک دو مہینے بالکل اکیلا اپنی کتابوں اور لکھنے کے سامان کے ساتھ ایک کمرے میں چھوڑ دیا جائے تو میں مکمل طور پر خوش رہوں گا اور ایسی زندگی کو ویلکم کروں گا۔ تم اپنے آپ میں بالکل نہیں رہ سکتے۔''

ہرقاسم ایک چھریرا درمیانے قد کا پینتالیس سال کا شخص تھا۔ پیشے سے انجینئر، مگر بڑا انٹلیکچوئل اور ذہین وفطین۔ وہ عربی کا عالم فاضل تھا جسے اس نے اسکول اور کالج میں مضمون کے طور پر لیے

بغیر اپنی کاوش اور لگن سے سیکھا اور اس کے کئی مضامین مصر اور بیروت کے اچھے عربی ادبی مجلوں میں شائع ہو چکے تھے۔ وہ بڑے مذہبی دیندارانہ خیالات رکھتا تھا مگر افضل کی صحبت نے اور اس کے ساتھ اٹھنے بیٹھنے سے اسے جدید انگریزی ادب سے شغف ہو گیا، جو اس درجے بڑھا کہ اسے عربی میں لکھنے سے چڑ ہو گئی۔ اس کے دل و دماغ کے دریچے کھلے تھے اور آخر اس نے تنگ دلانہ ملائیت کی کینچلی اتار دی اور اس کے خیالات میں کشادہ ذہنی اور وسیع المشربی آ گئی۔ وہ حال ہی میں جرمنی ہو کر آیا تھا اور جرمنی پہنچ کر اس نے اپنے ہوٹل میں پہلی رات گذارنے سے پہلے اپنا سیفٹی ریزر نکالا اور اپنی چھوٹی ترشی ہوئی داڑھی مونڈ ڈالی۔ ماضی سے سب رشتے پھر اس طرح کٹ گئے۔

کپتان عارف نے ڈیوک سے پوچھے بغیر سیل بوٹ کو واپس لے جانے کے لیے کہہ دیا۔ ڈیوک نے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ کون نے بادبان کے رسّے ڈھیلے کر دیے۔ وہ اب منوڑا آئی لینڈ کے دکھن پرسکون سے اچھل رہے تھے۔ سورج بادبان کے پیچھے ہلکے بادلوں کی اوٹ میں دمکتے پیتل کی تھالی تھا اور مغربی افق پر ایسے دھندلے بوقلموں رنگ نمودار ہو رہے تھے جن کا کوئی نام نہیں ہے۔ دن میں ابھی اجالا اٹکا ہوا تھا۔ ان کے بائیں طرف منوڑا آئی لینڈ کے بغلی ساحلی قطعے کے ساتھ ایک دوسرے کے پیچھے کئی جہاز پیلے افق کی سطح پر سیلہوٹ (silhouette) بنے تھے — ان نقشوں کی طرح جو تم اپنے بچپن میں کاغذ پر روشنائی سے اپنا نام یا کوئی عبارت لکھ کر اسے تہہ کر کے بناتے تھے۔ کپتان عارف نے ان کو بتایا کہ یہ سب کارگو جہاز ہیں جو بندرگاہ میں جانے کے لیے اپنی باری کے منتظر ہیں۔

''ایسا غروب آفتاب آدمی سمندر سے ہی دیکھ سکتا ہے،'' برقاسم نے کہا۔

''اس نظارے کو الفاظ کیسے مسخر کر سکتے ہیں؟'' افضل نے ایک سوال پوچھا۔ اس کا ذہن ابھی سے اس طرف کام کر رہا تھا — ایک بری عادت جو اسے چھوڑتی نہ تھی۔ ''اب بتاؤ تم اس سمندر کے رنگ کو کیا کہو گے؟''

''اے ابوجہل!'' ڈیوک نے میٹر آف فیکٹ ہوتے ہوئے کہا، ''سمندر کا کوئی اپنا رنگ نہیں ہوتا۔ وہ تو آسمان سے اور اپنے پانی کی گہرائی سے اپنا رنگ لیتا ہے۔''

''اے کودن، میں جانتا ہوں، مگر یہ کون سا رنگ ہے؟''

''سمندر کا کوئی کلر نہیں،'' ڈیوک نے اصرار کیا، اور پھر وہ ایک اور ڈگر پر چل نکلا۔ ''مجھی مجھے یہ جدید ناولوں اور افسانوں میں منظر نگاری بڑی ناپسند ہے۔ جہاں منظر نگاری کا ٹکڑا آیا، میں اسے چھوڑ دیتا ہوں۔ اور اسی طرح کرداروں کی شکل و شباہت، ناک نقشے پر عبارت آرائی مجھے بور

کرتی ہے۔ اب مصنف صاحب اپنے ناول کی ہیروئن کے بارے میں لکھ رہے ہیں کہ اس کی آنکھیں ہرنی جیسی تھیں، ناک ستواں تھی، اس کا جسم سڈول تھا، وغیرہ وغیرہ۔ بھئی مجھے کیا! پڑھنے والا اس عورت کا تصور باندھتا ہے جسے وہ چاہتا ہے، تو پھر ایسی گوہر افشانی کا کیا فائدہ؟ یہ ریڈر کا وقت ضائع کرنا ہے۔ اتنا لکھ دینا کافی ہے کہ وہ خوبصورت تھی۔ ریڈر اس کا روپ مصنف کی مدد کے بغیر ڈھال لے گا۔ ہم اب ایک ناول نئی تکنیک پر لکھنے کا ارادہ کر رہے ہیں، لیکن تم لوگ کچھ مدد نہیں کرتے۔''

وہ ڈیوک کی ناول نویسی کی نئی تکنیک کی تھیوری پہلے بھی کئی بار سن چکے تھے۔ انھوں نے اسے اس تھیوری کو پھر واضح کرنے دیا۔ پھر وہ اسے روک بھی کیسے سکتے تھے!

''ہم ناول کے شروع میں اس میں آنے والے ہر کردار کے پورے حالات و کوائف دیں گے کہ وہ کہاں پیدا ہوا، اس کے بعد اس پر کیا گذری، اس کا پیشہ کیا ہے، خانگی لائف کیسی ہے، تاکہ جب پڑھنے والا اصل قصے کو پڑھے تو کرداروں کی پوری بیک گراؤنڈ اس کے سامنے ہو اور ہم کو بھی کردار کے حلیے، خاندان وغیرہ کے بارے میں دوبارہ وضاحت نہ کرنی پڑے۔ بس پھر ناول پرانے قصوں کی طرح واقعات پر چلے۔ ہم ناول کو کبھی کے شروع کر دیتے، مگر ڈکٹیشن لینے والی سیکرٹری کے بغیر مصیبت لگتا ہے۔ کیوں، تم لوگ اس تکنیک کی داد دیتے ہو یا نہیں؟''

افضل نے کہا، ''بالکل نئی اور انوکھی تکنیک ہے۔ تم اس کے موجد ہو گے۔ پہلے کوئی ناول اس تکنیک پر کسی نے نہیں لکھا۔ تمھاری دھوم مچ جائے گی۔ لوگ پوچھیں گے، یہ ڈیوک کون ہے؟''

ہر قاسم سنجیدگی کے موڈ میں تھا اور اس تھیوری پر بحث کرنے پر آمادہ۔ اس کی آواز میں جھلاہٹ تھی، ''یہ تم اپنی تھیوری کو کیا لیے پھرتے ہو؟ جو کچھ بکواس تم اس تکنیک پر لکھو گے وہ ناول نہیں ہوگا۔ تمھاری مصیبت یہ ہے کہ تم کو ابھی تک یہ پتہ نہیں چلا کہ افسانہ اور ناول کس بلا کا نام ہے۔ واقعاتی رپورٹ ناول نہیں بنتا۔ افسانہ اور ناول میں یہ قطعاً ضروری نہیں کہ پہلے کرداروں کا تفصیلی تعارف کرا دیا جائے، بلکہ کردار واقعاتی بیان میں خود بخود ابھرتے ہیں اور زندہ ہوتے ہیں۔''

افضل بھی اب اس بحث میں حصہ لینے لگا، اگرچہ ڈیوک اپنی تھیوری کی صحت اور معقولیت کے بارے میں پوری طرح بایقین تھا اور موقف سے ایک انچ ہٹنے کو تیار نہ تھا۔ ''دیکھو ڈیوک، افسانے اور ناول میں پڑھنے والے کو کرداروں کے بارے میں سب کچھ بتانا ضروری نہیں۔ سعادت حسن منٹو کو لو، وہ چار جملوں میں اپنے کردار کی تصویر کھینچ دیتا ہے اور تمھیں اپنے کردار کے بارے میں وہ سب کچھ بتا دیتا ہے جو اس کی کہانی کے مقصد کے لیے ناگزیر ہے۔ تم نے وہ نہیں پڑھا کہ بڑا فن حذف کرنے سے بنتا ہے۔''

''ممکن ہے۔'' ہر قاسم نے کہا، ''تمھاری تھیوری پر ناول لکھا جا سکے، مگر اس کے لیے ایک جینیس چاہیے۔''

ڈیوک نے فوراً کہا، ''کیا تم لوگ مجھے جینیس نہیں سمجھتے؟ میں ضرور اس تھیوری پر ناول لکھوں گا۔''

ڈیوک نے ناول لکھنے کا پکا ارادہ کر لیا تھا اور اس لیے اس مسئلے پر مزید بحث فضول تھی۔

وہ اب منوڑا کے بریک واٹر پوائنٹ کے پاس پہنچ گئے۔ سیل بوٹ ہاربر کے دہانے میں داخل ہو چکی تھی۔ اندھیرا بڑھنے لگا اور ساتھ ہی ہوا کی سردی۔ منوڑا اب ایک جلے ہوئے چرمر ہوئے کاغذ کی شکل اختیار کرنے لگا تھا۔ ایک ماہی گیری کا ٹرالر چپ چاپ ہوا ان کے پاس سے گذرا اور ڈیوک اپنی واہمی دنیا میں پہنچ گیا — کوکا کولا کی بوتل اس کے ہاتھ میں تھی، مگر اس کا سیال تہہ کو چھونے کو تھا۔

''ہم نے بھی ایک تین لاکھ کا ماہی گیری کا بیڑا خرید لیا تھا۔ دو ٹرالر تھے اور پانچ مچھلیاں پکڑنے والے چلیر وغیرہ سے لیس کشتیاں۔ ہمارا تو لیکسا کی انجینئر تک کا لاکھوں کا کاروبار تھا، اوھر تو جہ نہ دے سکے۔ ہمارے پارٹنر نے ہمیں آخر میں دھوکا دیا اور ہمارا دو لاکھ روپیہ کھا گیا۔ ٹرالر بھی نہیں بک سکے۔''

افضل ڈیوک سے کبھی نہ چوکتا تھا۔ وہ جھٹ بولا، ''پاکستان نیوی کو ان کی ضرورت نہ تھی؟''

ڈیوک نے مذاق کو نہ سمجھا اور سنجیدگی سے کہا، ''ارے بھئی، تم بھی جاہل شخص ہو۔ پاکستان نیوی مچھلیاں پکڑنے کے لیے تو نہیں۔''

ڈیوک نے اپنے پورٹ مینٹو میں سے ڈھونڈ ڈھانڈ کر چکیلے کاغذ میں لپٹی ہوئی پنیر کی ایک ٹکیہ نکال کر ان کی طرف بڑھائی۔ ''لو بھئی یہ خصوصی فارن پنیر ہے۔ پاکستان میں بالکل دستیاب نہیں ہوتا۔''

''اسمگلڈ؟'' افضل نے کہا۔

''جو سمجھو، موج اڑاؤ۔''

ہرقاسم اور افضل نے پنیر کی ٹکیہ میں سے تھوڑے تھوڑے ٹکڑے توڑے اور پھر اسے پنیر پیش کرنے والے کی طرف بڑھایا۔

''نہیں بھئی، یہ فیٹننگ ہے۔ اس میں فیٹ (چربی) ہوتی ہے۔ فیٹ مجھے منع ہے۔''

وہ اس سے پوچھنا چاہتے تھے کہ اگر یہ پنیر کی ٹکیہ اس کے لیے اتنی مہلک تھی تو وہ کیوں اسے ہر وقت اپنے پورٹ مینٹو میں لیے پھرتا ہے۔

جب وہ کھانے لگے تو ڈیوک نے اپنا ارادہ بدل دیا۔ ''بھئی، ایک بالکل چھوٹا سا ٹکڑا ہم کو دو

—اس سے بھی چھوٹا۔"

"اسے مت دینا۔" افضل نے ہرقاسم کو ہدایت کی۔ "اس سے اس کی موت واقع ہو جائے گی۔ پھر نئی تکنیک کا ناول کون لکھے گا؟"

ہرقاسم نے کہا، "مجھے مشرقی پاکستان جانے کی ہمیشہ بڑی خواہش رہی۔ مجھے بنگال کے لوک گیتوں، ادب اور فن سے بڑی محبت ہے۔ اب اٹ از ٹو لیٹ۔ وہ اب بنگلہ دیش بن چکا ہے۔"

"ہم جب بنگال میں پی آئی ڈی سی کے پراجیکٹ ہیڈ تھے تو ہمارے کافی بنگالی دوست تھے،" ڈیوک مکمل طور پر اونچی ہواؤں میں تھا۔ "لیکن یار، اب تو ان بنگالیوں سے ہمیں نفرت ہوگئی ہے۔ نہایت رذیل لوگ ہیں۔ وہاں جانے میں کوئی لطف نہیں۔ ہم تمھیں سیلون لے چلیں گے۔ نیچرل سینری کے لحاظ سے تمھارا بنگلہ دیش اس کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ وہاں رہائش کی تکلیف بھی نہیں ہوگی۔ میری وائف کی پھوپھی زاد بہن سیلون میں پاکستانی ہائی کمیشن کی ایک اعلیٰ شخصیت سے بیاہی ہوئی ہیں۔ وہیں ان کے پاس ایمبیسی میں رہیں گے۔ ہوٹل کا خرچ بھی بچ جائے گا۔ اور ویسے بھی وہ ہمیں ہوٹل میں کیوں رہنے دیں گے۔"

وہ سیلون جانے کا پروگرام طے کرنے لگے۔ ڈیوک نے ستمبر کا مہینہ تجویز کیا۔

"لیکن یار تم لوگوں کو پول کرکے میرے کرائے کا انتظام کرنا ہوگا،" ڈیوک نے ان کو آگاہ کیا۔ "میرے فنانسز (finances) آج کل کچھ گڑبڑ ہو رہے ہیں۔ اس کشمی چیمبرز والی فرم نے جس کا میں ٹیکسٹائل ایڈوائزر ہوں، روی ٹیکسٹائل مشینری کی ایجنسی لی ہے۔ ہم نے کوئی سات مہینے میں ایک کروڑ کی مشینری کے آرڈر بک کیے۔ ظاہر ہے ہمارے ٹیکسٹائل لارڈز سے ذاتی تعلقات کی بنا پر یہ ممکن ہے۔ میرا کمیشن — کل میں نے حساب لگایا تو کوئی ڈھائی لاکھ روپیہ بنتا ہے۔ یہ سیٹھ بات نہیں کرتا یار! یہ لوگ بڑے خسیس ہوتے ہیں۔ سوچتا ہوں، کورٹ جاؤں یا اس فرم سے احتجاجاً ریزائن دے دوں۔ ہاں، ہمارا اس کار کی اوور اسپیڈ پروٹیکشن والی ایجاد کا پیٹنٹ ہوگیا تو پھر لاکھوں روپے ہو جائیں گے۔ پھر کوئی پروا نہیں ہوگی۔ میں تم لوگوں کو اپنے خرچ پر سیلون لے جاؤں گا، اور میں اس پر اصرار کروں گا۔"

ڈیوک کے لیے کرایہ پول کرنے کے مسئلے نے افضل اور ہرقاسم کے سیلون جانے کے شوق کو کچھ سرد کر دیا۔

کپتان عارف اب شب شپاتی نیلے جھٹپٹے میں منوڑا آئی لینڈ کے اتری چٹوں کے قریب تھی۔ اندھیرا گہرا ہونے کی وجہ سے وہ بمشکل موجوں کو دیکھ سکتے تھے مگر سیل بوٹ کی حرکت سے پتہ چلتا

تھا کہ سمندر کے تیور بدل رہے تھے۔ آئی لینڈ کے لائٹ ہاؤس کی دودھیلی روشنی بحیرۂ عرب کے مرتعش تاریک پانیوں پر سفر کرنے لگی۔ اپنی منزل کے قریب آتے ہوئے ڈیوک پر اداسی اور دل شکستگی کا موڈ طاری ہو گیا۔

"ابھی تمبر میں آٹھ مہینے ہیں،" اس نے کہا۔ "تم کیا سمجھتے ہو، اس وقت تک میں زندہ رہوں گا؟ جلدی کا پروگرام بناؤ۔"

"فکر نہ کرو، تم زندہ رہو گے اور اسی طرح چاق و چوبند،" افضل نے اسے تشفی دی۔

"بھئی، میں تین بار اٹیک بھگت چکا ہوں۔ ڈاکٹر کہتا ہے، چوتھا بالکل فیٹل ہو گا۔ آخر تم لوگ کیوں چاہتے ہو کہ میں زندہ رہوں؟"

"ہم نہیں چاہتے۔ یہ صرف تمھارے اپنے فائدے میں ہے۔"

"ہم تینوں کے یکجا ہونے کا یہ آخری موقع ہے،" ڈیوک نے حتمی لہجے میں کہا۔ "تم لوگ میرے بارے میں خواہ مخواہ خوش فہمی میں مبتلا ہو۔ بات یہ ہے کہ موت سے آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے اب چھ سال ہو گئے ہیں اور اب اس کھیل میں بھی کوئی خاص چارم نہیں رہا۔ اس لیے تین مہینے تک یعنی مارچ پر سیلون جانے کا ٹرپ رکھو تو میں تمھارے ساتھ سیلون چلنے کے لیے زندہ رہوں، ورنہ اس کے بعد تم دونوں کو اکیلے ہمارے بغیر ہی جانا پڑے گا۔"

وہ چاہتا تھا کہ اس کے دوست اس پر رحم کھائیں اور اس کے مرنے کے ارادے کے خلاف احتجاج کریں، مگر دوستوں نے کچھ نہیں کیا بلکہ وہ ہنسے۔

جب کپتان عارف کیاڑی کے پتن پر پہنچے تو اس کے دوست بے خیالی میں اسے سیل بوٹ میں بیٹھا چھوڑ کر سیڑھیوں پر چڑھ گئے اور پرے کھڑی ڈکی بل مین ہنٹر کی طرف چلنے لگے۔ وہ تھوڑی دیر سیل بوٹ میں اپنی راجرز کی خالی بوتل اور دوسری چیزوں کو پورٹ میٹو میں بند کرنے کے لیے رکا۔ اس کا پورٹ میٹو اٹھانے کے لیے اب اس کے دوستوں میں سے کوئی بھی نہیں تھا۔ کپتان عارف نے پورٹ میٹو کو سنبھالا اور وہ تین کوکا کولا کی بوتلیں بھی، اور اوپر چبوترے پر لے چلا۔ ڈیوک قدرے ڈگمگاتی ٹانگوں سے کٹہرے کو پکڑ کر کپتان عارف کے پیچھے چڑھا۔ اوپر جا کر کپتان عارف کو ٹرپ اور بوتلوں کا حساب چکانے میں اسے کچھ وقت لگا۔ اس نے خود کو تنہا اور بے آسرا تصور کیا۔ اس کے دوست کار کے نزدیک پہنچ چکے تھے۔ اس نے پورٹ میٹو کپتان عارف کے ہاتھ سے لے لیا اور اچانک اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں اور شیڈ کی نیم تاریکی میں ایک متزلزل چال سے وہ بل مین ہنٹر اور اپنے دو دوستوں کی طرف لپکا، جیسے ایک ڈوبتا ہوا شخص تنکے کا سہارا لیتا ہے۔

ایک جنازے پر

(اس کہانی کے افراد اور واقعات فرضی ہیں۔ اگر کوئی مشابہت ہو تو محض اتفاق سمجھا جائے۔)

جب میں اتوار کی صبح کو اپنے دوست محمد منیر تنویر کی کوٹھی پر اس سے ملنے کے لیے گیا تو مجھے یہ خیال نہ تھا کہ اس صبح مجھے ایک جنازہ پڑھنا ہوگا۔ محمد منیر تنویر ایک درآمد برآمد کی کامیاب کمپنی کا مینیجنگ ڈائریکٹر ہے۔ کامیابی اس کے رگ و پے میں سرایت کر چکی ہے، اگرچہ اس کا اقرار کرنا ضروری ہے کہ اس نے اسے مغرور نہیں بنایا۔ میرا مطلب ہے، اپنے دفتر کے عملے اور گھر کے نوکروں کو چھوڑ کر، وہ ہر ملنے والے سے خوش اخلاقی اور ایک تیار دلکش مسکراہٹ سے پیش آتا ہے۔ اسے یہ سن کر بڑی خوشی ہوتی ہے کہ وہ امپورٹ ایکسپورٹ کا نپولین ہے یا یہ کہ وہ عورتوں کے لیے مکمل مرد آدمی (He Man) ہے اور کیونکہ میں اپنے دوستوں کا دل خوش کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں، اس لیے ہمیشہ فراخ دلی سے اس کی اپنے متعلق ان رایوں کی تائید کرتا ہوں۔ محمد منیر تنویر ایک اچھا آدمی ہے۔ مجھے اس سے تقریباً محبت ہے... اُن دنوں میں معاشیات پر کچھ لکھ رہا تھا اور میرے دوست نے اپنے دو سالہ امپورٹ ایکسپورٹ کے تجربے پر مجھے کہا تھا کہ اگر میں اتوار کی صبح کو اس کوٹھی پر آ جاؤں تو وہ مجھے پاکستان کی معاشیات پر ایک ایسا جامع لیکچر دے گا کہ مجھے کسی اور حوالے کی کتاب کی ضرورت ہی نہ رہے گی۔

میرا دوست ناشتہ کرتے کرتے باہر آیا، پاجامے اور قمیص میں۔ اس لباس میں میرا نپولین کچھ کچھ مایوس کن لگ رہا تھا، مگر یہ اتوار تھا، جب ہر کوئی آرام کرتا ہے۔ پہلی خبر جو اس نے مجھے سنائی یہ تھی کہ خان بہادر ارشاد حسین کا انتقال ہو گیا ہے۔ اوہو! مجھے فی الواقع ایک صدمہ سا ہوا، جیسا کہ

کسی انسانی زندگی کے ختم ہو جانے پر ہوتا ہے — شاید اس لیے کہ آدمی اس میں خود اپنے الوداعی وقت کی گونج سنتا ہے۔

مجھے خان بہادر ارشاد حسین سے صرف ایک بار ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ہمرور کے ریلوے اسٹیشن پر جس ملاقات کو اب تقریباً ایک سال ہو چکا تھا۔ وہ ان دنوں ہمرور میں انکم ٹیکس کمشنر تھے۔ میری آنکھوں کے سامنے ٹھنڈے ریشمی سوٹ میں ایک جیتی مچھلی کی طرح تھرتھراتے ہوئے چہرے والے آدمی کی تصویر آئی، جو اپنے منھ سے زیادہ اپنے چہرے کی تھرتھراہٹوں اور اپنے بازوؤں اور اپنی ہاتھوں کی حرکات سے باتیں کرتا تھا۔ وہ ریلوے اسٹیشن پر پرائم منسٹر کو، جو ایک اور خان بہادر تھے اور کراچی جا رہا تھا، الوداع کہنے آیا تھا۔ مجھے یاد ہے کہ پہلے مرحلے ہی پر میرا ان سے یہ موضوع سخن رہا کہ آیا میں ہمرور میں ملازم ہو جاؤں یا باہر پنجاب یا سندھ میں تلاش کروں اور یہ کہ خاندان کا مستقبل کہاں ملازمت کرنے سے زیادہ منور کیا جا سکتا ہے۔ خان بہادر نے اپنے بارے میں کہا کہ وہ ہندوستانی گورنمنٹ سے ریٹائر ہونے کے بعد ساڑھے تین ہزار روپے ماہوار کے مشاہرے پر اس لیے ہمرور میں انکم ٹیکس کمشنر ہو گئے تھے تاکہ ایک اسلامی ریاست کی کچھ خدمت کر سکیں، مگر ان کے نزدیک موجودہ حالات ایسے تھے کہ ان کے لیے کوئی حقیقی خدمت کرنا ناممکن تھا۔ وہ مجبور تھے اور ان کے ہاتھ بندھے تھے۔ میرے باپ اور میں نے فوراً تائید کی کہ وہ (خان بہادر) مجبور تھے اور ان کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ وہ خان بہادر ارشاد حسین اب انتقال کر چکے تھے۔

اس خبر کے فوری بعد مجھے دوسرا خیال جو آیا یہ تھا کہ اب خان بہادر کی صاحبزادی کی اس خوجہ کے لڑکے سے نسبت کا کیا ہوگا؟ میں نے محمد منیر تنویر سے پوچھا۔ اسے خود اس امر کا یقین نہ تھا کہ آیا وہ شادی اب اسی طرح تصفیے کے مطابق طے پائے گی یا یہ کہ لڑکی کے بھائی، جو اس نسبت سے سخت ناراض تھے، کوئی روڑا اٹکائیں گے۔

بات یہ تھی کہ ریاست ہمرور کی انکم ٹیکس کمشنری سے ایک بھونڈے طریق پر دستبردار کر دیے جانے کے بعد خان بہادر ارشاد حسین کراچی میں ایک سندھی ہندو کی کوٹھی میں آ کر اقامت پذیر ہو گئے۔ سندھی ہندو ہندوستان بھاگنے کے لیے تیار نہ تھا۔ خان بہادر نے اپنی چرب زبانی سے اس ہندو کو اپنی ان وسیع کوٹھیوں اور جائیدادوں کا جھانسا دیا جو وہ پیچھے دلی میں چھوڑ آئے تھے اور اس کو جائیداد کے تبادلے پر راضی کر لیا۔ لیکن جب وہ سندھی دلی پہنچا تو خان بہادر کی تمام وسیع جائیداد جو وہ دریافت کر سکا، کوچہ بلی ماراں میں ایک چھوٹی سی پرانی حویلی تھی، اور اس پر بھی گورنمنٹ اس کو قبضہ دینے پر تیار نہ ہوئی۔ بیچارہ سر پیٹتا رہ گیا۔ یہ سودا ظاہر کرتا ہے کہ خان بہادر ارشاد حسین محض

"جیلی فش" ہی نہ تھے، بلکہ اپنا الو اتنی ہی اچھی طرح سیدھا کرنے کے اہل تھے جتنا کہ کوئی اور۔

تقسیم کے بعد کراچی کی ہر گلی اور کوچے کے پرانے اور اصلی مکین اپنے مکانوں کو چھوڑ کر بھاگنے لگے اور تقریباً رات کے اندر اندر ان مکانوں میں نئے اور اجنبی لوگ آ کر بس گئے۔ جہانگیر سوڈا واٹر والا روڈ پر بھی اب نئے بسنے والے آ گئے تھے — جو ہزاروں میل دور پیدا ہوئے تھے، مختلف آب و ہوا اور ماحول میں پروان چڑھے تھے اور اب جڑوں سے اکھڑے ہوئے پودوں کی طرح ایک نئی آب و ہوا اور نئے ماحول میں پھولنے کے لیے آنے پر مجبور کیے گئے تھے؛ وہ لوگ جو دلی یا لکھنؤ یا حیدرآباد کو اپنا وطن کہنے پر ناز کیا کرتے تھے، اب انھوں نے ایک نیا وطن پا لیا تھا۔

جس کوٹھی میں خان بہادر ارشاد حسین خان رہتے تھے، اس کے ساتھ کی دوسری کوٹھی میں بمبئی کا ایک خوجہ حاجی عبدالغفور بھوسا اور اس کے رشتے دار آ کر مقیم ہو گئے تھے۔ حاجی غفور بھوسا کا ایک لڑکا تھا، جس نے باپ کا سارا عظیم الشان کاروبار سنبھال رکھا تھا۔ خان بہادر بنگلور سے کراچی آئے تو بیکار وقت پہاڑ لگنے لگا۔ سوشل بننے اور وقت گذارنے کے لیے وہ پاس کے 'ریورز کلب' کے ممبر بن گئے اور اکثر شام کو اپنی صاحبزادی حمیدہ کے ساتھ وہاں جانے لگے۔ 'ریورز' نے، جو زیادہ تر گنوار سے تھے، ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔

حمیدہ اکیس بائیس برس کی، ایک اچھی خاصی عام نقش و صورت کی لڑکی تھی۔ خان بہادر کا کلب کا ممبر بننے میں ایک خیال یہ بھی تھا کہ شاید اس طرح حمیدہ کے لیے کوئی مزید خاوند مل جائے۔ حاجی بھوسا کا لڑکا بھی کلب کا ممبر تھا اور ہر شام وہاں جایا کرتا تھا، جہاں حمیدہ سے اس کی اکثر باتیں ہوتیں۔ ایسے حالات میں رومان نگاروں اور فلمی پروڈیوسروں کے مسلم قواعد کے مطابق محبت لازمی تھی۔ ایک مہینے کے اندر کم از کم لڑکا حمیدہ کو اس حد تک چاہنے لگا کہ اس نے گھر جا کر حاجی بھوسا سے صاف صاف کہہ دیا کہ حمیدہ اس کے لیے دنیا میں ایک ہی لڑکی ہے اور وہ شادی کرے گا تو اسی سے۔ حاجی بھوسا کو پہلے یقین نہ آیا۔ کیا اس کے کانوں نے ٹھیک سنا ہے؟ دنیا کو کیا ہونے لگا ہے؟ بھوسوں کی پچھلی تاریخ میں ایسی بات سنی نہ گئی تھی کہ کسی بھوسے نے خوجہ برادری سے باہر شادی کی ہو! حاجی بھوسا اپنے بیٹے کی شادی اپنے خاندان میں کرنا چاہتا تھا اور اس کے لیے بات چیت بھی تقریباً پکی ہو گئی تھی۔ خوجوں میں پڑھی لکھی حسین عورتوں کی کمی نہ تھی، مگر لڑکا جو ماڈرن خیالات کا تھا، اپنے اس ارادے میں کچھ بھی عجیب یا غیر معمولی نہ پاتا تھا۔ جدید پود کی عمومی بے ادبی اور گستاخی کے ساتھ وہ خوجہ برادری اور بھوسا خاندان کا اکثر مذاق اڑاتا۔

بوڑھا غفور بھوسا پھر بھی نہ مانتا، لیکن کس طرح وہ نہ صرف رضامند ہوا، بلکہ اس شادی کے

لیے کافی آرزومند بھی، یہ ایک دلچسپ کہانی ہے۔ اس نے اپنے دفتر میں ایک روز شمالی ہند کے مسلمانوں کو شیخی بگھارتے سنا کہ جب وہ بمبئی میں تھا تو خوجہ لڑکیاں اس پر مرا کرتی تھیں اور ایک اس کے ساتھ بھاگ کر دلی آ گئی تھی، جو کچھ عرصے اس کی غیر سرکاری بیوی رہی۔ بوڑھے خوجے کی رگِ حمیت پھڑک اٹھی اور اس کے محدود احمق دماغ نے اپنے لڑکے کی شادی کے معاملے کو ایک اور نظریے سے جانچنا شروع کیا۔ وہ سارے پنجابی اور یوپی والوں کو دکھا دے گا کہ خوجہ نوجوان بھی ان کی لڑکیوں پر ہاتھ صاف کرنے کے اہل ہیں۔ اس کا اپنا بیٹا خوجہ جماعت کی ناک رکھے گا۔ اس خیال کے بعد، جس قدر وہ پہلے اس معاملے میں تامل کرتا تھا، اتنا ہی اب اس کی تکمیل میں سرگرم ہو گیا۔ اس نے اپنی جیت کا ایک لمبا سانس کھینچا۔ سالا لوفر!

اس نے گھر پہنچ کر اپنے بیٹے کو بلایا۔ اسے اب اپنا بیٹا ایک ’ناٹ ایزی‘ لگنے لگا اور ایسے لڑکے کا باپ ہونے پر اس نے فخر محسوس کیا۔ بوڑھے کی اس رضامندی اور نرمی کے انداز پر اس کا بیٹا جتنا خوش ہوا اتنا ہی متعجب بھی ہو گیا۔ ”بیٹے،“ غفور نے اپنے لڑکے کو یقین دلایا، ”میں تمھاری شادی کراؤں گا اور اس کو مجھ پر چھوڑ دو۔“ بیٹے نے، جو اپنے دقیانوسی والد کی اس فوری کایا پلٹ پر کچھ حیران تھا، معاملے کو اپنے باپ پر چھوڑ دیا۔

یہاں بوڑھے غفور کے اس قلبی تغیر کو سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ ایک بات کو جان لیا جائے۔ اگر یہ خوجے بمبئی میں ہوتے تو کوئی خوجہ (رگِ حمیت پھڑکنے کے باوجود) خاندان کے باہر رشتہ ناطہ کرنے کا خیال نہ لاتا، مگر وہ اب نئے ماحول میں تھے؛ پھر انھیں یہ بھی احساس ستاتا تھا کہ شمالی ہند کے مسلمان ان کو ’آدھے آدمی‘ متصور کرتے ہیں اور اپنی بہتر صحت اور اعلیٰ خاندانیت کی بنا پر ان کی، ہندو بنیوں سے مسلمان بنی ہوئی قوم کو تحقیر سے دیکھتے ہیں۔ وہ اب ’آدھے آدمی‘ نہیں رہنا چاہتے تھے۔ بوڑھے خوجے نے پکا ارادہ کر لیا کہ وہ اپنے بیٹے کے لیے خان بہادر کی بیٹی بیاہ کر ضرور لائے گا۔ ظاہرا یہ بے حد مشکل تھا۔ ارشاد حسین سید تھے، بے حد اونچے خاندانی۔ یوپی میں پراونشل سروس میں ساری ملازمت بتانے کے بعد ریٹائر ہونے سے پہلے آئی سی ایس بھی ہو گئے تھے، ایم بی ای بھی تھے اور پاکستان بننے کے بعد تین مہینے ریاست سرور کی انکم ٹیکس کمشنری بھی بھگتا آئے تھے۔ ایسے آدمی کی بیٹی مارنا کوئی خالہ جی کا گھر نہ تھا۔ خوجے غفور کو یہاں اپنے سارے گروں اور اوزاروں کے استعمال کی ضرورت تھی۔

چنانچہ اس نے دوسرے روز خان بہادر سے اس معاملے پر بات کی۔ پہلے تو انھوں نے بالکل انکار کر دیا۔ ان کی بیوی جو ایک پرانے خیالات کی کٹر دیندار خاتون تھیں، اس رشتے کی سخت

مخالف تھیں۔ کیا بوڑھے خوجے کا دماغ تو درست ہے؟ وہ ٹھہرے سید اور خاندانی اور بھوسے ٹھہرے خوجے!
بوڑھے خوجے نے اس بار اپنے اوزاروں کو تیز کیا۔ خان بہادر کی مالی حالت اب اتنی اچھی نہ تھی اور انھوں نے غفور بھوسا سے پہلی ملاقات پر اس کا رونا بھی رویا تھا۔ اس میں خوجے کو روشنی کی ایک رمق دکھائی دی۔ وہ پھر ارشاد حسین کے ہاں گیا اور ان سے صاف صاف کہہ دیا کہ "اگر تم ہمارے بیٹے کو رشتہ دے گا تو ہم پچاس ہزار روپیہ گڈول کے طور پر تم کو پیشگی دے گا۔" ارشاد حسین کچھ پسیجے۔ ان کی بیوی بھی پسیجیں۔ خوجے نے زمین کو اپنے پاؤں کے نیچے دبتے دیکھ کر ایک آخری بولی دی: "ایک لاکھ روپیہ" اور اس نے معاملے کا فیصلہ کر دیا۔ اب یہ سچ تھا کہ ارشاد حسین سید تھے اور غفور ایک خوجہ۔ ان کی زبان، معاشرت اور تمدن میں بہت کم یکسانیت تھی، مگر اس سے بھی کوئی انکار نہیں کہ ایک لاکھ روپیہ ایک لاکھ روپیہ ہوتا ہے۔ دیکھیے، ان کی خان بہادری اور آئی سی ایس ریٹائرڈ ہونا اب، نوکری چھوٹنے کے بعد بھی ان کے کام آرہے تھے۔ خان بہادر مان گئے اور زبانی سب بات چیت طے پا گئی۔ غفور بھوسا اس پر اپنے دوستوں کے حلقے میں فخر یہ کہتا ہوا سنا گیا، "سالا! ایک لاکھ تو ایک لاکھ، ہم دو لاکھ تک جانے کے واسطے تیار تھا۔" اگرچہ خان بہادر صاحب رضامند ہو گئے تھے اور ان کی بیوی بھی، جن کو اب لڑکے میں کئی ایسے گن نظر آنے لگ گئے تھے جو پہلے ان کی نظر سے پوشیدہ تھے، لڑکی کے بھائی جو لاہور اور ملتان کی طرف ملازم تھے، بے حد خفا تھے۔ وہ کھلم کھلا کہتے سنے گئے تھے کہ ان کے باپ نے ان کی بہن کا سودا کیا ہے اور انھوں نے دھمکی دی تھی کہ اگر یہ شادی ہوگی تو وہ اس میں شریک نہ ہوں گے اور اپنے باپ سے قطع تعلق کر لیں گے۔
یہ خان بہادر کی صاحبزادی کی شادی کا معاملہ تھا، جس کا مجھے اب خیال آیا۔
محمد منیر تنویر نے پنجابی میں کہا، "تو بھی چلیں گا نا؟ میں اب وہیں جانے کے لیے تیار بیٹھا تھا۔ رات کو بیچارے کا سات بجے انتقال ہوا، مگر ہمیں صبح اطلاع دی گئی۔ میجر کو بھی بلا لیں... میجر... او میجر!"
میجر محمد منیر تنویر کی کوٹھی کی اوپر کی منزل پر رہتا تھا۔ اس وقت اس کا فوج سے کوئی تعلق نہ تھا؛ وہ اب ایک کلیئرنگ اور فارورڈنگ کمپنی کا ڈائریکٹر تھا اور خدا جانے کس مصلحت کی بنا پر میجر کے دم چھلے کو (جو فوج میں دو سال گذارنے کے عوض اس کے نام کے ساتھ لگ گیا تھا) وہ اب تک اپنی سویلین زندگی میں گھسیٹے لیے جا رہا تھا۔ اپنے سارے دوستوں کے لیے وہ میجر تھا، اور اس کو دیکھنے کے بعد یہ واضح ہو جاتا تھا کہ وہ میجر کے علاوہ اور کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ جس طرح کئی لوگ پیدائشی شاعر یا مصنف ہوتے ہیں، وہ ایک پیدائشی میجر تھا۔ وہ اچھے مذاق اور کئی گنوں کا حامل تھا۔ کیمبرج کا بی اے، فوج میں شامل ہونے سے پہلے وہ لکھنؤ کے ایک کالج میں انگریزی ادب بھی پڑھاتا رہا

تھا، اگرچہ وہ ادبی ٹائپ مطلق نہ تھا۔ تقسیم کے بعد فوج چھوڑ کر وہ کراچی میں کاروبار کرنے کے لیے چلا آیا اور دنیا کے سب پیشوں میں سے اس نے خدا جانے کیوں کلیئرنگ فارورڈنگ ایجنٹ کا انتخاب کیا جو بڑی بک جھک اور بوٹ گھسانے کا کام ہے۔ اس نے حال ہی میں شادی کی تھی اور اس وقت اس کی عمر چالیس پینتالیس سال کی تھی۔ وہ ایک اچھا گفتگو کرنے والا تھا اور فحش مذاق کی کہانیاں اسے بڑی تعداد میں یاد تھیں۔ میرے خیال میں اس آرٹ میں بہت کم لوگ ایسے ملیں گے جو اس کے مقابلے میں پیش کیے جا سکیں۔

میجر نے اوپر سے آواز دی: "آ رہا ہوں!" اور تھوڑی دیر کے بعد میجر نیچے آ گیا — ایک بش شرٹ اور نئی استری شدہ سفید پتلون میں اسمارٹ لگتا ہوا۔ وہ اس طرح کپڑے پہن کر آیا تھا جیسے وہ ایک جنازے کی بجائے ایک ٹی پارٹی پر جانے کے لیے نکلا ہو۔ اس کا حلیہ یہ تھا: پرا گٹھا ہوا جسم، میجرانہ چہرے سا چہرہ، ہٹلرانہ کھڑی ہوئی مونچھیں، جو پٹھانستانی کا پتہ دیتی تھیں، مسرور شرارتی آنکھیں۔

میجر نے محمد منیر تنویر سے پنجابی میں کہا، "یہ تم نے کیا حلیہ بنا رکھا ہے؟ ایسے چلو گے؟"

محمد منیر تنویر نے جواب دیا، "اور کیا کالی اچکن اوپر سے پہن لیں گے۔ تو تو چاچا گویا شاہ زمان میں چائے پینے کے لیے نکلا ہے۔"

"ہم تو ایداں ہی جائیں گے،" میجر نے جواب دیا، "یہ ضروری نہیں کہ آدمی کسی کے جنازے پر جائے تو پورا بھیا ہی بن کے جائے۔"

"میجر، کوٹ میں ایک بڑا سا پھول بھی لگا لو!" میں نے کہا۔ "جنازے بے حد افسردہ کن ہوتے ہیں اور افسردگی کو دبانے کے لیے ایک بڑے سرخ پھول سے بہتر اور کوئی چیز نہیں۔"

"فلاسفر! تو بھی بولیاں،" میجر مجھے حسب معمول آڑے ہاتھوں لینے کا آغاز کر رہا تھا، جس عمل کو میں زیادہ ناپسند نہیں کرتا۔

"جنازہ دس بجے تک کہیں تیار ہو گا۔ ابھی تو وقت ہے،" محمد منیر تنویر بولا۔ ہم کرسیوں پر بیٹھ گئے۔ ٹھنڈا پانی پیا گیا، ایک دو سگریٹ پھونکے گئے، اور اس عرصے میں میجر اور محمد منیر تنویر پر مذاق پٹھانی لہجے میں ایک فحش گفتگو کرنے کی مشق کرتے رہے۔ اس بات چیت میں وہ دونوں اپنے آپ کو ایسے پٹھان متصور کر لیتے تھے جن کو ہم جنسیت سے مذاق ہو۔ ایسی گفتگو بعض دفعہ اور باتوں کے درمیان یکلخت شروع ہو جاتی۔ کبھی میجر اور کبھی تنویر پہل کرتا، "خوا تم احمد خان کا بھائی ہے۔ چلو تم بالاخانہ پر چلو! خان تم کو بالائی کھلائے گا، چلغوزہ کھلائے گا..." بعض دفعہ عام بات چیت بھی اس

لہجے میں کی جاتی۔

''اب چلنا چاہیے۔ دس بجنے والے ہیں۔'' محمد منیر تنویر نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ہم باہر نکل کر خان بہادر ارشاد حسین کی کوٹھی کی طرف چل پڑے جو اسی طرف ایک کوٹھی چھوڑ کر اگلی تھی۔ پھاٹک کے باہر دو تین کاریں تھیں اور دس بارہ آدمیوں کا گروہ ایک عجیب خالی سے انداز میں کھڑا تھا۔ گیٹ پوسٹ پر ایک کیل سے لگی ہوئی تختی پر، جو ترچھی ہو رہی تھی اور بے حد گرد آلود تھی، مٹے ہوئے انگریزی حروف میں لکھا تھا: ''خان بہادر ارشاد حسین، آئی سی ایس، ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر۔ اندر کوٹھی میں بعض بیزار لوگ ایک قطار میں کرسیوں پر اس انداز سے بیٹھے تھے جیسے سروس کمیشن بورڈ کے انٹرویو کا انتظار کر رہے ہوں۔

کوٹھی کے باہر مجوسے فراواں تھے! وہ اس شو کے چیف مہتمم اور منتظم تھے اور چیف نوحہ گروں اور کنوینروں (conveners) کے فرائض سرانجام دینے میں پیش پیش تھے۔ وہ لوگوں پر مرحوم سے اپنی نئی رشتے داری واضح کرنے کے لیے اتنے سرگرم منتظم بنے ہوئے تھے؛ ساتھ ہی وہ اس موقعے کا فائدہ اٹھا کر اپنی قرابت داری کی زمین کو اس قدر پکا کر رہے تھے کہ اس بارے میں کسی کو کوئی شک ہی نہ رہے اور لڑکی کے بھائی بھی بعد میں کوئی رکاوٹ نہ بن سکیں۔

بڑے حاجی غفور مجوسا کا چھوٹا بھائی، جس نے توریہ اور تارامیرا کے سٹے میں حال ہی میں لاکھوں کمائے تھے اور جو اپنی سفید ریشمی بش شرٹ، سفید پتلون اور سنہری رموں والی عینک میں کسی ختم شدہ ہندوستانی ریاست کا پنشنر مہاراجہ لگتا تھا، محمد منیر تنویر سے ملا۔

''ارشاد حسین صاحب کے انتقال کا بڑا افسوس ہے،'' تنویر نے کہا، ''ہوا کیا تھا؟'' اگرچہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ کیا ہوا تھا اور مجھے یقین ہے کہ وہ اس کہانی کو آدھی درجن بار سن چکا تھا۔

''بڑے اچھے آدمی تھے،'' مجوسے کے بھائی نے حد درجہ مسرت سے اپنی ٹیک کی لکڑی کو سہلاتے ہوئے کہا۔ اس کے منہ میں دو تین سنہری دانت تھے۔ ''سالا! اس کو کری کے لیے بھیجا ہے، ابھی لایا نہیں۔'' اور وہ اپنی چھڑی سہلاتا ہوا ظاہراً سالے کو ڈھونڈنے کے لیے چلا گیا۔

محمد منیر تنویر نے بڑھ کر ایک اور شخص سے مصافحہ کیا، جو قدرے فربہ اندام تھا۔ وہ اپنے ڈھیلے پاجامے اور ڈھیلی کھلی آستینوں والی ململ کی قمیص اور چپلوں میں کسی قدر معزز قصبہ خانے کا (صرف شرفا کے واسطے) چودھری نظر آتا تھا۔ اس کا ریشمی رنگین ازار بند پتلی قمیص میں سے بہار دکھا رہا تھا اور وہی اس شخص کا سب سے زیادہ مظہر اور اہم حصہ تھا — رنگین لٹکتا ہوا ازار بند ہی خود یہ شخص تھا۔ اس کے انداز میں ایک واجد شاہیت، فرصت اور اطمینان سا تھا اور اڑے ہوئے بالوں سے بنائے

ہوئے فراخ پیشانی کے نیچے اس کا تجیم بھاری چہرہ ایک ایسے خالی الذہن شخص کا چہرہ معلوم ہوتا تھا جس نے بڑے عرصے سے سنجیدگی سے سوچنا چھوڑ رکھا ہو۔

تنویر نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا، ''حمید، تم تو ان کو جانتے ہی ہو: ایف ایل سرور، فلم پروڈیوسر!''

''اوہو!'' میں نے کہا، ''ایف ایل سرور!'' اور میں نے اس سے ہاتھ ملایا۔ میرے سامنے ایک صحت مند، ذہین، کچھ خاموش طبع لڑکے کی شکل آئی۔ وہ ہاکی اسٹک کے ساتھ سبز گراؤنڈ میں کھڑا تھا — ایف ایل سرور۔ اُن دنوں وہ صرف فیاض تھا۔ ہائی اسکول میں مجھ سے دو سال سینئر تھا۔ وہ ہاکی میں اسکول کا نمبر ایک کھلاڑی تھا اور پڑھنے میں بھی سب سے آگے ہوتا۔ کتنے آدمی تبدیل ہوجاتے ہیں! مجھے توقع نہ تھی کہ وہ صحت مند لڑکا، چودہ پندرہ برس کے بعد یہ کثیف، کورا آدمی بن جائے گا جواب میرے سامنے کھڑا تھا۔

میں نے ذرا دیدہ دلیری سے پوچھا، ''آپ کا آج کل کیا شغل ہے؟'' (اس سوال پر بعد میں میجر اور محمد منیر تنویر نے میری پیٹھ تھپکی اور محمد منیر نے کہا کہ ''ہمارا سرور نہ بولے تو نہ بولے اور بولے تو کفن پھاڑ ے۔'')

ایف ایل سرور، تھوڑا سا خفیف ہو کر اسی خوشگوار انداز میں بولا، ''آج کل بیکاری میں ہیں۔ ہم لوگ حکومت پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ یہاں ایک فلم بورڈ بنایا جائے۔ آپ کہاں ہیں؟''

''میں اللہ توکل کمپنی کا منیجنگ ڈائریکٹر ہوں!'' میں نے آنکھ جھپکے بغیر جواب دیا۔ وہ محمد منیر تنویر سے مخاطب ہوا، ''ہاں بھئی تنویر، تمھاری ہی لائن امپورٹ ایکسپورٹ بڑی ویل ایڈورٹائزڈ فرم ہے۔ اکثر اشتہار اخباروں میں نظر آتے ہیں۔ اور تمھارا وہ سمندری شیر کا نشان بے حد پسند آیا —''

(شیر کے نشان کا خیال محمد منیر تنویر نے میٹرو گولڈون میئر سے لیا تھا!) ایف ایل سرور، جیسا کہ آپ کو معلوم ہے، ایڈورٹائزمنٹ پبلسٹی کا بے حد قائل ہے اور حقیقت یہ ہے کہ اس نے اپنے لاکھوں پبلسٹی کے سہارے ہی کمائے۔ اس کی فلموں اور ہیروئنوں کی اس قدر پبلسٹی کی جاتی کہ کلکتہ میں جہاں کہیں بھی تم جاتے، ایف ایل سرور سے بچنا ناممکن تھا۔ دیواروں پر پوسٹر کے پوسٹر، چوکوں پر سائن بورڈوں کی قطاریں تمھیں چلا چلا کر بتاتے: ''ایف ایل سرور کا ہوشربا فلم صالن دیکھیے — نئے ایکٹر، نئی ٹیکنیک، اچھوتا تخیل!'' یا ''ایف ایل سرور کی نئی معرکہ آرا دریافت: پردۂ سیمیں کی حسین ترین پری 'چمپا' جس کے حسن کی تازگی اور ایکٹنگ کی دلفریبی آپ کو مسخر کر دے گی۔ اے پروڈیوسر ایف ایل سرور کے پیش کردہ نئے فلم بیگنگن میں دیکھیے جو ناولٹی میں رش لے رہا ہے اور

پچاسویں پر بہار رخنتے میں ہے۔'' اس کی فلموں کے پورے پورے صفحات کے رنگین اشتہار فلمی میگزینوں میں دیے جاتے اور ایف ایل سرور عموماً پبلسٹی پر اس سے بھی زیادہ خرچ کرتا جتنا فلم بنانے پر۔ اس کی فلمیں اور ان کے نام عموماً ہم وزن ہوتے تھے۔ (مالن، بیننگ، ناگن، سہاگن وغیرہ) وہ ویسی ہی احمقانہ، عقل کے لیے اہانت اور مضحکہ خیز پروڈکشنز ہوتی تھیں جیسی کہ زیادہ تر ہندوستانی فلمیں ہوتی ہیں، مگر وہ اشتہار اور ایک وسیع وافر گورذوقی کے بوتے پر خوب چلتی اور رش لیتی تھیں اور سرور کی تھیلیوں میں روپیہ لاتیں — بہتا ہوا روپیہ! ہندوستانی فلم انڈسٹری کے ڈائریکٹروں میں ایف ایل سرور کا طلوع سب سے زیادہ ڈرامیٹک تھا اور اس کی کامیابی اس کے ہم پیشہ ساتھیوں کے لیے بے حد قابلِ رشک (اگرچہ بعد میں اس کا غروب اس سے بھی زیادہ ڈرامیٹک ہوا)۔ ان دنوں مجھے یاد ہے سینے سین کے ایڈیٹر نے ایک پڑھنے والے کے اس سوال کا کہ ڈائریکٹر عظیم فنکار کیسے بن جاتے ہیں، اپنے جوابات کے کالم میں یہ جواب دیا تھا'' ایف ایل سرور کے کیریئر کا مطالعہ کرو۔'' میرا خیال ہے ایڈیٹر کو یہ جواب دینا چاہیے تھا'' سنے سین میں ہر ماہ دو ہزار کا اشتہار دینے سے۔'' ایف ایل سرور دنیا کا کامیاب شخص، ایک فلم پروڈیوسر بن گیا، مگر اس عمل میں وہ سبز لان پر ہاکی کھیلنے والا، گلابی گالوں والا، سوچنے والا سنجیدہ لڑکا ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کھو گیا۔ دنیا کہتی تھی کہ ایف ایل سرور نے کامیابی پائی تھی؛ اب اسے دیکھ کر میں نے محسوس کیا کہ وہ ایک مجسم حزنیہ کردار ہے جو رحم کے قابل بھی نہیں۔

گفتگو کچھ کچھ سست پڑ گئی۔ دھوپ تیز ہو رہی تھی۔ میجر نے کہا،'' موٹر میں چلنا پڑے گا۔ قبرستان یہاں سے کافی دور ہوگا۔''

تنویر بولا،'' میرا ڈرائیور آج کہیں مرکھپ گیا ہے۔ میجر، تو ڈرائیو کر لے گا؟''

''ہاں،'' میجر نے کہا،'' اگرچہ مجھے اسٹیرنگ پر بیٹھے آٹھ نو مہینے ہوئے ہیں۔ چل پھر موٹر نکال لائیں۔ جنازے کا وقت قریب ہے۔''

وہ دونوں مجھے اکیلا چھوڑ کر موٹر لانے کے لیے چلے گئے۔ میں دیوار کے سائے میں کھڑا ہو گیا۔

سنہری چشموں والا راجہ نما بھوسا چند آدمیوں کو محمد منیر تنویر کی کوٹھی سے کرسیاں لانے کی ہدایتیں دے رہا تھا کہ ایک مونچھوں والا اعصابی شخص، جو بڑی عجلت اور گھبراہٹ کا پیکر تھا، خوجہ منتظمین کی سنڈیکٹ کے اس صدر کو ایک اہم رپورٹ دینے کے لیے آیا۔ اس نے رپورٹ دی کہ قبرستان جانے پر اسے معلوم ہوا کہ وہاں خان بہادر ارشاد حسین کے لیے دو قبریں کھد رہی تھیں۔ قبرستان کے گورکنوں کو شدید غلط فہمی ہوئی تھی۔ معلوم ہوتا تھا کہ پہلے خان بہادر کے گھر کے دو

آدمیوں نے قبرستان والوں کو جا کر قبر تیار کرنے کے لیے کہا اور موقع بھی انتخاب کر کے دے آئے۔ یہ قبر ایک ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر صاحب کے لیے مختص تھی۔ اس کے بعد جب جلوس نے عنان انتظام کو اپنے ہاتھ میں لیا تو خان بہادر کے گھر والوں سے پوچھے بغیر انھوں نے اپنا ایک آدمی قبرستان بھیجا، جس نے گورکنوں کو ہدایت دی کہ بھاگل پور کے ریونیو منسٹر صاحب کے لیے ایک قبر فوراً تیار کی جائے۔ وہ بھی ایک موقع منتخب کر کے دے آیا۔ گورکنوں نے دو قبریں کھود رکھی تھیں — ایک ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر کے لیے، دوسری انکم ٹیکس کمشنر کے لیے۔ ارشاد حسین کے ایک عزیز نے اس خبر لانے والے سے کہا، "آپ فوراً ٹرک پر واپس جائیں اور ان میں سے ایک قبر کو، جو مکمل ہو چکی ہو، رہنے دیں اور دوسری پر کام بند کروا دیں۔" مگر خجلت زدہ بوکھلائے ہوئے آدمی کو پورا یقین تھا کہ اب تک دونوں قبریں مکمل ہو چکی ہوں گی اور اس کا جانا لاحاصل ہوگا۔ اس کی نارضامندی اور ہچکچاہٹ کے باوجود اسے دوبارہ ٹرک میں چڑھا کر بھیج دیا گیا۔ میری رائے میں دو ملاؤں میں مرغی حرام کی اس سے بہتر مثال مشکل ہی سے مل سکتی ہے۔

پھاٹک کے پرلی طرف پانچ چھ آدمی، اکیلے، اپنے اپنے پراہلم سوچتے کھڑے تھے۔ ان میں میں نے عارف کو پہچانا۔ جب میں اسکول میں تھا، وہ کالج میں پڑھتا تھا۔ وہ پرنسپل کا لڑکا تھا۔ مجھے یاد ہے، ایک دفعہ لیفٹیننٹ گورنر کی کالج میں آمد پر شیکسپیئر کا ڈراما ہنری دی ایتھ کالج ہال میں کھیلا گیا۔ عارف اس میں فالسٹاف بنا، اور بہت اچھا فالسٹاف۔ یہاں سے جانے کے بعد اس نے الٰہ آباد سے ایل ایل بی کیا اور اپنے آبا کے شہر دلّی میں وکالت شروع کر دی، اور میری معلومات کے مطابق اس نے وکیل کی حیثیت سے اچھی شہرت اور کامیابی حاصل کر لی۔ پھر پارٹیشن آئی، ملک دو حصوں میں بٹ گیا اور ایک ایسا غضبناک طوفان آیا جس نے دو تین مہینے میں لاکھوں کو بے گھر کر کے نیا وطن بنانے پر مجبور کر دیا۔ مغرور مسلمان بادشاہوں کا شہر دلّی، اردو زبان اور اسلامی تمدن کا گہوارہ دلّی، لال قلعہ، قطب مینار اور ہمایوں کا دلّی، تقریباً مسلمانوں سے خالی ہو گیا۔ اہل دلّی کا مکہ کراچی بنا اور کراچی کی جانب وہ آئے، پہلے سوؤں میں اور پھر ہزاروں میں۔ عارف بھی اپنے خاندان کے افراد کے ساتھ کراچی آیا۔ یہاں وکالت کرنے کے لیے نئے سرے سے تہ جمانے کی ضرورت تھی۔ اب اس کے تنے ہوئے فاقہ کش چہرے اور قدرے میلی پتلون کو دیکھ کر میں نے قیاس لگایا کہ زندگی اس کے لیے سخت کشمکش ہے۔

میں اس کے پاس گیا۔ "السلام علیکم عارف صاحب۔"

"وعلیکم السلام۔" وہ کچھ حیران تھا۔ قدرتاً وہ مجھے پہچان نہ سکا۔ اس نے مجھے اس وقت دیکھا

تھا جب میں چھوٹا لڑکا تھا۔

''میں حمید ہوں... چودھری غضنفر خاں کا لڑکا۔''

''اوہو! چودھری صاحب کا کیا حال ہے؟ آپ یہاں کیا کرتے ہیں؟''

میں نے بزنس اور اللہ توکل کمپنی کے بارے میں کچھ سنایا۔ جس وقت مجھ سے یہ سوال کیا جاتا ہے — آپ کیا کرتے ہیں؟ — تو میں کچھ گھبرا جاتا ہوں اور خوشی محسوس نہیں کرتا اور اس سوال کے پوچھے جانے کے خیال سے بے حد خائف رہتا ہوں۔ کوئی بھی یہ سوال مجھ سے کسی وقت پوچھ سکتا ہے۔

میجر اور محمد منیر تنویر بھی میرے پاس آ کھڑے ہوگئے۔ میجر دلّی میں کچھ عرصے رہنے سے اور ملنسار سوشل ٹائپ ہونے کی وجہ سے عارف کو جانتا تھا۔ کراچی میں اب پہلی بار ان کو ایک دوسرے کی یہاں موجودگی کا پتہ چلا۔ عارف نے یہاں رہائش کی تکلیف کی شکایت کرتے ہوئے بتایا کہ وہ بمشکل جہانگیر سوڈا واٹر والا روڈ کے اختتام کی ایک کوٹھی میں ایک چھوٹا کمرہ حاصل کر سکا ہے۔ ہم سب نے اتفاق کیا کہ مکانوں کی سخت قلت ہے۔ پھر شاید عارف نے محسوس کیا کہ خان بہادر ارشاد حسین سے بالکل غفلت برتنا ناروا ہے۔

عارف نے کہا، ''دیکھیے، کراچی میں میں اب ان کی کوٹھی کے پاس ہی تو رہتا ہوں اور ان کے ہم سے تعلقات بھی تھے، مگر مجھے آج صبح جا کر کہیں پتہ لگا کہ ان کا انتقال ہو گیا ہے۔''

''ہمارے ساتھ خود یہی ہوا۔ ہمیں خود بھی صبح ہی کو پتہ لگا،'' محمد منیر تنویر نے کہا۔ ''ہوا کیا تھا؟''

''ذیابیطس تو عرصے سے تھی۔ کل شام تک اچھے بھلے تھے۔ یکلخت طبیعت بگڑی، مٹھیاں بھینچ گئیں۔ یہ سامنے ڈاکٹر برکت محمد خاں ہیں، ان کو بلایا گیا۔ انھوں نے دیکھا اور مارفیا کا انجکشن دے کر کوٹھی سے باہر نکلے ہی تھے کہ پیچھے ارشاد حسین ختم ہو چکے تھے۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔''

''دراصل ایسی خطرناک حالت میں مارفیا کا انجکشن دینا درست نہیں تھا،'' محمد منیر تنویر نے کہا، جو درآمد برآمد پر عبور کے علاوہ یہ بھی یقین رکھتا ہے کہ وہ ڈاکٹروں کو ایک دو باتیں سکھا سکنے کا اہل بھی ہے۔

''کراچی کی زندگی عجیب ہے۔ ہمسایہ مر جاتا ہے، خبر تک نہیں ہوتی،'' عارف نے کہا۔

''بس یہاں بھی بمبئی کی سی زندگی ہو رہی ہے... وہاں بھی پاس کے ہمسائے کا پتہ نہیں ہوتا... اچھے اچھے بزنس میگنیٹوں کے جنازے کے لیے پانچ چھ آدمی نہیں ملتے،'' محمد منیر تنویر بولا۔ وہ غالباً سوچ رہا تھا کہ اگر وہ کل مر جائے تو اس کی موت بھی جہانگیر سوڈا واٹر والا روڈ پر اتنی ہی سنسنی پیدا کرے گی: چار پانچ سگریٹ پیتے ہوئے بیزار لوگ، غیر ضروری احمقانہ سوال پوچھتے ہوئے، ایک دوسرے سے کہتے ہوئے، ''محمد منیر اچھا آدمی تھا۔ یاروں کا یار —'' دل میں سوچتے ہوئے، ''یہ ختم ہو

تو گھر جائیں، آج پہنچ کو تو دیر ہو ہی جائے گی۔"
میں نے کہا "اس کی وجہ یہ ہے کہ بڑے شہر میں زندگی بے تعلقانہ اور غیر شخصی ہو جاتی ہے۔"
"نہیں، یہ بات نہیں،" عارف بولا۔ "اب صاحب دلی میں ایسا نہ تھا۔ وہاں ایسا مرنا ہوتا تو عزیز اقربا احباب کو فوراً اطلاع ہو جاتی اور وہ فوراً آ کر جمع ہو جاتے۔ یہاں کہیں کہیں سے لوگ آئے ہیں۔ کوئی دلی کا ہے، کوئی مدراس کا ہے اور کوئی بمبئی کا — ایک دوسرے کے لیے اجنبی اور ایک دوسرے کی تہذیب زبان اور تمدن کے لحاظ سے کوسوں دور۔"
"جنازہ نکلنے میں دیر ہو رہی ہے،" محمد منیر تنویر نے کہا۔ "سارھے دس ہونے کو آئے ہیں۔"
عارف بولا "اصل میں انتظام میں خلل پڑ گیا ہے۔"
میں جب سے انگلستان سے ہو کر آیا ہوں، مجھے لوگوں کو یہ بتانے کا بڑا شوق ہے کہ انگلستان میں کام کیسے کیے جاتے ہیں۔ میں اس موقعے پر اپنا مغربی نظریہ پیش کیے بغیر نہ رہ سکا۔ "میرا خیال ہے یہاں بھی انڈر ٹیکرز ہونے چاہئیں۔ گھر میں کوئی موت ہوئی۔ آپ نے فوراً انڈر ٹیکرز کو فون کیا، جو فوراً آ کر سب انتظام اپنے ہاتھ میں لے لیں گے۔ تجہیز و تکفین، قبر کی تیاری وغیرہ وغیرہ... دو دن کے بعد آپ کو انڈر ٹیکرز کا بل مع انڈر ٹیکرز کے آپ کے غم میں دلی ہمدردی کے خط کے، آپ کو پہنچ جائے گا..."
"ہاں،" عارف نے کہا۔ "مگر صاحب، یہ سسٹم انگلستان کے لیے ہی ٹھیک ہے اور وہاں ضروری بھی ہے۔ یہاں یہ نہیں چل سکتا۔ ایک تو یہ کچھ غیر فطری ہے... اور پھر ہمارے ہاں بھی تو اس قسم کا ماڈرن قائم سسٹم رائج ہے۔ دلی میں بھی ایسا ہوتا تھا کہ کسی کا انتقال ہوا، اسی وقت وہ مولوی لوگ، جو 'قل آعوذیے' کہلاتے ہیں اور تجہیز و تکفین کے سب آداب سے واقف ہوتے ہیں، بلوا لیے جاتے تھے۔ وہ اسی وقت حساب لگا کر بتا دیتے کہ صاحب، اتنا کفن کے لیے کپڑا درکار ہوگا، اتنا کافور، اتنا یہ کچھ، اتنا وہ کچھ، اور اتنی لاگت آئے گی۔ گھر کا کوئی شخص ان کے ساتھ بھیج دیا جاتا اور قل آعوذیے اس کو سب ضروریات خریدوا کر دلوا دیتے ہیں۔ گھر والوں کو بھاگ دوڑ اور پریشانی کی ضرورت نہیں۔ لیکن صاحب کراچی میں تو اب یہ مصیبت ہے کہ قل آعوذیے ہیں بھی سہی تو یہ معلوم نہیں کہ کہاں ان کو ڈھونڈیں..."
ہمارے ساتھ بچوں کا ایک جھنڈ کھڑا تھا۔ میں نے سرگوشی میں محمد منیر تنویر سے پوچھا "وہ لڑکا جس سے خان بہادر کی لڑکی کی شادی ہوئی ہے، کیا ان میں ہے؟"
محمد منیر نے مجھے وہ لڑکا دکھایا۔ وہ بائیس سال کا گٹھا ہوا، زرد رو اور سستے طریق پر خوبصورت

لڑکا تھا اور پورے صبر اور تحمل سے "عظیم ماتمی" کا رول بنانے کا عزم کیے ہوئے تھا، کیونکہ خان بہادر کے لڑکے ابھی نہیں پہنچے تھے۔ وہ حقیقتاً غمگین دکھائی دیتا تھا، کم از کم دوسرے بھوسوں کی طرح احمقانہ طور پر خوش نہیں۔

ہم دھوپ سے ہٹ کر دیوار کے پاس سائے میں جا کھڑے ہوئے۔ محمد منیر تنویر جس وقت موٹر لانے کے لیے گیا تھا، پیش بینی کے طور پر اپنے رنگین دھوپ کے چشمے بھی پہن آیا تھا، جن پر وہ بے حد مغرور ہے اور جنھیں وہ بعض دفعہ اپنے دفتر میں پہن کر بیٹھتا ہے۔ اس کے خیال میں ان کے ساتھ وہ شاندار اور عظیم نظر آتا ہے — ایک حقیقی بزنس میگنیٹ، درآمد برآمد کا بادشاہ، سوداگری کا نپولین، پیئر پائنٹ مارگن...

میں نے کہا، "یار تنویر، مجھے جانے دو۔ میرے لیے یہ جنازے بے حد بیزار کن ہوتے ہیں۔ تمھیں تو خیر نماز جنازہ پڑھنی ہے بحق ہمسائیگی کے طور پر — میرے لیے کیا مزا ہے؟"

میجر، دنیا کے آدمی نے کہا، "دراصل ہماری ماڈرن زندگی میں کسی کے جنازے پر جانا بالکل ایک سوشل فنکشن بن کر رہ گیا ہے۔ لوگ وہاں جا کر ایک دوسرے سے ملتے اور پچھلی واقفیتیں تازہ کرتے ہیں، اور زیادہ تر اسی لیے جاتے ہیں۔ کئی اس خیال سے بھی جاتے ہیں کہ اگر اس جنازے کے بعد کل کوئی اور سوشل فنکشن متوفی کے گھر میں ہو، یعنی کوئی شادی بیاہ کی دعوت یا پارٹی تو ان کو یاد رکھا جائے اور مدعو کیا جانا نہ بھولا جائے۔"

محمد منیر تنویر نے کہا، "جنازہ باہر لا رہے ہیں۔"

یہ تنگ صندوق نما جنازہ تھا، جو کراچی کی فلیٹوں کی تنگی اور قبرستانوں کی دوری کی وجہ سے ٹرانسپورٹ میں لے جانے کی مجبوری کی بنا پر اب کافی مقبول ہو رہا ہے۔ ٹرک کو کوٹھی سے کچھ دور پر کھڑا کیا گیا تھا تاکہ مرحوم کے مخلص دوست اور اقربا (جن میں بھوسے اب پیش پیش تھے) میت کو کندھا دینے کی سعادت سے محروم نہ رہ جائیں۔ محمد منیر تنویر نے بھی زبردستی آدھ منٹ کے لیے کندھا دیا، اگرچہ بھوسے کسی دوسرے کو آسانی سے یہ موقع نہیں دیتے تھے۔ تنویر کندھا دے کر فخریہ سے انداز میں واپس آیا۔ وہ اپنے آپ کو بے حد راست باز اور نیکی کا پیکر سمجھ رہا تھا اور اس کے دل میں اب مرحوم کے بخشے جانے کے معاملے میں کوئی شک کی گنجائش نہ تھی... میجر اور میں دونوں، جو غالباً کچھ کچھ ملحد ہو چکے ہیں اور شوپنہار کی طرح سنکی، دینداری اور غم کے اس مظاہرے سے پیچھے ہی ہٹے رہے۔ دوسرے، ہم بھوسوں کو ناراض نہیں کرنا چاہتے تھے۔ یہ ان کا شو تھا۔

میت کو ٹرک میں رکھ دیا گیا اور ٹرک آہستہ آہستہ چلنے لگا۔ ایک کھلی کار، پائلٹ کار کی طرح،

ٹرک کے آگے تھی، جس میں راجہ نما بھوسا اور غفور کا بیٹا تھے۔ ٹرک کے پیچھے خوبچوں کی کاروں کا فلیٹ تھا۔ قدرت کی ستم ظریفی دیکھیے کہ سوائے دو تین پرانے جاننے والوں کے ارشاد حسین مرحوم کو آخری سفر پر پہنچانے والے یہ خوبچے تھے؛ ان کے بیٹے بھی وقت پر نہ پہنچے تھے، اور قرابت دار اگر تھے بھی تو اس موقعے پر بھوسوں سے مطلق مغلوب ہو چکے تھے۔

ہم بھی محمد منیر تنویر کی موٹر میں سوار ہو گئے۔ میجر ڈرائیو کر رہا تھا۔

میجر نے ایک سگریٹ اپنے لیے نکالتے اور سلگاتے ہوئے کہا، ''سگریٹ تو پی لیں، وہاں قبرستان میں تو نہ پی سکیں گے۔''

ہم نے بھی سگریٹ سلگائے۔ میں نے کہا، ''مجھے ایک چھوٹے سے فقرے کا خیال آ گیا ہے، جو میرے باپ نے کہا تھا اور جو جنازوں میں شامل ہونے والوں کے دلی احساسات کو بے حد خوبصورتی سے سم اپ کرتا ہے۔ ایک طرح یہ زندگی کا فلسفہ ہے۔ مارکس آریلیس اس کو کہہ سکتا تھا۔ ماڈل ٹاؤن میں ایک شام ہماری کوٹھی کے سامنے کی سڑک پر سے ایک جنازہ گزرا۔ جنازے کے پیچھے کچھ آدمی بھاری بھاری اوورکوٹ پہنے اور جیبوں میں ہاتھ ڈالے چل رہے تھے۔ میرے باپ نے انھیں دیکھتے ہوئے مجھ سے پنجابی میں کہا: 'میریا! آدمی مر جاندا اے تے دو جے پچھے اوورکوٹ پا کے چھڑ دے رہندے نے۔''

میجر نے کہا، ''خان، تم سچ کہتا ہے۔ خو، ہمارا ساتھ چلو، خو ہم... پلاؤ کھلائے گا، چلغوزہ کھلائے گا۔'' محمد منیر تنویر نے بے صبری سے میجر کے الفاظ کو چباتے ہوئے کہا۔

ہم قبرستان پندرہ منٹ میں پہنچ گئے۔ کاریں باہر سڑک کے ایک طرف کھڑی تھیں اور جنازے کو ٹرک سے اتار کر اندر قبرستان کے احاطے میں بنی ہوئی چھوٹی مسجد کے صحن میں رکھا جا چکا تھا۔ ہم سگریٹوں کو مسلتے ہوئے اندر داخل ہو گئے اور چھوٹی مسجد سے باہر دھوپ میں کھڑے نماز جنازہ کے پڑھائے جانے کا انتظار کرنے لگے۔ لوگ مسجد کے اندر جا کر وضو کر رہے تھے۔

''میرا تو وضو ہے!'' محمد منیر تنویر نے اپنے آپ کو پہلے ہی محفوظ کرتے ہوئے کہا، ''آپ وضو کر لیجیے۔''

''میرا بھی ہے یارا،'' میجر نے کہا۔

میں نے کچھ نہیں کہا، مگر ان کے خاموش انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ مجھے بھی باوضو ماننے پر رضامند ہیں۔ سامنے ایک چھوٹی مکعب عمارت پر ایک آویزاں بورڈ پر سفید حروف میں لکھا تھا: ''دفنانے والے اصحاب سے گذارش ہے کہ قبر کے لیے جو جگہ نیچے لکھی ہوئی ہے، اس جگہ سے زیادہ

کی اجازت نہیں۔"

بچے کے لیے... لمبائی چوڑائی
نوجوانوں کے لیے...
عورت کے لیے...
نابالغ لڑکے کے لیے...
نابالغ لڑکی کے لیے... وغیرہ وغیرہ

ہم آخر سائے کی تلاش میں مسجد میں داخل ہوئے۔ قل آعوذیے، جو شکل و شباہت میں جڑواں لگتے تھے، منکر نکیر کی طرح میت کے سرہانے اور پائنتی ہو بیٹھے تھے۔ وہ مرحوم کو جاگ جانے دینے کا ہرگز موقع نہ دینا چاہتے تھے... مسجد کے باہر، ہمارے سامنے ابھی قبر کھودی جا رہی تھی۔ زمین سخت اور پتھریلی تھی اور قبر کے مکمل ہونے میں دیر تھی۔

جنازہ پڑھنے کی تیاری ہونے لگی۔ میت کو آگے منبر کے پاس رکھا گیا۔ یہاں قل آعوذیوں نے اعتراض کیا کہ سر غلط طرف ہے۔ چارپائی کو ۱۸۰ درجے زاویے سے گھمایا گیا۔ یہاں کسی اور نے کہا کہ وہ پہلے والی طرف ہی ٹھیک تھی، قل آعوذیوں کو میت کی پائنتی اور سرہانے کے متعلق غلط فہمی ہوئی تھی، چنانچہ جنازے کو گھما کر پہلے ہی رخ پر رکھا گیا، اگرچہ قل آعوذیوں نے منہ سے بول کر اس نئے فیصلے پر صاد نہ کیا— اپنے قبیلے کے دوسرے بھائیوں کی طرح وہ کسی بات میں اپنی غلطی ماننے کے عادی نہیں۔

صفیں بندھنی شروع ہوئیں۔

"آپ لوگ یا تین صفیں بنائیے یا پانچ!" ایف ایل سرور نے اگلی صف میں سے پیچھے مڑ کر ہدایت کاری کی۔

"اللہ اکبر!" امام نے، جو قل آعوذیوں میں سے ایک تھا، نماز شروع کرائی۔ دوسری اللہ اکبر پر میں نے اور میجر نے انکھیوں سے محمد منیر تنویر کو دیکھا کہ آیا وہ ہاتھوں کو دوبارہ تکبیر کے لیے کانوں تک لے جاتا ہے یا ویسے ہی باندھے رکھتا ہے۔ یہ مجھے یاد نہیں کہ اس نے کیسے کیا۔ بہر حال، ہم نے وہی کیا جو اس نے کیا، اور اس نے وہی کیا ہوگا جو سامنے ایف ایل سرور اور دوسروں نے کیا ہوگا۔ پھر بھی میں نے دیکھا کہ بعض نے ہاتھ باندھے، بعض نے چھوڑ دیے۔

"السلام علیکم ورحمتہ اللہ!" امام نے سلام پھیرا۔

سنہری چشمے والے پنشنر مہاراجہ نما بھوسے نے پہلے بائیں طرف سلام پھیرا، پھر دائیں

طرف۔ شاید یہ اس کی کسی قسم کی نماز پڑھنے کی پہلی سنجیدہ کوشش تھی، یا شاید وہ سلام کے معاملے میں انفرادیت پسند تھا۔ نماز جنازہ کے بعد قل اعوذیے دعائیں پڑھتے اسی طرح میت کے گرد جو بیٹھے — ایک مرجائے، دوسرا پانچی۔ وہ ایسے منکر نکیر لگ رہے تھے جو مردے کے قبر میں جانے سے پہلے ہی اس سے حساب لینے آموجود ہوئے ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ وہ اس معاوضے کا سوچ رہے تھے جو نماز جنازہ کے پڑھانے جیسے اہم فرض کی ادائیگی اور درود شریف سے میت کو ثواب پہنچانے کے لیے ان کو ملے گا۔ ان کی خان بہادر ارشاد حسین کو اپنے درمیان سے نکلنے دینے میں ہچکچاہٹ اس قدر ان کی دینداری اور خدا ترسی کی آئینہ دار تھی جس قدر ان کی ریاکاری اور حرص کی مظہر تھی۔

ہم اب مسجد سے باہر مکعب نما عمارت کی دیوار کے پاس آ احاطے میں کھڑے ہو گئے۔ سامنے دھوپ میں ابھی قبر کی کھدائی ہو رہی تھی اور کہا جا رہا تھا کہ ابھی اس میں چھ دیر ہے۔ جو اجتماعی اور انفرادی امور پر اتنے مکمل طور پر حاوی تھے کہ کسی اور کی اس حلقے میں گنجائش نہ تھی۔

میجر جمائیاں لے رہا تھا۔ دیوار کے پاس پنشنر مہاراجہ اپنی ایڑیوں کے بل بیٹھا ہوا اور اپنی چھڑی کو گھماتا ہوا وہ داڑھی والے کاروباری شکل کے پنجابیوں سے باتیں کر رہا تھا۔ "کوریہ کا کوٹا... سالا کاٹن کا مال..." "ایک گھنی سفید مونچھوں والا بڑا شخص محمد منیر تنویر پر بڑا بس میں اپنی راست بازی کے اصول واضح کر رہا تھا۔ "اب سالا ہم تین سو پنکھا پنجاب سے منگایا تھا۔ سالا سب بیچ ڈالا اور ایک مہینے کے اندر اندر ہم نے اپنے ہر ایک کا بہت صاف بتایا۔ دیکھو بابا ہم واسطے میں یہاں آکر پڑا اتنا ہمارا منافع ہے۔ پانچ روپے منافعے پر سب بیچ دیا۔ کیا کرتا؟ سالا صرف دس پنکھا تو ہم خود نیپیئر روڈ جا کر یاروں کو بیچا۔"

"اس سفید یہودی نے" محمد منیر تنویر نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا، "نیپیئر روڈ کی ایک کام کی عورت نہیں چھوڑی..."

میرے پیچھے ایک سولا ہیٹ پہنے، جو اس جتنے آدمی کے لیے بہت بڑا تھا، اور ایک ڈھیلے شرکی سوٹ میں ملبوس، ایک مضحکہ خیز چھوٹا سا آدمی، ایک لٹکے ہوئے ہونٹوں والے احمق بھوے سے سیاسیات پر تبادلہ خیالات کر رہا تھا۔ یہ شخص، مجھے کسی نے بتایا، چودھری معراج دین تھا جو ٹمبکٹو کو روانہ ہونے والے پاکستان ٹریڈ ڈیلی گیشن کا صدر چنا گیا تھا اور اگلے روز بذریعہ ہوائی جہاز جا رہا تھا۔ چودھری معراج دین ایک قسم کا چوہا لگتا تھا، جس نے کسی طرح ایک سوٹ میں سے اپنا راستہ نکال لیا ہو۔ وہ آدمی کی بجائے والٹ ڈزنی کی کوئی تخلیق نظر آتا تھا — ایک نوع کا 'سپر ماؤس' جو سینما ہاؤس کے پردے پر سے آدمیوں کی دنیا میں اتر کے آگیا ہو۔ اس کی آواز گھرگھراتی اور چیم

تھی (جس میں ایک اور عجیب سی آواز جو حلق اور ناک دونوں کی کوششوں کا نتیجہ تھی اور جسے لفظ ''امیاؤ'' سے نامکمل طور پر ظاہر کیا جا سکتا ہے) جابجا اوقاف و اعراب کا کام دیتی تھی... ''امیاؤ!'' جیسے وہ بھنچے ہوئے ہونٹوں سے کوئی چیز نکلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ چودھری معراج دین اپنے ننھے پھیپھڑوں کے پورے زور سے بول رہا تھا۔ وہ پوری احتیاط برت رہا تھا کہ دوسرے بھی اس کو سن سکیں اور ان کو اس چھوٹے چوبانما آدمی کی اہمیت کا احساس ہو جائے۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''تو دراصل بات یہ ہے امیاؤ، کہ میں نے نوابزادہ صاحب سے کہہ دیا تھا کہ امیاؤ، پاکستان میں ٹمبکٹو کے سفیر کے لیے رہائش کا انتظام ہونا چاہیے، اور امیاؤ، نوابزادہ صاحب نے فرمایا کہ میں نے سفیر صاحب کے لیے ایک کوٹھی کلفٹن میں سیٹ اپ ایسائنڈ کرا دی تھی، مگر وہ خود ہی ہوٹل چھوڑ کر نہیں آئے۔ امیاؤ۔ تو میں نے نوابزادہ صاحب سے عرض کیا کہ میں، امیاؤ، پوری کوشش کروں گا کہ ٹمبکٹو کے سلطان کو پاکستان میں آنے کی دعوت دوں اور، امیاؤ، ان کو رضامند کرنے کی جو کچھ ممکن ہوا کروں گا اور، امیاؤ، کوئی وجہ نہیں کہ پاکستان دعوت نامہ بھیجے اور وہ نہ آئیں۔ اور میں بھی انشاء اللہ اس بارے میں پوری کوشش کروں گا کہ امیاؤ، سلطان صاحب کو اس بات پر آمادہ کروں کہ اگر وہ خود نہیں آ سکتے تو امیاؤ، نوابزادہ صاحب کو وہاں آنے کی دعوت دیں، امیاؤ، اور دراصل بات یہ ہے کہ امیاؤ، اسلامی ممالک کو آپس میں ملنا پڑے گا۔ امیاؤ، حالات خطرناک ہو رہے ہیں اور دراصل بات یہ ہے کہ غربت اس قدر ہے کہ امیاؤ، اگر دو تین سال اور کچھ نہ کیا گیا تو امیاؤ، کمیونزم پھیلنے کا خطرہ ہے۔ اور دراصل کمیونزم کا واحد علاج ہے، اسلامی سوشلزم لایا جائے، یعنی امیاؤ، صنعتوں کو نیشنلائز کریں، بیت المال قائم کریں اور لوگوں کی تعلیمی حالت کو سدھارا جائے، ورنہ امیاؤ، یہاں کمیونزم پھیل جائے گا، اور میں نے بھی نوابزادہ صاحب سے یہی ذکر کیا تھا اور امیاؤ، انھوں نے فرمایا کہ امیاؤ... امیاؤ...''

چھوٹا مضحکہ خیز آدمی گھر گھراتا رہا۔ وہ اہمیت سے پھول کر اپنے کپڑوں کے باہر آ رہا تھا۔

اب قبر تقریباً مکمل ہو چکی تھی۔ کسی نے کہا کہ قبر کی لمبائی قدرے چھوٹی رہ گئی ہے۔ ایف ایل سرور جو کلکتہ میں کئی فلموں کی ہدایت کاری کرنے کے بعد اب اپنے آپ کو اس کا اہل سمجھتا تھا کہ وہ ایک جنازے کی بھی ڈائریکشن کرے، اس نے پنشنر مہاراجہ سے اس کی ٹیک کی لکڑی ادھار مانگی۔ پہلے اس نے مسجد کے اندر جا کر لکڑی سے ارشاد حسین ایم بی ای کی میت کو طولاً ناپا۔ پھر وہی لکڑی لیے وہ قبر پر آیا اور اس کے کنارے پر بیٹھ کر اس نے قبر کی لمبائی ناپی۔

''تھوڑی چھوٹی رہ گئی ہے۔'' اس نے نہایت خوشی سے ایک تعریفی مجمع کو اطلاع دی، جو فلمی ڈائریکشن کی تکنیک کو جنازوں میں استعمال ہوتے دیکھ کر کچھ کم متاثر نہ تھا۔

قبر مکمل ہو گئی تو میت کو مسجد سے باہر لا کر قبر کے کنارے پر رکھا گیا۔ مرحوم کو قبر میں اتارنے کے لیے جھوسوں کی ایک پوری کنٹنجنٹ (contingent) پرلے کنارے پر تیار کھڑی تھی — بڑے حاجی جھوسا کا لڑکا، واقعی غمزدہ نظر آتا ہوا، پنشنر مہاراجہ اپنے سونے کے دانتوں کو چمکاتا ہوا، حاجی جھوسا کا سب سے چھوٹا بھائی، ایک کھلے ہوئے منہ والا حیوان شکل شخص جو ایک انگلی پتلون کے بٹنوں میں سے اندر ڈال کر کھجا رہا تھا، دوسرے متعدد رنگارنگ کے جھوسے۔

میت کو ذرا وقت اور کافی اضطراب کے ساتھ قبر میں اتار دیا گیا، اوپر مٹی ڈال دی گئی، اور خان بہادر ارشاد حسین، آئی سی ایس، ایم بی ای، ریٹائرڈ ڈپٹی کمشنر مرحوم، سابق انکم ٹیکس کمشنر بہاگلپور، پانچ فٹ مٹی کے تلے آدمیوں کی آنکھوں اور ان کے دلوں سے ہمیشہ کے لیے روپوش ہو گئے۔ سوشل فنکشن ختم ہو گیا۔

واپسی محمد منیر تنویر کی کار میں آتے ہوئے ہمارے ساتھ دو جھوسے بھی تھے، جن کو محمد منیر نے لفٹ دی تھی۔

"سالا! وہ تمھارا موٹر کب آ رہا ہے؟ کیا نام اس کا، جیسر؟" ان میں سے ایک نے پوچھا۔

محمد منیر تنویر نے حال ہی میں جرمن موٹروں کی ایجنسی حاصل کی تھی اور اس کے مال کی پہلی کنسائنمنٹ شپ ہو چکی تھی۔

"بارہ پندرہ روز میں،" محمد تنویر نے کہا، اور پھر پورا بزنس مین بنتے ہوئے: "بہترین گاڑی ہے۔ آٹومیٹک فلوئڈ ٹرانسمیشن۔۔۔"

"اچھا سالا، آئے تو ہم کو بتانا ہوں!" جھوسے نے کہا۔ "ہم اپنے بھانجے کو، یہ اپنے حاجی غفور کا بیٹا ہے نا، اس کی شادی پر موٹر کا ویڈنگ گفٹ دینا چاہتا ہے۔۔۔"

مقیاس المحبّت

۱

آپ نے چند روز پہلے اخباروں میں ڈاکٹر غریب محمد کے افسوسناک انجام کی خبر پڑھی ہوگی — غالباً اسی سرسری انداز میں جس طرح آپ روزانہ خودکشیوں، ڈاکوں یا اغوا کی خبریں پڑھتے ہیں۔ پڑھنے کے فوراً بعد ہی آپ اس کے متعلق بالکل بھول گئے ہوں گے۔ آپ یقیناً ایک حزنیہ اور عجیب حالات کے سلسلے سے بھی ناواقف ہوں گے جو بالآخر اس دردناک اور خوفناک ٹریجیڈی کا باعث ہوئے۔ بھلا کتنوں کو خبر پڑھتے وقت یہ احساس ہوا ہوگا کہ چاکیواڑہ کا یہ ڈاکٹر، جس کی ڈاکٹری اکیڈیمک ڈگریوں کی مرہون منت نہ تھی، پاکستان کا پہلا اور یکتا سائنٹسٹ تھا جو اگر کچھ دیر اور زندہ رہتا تو اپنے ملک کے لیے فخر کا موجب ہوتا۔ اس کی بے وقت موت سے حقیقتاً یہ نوزائیدہ سلطنت ایک ایسے سائنٹسٹ اور موجد کی خدمات سے محروم ہوگئی ہے جس کا ہم پلہ اس زمانے میں شاید ہی پیدا ہو سکے۔

میں اس کا دوست تھا — ایسا واحد دوست جو مڈل تک سکول میں تعلیم پا سکنے کی وجہ سے اس قابل ہے کہ اردو کے ایسے مکمل فقرے لکھ سکے جن میں فاعل، فعل اور مفعول تینوں موجود ہوں۔ یہ میرا فرض ہے کہ میں پہلے چاکیواڑہ کے مکینوں پر، پھر پاکستان پر اور اس کے بعد دنیا پر واضح کروں کہ میرے دوست کی وفات سے سائنس کو کتنا نقصان پہنچا ہے اور کیسے اس کی اپنی حیرت انگیز ایجاد مقیاس المحبت ہی اس کے دریائے لیاری کے طغیانی زدہ پانیوں میں چھلانگ لگا کر ڈوبنے کا سبب ہوئی۔

ہر وہ شخص جو چاکیواڑہ میں رہتا ہے، کارپوریشن اسٹریٹ کو اچھی طرح جانتا ہے۔ یہ چاکیواڑہ کی سب سے فیشن ایبل گلی ہے اور اس شہر میں وہی حیثیت رکھتی ہے جو صدر میں الفنسٹن اسٹریٹ کو حاصل ہے۔ کارپوریشن اسٹریٹ کیا ہے؟ گارے کے کچے ٹیڑھے میڑھے سے گھر، چھوٹی

شرمائی ہوئی سی دکانیں جو سڑک کے بجائے کسی اور سمت رخ کیے ہیں۔ کارپوریشن اسٹریٹ کے وسط میں پمپ ہے جہاں پھولدار جمپروں میں ملبوس حبشی عورتیں کھڑی سارا دن پانی بھرتی رہتی ہیں۔ اسٹریٹ کی چوڑائی ہر دس قدم پر بڑھتی اور گھٹتی رہتی ہے۔ بعض جگہ دروازے سے لگی ہوئی میوزیکل کی مشین ایک تنے ہوئے بازو کی طرح آنکھوں کے سامنے ناگہانی طور پر نمودار ہو جاتی ہے۔ مختصراً کارپوریشن اسٹریٹ خود رومانس کا دوسرا نام ہے۔ میرا ایک دوست منظر کمال، جو ایک ترقی پسند ادیب بھی ہے، اس کو گھٹی ہوئی حسیناؤں کی گلی کہا کرتا ہے، جس سے بہتر اور زیادہ مناسب نام شاید اور کوئی نہیں سوچا جا سکتا۔ کارپوریشن اسٹریٹ میں تقریباً دو فرلانگ آگے جا کر فضل محمد کی شاپ کے سامنے ڈاکٹر غریب محمد کی دکان تھی۔ وہ ایک معنک، نوکدار داڑھی والا فراخ گنبد نما پیشانی والا آدمی تھا اور اسے پہلی نظر دیکھتے ہی یہ یقین ہو جاتا تھا کہ اگر کسی شخص پر لفظ ''جینیس'' کا اطلاق ہو سکتا ہے تو وہ چیکوا ردو کا یہ ڈاکٹر ہے۔ بحیثیت ڈاکٹر کے — یہ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے — وہ ان ہزاروں ڈاکٹروں میں سے تھا جو مریض کو دیکھ کر بہت پر حسرت انداز میں اپنا سر ہلاتے ہیں اور لواحقین کو یقین دلا دیتے ہیں کہ اگر ان کو ایک دو مہینے پہلے بلا کر مریض دکھایا جاتا تو اس کے بچنے کی کوئی صورت ہو سکتی تھی۔

چیکوا ردو کے کئی شر پسند لوگ ڈاکٹر پر بہتان باندھتے تھے کہ لیڈی وارڈ کا قبرستان آباد کرنے میں اس کا سب سے زیادہ ہاتھ ہے۔ یہ دراصل ایک ذلیل بہتان تھا۔ بات دراصل یہ ہے کہ ڈاکٹر غریب محمد کو بلایا ہی اس وقت جاتا تھا جب کہ مریض کے بچنے کی کوئی صورت ہی نہ ہوتی تھی۔

اپنی خودکشی سے تقریباً ایک مہینہ پہلے ڈاکٹر غریب محمد میں ایک عجیب تبدیلی نظر آنے لگی۔ وہ خاموش اور کھویا کھویا سا رہنے لگا اور جب میں ایک دو بار اس کی دکان پر گیا تو اس کے چہرے کی وحشت اور اس پر آسمانی سا جلال دیکھ کر مجھے اظہار مدعا کی جرأت نہ ہوئی۔ اس نے اپنی وزٹس کم کر دیں۔ صرف ایک دفعہ اس نے مجھے اتنا اشارہ دیا کہ اس کا دماغ بہت بڑی باتوں میں الجھا ہوا ہے۔ ''اسپ! میں دن رات اپنا سارا وقت ایک ایسی ایجاد کے بارے میں صرف کر رہا ہوں جو دنیا میں تہلکہ مچا دے گی۔ اس کے مقابلے میں پچھلی سب ایجادیں، ریڈیو، ایٹم بم وغیرہ، بچے کا کھیل معلوم ہوں گی۔ اس کے منظر عام پر آنے کے بعد جرمنی کے ماہرین نفسیات کی تمام تھیوریاں بیہودہ ہو کر رہ جائیں گی اور آنے والی نسلیں ڈاکٹر غریب محمد سے پہلے زمانے کو انسانیت کا تاریک دور کہا کریں گی۔''

۲

مجھے یقین ہے انھی دنوں ڈاکٹر غریب محمد کو پہلے پہل یہ خیال سوجھا تھا کہ ایسا آلہ ایجاد کیا جائے جس سے محبت ناپی جا سکے۔ دراصل یہ صرف اکیلے اس کے دماغ ہی کا نتیجہ نہ تھا بلکہ اس کو تکمیل تک پہنچانے میں کچھ حصہ حکیم اللہ لوک سنیاسی کا بھی تھا۔ انھوں نے اس ایجاد کی ضرورت پر چائےخانوں کے مخیر اور رحمدل ریستورانوں میں (جو اب تک اس مہنگائی کے زمانے میں بھی اپنی پرانی غریب پروری اور مہمان نوازی کی روایات برقرار رکھتے ہوئے اپنے گاہکوں کو گرم گرم بنی ہوئی چائے کی پیالی، اور غالباً بڑ کا بنا ہوا نان، صرف دو آنے میں مہیا کرتے ہیں) بیروں اور گھنٹوں سر جوڑ جوڑ کر بحثیں کیں۔ عموماً جس وقت ہم ان پر بلائے ناگہانی کی طرح نازل ہو جاتے تو وہ دائیں بائیں یوں دیکھنے لگتے جیسے اپنا جوتا تلاش کر رہے ہوں، اور بات کا رخ فوراً بدل دیتے۔ ہم سب کا خیال تھا کہ وہ چائےخانہ کو رات رات میں بارود سے اڑانے کی قسم کی خطرناک سازش کر رہے ہیں مگر ان کے پچھلے کئی برسوں کے حب الوطنی اور جاں فروشی کے ریکارڈ کے پیش نظر ہمیں اپنا خیال ترک کرنا پڑا اور ہم نے سوچا کہ یہ سقراط بقراط، یہ دو عظیم گنبد نما دماغ، یقیناً اپنے امتزاج سے کوئی ایسا اچھوتا فارمولا، ایسا مفید آلہ ایجاد کریں گے جو چائےخانہ کے مکینوں کی زندگی قابلِ رشک بنا دے گا۔ ایک دفعہ میں نے ان دونوں میں سے ایک کو "مقیاس المحبت کا پارہ" کہتے سنا!

پچھلی جولائی کو ایک صبح جب میں یعقوب کمرانی سے پانچ روپے ادھار مانگنے کے ارادے سے جا رہا تھا تو کارپوریشن اسٹریٹ میں ڈاکٹر غریب محمد کی دکان کے سامنے ٹھہر گیا۔ کیوں نہ ڈاکٹر غریب محمد ہی کو پانچ روپے مانگنے کے لیے کہا جائے؛ آخر دوست ہی دوست کے کام آتا ہے۔

ڈاکٹر گلی کی طرف پیٹھ کیے کرسی پر پاؤں رکھے سامنے میز پر ایک گھڑی نما چیز سے کھیل رہا تھا۔ میز پر چند ایسے اوزار رکھے تھے جو جہاں تک مجھے معلوم ہے، ڈاکٹر استعمال نہیں کرتے — ایک ہتھوڑا، آدھ درجن کیلیں اور گراریاں، دو پیچ کس۔ میں نے گمان کیا کہ شاید ڈاکٹر خود اپنی گھڑی کی مرمت کر رہا ہے، اور اس میں تعجب کی کوئی بات بھی نہیں تھی کیونکہ ڈاکٹر کئی گھڑیوں کا مالک تھا۔ میں دکان کے اندر چلا گیا اور پیشتر اس کے کہ وہ مجھے مڑ کر دیکھتا یا اپنی گھڑی نما چیز کو چھپانے کی کوشش کرتا، میں اس کے سر پر موجود تھا اور اپنی انگلیوں سے اس کی سپاٹ چاند تھپتھپا رہا تھا۔

اس نے بڑے بھدے طریقے سے گھڑی نما آلے کو الٹ پلٹ کیا جیسے وہ ایسے ہی اس سے کھیل رہا ہے مگر اس کے چہرے پر ایسے لڑکے کی ملزمانہ جھلک تھی جو چوری کرتا پکڑا گیا ہو۔

میں نے قیاس دوڑایا۔ "کیا یہی تو مقیاس المحبت نہیں؟"

ڈاکٹر حیران اور خوف زدہ ہوکر اپنی کرسی پر اچھل پڑا۔ ''تمھیں کیسے معلوم ہوا؟ تمھیں کس نے بتایا؟ اس عالم میں صرف دو آدمیوں کو اس آلے کا علم ہے — ایک تو اس کم فہم کو، دوسری حکیم اللہ لوک سنیاسی کو!''

''مجھے؟'' میں نے ایک سرسری انداز سے اس کو مرعوب کرنے کے لیے جھوٹ بولا، ''مجھے کیسے معلوم نہ ہو؟ میں خود ایک عرصے سے مقیاس المحبت پر ریسرچ کرتا رہا ہوں، مگر میرے فارمولے میں کوئی غلطی رہ گئی ہے۔ دراصل پہاڑی چمگادڑ کا دل جو اس آلے کے اجزائے کیمیاوی کے لیے اشد ضروری ہے، پاکستان میں نایاب ہے۔''

''سچ!'' ڈاکٹر نے اب ایک مربیانہ انداز سے کہا — ایک ایسے انداز سے جو ایک سینئر کامیاب سائنسٹ، اپنے مبتدی ہم پیشہ بھائی کے لیے استعمال کرتا ہے۔ ''تو تم بھی ایک فیلو سائنسٹ ہو؟ مجھے یہ معلوم کرکے خوشی ہوئی ہے۔'' پھر اس نے ایک ترحم آمیز نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے اپنا بڑا مہیب سر گردن میں ہلایا، ''مگر تم غلط راستے پر چلے گئے۔ پہاڑی چمگادڑ کا قلب مقیاس المحبت میں! ہاہاہا۔ میں جانتا ہوں کہ تم کیوں کامیاب نہیں ہو سکے — صحیح سائنٹفک اپروچ کے نہ ہونے کی وجہ سے۔ کسی ایجاد کے لیے صحیح سائنٹفک اپروچ کا ہونا پہلی شرط ہے۔ مثلاً تھرمامیٹر کو لو۔ اس کے لیے صحیح سائنٹفک اپروچ کی خاص بہت مطلقاً ضرورت نہیں۔ ہر الو اس کو ایجاد کرسکتا تھا۔ یہ ایک بالکل معمولی اور سیدھا سادا آلہ ہے جو جسم کی حرارت ناپتا ہے۔ مگر مقیاس المحبت! محبت کو صحیح ڈگریوں میں ناپنا اس قدر سہل نہیں جتنا جسم کی حرارت ناپنا۔ اس کے موجد کے لیے ضروری ہے کہ وہ قدرت کے فزیکل قوانین کے علاوہ روحانی قوانین پر بھی عبور رکھتا ہو۔ اور روحانی قوانین کو صحیح سائنٹفک اپروچ سے قابو میں لانا ہر ایک کے بس کا روگ نہیں۔ اگر حکیم اللہ لوک سنیاسی جیسے عامل روحانیت کی مدد شامل حال نہ ہوتی تو میں خود تمھاری طرح تاریکی میں بھٹکتا رہتا۔ یہی جگہ ہے جہاں تم لوگ ٹھوکر کھا جاتے ہو — تم لوگ مقیاس المحبت کو بالکل انھیں فزیکل قوانین کے مطابق ایجاد کرنا چاہتے ہو جن پر تھرمامیٹر — صرف اس قانون پر کہ پارہ حرارت سے پھیلتا ہے۔ مگر محبت صرف فزیکل قوانین کے تابع نہیں۔ ہاہاہا! ہی ہی ہی!'' وہ برترانہ طریق پر ہنسا۔ یہ مجھے سخت ناگوار گذرا۔

میں نے ضبط کرتے ہوئے پوچھا، ''تمھارا یہ محبت ناپنے کا آلہ، یہ مقیاس المحبت، پورے طور پر مکمل ہو چکا ہے؟''

''بالکل مکمل! تم نے کیا سوچ رکھا تھا؟ بھلا میں اتنے روز سے اور کیا کر رہا تھا؟'' ڈاکٹر غریب محمد نے مصالحانہ نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے جواب دیا، ''دو اور دو چار کی سی صحت اور

خوبصورتی سے کام کرتا ہے میرا مقیاس المحبت!'' پھر دفعتاً چونک کر اور قدرے ہراس زدہ ہو کر بولا، ''اسپ یار!'' (میرا نام اصل میں کچھ اور ہے۔ دوست احباب پیار سے اسپ کہتے ہیں۔ غزل میں میرا تخلص بھی یہی ہے۔) ''یہ ایجادیں پیٹنٹ بھی تو کرانا پڑتی ہیں۔ تمھیں معلوم ہے، یہ پیٹنٹ کرانے کا معاملہ کیا اور کس طرح ہوتا ہے؟''

''یہ مجھ پر چھوڑ دو۔'' میں نے اپنے دوست کے لیے مضبوط سہارا بنتے ہوئے کہا، ''میں اس کام میں اسپیشلسٹ ہوں۔ ڈبل روٹیاں بنانے کا ایک بالکل نیا طریقہ ابھی حال ہی میں پیٹنٹ کرا چکا ہوں۔ مگر مقیاس المحبت کو پیٹنٹ کرنے کے لیے تم اس قدر بے چین کیوں ہو؟''

''کیوں نہ ہوں؟ فرض کرو کوئی اور مجھ سے پہلے مارکیٹ میں یہ ایجاد لے آتا ہے؟''

''تمھارے سوا اور کون یہ آلہ ایجاد کر سکتا ہے۔'' میں نے اسے حوصلہ دیا۔ ''میرا امکان تھا مگر سائنٹفک اپروچ کے فقدان کی وجہ سے میرا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور پھر تمھارا بہترین دوست ہوں۔ تم کیسے اپنے بہترین دوست سے ایک ناشائستہ حرکت کی توقع رکھ سکتے ہو؟''

''نہیں!'' اس نے کہا، ''مجھے تمھاری طرف سے کوئی خطرہ نہیں۔ خطرہ ہے تو صرف ایک شخص سے جو اس ایجاد کے کئی خفیہ رازوں میں میرا شریک کار رہا ہے۔ بجنی نیت بدلتے دیر نہیں لگتی۔'' وہ رازدارانہ طریق پر اپنا منھ میرے اس قدر قریب لے آیا کہ اس کی نوکیلی داڑھی کے چند بال میرے کھلے ہوئے منھ میں گھس کر میری زبان پر کھجلی کرنے لگے۔ ''تم سے کیا چھپاؤں۔ تم تو ہوئے لنگوٹیے۔ اسپ یار، میں تمھاری وہ چار دن کی مسلسل تگ و دو نہیں بھولا جو معجون حب کے لیے تم نے بلبلیں فراہم کرنے کے سلسلے میں کی تھی! مجھے حکیم اللہ لوک کا ڈر ہے۔ اسے مقیاس المحبت کے پرزوں اور اس کی مشینری کے راز کا علم ہے اور اس میں چند عمل اور تعویذ اسی عامل کامل کے ہیں۔''

''تعویذ!'' میں چلایا، ''تمھارا مطلب ہے یہ مقیاس المحبت تعویذوں سے چلتا اور کام کرتا ہے؟''

''صرف تعویذ نہیں۔ تعویذ بعد میں آتے ہیں۔ پہلے اس میں پرزوں، گراریوں اور اسپرنگوں کا ایک بے حد الجھا ہوا مکینزم ہے — ایک جیبی گھڑی کے مکینزم سے ملتا جلتا، مگر اس سے کہیں زیادہ پیچ دار۔ یہ گھڑی بند جو تم دیکھتے ہو ایک خاص دھات کا ہے جو اندر سے کھوکھلی ہے اور جس کی ماہیت اور خصوصیات سے انگریز، جرمن اور امریکن ہیئت دان تک ناآشنا ہیں۔'' وہ مجھے اس سے زیادہ بتانے پر تیار معلوم نہ ہوتا تھا۔

''تم جانتے ہو ڈاکٹر،'' میں نے کہا، ''میں تمھارا بہترین دوست ہوں۔ وہ واقعہ یاد کرو جب میں بلبلیں پکڑنے کے لیے چار پانچ روز بغیر کھائے پیے صحراؤں اور گلستانوں کی خاک چھانتا پھرا

تھا اور جب میں ان کو ڈ کرے میں رکھ کر تمھارے پاس لایا تو میرے بعض حاسدوں نے تم کو بہکایا تھا کہ یہ بلبلیں نہیں بلکہ جنگلی مولے ہیں۔ تم بھی ان کی بات مان گئے تھے اور مجھے اس شہادت کے لیے کہ واقعی یہ بلبلیں ہیں شیخ فضل علی نامی دوست کو آدھی رات کے وقت اس کے بستر سے اٹھا کر لانا پڑا تھا۔ وہ وقت یاد کرو اور مجھے ذرا تفصیل سے بتاؤ کہ یہ آلہ کیسے کام کرتا ہے۔"

ڈاکٹر نے کچھ تامل کے بعد مجھے تفصیل سے بتایا کہ آلہ کس طرح کام کرتا ہے۔ گھڑی کے ساتھ ایک گھڑی بند یا ٹکن سا لگا تھا جو کلائی پر فٹ کیا جا سکتا تھا۔ اس ٹکن کے دوسرے سرے پر گھڑی کے متقابل ایک بلوریں ٹکڑا جڑا ہوا تھا جو دراصل بلور کا نہ تھا بلکہ ایک عجیب وغریب نامعلوم دھات کا تھا جس کی دریافت مغرب کے مادیت پرست ہیئت دان شاید اس وقت تک نہ کر سکیں گے جب تک ان کے درمیان کوئی ایسا ہیئت دان نہ پیدا ہو جو بیک وقت ہیئت دان بھی ہو اور ایک ولی کامل بھی۔ اس بلور کے ٹکڑے کی خاصیت یہ تھی کہ عام فزیکل حرارت اس پر کوئی اثر نہ کرتی تھی مگر محبت کی لہریں جو فضا میں ریڈیو کی لہروں کی طرح سفر کرتی ہیں اس کے ساتھ ٹکرا کر ایک متوافق قوت کی رو ٹکن کے حلقے اور گھڑی کے اندر کلوں میں سے دوڑا دیتی تھیں۔ اسی تک مقناطیسیت زدہ ہو کر گھڑی کے پوائنٹر (سوئی) کو کلاک وائز یا اینٹی کلاک وائز اطراف میں حرکت میں لاتے تھے۔ گھڑی کے چہرے پر ۱+ سے ۶+ تک ایک طرف اور ۱- سے ۶- تک دوسری طرف ہندسے لکھے تھے جن میں سے ہر ہندسہ محبت یا نفرت کی (منفی ہندسے نفرت کے تھے) ڈگری ظاہر کرتا تھا۔ اس طرح:
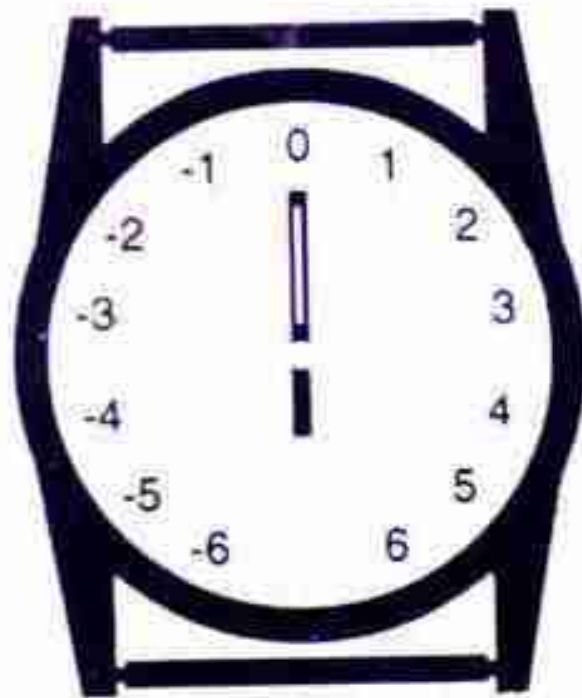
ڈاکٹر نے اتنا سمجھانے کے بعد مجھ سے کہا "میں تم کو اس کے استعمال کا طریقہ بتاتا ہوں۔ فرض کیا تم سامنے سے ایک خوبصورت عورت آتی دیکھتے ہو اور یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ اس کو تم سے اس وقت کتنی ڈگری کی محبت ہے یا وہ کتنی شدت سے تمھاری طرف کھنچ رہی ہے۔ تم اسی وقت اس گھڑی

کو اپنی کلائی پر پہن لیتے ہو۔ بلور کے ٹکڑے کو تم اپنے منھ کے سامنے اس طرح لے آؤ گے کہ وہ آنے والی کی تیر مژگاں نظروں کے راستے میں حائل ہونے لگے۔ محبت کی لہروں کے اس بلور پر کھیلتے ہی گھڑی کا پوائنٹر اپنی زیرو کی پوزیشن سے ہٹ کر دائیں یا بائیں حرکت کرے گا۔ فرض کیا کہ سوئی ۱+ پر آ کر رکتی ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اس عورت کو تم سے محبت ضرور ہے مگر واجبی قسم کی۔ ۱+ سے ۳+ یا ۵+ پر آ کر ٹھہرے تو اس کا مطلب ہے کہ اس عورت کی محبت تمھارے لیے اس شدت کی ہے کہ اگر تم کوشش کرو تو وہ تمھارے ساتھ بھاگ نکلنے کے لیے بھی تیار ہو جائے گی۔ ۶+ پر شادی ہو سکتی ہے، بشرطے کہ لڑکی کا باپ رضامند ہو۔

''اور... اور یہ کیا ظاہر کرتے ہیں؟''

''تم تو محض بچے ہو، اتنا بھی نہیں جانتے۔ اے ڈگری محبت کا کیا مطلب ہو سکتا ہے؟ یہی کہ اذ ڈگری نفرت۔ اگر سوئی اینٹی کلاک وائز حرکت کرے اور منفی ایک پر رکے تو اس کا مطلب ہے کہ عورت کو تم سے نفرت ہے اور اس نفرت کی شدید اور آخری ڈگری ۶- ہے — ایسی نفرت جو تم کو اس عورت کے بھائیوں سے جوتیاں پڑوا سکتی ہے۔''

جوتیاں پڑنے کے ذکر پر آنکھیں جھپکائے بغیر میں نے ایک بالکل غیر ضروری سوال کیا، ''ایک اور بات، اے مشہور ہیئت داں! کیا یہ گھڑی — اور... مقیاس المحبت صرف چاکیوارہ کے خوش نصیب باشندوں ہی کے لیے وقف ہوگا؟''

''نہیں،'' ڈاکٹر غریب محمد ایک عظیم سائنس دان کے لب و لہجے میں کہنے لگا، ''میں ایک سچا سائنس داں ہوں، اور ایک سچا سائنس دان قوموں، ملکوں اور حد بندیوں کی terms میں نہیں سوچتا۔ اس ایجاد کا فیض ساری بنی نوع انسان کے لیے ہے — حتیٰ کہ سکھوں کے لیے بھی۔''

''اتنا فراخ دل! سکھوں کے لیے بھی!'' میں تعریفی نگاہوں سے اسے پیتے ہوئے چلایا۔ ''اس ایجاد کے فیض سے تم سکھوں کو بھی محروم نہیں رکھنا چاہتے! مگر فیض؟ میں سچ کہتا ہوں اس مقیاس المحبت میں کوئی فیض نہیں۔ تم نے ایک حیرت انگیز آلہ ایجاد کیا ہے مگر اس میں فیض کوئی نہیں۔ اس سے کئی گھروں کی خوشی تباہ ہو جائے گی اور ان کئی عاشقوں کے دل جو اب تک اپنی محبوباؤں کی عشق اور محبت کے یقین میں فریب زدہ اور مست ہیں، ٹوٹ جائیں گے...''

''پھر بھی یہ ایک عظیم ایجاد ہے،'' ڈاکٹر غریب محمد بولا، ''ہر چیز کے فوائد ہوتے ہیں اور نقصانات بھی۔ میں اس کا انکار نہیں کرتا کہ اس ایجاد سے اس کے عاملوں کی زندگیاں اجیرن ہو جانے کا احتمال ہے۔ ہو سکتا ہے بعض لوگ جو اب اپنے محبوبوں کی محبت کا یقین رکھتے ہوں مقیاس

المحبت کے چہرے پر سیاہی پڑھ کر اتنے مایوس ہوں کہ خودکشی کر لیں — مگر میرا خیال ہے کہ اس ایجاد سے زیادہ تر خلق کو فائدہ ہی پہنچے گا۔ اس سے نوجوانوں کو شادی کے لیے صحیح انتخاب کرنے میں بے حد سہولت ہو جائے گی۔"

"خیر، کم از کم یہ ایجاد میرے لیے بیکار اور بے ضرر ہے۔ مجھے دیکھ کر، خدا جانے کیا بات ہے، عورتوں کی وہ ہیجانی لہریں، جن کی طرف ابھی ابھی تم نے نہایت خوبصورتی سے اشارہ کیا ہے، وہیں رک جاتی ہیں۔ مجھے یقین ہے اگر میں اس مقیاس المحبت کو اپنی کلائی پر باندھوں تو یہ پوائنٹ صفر پر ٹھہرا رہے گا۔ عورتیں مجھ سے محبت کرتی ہیں نہ نفرت۔"

انجام کار میں نے ڈاکٹر سے وعدہ کیا کہ میں اس ایجاد کے بارے میں اپنی زبان بند رکھوں گا اور کسی سے ذکر تک نہ کروں گا۔ اس کے بعد میں نے ڈاکٹر کی اجازت سے مقیاس المحبت کو اپنی کلائی پر باندھ کر مختلف اشیا کے درجہ محبت کو، جو انھیں اس ناچیز سے تھی، ناپا۔ نتیجہ مندرجہ ذیل ہے:

گھڑا اٹھائے ہوئے ایک عورت جو آرہی تھی: پوائنٹ صفر پر ٹھہرا رہا۔

بغیر گھڑے کے ایک عورت: پوائنٹ صفر پر ٹھہرا رہا۔

ایک اونٹ جو کارپوریشن اسٹریٹ کے نکڑ پر کھڑا میری طرف دیکھ رہا تھا: ۴+

دو گدھے جو سامنے سے آرہے تھے: ۹+ (غالباً ۳+ ذہنی گدھا)

یعقوب عمرانی — چاکیواڑہ کا لال داڑھی والا یہودی جس کا میں ایک سو روپے کا مقروض تھا اور جس کے پاس میری پانچ ٹائیاں رہن تھیں: ۹-

یعقوب عمرانی کی ۹- محبت کو دیکھتے ہی میں فوراً ڈاکٹر غریب محمد کی ڈسپنسری میں — اندر ایک چھوٹی سی کال کوٹھڑی تھی، جس کو اس نام سے پکارا جاتا تھا — جا چھپا اور اس وقت تک چھپا رہا جب تک ڈاکٹر نے "آل کلیر" کا سگنل دے کر مجھے یقین نہ دلایا کہ یعقوب عمرانی اب فی الواقع آگے گذر گیا ہے۔

"واقعی ڈاکٹر!" میں نے ڈسپنسری سے نکلتے ہوئے اور عمری کے جالوں کو جھاڑتے ہوئے کہا، "آج مقیاس المحبت نے، جو مقیاس النفرت بھی ہے، میری جان بچائی اور عزت رکھ لی۔ اس نے مجھے فوراً اطلاع دے دی کہ آج تمھارا قرض خواہ تمھارے سر پر جوتیاں توڑنے کے ارادے سے نکلا ہے — کم بخت آج بوٹ بھی نئے اور نوکدار کیلوں والے پہنے تھا!"

"بس اب یہ مقیاس اتار کر مجھے دے دو۔ مجھے ابھی دو تین پیچ کسنے ہیں اور ایک اور تعویذ گھڑی کے پیچھے ڈالنا ہے۔ کل تک میں اس کو پیٹنٹ کرا دوں گا — لیکن حکیم اللہ لوک سنیاسی..."

''میں پیٹنٹ کرانے میں تمھاری مدد کروں گا۔'' میں نے آڑے وقت میں اپنے دوست کے کام آتے ہوئے جواب دیا۔ ''پروا نہ کرو۔ ایڈمنسٹریٹر کے دفتر کا ہیڈ چپراسی میرا دوست ہے۔ اچھا اب میں چلتا ہوں... '' یک لخت مجھے خیال آیا اور میں مڑا۔ ''ڈاکٹر غریب محمد! کیا تم مجھ کو آج شام تک پانچ روپے ساڑھے تین آنے ادھار دے سکتے ہو؟''

وہ کچھ متامل سا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اسے دوبارہ جتایا کہ میں اس کا بہترین دوست ہوں۔ بلبلوں کا لطیفہ سے طریقے سے ذکر کیا۔ آخر ڈاکٹر نے اپنے تھیلے سے پورے پانچ روپے ساڑھے تین آنے گن کر میری ہتھیلی پر رکھ دیے۔

''پانچ روپے کیا چیز ہیں۔'' ڈاکٹر روپے دے چکنے کے بعد اب حاتم طائی کا پارٹ کھیلنے میں کوئی ہرج نہیں سمجھتا تھا۔ ''پانچ روپے اپنے بہترین دوست کے لیے! میں آخر اس ایجاد سے لاکھوں کمانے والا ہوں!'' وہ اپنے آپ کو ڈھارس دے رہا تھا۔

۳

کوئی تین روز کے بعد بارش سے پناہ لینے کے لیے میں جب ڈاکٹر غریب محمد کے مطب میں داخل ہوا تو اس سنجیدہ اور ہونہار 'جینیئس' کو ایک ایسے دلفریب مشغلے میں کچھ ایسا منہمک پایا کہ اسے میرے آنے کا پتا تک نہ چلا۔ وہ زمین پر اکڑوں، پنجوں کے بل بیٹھا ایک سفید زنانہ ٹانگ کا بغور ٹوہ ٹوہ کر ایک مبصر کے سے انداز میں معائنہ کر رہا تھا۔ اس ٹانگ کی مالکہ کرسی پر بیٹھی تھی اور دلفریبانہ طور پر جھکی ہوئی تھی جیسے پھلوں سے لدی ہوئی ٹہنی آپ ہی آپ گرنے کو آئے۔ وہ ایک ہاتھ سے اپنے پھولدار فراک کے گھیرے کو اوپر گھٹنوں تک اٹھائے تھی۔ اگر آپ چاکیواڑہ کے باشندے ہیں تو آپ نے ضرور اس کو کہیں نہ کہیں دیکھا ہوگا۔ اس فتنہ ساماں کا نام ہے راقیہ! چاکیواڑہ کے کئی جدید نوجوان ترقی پسند شعرا نے اس سے خطاب کر کے بجلی جیسی گرم تپتی ہوئی نظمیں کہی ہیں اور دو تین ناکام محبت نوجوانوں کی خودکشی بھی اسی سے منسوب کی جاتی ہے۔ وہ یقیناً کارپوریشن اسٹریٹ کی کھلتی ہوئی حسیناؤں میں نمبر ون ہے۔ وہ اتنی حسین نہیں؛ اس کا شمار اس قسم کی لڑکیوں میں کیا جا سکتا ہے جو بیس سال کے بعد مرجھائی ہوئی، دخل اندازی کرنے والی، طوطے کی چونچ جیسی مڑی ہوئی ناک والی عورتوں میں تبدیل ہو جاتی ہیں اور جن کے متعلق یہ گمان بھی نہیں کیا جا سکتا کہ ان کے بھی چاہنے والے تھے۔

ان سطور کے ناچیز لکھنے والے نے بھی، یہ ایک سال پہلے کا واقعہ ہے جب وہ انجمن کنواران چاکیواڑہ کا آفیشل ممبر نہیں بنا تھا، ایک دفعہ گلی میں اس کی بالکنی کے نیچے کھڑے ہو کر اس کو محبت اور

پیار کے الفاظ سے مخاطب کرنے کی جرأت کی تھی۔ مگر اوپر سے مرد پنڈلی کی دو بالشتیں پڑنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اس عشق کی ابتدا حوصلہ افزا نہیں ہے۔ تجھے راقم الحروف مستقل مزاج عاشق بھی نہ رہا۔ اگر ابتدا ہی میں اس کی حوصلہ شکنی کر دی جائے تو وہ محبوب سے مایوس ہو کر عشق کے اور امتحانوں میں اپنی قسمت آزمانے کو چل پڑتا ہے۔ وہ اور کیا دن تھے!

میں اس محبت کے ضمن میں مخل نہیں ہونا چاہتا تھا مگر کیا کرتا، باہر موسلا دھار بارش ہو رہی تھی — ایسی بارش جو کراچی میں کبھی نہ ہوئی تھی۔ آخر اچانک راقبہ نے اوپر آنکھیں اٹھائیں اور مجھے دیکھتے ہی اس کے فرغل کا دامن نیچے ٹخنوں تک آ گیا۔ راقبہ کی نظروں میں میرے لیے اس وقت زہر بھرا تھا اور مجھے یقین ہے کہ اگر میری کلائی پر اس وقت مقیاس الحرارت ہوتا تو اس پر یہ نمک ۵- اور ۶- کے درمیان ہوتی۔ ڈاکٹر غریب محمد نے بھی مجھے قاتلانہ نظر سے دیکھا گویا مجھے کچا چبا جانا چاہتا ہے۔ وہ میرے "سلام علیکم" کا جواب دیے بغیر اپنی مریضہ کی طرف متوجہ ہوا۔ "کتے جو ہوتے، آخر کاٹ ہی لیتے ہیں۔ گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کتے کے پاگل ہونے کا وہم بھی نہ کیجیے۔ میں اس کتے کو عرصہ تین سال سے جانتا ہوں۔ وہ ٹھیک ہے۔ زخم بھی معمولی ہے۔ روز یہاں مجھے ایک دفعہ آ کر ٹانگ دکھا دیا کیجیے۔"

راقبہ ایک مرہم کی ڈبیا اٹھائے، جو اسے ڈاکٹر غریب محمد نے دی تھی، پنجوں کے بل قدم رکھتی دکان سے اتر گئی اور میں نے اپنے دل کو اس عہد سے مضبوط کیا جو حال ہی میں انجمن کنواراں کے سالانہ جلسے میں کئی ایک معتبر ہستیوں کے سامنے میں نے کیا تھا۔

"پچھو!" ڈاکٹر غریب محمد نے پیشانی سے پسینے کے قطرے پونچھتے ہوئے کہا، "پچھو — میں کہتا ہوں، کتنی خوبصورت ٹانگ! کیسی سفید پنڈلی!"

"یہی میں کہتا ہوں، کتنی خوبصورت پنڈلی، کیسی سفید ٹانگ! آپ تو جوہر شناس معلوم ہوتے ہیں۔"

"کیا بکواس ہے!" ڈاکٹر بولا۔ "آپ تمھارے مذاقوں میں اصلی مزاح نہیں ہوتا۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آتے۔ میں نے آج تک صرف ایک اور ایسی عورت دیکھی ہے جس کی ٹانگیں راقبہ کے مقابلے میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ وہ تھی مارلین ڈیٹرچ، فلم ایکٹریس۔ اس ہوشربا نے صرف اپنی ٹانگیں ہی کئی ہزار ڈالرز میں انشور کرا رکھی تھیں۔"

"تم اس سے کہاں ملے ہو؟ جہاں تک مجھے معلوم ہے تم ہالی وڈ تو ہالی وڈ، کوٹ رادھا کشن تک نہیں گئے۔"

"آہ! میں نے اس کو، اس کی ٹانگوں کو، پردۂ سیمیں پر دیکھا ہے۔ ایک زنانہ خوبصورت ٹانگ

دیکھنا نادرات زمانہ میں سے ہے اور اہل نظر کے لیے ایک عظیم وجدانی تجربہ! کیٹس نے ایک ایسی نانگ دیکھ کر وہ مشہور بند لکھا تھا جو یوں شروع ہوتا ہے: حسین چیز ایک دائمی مسرت ہوتی ہے...''

''کیٹس کون تھا؟''

پیشتر اس کے کہ ڈاکٹر غریب محمد مجھے کیٹس اور انگریزی ادب پر پرمغز لیکچر دیتا، پشاوری لنگی میں ایک ممماتی ہوئی آنکھوں اور تلطفانہ ڈاڑھی والا ادھیڑ عمر کا آدمی ہاتھ میں سوٹی لیے آیا۔ یہ راقبہ کا چچا اور سرپرست حاجی بھلے ڈینو تھا۔ ڈاکٹر نے فوراً دوڑ کر اس کے قدم لیے، اس کے دائیں گال کو بوسہ دیا، گدے دار کرسی ڈسپنسری سے لاکر اس کے لیے رکھی۔ میں اب جانے کی سوچ رہا تھا مگر جب ڈاکٹر نے سامنے فضل محمد ٹی والے کو آواز دی کہ فوراً اسپیشل چائے لے کر آئے تو میں نے سوچا کہ اس وقت میرے سامنے کوئی اور ایسا اہم معاملہ نہیں جو چائے جیسا اہم ہو۔ چنانچہ میں رُک گیا۔

''آج کل اسپ صاحب، آپ کو کام پر صبح سویرے جانا پڑتا ہے؟'' ڈاکٹر غریب محمد نے شریفانہ طریقے پر مجھے اشارتاً کہا کہ میں تشریف لے جاؤں۔

''نہیں،'' میں نے نہایت خوش مزاجی سے جواب دیا، ''میں نے وہ کام چھوڑ دیا ہے اور اب جس کام پر جاتا ہوں اس کا کوئی معین وقت نہیں۔''

تلطفانہ ڈاڑھی نے ڈاکٹر سے سوال کیا، ''راقبہ یہاں آئی تھی؟''

''ہاں آئی تھیں،'' ڈاکٹر نے اپنے دل کی ملکہ کے لیے ادب کے طور پر صیغہ جمع غائب استعمال کرتے ہوئے کہا، ''میں نے ان کی تسلی کردی ہے۔ زخم معمولی ہے۔ صرف چند روز مجھے ٹانگ دکھانے کے لیے آنا پڑے گا۔''

''ہوں!'' حاجی بھلے ڈینو نے چائے سڑکتے ہوئے ایک ڈکار لی۔ ''آج کل افیم پھر مہنگی ہورہی ہے اور ٹھیکے والے بلیک کررہے ہیں۔''

''بندے کو کہا ہوتا،'' ڈاکٹر نے جھٹ اپنی سعادت مندی اور خدمت گذاری کا ثبوت دیا، ''آخر بندہ یہاں کس لیے بیٹھا ہے۔''

''اچھا — ہوں! آج شام تک چھ تولہ افیم کا انتظام کر رکھنا۔ دام میں عراق سے برخوردار وڈے ڈینو کا منی آرڈر آنے پر چکاؤں گا۔ ڈاکٹر غریب محمد، تم چاکیواڑہ کے نیک ترین آدمیوں میں سے ہو۔ کئی بیوائیں اور یتیم بچے تمھیں دعائیں دیتے ہیں۔ میں مکرانی زبان میں چاکیواڑہ کی تمام روشن اور مقتدر ہستیوں کے حالات زندگی با تصویر مرتب کررہا ہوں۔ یہ چاکیواڑہ کا 'کون کون ہے' یعنی 'ہو از ہو' ہوگا۔ مقتدر ہستیوں میں تمھارا نام دوسرے نمبر پر رکھوں گا۔ پہلا نام خود میرا ہوگا۔ مجھے اپنے حالات

زندگی، تصویر کا بلاک اور اپنے کلام کا انتخاب جلد مہیا کر دو۔ ہو سکے تو نام چھپوانے کا ہدیہ صرف پچیس روپے ہے — البم بڑی مہنگی ہو رہی ہے اور راقبہ بھی اب انیس سال کی ہو چکی ہے۔''

میں اتنے عرصے میں رجسٹر کا ایک بن کھانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ آخر مجھے اس کو نگلنا پڑا جس کی وجہ سے مجھے اچھو آ گیا اور باہر بھاگنا پڑا۔

شام کو لوٹتے وقت میں نے ایک لڑکی کو، جو راقبہ تھی، دیکھا۔ وہ میونسپلٹی کی لالٹین کے نیچے ڈاکٹر کی دکان کے سامنے ایک انداز سے کھڑی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی ہٹ گئی۔ میں عورتوں کے لیے سم قاتل سمجھا جاتا ہوں۔ ڈاکٹر دکان میں تھا اور اپنی داڑھی کے پیچھے مسکرانے کی کوشش کر رہا تھا۔

میں نے پوچھا، ''آج تم بڑے خوش معلوم ہوتے ہو۔''

''خوش ہونے کی بات ہی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''بوڑھا لنگور رضامند ہو گیا ہے۔''

''بوڑھا لنگور کون؟ کس بات پر رضامند ہو گیا ہے؟''

''بچے کی طرح تمھیں ایک ایک بات بتانا پڑتی ہے۔ بوڑھا لنگور، حاجی تھے! دیکھو اور کون؛ جو ابھی یہاں میرے پاس بیٹھا تھا۔ تمھارے رفع ہونے کے بعد وہ تین گھنٹے اور یہاں بیٹھا رہا۔ وہ پہر کا کھانا بھی میرے ساتھ ہی کھایا۔ میں اس کو اڈے پر سے آیا ہوں۔ راقبہ کا رشتہ دینے کے لیے تیار ہو گیا ہے۔''

''ہوش کرو۔'' میں چلایا۔ ''تم چھ کنواروں کی انجمن کے سیکرٹری ہو۔ اپنے وعدے یاد کرو۔ اپنے عہد، اپنی قسمیں!''

''میں سیکرٹری کے عہدے سے استعفیٰ دے رہا ہوں۔ اگر راقبہ میری زندگی میں نہ آتی تو بھی اسپ، یقین کرو، میں اپنے بہترین لنگوٹیوں کو اس طرح نہ چھوڑتا۔ پھر بھی میری ہمدردیاں ہمیشہ تمھارے اور دوسرے کنواروں کے ساتھ رہیں گی۔ روحانی طور پر میں تمھارے شانہ بشانہ چلوں گا۔''

''راقبہ!'' میں نے حسد میں جلتے ہوئے کہا، ''ایک عورت کی خاطر تم اپنے حلف وفاداری اور دوستوں کو چھوڑنے پر تل گئے ہو۔ اور ایک ایسا خطرناک اور احمقانہ قدم اٹھانے کے لیے تیار ہو گئے ہو جس کا انجام میں سوچتا ہوں تو دل ہل جاتا ہے۔ اب بھی وقت ہے، ڈاکٹر غریب محمد، پلٹ جاؤ۔ باز آ جاؤ۔''

''ناگن،'' ڈاکٹر وجدانی کیفیت میں سرشار تھا، ''اتنی خوبصورت ناگن!''

''مگر تم کو کیسے معلوم ہے کہ اسے ... راقبہ کو تم سے محبت ہے۔ تم جانتے ہو تم اب چھتیس سینتیس کے ہو اور اتنے یوسف بھی نہیں کہ عورتیں تمھارے پیچھے مریں۔''

''لیکن راقبہ ضرور مجھ پر مرتی ہے۔ اس کی آنکھیں مجھے محبت کا صاف پیغام دیتی ہیں۔ اس

کے ہونٹ مجھے چومنے کی دعوت دیتے ہیں۔ اس کی ہر ادا میں، ہر اشارے، ہر کنایے میں میرے لیے محبت ہی محبت ہے — محبت اور دعوت!''

دعوت کا لفظ سن کر میں نے کہا: ''میں کچھ بھوک محسوس کر رہا ہوں۔ چائے کے متعلق کیا خیال ہے؟'' میں نے پرامید نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ ''اور محبت کے بارے میں، کہ اس کو تم سے محبت ہے، یہ تمھاری غلط فہمی ہے۔ اس کی اداؤں اور نیلی آنکھوں سے کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ عورت نہایت ہی پراسرار مخلوق ہے۔'' میں ایک ایسے انداز سے باتیں کر رہا تھا جیسے میں نے ساری عمر عورت کی نفسیات کے مطالعے میں گذاری ہے۔ ''اب دو پرسوں جو اونٹ یہاں سے بلبلاتا ہوا گذرا تھا۔ ظاہرا اس کا مجھ سے کسی قسم کی شیفتگی رکھنا قرین قیاس نہ تھا، لیکن مقیاس المحبت کو لگانے سے مجھ پر یہ حقیقت کھلی کہ اس اونٹ کو مجھ سے ۴+ ڈگری محبت ہے۔ میرا دوستانہ مشورہ ہے کہ تم کل مقیاس المحبت سے یقین کر لو کہ اس کا درجہ محبت کیا ہے۔ پھر کوئی اور چیز سوچنا۔''

مجھے اب افسوس ہے کہ میں نے اس کو یہ مشورہ دیا۔ ایک طرح یہی مشورہ چار روز کے بعد اس کے خوفناک انجام کا سبب بنا۔ آپ کہیں گے مجھے یہ مشورہ نہ دینا چاہیے تھا۔ لیکن میرے خیال میں حقیقت بہرحال اس پر کھلنی ہی تھی — آج نہیں تو کل، کل نہیں تو پرسوں۔

میں جانے لگا۔ یک لخت ایک خیال آنے پر میں مڑا۔ ''ڈاکٹر غریب محمد، کیا تم مجھے کل دوپہر تک دس روپے ساڑھے آٹھ آنے ادھار دے سکتے ہو؟ ڈبل روٹیاں بنانے والوں کی جنرل ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ ہے اور یہ حقیر صدارت کے فرائض انجام دے رہا ہے۔ صدر کے فرائض میں سے ایک یہ بھی ہے کہ وہ سب ممبروں کی چائے سگریٹ سے تواضع کرے۔ صرف کل دوپہر تک! تم جانتے ہو میں تمھارا بہترین دوست ہوں۔ وہ بلبلیں یاد کرو! چاکیوارہ میں ایک بہترین دوست کا ہونا جو دکھ سکھ میں ساتھ دے سکے اور مشورے دینے میں اپنا ثانی نہ رکھتا ہو، قدرت کی عظیم ترین نعمتوں میں سے ہے۔''

لیکن آج اتنی لمبی چوڑی تقریر کی ضرورت نہ تھی: ڈاکٹر غریب محمد پر حاتم طائی مکمل طور پر سوار ہو چکا تھا۔

اس نے مجھے تھیلے میں سے دس روپے ساڑھے آٹھ آنے نکال کر دے دیے جو دکان کے باہر آتے ہوئے یعقوب مکرانی نے، جو میری گھات میں کھڑا تھا، اپنے سود کی ادائیگی میں دھروا لیے۔ پہلے کی طرح حسین طور پر مفلس اور قلاش، میں روپہلی شام میں سیٹیاں بجاتا چلا گیا۔

میرے استاد نے مجھے کہا تھا: جی چھوٹا کبھی نہیں کرنا چاہیے۔

۴

کراچی میں اس جولائی میں بارشوں نے جو بربادیاں کیں اور جو گل کھلائے ان کا تذکرہ ہمیشہ شہر کی تاریخ میں یادگار رہے گا۔ ان بارشوں کے فوراً بعد ایک مہیب بادِ صرصر آنے کی پیش گوئی حکومت کے "موسم کے خداؤں" کی طرف سے کی گئی مگر بعض وجوہ کی بنا پر، جو صرف بادِ صرصر ہی کو معلوم ہیں، وہ کراچی کی طرف آتے آتے لوٹ گئی۔ حکومت کے جلد باز "موسم کے خدا" کھسیانے ہو کر منھ دیکھتے رہ گئے۔ بعض دوسرے حضرات بھی، جو اس سائیکلون کی تباہی کے منتظر تھے، سخت مایوس ہوئے۔ پھر بھی بارشوں نے جو کچھ کر دیا تھا، سائیکلون کے لیے اس میں اصلاح کرنے کی مطلق گنجائش نہ تھی، اس لیے غالباً اس نے نازل ہونے کی ضرورت نہ سمجھی۔

چاکیواڑہ میں حالات بالکل ہی سبحان اللہ تھے۔ جہاں پانی کے گڑھے تھے، وہاں تالاب بن گئے؛ جہاں تالاب تھے، وہاں جھیلیں۔ اس شہر کی وہ تنگ گلیوں میں لوگ تیر کر گزر رہے تھے۔ لیاری ندی، جو اپنے اندر ایک معمولی نالے کی بھی سکت رکھتی معلوم نہیں ہوتی تھی، اب بڑھ کر ایک تیز و تند دریا بن گئی تھی اور کنارے کی بستیوں کے لیے ایک بہت بڑا خطرہ۔

یہ بارشیں ختم ہونے کے بعد دوسرا دن تھا۔ میں کوئی دو بجے غریب نواز ہوٹل میں ڈبل روٹیاں بنانے والوں کی انجمن کی غیر معمولی میٹنگ کی صدارت کر رہا تھا۔ ہمارے علاوہ غریب نواز ہوٹل میں اس وقت کئی اور مشہور اور سربرآوردہ ہستیاں موجود تھیں اور چائے نوشی میں اپنے غموں اور اپنی ناکامیوں کا مداوا ڈھونڈ رہی تھیں۔ مسٹر ایم اے چھوکری تھے، ادب پرور، معطل شدہ فلم ایڈیٹر، اب گمنام، فراموش کردہ اور کچھ بوسیدہ سا۔ وہ دنیا سے اس قدر بیزار ہو چکا تھا کہ عرصے سے اس نے اپنے مذاقوں پر خود بھی ہنسنا چھوڑ دیا تھا۔ اس کی زندگی کا اب ایک اصول تھا — غریب نواز ہوٹل میں بیشتر آنے والوں کا یہی اصول تھا — کہ چائے کے دام بھی اپنی جیب سے نہ دیے جائیں۔ شیخ فضل علی دہلوی، منشی فاضل، کئی جاسوسی، سنسنی خیز، راتوں کی نیندیں حرام کرنے والے ناولوں کا مصنف، جس کے ناولوں نے کئی اسکول کے لڑکوں کو جاسوس اور دلیر عاشق بنانے میں اہم حصہ لیا تھا۔ وہ اصلی زندگی میں نہایت دھیما، بزدل شخص تھا، ہمیشہ پیچھے مڑ مڑ کر دیکھنے کا عادی۔ اس کے قرض خواہ چاکیواڑہ میں جگہ جگہ موجود تھے۔ ان میں ایک میں بھی تھا۔ اس وجہ سے اس کی زندگی از خود ایک جاسوسی ناول بن گئی تھی۔ حکیم شاہسوار خان، عامل کامل، طبیب امراض روحانی و جسمانی بھی وہاں بیٹھا تھا۔ حکیم اللہ لوک سنیاسی کے اس ہونہار شاگرد کی باتوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ سال کے اندر اندر پاکستان پر فقیروں اور قطبوں کی حکومت ہو جائے گی، جس کے فوراً بعد بعض عملوں کے زور

سے ہندوستان والے خود بخود جھک جائیں گے اور جواہر لال نہرو ان فقیروں اور قطبوں سے درخواست کریں گے کہ وہ بھارت پر راج کریں۔ اس کے تین سال بعد سارا بھارت مسلمان ہو جائے گا اور کفر کا خاتمہ ہو جائے گا۔ اس سیاسی تدبر و آرائی کے بعد حکیم شاہسوار خان نے یہ بھی واضح کیا کہ وہ دو مہینے کے اندر سب سنگدل محبوبوں کو مجبور عاشقوں کے پاؤں میں ڈالنے کی ایک اسکیم بنا رہا ہے، جس کے بعد اس کے خیال میں چاکیوارہ میں صرف ایک حل طلب معاملہ رہ جائے گا کہ کس طرح ان جنات کو، جو یہاں کے طبقۂ اناث پر شیفتہ ہو چکے ہیں، اس بات کے لیے آمادہ کیا جائے کہ وہ انھیں چھوڑ کر دریائے لیاری کے پار ہجرت کر جائیں۔

ان کے علاوہ چاکیوارہ کی ''جواز ہو'' کا ہونے والا مولف حاجی بجھے ڈیو بھی وہاں تھا۔ وہ دور ایک کونے میں بیٹھا چائے شڑپ رہا تھا اور اس کی داڑھی اس قدر مطمئنانہ نظر آ رہی تھی کہ کوئی بھی اس کے پاس بے دھڑک جا کر اس کی لڑکی کا رشتہ مانگ سکتا تھا۔ اگر کوئی اس وقت اس کے پاس جا کر راقم کا رشتہ مانگتا تو وہ نہایت پدرانہ طریق پر مسکراتا، اس کی داڑھی مسکراتی، وہ اپنی ''جواز ہو'' کی اسکیم اور چالیس روپے ہدیے کا ذکر کرتا اور جب رشتہ مانگنے والا اس کی چائے اور کیکوں کے دام دے چکتا تو وہ اٹھ کر سونے کے لیے چلا جاتا۔ دوسری صبح وہ اس کو بھول چکا ہوتا۔ یہ حاجی بجھے ڈیو تھا — بزعم خود چاکیوارہ کا نمبر ون شہری۔

یک لخت میں نے سامنے کھلے دروازے میں سے دیکھا کہ کوئی شخص سڑک کے عین وسط میں سیاہ گاؤن پہنے، چشمہ لگائے، اسٹیتھو اسکوپ گلے میں ڈالے اپنے دونوں بازو اوپر ہوا میں اٹھائے بگٹٹ بھاگ رہا ہے۔

شیخ فضل علی ڈگموری ناولسٹ نے کہا: ''ڈاکٹر غریب محمد معلوم ہوتا ہے۔''

یقیناً ڈاکٹر غریب محمد ہی تھا۔ اس قدر تیز بھاگے جانا اور ایسی ہیئت کذائی میں! آخر بات کیا تھی؟

حکیم شاہسوار خان ایک جلالی لے میں بولے: ''اس پر جن سوار ہو گیا ہے۔''

''میرے خیال میں دماغ چل گیا ہے۔'' میرے ڈبل روٹیاں بنانے والے ایک ساتھی نے رائے ظاہر کی، جو خود چند مہینے پہلے اس حد تک پاگل ہو گیا تھا کہ جی پوسٹ آفس کے پاس ایک درخت کی ٹہنیوں پر چڑھ گیا تھا اور ہر گذرنے والے کو بتاتا تھا کہ وہ اپنے آشیانے میں آرام کر رہا ہے۔

شیخ فضل علی بولا: ''ڈاکٹر اس سے زیادہ پاگل نہیں ہو سکتا جتنا کہ وہ ہے۔''

ہم سب نے اس فقرے کی گہرائی اور اس کے مزاح کو بے حد سراہا۔ ایکٹر ایم اے چکوری نے محسوس کیا کہ اسے بھی کچھ کہنا چاہیے۔ ''معلوم ہوتا ہے ڈاکٹر غریب محمد کسی مریض کو دیکھنے جا رہا

ہے۔ جلدی میں اس لیے ہے کہ کہیں عزرائیل اس کا شکار اس سے پہلے ہی نہ چھین لے جائے۔"

یہ مذاق ہمیں کچھ اچھا معلوم نہ ہوا کیونکہ ہم اسے چھدری داڑھی والے کو ابھی چاکیواڑہ کے حقوق شہریت نہیں دے گئے تھے۔ وہ ایک بیرونی آدمی، مسافر تھا اور بیرونی آدمیوں کو ہمیں شہریوں کا مذاق اڑانے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔ اس کا یہ فقرہ ہمارے بہترین سائنٹسٹ پر ایک اوچھا حملہ تھا۔

چھدری داڑھی والا آدمی جانے لگا تھا کہ دفعتاً میرے پاس آیا۔ اس نے پوچھا: "یہ آدمی کون ہوتا ہے؟"

"ڈاکٹر غریب محمد — اپنے ہونے والے داماد کو نہیں پہچانتے!"

"ڈاکٹر غریب محمد کون؟" میرا دماغ چکرا رہا ہے۔ آج مجھے الفت نہیں ہے۔ تمہارے پاس ایک روپیہ سوا دے چرا کے لائے ہو؟" اور پھر یکلخت اس نے میری گردن کے گرد اپنی باہیں حمائل کردیں اور چلانے لگا۔ "اس شخص نے مجھ سے ایک روپیہ سوا دے چرا کے لیا تھا۔ میں دو مہینے سے اس کی تلاش میں ہوں۔"

میں نے حالات کو قابو سے نکلتے دیکھ کر اسے دھکا دیا اور دوڑ کر ڈاکٹروں کو جالیا اور چند قدم تک پہنچ گیا۔ وہاں جو "اللہ اکبر" کا نعرہ لگا، میں نے دیکھا کہ ہر آدمی خوف سے ہانپ رہا تھا۔ ایک گدھا گاڑی پر صاف ہانپ رہا تھا۔ اپنے تعاقب کرنے والوں کو دور پیچھے چھوڑ دیا۔ ڈاکٹر غریب محمد سے آگے آگے بے تحاشا اس طرح بھاگ رہا تھا جیسے اس کے سب پچھلے مریضوں کی روحیں اس کے تعاقب میں ہیں۔

میں چلایا: "ڈاکٹر، ڈاکٹر!"

اس نے بھاگتے ہوئے پیچھے مڑ کر مجھے آواز دی: "آپ امیر کی دکان پر جاکر میز کے پاس کے نیچے جاکر دیکھو، تمھیں سب کچھ معلوم ہوجائے گا۔" اس نے اپنی رفتار اور زیادہ تیز کردی۔ وحشت اور دیوانگی نے اس کے چہرے کو اس قدر مسخ کر رکھا تھا کہ اس کو پہچاننا مشکل ہو رہا تھا۔ مجھے یقین ہوگیا کہ اس کے سامنے کوئی خطرناک ارادہ ہے۔ اب ڈاکٹر پرامینیڈ پر تھا۔ پرامینیڈ دریائے لیاری کے کنارے پر ایک پختہ بند ہے۔ یہاں سے لیاری میں نیچے اپلے تھاپتی ہوئی عورتیں اور کیچڑ میں لتی ہوئی بھینسیں ایک دلکش منظر پیش کرتی ہیں۔ سنہری کیچڑ اور بھینسوں کے پیچھے غروب آفتاب بے حد حسین ہوتا ہے۔ چاکیواڑہ کے باشندے اکثر پرامینیڈ پر غروب آفتاب کا حسین منظر دیکھنے کے لیے آتے ہیں۔ لیکن اس وقت لیاری واقعی ایک دریا تھا۔ میرے سامنے پانی ہی پانی تھا — متلاطم پتھروں کے اوپر دوڑتا ہوا، کف آلود، بپھرا ہوا پانی۔ ڈاکٹر غریب محمد پرامینیڈ کی منڈیر پر

چڑھ گیا۔ شام کے مٹتے ہوئے گلاب جیسے پس منظر پر ایک سلہوٹ، اکیلی عجیب و غریب تصویر۔ ڈاکٹر نے بازو اٹھائے ہوئے تھے۔ میں نے اس کو آوازیں دیں۔ اس نے ایک بار زور سے "یا علی" کا نعرہ لگایا اور میری آنکھوں کے سامنے سے غائب ہو گیا۔

ڈاکٹر غریب محمد نے دریائے لیاری میں چھلانگ لگا دی تھی۔ یہ اس عظیم سائنسدان کا انجام تھا۔ لیکن اس انجام کا ذمے دار کون تھا — اس کا آلہ مقیاس المحبت؟ راقیہ؟ اس کی اپنی بڑھتی ہوئی دیوانگی؟ بہر حال میں جانتا تھا کہ پاکستان ایک ایسے موجد کی قابلیتوں اور دیسرچ سے محروم ہو گیا ہے جس کی نظیر یہ صدی شاید ہی پیش کر سکے۔

۵

ڈاکٹر کی دکان کے دونوں پٹ کھلے تھے۔ اندر کوئی نہ تھا اور ایسا لگتا تھا جیسے وہ ڈسپنسری میں کسی کام سے گیا ہے اور ایک منٹ میں آجائے گا۔ میں جانتا تھا کہ وہ اب کبھی نہ آئے گا — کبھی نہیں۔ میں نے میز پر سے کپڑا سرکایا۔ ایک میرے نام کا بند اور سربمہر لفافہ تھا جس کے اوپر مقیاس المحبت رکھا تھا۔ مقیاس المحبت کی سوئی ۹ — پر تھی!

میں نے لفافہ کھولا۔ خط کا مضمون یہ تھا:

"میں ڈاکٹر غریب محمد، مقیاس المحبت کا اصلی موجد (صرف وہ تعویذ جو اس آلے میں بند ہیں، حکیم اللہ توکل سنیاسی کے ہیں) اب اپنی عمر کے سینتیسویں سال میں اپنی بیکار زندگی کو ختم کرنے کے لیے جا رہا ہوں۔ دریائے لیاری کا پانی بارشوں کی وجہ سے چڑھا ہوا ہے اور خودکشی کرنے کا ایسا نادر موقع چاکیواڑہ کے باشندوں کی زندگی میں روز روز نہیں آیا کرتا۔ آپ پوچھیں گے کہ میں ایک کامیاب ڈاکٹر، کئی عجیب و غریب ایجادوں کا موجد، مقیاس المحبت جیسی حیران کن چیز کا ایجاد کرنے والا، کیوں عزت اور دنیاوی شہرت کو ٹھکرا کر اپنی زندگی سے ہاتھ دھونا چاہتا ہوں۔ اس کی وجہ ناکامی محبت ہے۔ آج وہ عورت جس کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ اسے مجھ سے بے اندازہ محبت ہے، میرے پاس آئی۔ میں نے اس وقت جب وہ اپنے مدھر ہونٹ میرے ہونٹوں پر رکھنے کے لیے بڑھا رہی تھی، مقیاس المحبت سے اس کے درجۂ محبت کو ناپا۔ افسوس، اس کی محبت جھوٹی تھی، اس کے عہد و پیمان جھوٹے، اس کی مدھر آنکھوں کا نشہ جھوٹا تھا۔ مقیاس المحبت پر سوئی کی ریڈنگ ۹۔ تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ اس کی محبت ظاہری تھی اور حقیقت میں اسے مجھ سے نفرت تھی۔

"آپ اتفاق کریں گے کہ اب میرے لیے اس دنیا میں رہنا بے سود ہے۔

"میں اپنی یہ دکان، جو چاکیواڑہ کا بہترین پرائیویٹ مطب ہے، اپنے دوست اسپ کے

حوالے کرتا ہوں۔ میری اولاد نرینہ کوئی نہیں (میں نے شادی نہیں کی اور یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا)، نہ میرے کوئی ایسے رشتے دار ہیں جو میری زندگی میں اپنے آپ کو میرے رشتے دار کہتے ہوں۔ اسپ میرا بہترین دوست ہے۔ اس مطب کے کئی تیر بہدف نسخوں کی تیاری کے لیے اس نے اپنی جان تک لڑادی تھی اور عرصے تک مثلاً بلبلوں کی تلاش میں مجنوں کی طرح دشت وصحرا میں مارا مارا پھرتا رہا تھا۔ مجھے امید ہے کہ اسپ ڈاکٹری کے پیشے کو ڈبل روٹیاں بنانے کے پیشے سے زیادہ منفعت بخش اور سہل پائے گا۔

''میں اپنی ایجاد مقیاس المحبت بھی اس کو دیتا ہوں اور ساتھ ہی یہ تنبیہ کرتا ہوں کہ اس کو ہرگز ہرگز استعمال نہ کرے اور نہ اس کو عام کرے۔ اس کے استعمال کے نتائج انتہائی طور پر خطرناک ہوسکتے ہیں، جس طرح خود میرے کیس میں۔ یقیناً اس سے دنیا کو کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ ہاں اگر میں زندہ رہتا تو میرا ارادہ تھا کہ اس آلے میں ایسی اصلاح کی جائے کہ بعض عملوں سے نفرت کو محبت میں تبدیل کیا جاسکے۔ مگر یہ خداوند تعالیٰ جل شانہٗ کو منظور نہیں تھا۔ اب میں دریائے لیاری کی طرف روانہ ہوتا ہوں کیونکہ مجھے ڈر ہے کہ بارش تھم جانے کی وجہ سے پانی اتر جائے گا۔''

۲

مقیاس المحبت میرے پاس ہے، اور ڈاکٹر کی وصیت بھی۔ اگرچہ اس کی دکان وحکومت نے مرحوم کی خواہش کے خلاف میرے نام الاٹ کرنے سے انکار کردیا ہے لیکن میں مرحوم ڈاکٹر کی وصیت پر عمل کروں گا۔ مقیاس المحبت کبھی مارکیٹ میں نہیں آئے گا۔ میں بچا کیواڑہ میں خصوصاً اور ساری دنیا میں عموماً، مایوسی اور غم نہیں پھیلانا چاہتا۔ اگر نوجوان عاشق چند سال ایک رنگین دھوکے اور فریب میں کاٹ دینا چاہتے ہیں تو میں ان کی زندگیوں میں شک وشبہ کیوں پیدا کروں؟ ان کو اپنی خود فریبی کی دنیا میں مست ہی رہنے دینا چاہیے۔

میرے پاس مقیاس المحبت ہے لیکن میں ایک نہایت ناخوش انسان ہوں۔ آج پھر میں نے اس کو کلائی پر باندھا اور مختلف اشیا کا درجہ محبت ناپا۔ نتیجہ پہلے کی طرح مایوس کن تھا:

اونٹ: +۴

گھڑا سر پر رکھے ایک عورت: -۳

بغیر گھڑے کے ایک عورت: -۳

نتیجہ پہلے سے بھی بدتر ہے۔ عورتوں کا صفر اب -۳ ہوگیا ہے۔ اونٹ کی محبت اسی طرح بدستور پائیدار ہے۔ آئندہ سال کی بارشوں میں شاید میں بھی...

سیٹھ تنواڑی کی تباہی

۱

سیٹھ تنواڑی کا میں پورا نام نہیں جانتا اور نہ ہی مجھے اسے جاننے کی کوئی زیادہ خواہش ہے۔ وہ کراچی کے ان میمن جواڑی شاہزادوں میں سے ہے جو لاکھوں کے پھیر میں رہتے ہیں اور جن کی بدولت اسٹاک ایکسچینج کے نرخ گھٹتے بڑھتے رہتے ہیں۔ مالیات کی دنیا ایسے ہی لوگوں کے دم قدم سے سرسبز ہے اور ان پر وہ جس قدر ناز کرے کم ہے۔ روحانی علم میں ضرور کوئی نہ کوئی چیز ہوگی، ورنہ تنواڑی اور اس کے مالی معاملات پر اتنی حیرت انگیز تباہی کیونکر آتی، یہ غور طلب مسئلہ ہے۔ اس کی سزا اس کے جرم کی نسبت سے بہت سخت تھی (اگرچہ جہاں تک میرا تعلق ہے، میں اسے قطعی معاف کر چکا ہوں)۔

ہر کوئی جانتا ہے کہ ارواح جب کسی شخص کے در پے ہو جائیں تو پھر آسانی سے پیچھا نہیں چھوڑتیں اور کسی کی نہیں سنتیں، خواہ ان کی کتنی ہی منت کیوں نہ کی جائے۔ میں اس معاملے میں، جیسا کہ آپ پر واضح ہو جائے گا، سراسر بے قصور ہوں۔ جبکہ جو کچھ مجھ سے ہو سکا ہے میں نے کیا ہے۔ دو مہینے پہلے میں سیٹھ تنواڑی کی شکل تک سے ناواقف تھا۔ اسے دیکھا تو غالباً ہوگا لیکن چونکہ اس حلیے اور وضع کے بہت سے آدمی کراچی کے اس حصے میں بستے ہیں، اس لیے یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ تنواڑی ہی کو دیکھا ہوگا۔ وہ بھلا مجھ جیسے معمولی بے حیثیت حکیم کی زندگی میں کیسے آ سکتا تھا!

بات یہ ہے کہ چاکیوارہ کے مشہور ڈاکٹر غریب محمد مرحوم و مغفور دریائے لیاری میں چھلانگ لگانے سے پیشتر اپنی دکان پر ایک بند لفافے میں اپنی وصیت چھوڑ گئے تھے۔ مرحوم کو وصیت نامہ لکھتے وقت میری بعض گذشتہ خدمات یاد آئیں اور وہ اپنی دکان بمعہ اس کے کل سامان بوتلوں وغیرہ کے مجھ محمد دین اسپ کے نام کر گئے۔ ان کا وصیت نامہ میرے پاس اب تک بطور استاد کے تبرک

کے محفوظ ہے۔ مرحوم کا اپنا کوئی بیوی بچہ نہ تھا اور وہ دنیوی آلائشوں سے آزاد تھے۔ اپنے آخری دنوں میں مجھ سے فرزند کی طرح شفقت کرنے لگے تھے، بلکہ اپنے کئی سائنسی، روحانی آلات کی ایجاد میں میرا مشورہ بھی لیتے۔ الغرض، بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں۔

مرحوم کی خواہشات کے عین مطابق میں نے ان کی دکان پر قبضہ جما لیا اور ڈاکٹری شروع کر دی۔ یہ میرے لیے بالکل نیا کام تھا، لیکن میرا تجربہ ہے کہ آدمی جس کام میں بھی ہاتھ ڈالے، کچھ مدت کے بعد اس میں شد بد ہو جاتی ہے۔ اول تو ڈاکٹر مرحوم کی صحبت میں اٹھنے بیٹھنے سے مجھ کو پہلے ہی سے کئی ایک معجونوں اور ان کی تاثیروں سے واقفیت تھی اور کئی ایک نسخوں کی ترتیب میں استعمال ہونے والے پرندے اور مینڈک وغیرہ میرے توسط سے دستیاب ہوتے تھے؛ دوم، مجھے سب سے بالائی تختے پر رکھے مرتبانوں کے پیچھے ڈاکٹر غریب محمد کی بیاض کے چند کاغذات مل گئے۔ یہ بیاض ایک مدت سے ڈاکٹر مرحوم کے زیر تصنیف تھی اور مکمل ہو جانے پر ان کا ارادہ اسے چھپوانے کا بھی تھا۔ میں نے اسے دیکھا تو ڈاکٹری ادویہ کے نسخے اس میں درج پائے۔ یہ بیاض گویا مرحوم کے عالی قدر دماغ کا نچوڑ تھی۔ مجھ کو اس سے اپنی ڈاکٹری میں گراں بہا فیض حاصل ہوا۔

میں نے اپنی ڈاکٹری کو چمکانے کی خاطر چند اور بھی جتن کیے۔ مرحوم زندہ ہوتے تو ان کو بہ نظر استحسان دیکھتے۔ دکان پر ڈاکٹر غریب محمد کا بورڈ میں نے جوں کا توں رہنے دیا۔ صرف اتنا کیا کہ مرحوم کا لفظ ان کے نام کے آگے بڑھوا دیا اور نیچے ان الفاظ کا اضافہ کرا دیا: "جانشین خاص: ڈاکٹر محمد دین اسپ۔"

یار احباب نے ابتدا میں خوب مذاق اڑایا کہ تو ڈاکٹر کیونکر بن گیا، مگر تھوڑی ہی مدت میں ہر کوئی مجھے ڈاکٹر اسپ کہہ کر بلانے لگا اور ڈاکٹر کا لفظ میرے نام کے ساتھ جڑ گیا۔ میں نے مرحوم کی تقلید میں ایک چھوٹی سی نوکدار داڑھی بھی بڑھا لی۔ مرحوم خودکشی کے لیے جانے سے پہلے اپنے چشمے میز کی دراز میں بھول گئے تھے (یا عمداً چھوڑ گئے تھے)۔ میں نے کمانیوں کی مرمت کرا کے انھیں پہننا شروع کیا۔ عجیب بات ہے کہ وہ بالکل میری بینائی یا کوتاہ نظری کے مطابق نکلے۔ کچھ عرصے کے بعد ان کے بغیر مجھے کچھ بجھائی نہ دیتا تھا۔ انھی دنوں میں نے حاجی بھلے ڈینو کی دختر نیک اختر سے نکاح پڑھوا لیا، اگرچہ بوڑھا حاجی بڑی مشکل سے مانا۔ اس طرح میں نے نہ صرف اپنا گھر آباد کیا بلکہ ڈاکٹر مرحوم کی دیرینہ حسرت کی تکمیل کی۔ اس امر سے بھی ان کی روح پاک کو یقیناً راحت اور آسودگی حاصل ہوئی ہوگی۔

ڈاکٹر کا دست غیبی میری مدد پر تھا یا راقبہ اپنی خوش بختی ساتھ لے کر آئی تھی۔ میرے کام کو

بڑا فروغ ہوا۔ سارا سارا دن مجھے سر کھجانے کی فرصت نہ ملتی۔ میرے نسخے تیر بہدف ثابت ہوتے، جیسا کہ خدا نے میرے ہاتھ میں شفا دے دی ہو۔ میں جانتا تھا کہ اس میں میری اپنی لیاقت اور کارکردگی کو زیادہ دخل نہیں؛ یہ سب ڈاکٹر غریب محمد کی برکت کے طفیل ہے۔ ایک دو بار ڈاکٹر مرحوم مجھے خواب میں ملے اور انھوں نے مجھے مریضوں کے لیے نسخوں کی ترکیب سمجھائی جو میرے زیرِ علاج تھے اور جن کے امراض کی تشخیص میں اچھی طرح نہ کر پایا تھا۔ ایک بار انھوں نے کہا کہ میرا ٹائم پیس حاجی بھلے ڈینو کے پاس ہے، اسے لے آؤ۔ ٹائم پیس واقعی میرے خسر کے پاس تھا مگر کام نہیں کرتا تھا۔ اس نے مجھے چار روپے میں دے دیا اور وہ جبھی میں نے بطور تبرک دکان میں لا رکھا۔

ایک دن میں بیٹھا بیاض کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ ایک صفحے پر ایک عجیب و غریب آلے کا نقشہ کھنچا دیکھا۔ اس کے نیچے لکھا تھا: ''روحوں کو بلانے کا آلہ''۔ دوسرے صفحے پر آلے کے ترکیبی اجزا کی تفصیل تھی، جس کے نیچے ڈاکٹر صاحب نے استعمال کرنے والوں کو آگاہ کیا تھا کہ یہ آلہ ابھی تجرباتی منزل میں ہے اور جب تک روحوں کو واپس بھیجنے کا کوئی طریقہ دریافت نہ ہو جائے، اس کا استعمال پرخطر ہوگا۔ میں نے چند دنوں میں اس آلے کو مکمل کر لیا۔ یہ پلینچٹ کی قسم کا ایک آلہ تھا جس میں ایک خانے میں چند خاص تعویذات اور ڈیڑھ ماشہ کافور رکھے گئے تھے اور چوٹی کے اوپر ایک حجامت کرنے کا چھوٹا شیشہ تھا۔ میں نے اس کو بنا کر رکھ لیا اور بلائی ہوئی روح کو واپس لوٹانے کی کل کے سلسلے میں عامل کامل حکیم اللہ لوک سنیاسی سے مشورہ لینے کا فیصلہ کیا۔ ڈاکٹر مرحوم کی دوسری ایجادات کے نتائج کو جانتے ہوئے میرا ارادہ قطعی طور پر اسے اس وقت تک استعمال کرنے کا نہ تھا جب تک کہ اس کا مذکورہ نقص دور نہ ہو جاتا۔

ایک مصرع ہے:

بھلا گردشِ فلک کی چین دیتی ہے کسے انشا

فضل علی ناولسٹ اسے اکثر گنگناتا رہتا ہے۔ ایک صبح میں دکان پر آ کر بیٹھا ہی تھا کہ دو آدمی اندر داخل ہوئے۔ ایک ان میں سے زیادہ معمر تھا۔ یہ سیاہ گول ٹوپی اور کرتے پاجامے میں، ایک سخت چمڑے کے پھولے ہوئے چہرے کا فربہ اندام شخص تھا۔ دوسرا ایک زرد رو، پچکے ہوئے گالوں والا نوجوان تھا۔ ننگے سر اور خرگوش سے مشابہ۔ دونوں پان چبا رہے تھے۔ انھوں نے مجھ سے بات نہ کی اور دکان میں اس انداز سے پھرنے لگے جیسا کہ یہ ان کی ملکیت ہو۔

یہ شخص تواڑی تھا اور وہ دبلا نوجوان اس کا بیٹا، اگرچہ اس وقت میں یہ نہیں جانتا تھا۔ میں حیران ہوا کہ کیا معاملہ ہے اور یہ لوگ دکان کی چھت اور دیواروں کو اس دلچسپی سے کیوں دیکھ رہے

ہیں۔ میں پوچھنے ہی لگا تھا کہ بڑا تنوازی میری طرف مڑا۔

"آپ ادھر کب سے بیٹھا ہے؟" اس نے پوچھا۔

میں کہنے لگا، "اس سے مطلب کہ میں کب سے بیٹھا ہوں؟"

"یہ دکان ہم نے الاٹ کرا لیا ہے۔ آپ کو کل تک اسے خالی کرنا پڑے گا،" اس نے کہا۔

"خالی کیا مطلب؟ سمجھے، یہ میری دکان ہے۔"

دونوں کمرہ وہ اور نا خوشگوار طریق پر ہنسا۔ "تمھاری دکان ہے! اس کاغذ نے تمھارے نام اس کا پٹہ لکھ دیا ہے کیا؟ تمھارا دکان یہ کیسے ہو گیا؟ یہ ایویکوئی پراپرٹی ہے۔ کسٹوڈین نے اسے ہم کو الاٹ کیا ہے۔ ہم نے اس کو پچھلا بارہ مہینے کا کرایہ دیا ہے۔ کل آپ چپ چاپ اس کو خالی کر دے، سمجھا؟ یہ اپنا بوتل ووتل ادھر سے لے جاؤ۔ ہم جھگڑا نہیں کرنا چاہتا۔"

میں نے تنوازی کی ایسی تیسی کی اور باپ بیٹے دکان سے باہر نکلنے کے لیے کہا۔

تنوازی نے دھمکی دی، "ہم پولیس کو لے کر آئے گا۔ ہمارے پاس آرڈر ہے۔" اس نے ایک کاغذ کا پرزہ میرے سامنے لہرایا۔

ان کے جانے کے بعد میں نے ٹھنڈے دل سے غور کیا تو معاملہ ٹیڑھا معلوم ہوا۔ یہ سچ ہے کہ ڈاکٹر غریب محمد مرحوم نے یہ دکان اپنی وصیت میں مجھے دی تھی، لیکن یہ بھی سچ تھا کہ یہ ڈاکٹر بیچارے کی ذاتی دکان نہ تھی۔ یہ بقول تنوازی کے "ایویکوئی" (evacuee) پراپرٹی تھی، جس پر ڈاکٹر نے کسی طرح قبضہ جما رکھا تھا۔ مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ آیا یہ دکان ڈاکٹر کے نام الاٹ شدہ تھی اور آیا کبھی اس نے کسٹوڈین کو اس کا کرایہ بھی چکایا تھا۔ ایک اور سوال میرے ذہن میں گزرا۔ کیا کوئی الاٹ شدہ جائیداد وصیت نامے میں کسی اور کو چھوڑ سکتا ہے، اور میرے قبضے کی قانونی حیثیت کیا ہے؟ اگر میں ڈاکٹر کے وصیت کے کاغذ کو کچہری میں اپنی ملکیت کا حق ثابت کرنے کے لیے لے جاؤں تو کیا کوئی اسے دیکھے گا؟

میں ان مسئلوں کو سلجھانے اور مشورے کے لیے شیخ فضل علی ناولسٹ کے پاس گیا۔ ایک مشہور جاسوسی ناولوں کے مصنف ہونے کی وجہ سے میرا خیال تھا کہ وہ کچھ کچھ قانون دان بھی ہو گا لیکن اس سے مجھے خاک بھی مدد نہ ملی۔ گھر پہنچ کر میں نے راقیہ اور اپنے خسر بھلے ڈینو سے اس کا ذکر کیا۔ بھلے ڈینو نے کہا کہ جب تک وہ چاکیواڑہ میں بیٹھا ہے کوئی مجھ سے دکان نہیں لے سکتا، اور کل وہ خان بہادر کھوکھرو سے مل کر کسٹوڈین سے اسے آرڈر لے دے گا۔

دوسرے دن بھلے ڈینو نے شدید گنٹھیا میں مبتلا ہونے کی بنا پر کھوکھرو سے ملاقات کو ملتوی

کر دیا۔ میں حسبِ معمول دکان پر پہنچا اور مریضوں کو دیکھنے لگا، اگرچہ دل کو دھڑکا لگا تھا اور ہر دس پندرہ منٹ کے بعد نظر بازار میں دوڑاتا تھا۔ تنوازی ٹلنے والی چیز نہ تھا اور تھوڑی دیر میں وہ اپنے قول کے مطابق فرشتۂ اجل کی طرح آ موجود ہوا۔ ساتھ میں دو پولیس کے سپاہی تھے اور چار پانچ دوسرے آدمی بھی۔ وہ کہتے تھے دکان خالی کرو۔ کافی بھیڑ ہوگئی۔ دراصل ایک غریب آدمی کی کوئی زندگی نہیں ہوتی۔ وہ میرا سامان اٹھا اٹھا کر باہر گلی میں پھینکنے لگے۔ میں غصے میں بھی تھا اور ادھر اپنی دکان کے چھننے پر آنسو بھی نکلے پڑتے تھے۔ اسی مخمصے میں میری نظر روحوں کے بلانے کے آلے پر پڑ گئی جو ایک کونے میں رکھا تھا۔ میں نے بیاض کی ہدایات کے مطابق اس آلے کو اٹھایا اور آواز دی کہ ڈاکٹر غریب محمد، میری مدد کرو، تمھاری دکان چھنی جاتی ہے۔ یہ الفاظ کہے ہی تھے کہ بجلی کا ایک کرنٹ سا میرے ہاتھوں میں سے گذرا اور آلے کے آئینے میں ایک نوکدار داڑھی والی شبیہ نمودار ہوئی جو ڈاکٹر غریب محمد سے ملتی جلتی تھی۔ ویسے وہ میری شکل سے بھی غالباً کافی ملتی تھی۔ میں یہ یقین سے نہیں کہہ سکتا، کہ آئینہ، جو حجامت کے آئینوں کی طرح قبضوں پر ایک لکڑی کے فریم میں جڑا ہوا تھا، اس وقت پھر گیا اور وہ شکل مٹ گئی۔ مجھ پر اس شبیہ کا اثر قدرے جھرجھری پیدا کرنے والا اور ڈراؤنا سا ہوا اور میں اس طرح محسوس کرنے لگا کہ جیسے ڈاکٹر غریب محمد عالمِ بالا سے آ گیا ہے اور وہ دکان میں چل پھر رہا ہے۔ ویسے ڈاکٹر جیسے دانا آدمی سے یہ بعید بھی نہیں تھا۔ اسی وقت ایک سپاہی کا قدم جو میز کو کھینچ کر دکان سے باہر نکال رہا تھا، دکان کی سیڑھی پر قدرے بے ہنگم پڑا اور وہ چاروں شانے چت ہو کر فٹ پاتھ پر جا پڑا جیسے کسی نے اسے اڑنگے سے گرایا ہو۔ اس وقت تو مجھے یقین ہو گیا کہ ڈاکٹر غریب محمد پہنچ گیا ہے۔

وہ اسی وقت آیا یا بعد میں، جب میں نے وہ دکان خالی کر دی، اس کے متعلق میں حلفاً کچھ نہیں کہہ سکتا۔ ارواح کی آمد و رفت کے اوقات بتانے میں آدمی کو محتاط ہونا ضروری ہے۔ بات یہ ہے کہ اگر ڈاکٹر اسی وقت آ گیا تھا تو اس نے سپاہی کو اڑنگے سے گرانے کے بعد اس کارروائی میں مزید کوئی حصہ نہ لیا۔

سپاہیوں نے جو سیٹھ تنوازی کے کام کو اس گرم جوشی سے سرانجام دے رہے تھے جیسے وہ اس کے سپاہی ہوں، میرا کل سامان جب گلی میں رکھ دیا تو تنوازی نے مجھ سے کہا، "بابا، قانون کا بات ہے۔ ہم تمھارا نقصان نہیں چاہتا۔ اپنا ہر شے اچھی طرح دیکھ بھال لو۔" میرے دل میں تو آئی کہ اس کی اس ہمدردی پر اس کی تھوتھنی پر ایک گھونسا مار کر اسے توڑ دوں، مگر پھر جیل اور راقب اور ہونے والے بچے کے خیال سے چپکا ہو رہا۔

روتے ہوئے دل سے میں نے ڈاکٹر کی بیاض، اسٹیتھوسکوپ اور ادھر پڑی ہوئی دوسری چیزوں کو سنبھالا۔ ایک دیوار پر ڈاکٹر غریب محمد مرحوم اور میرا فوٹو لگا تھا جو ہم نے چاکیواڑہ میں اپنے ایک دوست سے کھنچوایا تھا، وہ بھی میں نے اتارا۔

"اور بابا، یہ بھی لے جاؤ۔" تواری نے دروازے کے باہر لگے بورڈ کی طرف اشارہ کیا۔

میں نے بورڈ وہیں رہنے دیا اور ایک طاق پر رکھ دیا اور کہا میں یہ آکر پھر لے جاؤں گا۔ تواری نے کہا کہ کوئی فکر کی بات نہیں، ہم کسی کا مال نہیں رکھتے۔ کل، پرسوں، جب آؤ لے جاؤ۔ واقعی یہ شور و غوغا کس کو آ پہنچی تھی۔ ہم نے ایک ردی پر اپنی کل متاع رکھی تھی۔ تواری انہیں اس کا کرایہ دینے کو تیار تھا لیکن میں نے انکار کر دیا۔ وہاں سے جاتے ہوئے میں نے سیٹھ تواری سے کہا،

"یاد رکھنا سیٹھ، یہ دکان تم کو مہنگی پڑے گی۔"

"ہم کو افسوس ہے حکیم صاحب، یہ قانون کا معاملہ ہے۔"

روتے ہوئے دل سے ہم اپنے سامان کے پیچھے پیچھے اپنے مکان کو چل دیے لیکن میرے دل کو ایک گونہ اطمینان تھا کہ میں نے بورڈ وہ دکان پر چھوڑا ہے۔ مگر پہنچ کر جب زیدو کو اس واقعے کا پتہ چلا تو اس نے کہا کہ کاش وہ وہاں پھر سکتا تو بتا دیتا کہ تواری کا باپ کیسے دکان خالی کراتا ہے۔ اسے اس بات کا بڑا افسوس تھا کہ وہ موقعے پر موجود نہ تھا۔ اس کے علاوہ اور طعنوں کے سوا اس نے اور کوئی بات نہ کی اور خان بہادر حکیم رو سے ملاقات کا کوئی ذکر نہ کیا۔

۲

تین چار دن تو میں دکان اور اپنی پریکٹس کے غم میں پیچ و تاب کھاتا رہا اور مجھے زیدو کی طویل بے سروپا کہانیاں سنتا رہا۔ آخر راقب نے صلاح دی کہ کیوں نہ شہر کے دوسرے حکیموں کی طرح فٹ پاتھ پر دکان جما کر دھندا شروع کر دیا جائے۔ یہ صلاح میرے دل کو بھائی اور میں نے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ میں نے ٹرام کی پٹری کے خاتمے پر ایک جگہ کا انتخاب کیا۔ میں یعقوب مکرانی سے، جو چاکیواڑہ کا دادا ہے اور خوانچے والوں، نجومیوں، سرمہ بیچنے والوں کو فٹ پاتھ پر اپنی خوشی کے مطابق جگہیں فروخت کرتا ہے، اس سلسلے میں ملا۔ اس نے دس روپے ماہوار پر فیصلہ کیا اور وعدہ کیا کہ کسی اور ڈاکٹر کو میرے آس پاس دھندا کرنے کی اجازت نہ دے گا۔ یعقوب مکرانی یاروں کا یار اور اپنے قول کا پکا ہے۔

میں نے وہاں اپنا اڈا جما لیا۔ پیچھے دیوار پر اپنا دکان کا بورڈ، جسے میں اتار لایا تھا، میخوں سے جوڑ دیا اور وضاحت کے لیے نیچے دیوار پر لال رنگ سے یہ اطلاع لکھ دی:

مشہور ڈاکٹر محمد دین اسپ جانشین ڈاکٹر غریب محمد مرحوم (کارونیشن اسٹریٹ) نمبر
(۱) والے اب یہاں تشریف لے آئے ہیں تاکہ سب خاص و عام فیض اٹھا سکیں۔
ہر مرض کی ایک خوراک کا ہدیہ دو آنے۔ تشخیص مفت۔

راقیہ اور میں ہر صبح ایک گدھے گاڑی میں (جو راقیہ کے بھائی کی تھی) ادویات کے مرتبان، بوتلیں، معجونوں کے ڈبے، سائن بورڈ اور انسانی پنجر کے چارٹ ایک بڑے صندوق میں رکھ کر یہاں لے آتے۔ راقیہ مجھ کو ادویات وغیرہ جمانے میں مدد دیتی اور پھر گدھے گاڑی میں بیٹھ کر لوٹ جاتی۔

میری بیوی بڑے حوصلے اور حوصلے کی عورت ہے اور وہ سب سے بڑی نعمت ہے جو خدائے عز وجل نے مجھے بخشی ہے۔ ہر شام وہ پھر مجھے لینے آ جاتی کیونکہ میں دکان کو جلدی سمیٹ دیتا اور ہم اپنے صندوق کے ساتھ شام کے دھندلکے میں سرسراتے ہوئے واپس گھر جاتے۔ (دونوں گدھے کافی تیز تھے اور گاڑی کے پہیے ربڑ ٹائر کے تھے۔) اس وقت راقیہ کے ساتھ سفر کرتے ہوئے میری دن کی تکان دھل جاتی اور میں اتنا مسرور ہوتا جتنا کوئی بادشاہ اپنے چار گھوڑوں کی لینڈو گاڑی میں۔ لوٹتے وقت میری پہلی دکان راستے میں پڑتی تھی۔ پہلے پہل تو اسے دیکھ کر میرا تن بدن کھولنے لگتا اور میرے دل میں تواڑی کے خلاف بڑے سے بڑے خیالات آتے، بعد میں اس نقصان اور غم کو قدرے فلسفیانہ نظریے سے دیکھنے لگا۔

اس دکان کے بالمقابل نکڑ پر ایک ایرانی ریستوران ہے، وہی رائل کارونیشن ریستوران، جس کا مالک پرویز علی میرا بڑا دوست ہے۔ پرویز علی پھیلی ہوئی مونچھوں والا، مکھن کی طرح ملائم اور گول مٹول شخص ہے۔ ڈاکٹر غریب محمد مرحوم نے ایک بار اس کا علاج کیا تھا جب وہ درد قولنج میں مبتلا تھا۔ اسے میری دکان چھن جانے کا بڑا رنج تھا اور وہ مجھ سے دلی ہمدردی جتاتا تھا۔ ہم جاتے ہوئے اکثر رائل کارونیشن ریستوران میں سنگل چائے پینے اور پرویز علی سے گپ شپ لڑانے کے لیے رک جاتے۔

گلی کے پار کی دکان کو راقیہ بڑی حسرت سے دیکھتی اور مجھے یقین دلاتی کہ اگر اس کا باپ گنٹھیا سے معذور نہ ہوتا تو یہ دکان مجھ سے کبھی نہ چھنتی۔ ڈاکٹر غریب محمد کے بورڈ کے بجائے اب تواڑی اینڈ کمپنی کا بورڈ دکان پر لٹک رہا تھا۔ پرویز علی نے مجھے بتایا کہ تواڑی خود یہاں صبح کو ایک دفعہ آتا ہے لیکن اس کا لڑکا سارا دن یہاں رہتا ہے۔ ان کا ارادہ اسے مال گودام بنانے کا تھا اور اس غرض سے اس کی توڑ پھوڑ اور مرمت کا کام زوروں سے جاری تھا۔ دکان کے اندر دیواروں پر سفیدی پھروادی گئی تھی اور ایک چگی ڈاڑھی والا نیم گنجا بڑھئی ہمیں ریستوران کے شیشوں میں سے ہمیشہ اپنے کام میں جتا ہوا نظر آتا تھا۔ تواڑی کا لڑکا دکان کے اندر مونڈھے پر بیٹھا کام کی نگرانی کیا

کرتا۔ وہ پان کھاتا اور بیڑی پیتا رہتا۔ بیٹا ایک سوکھا سڑا نوجوان تھا، دبلا پے کا مارا ہوا! اس کے چہرے پر خون کی ایک بوند بھی نہ تھی۔ کئی دفعہ راقبہ کو اور مجھے اس نوجوان پر رحم سا آتا۔ پھر بھی میں غیر معمولی باتوں کا متوقع تھا۔ میں جانتا تھا کہ ڈاکٹر غریب محمد چپکا نہیں رہے گا اور اپنا انتقام ضرور لے گا۔

ایک چمکیلی سہ پہر کو راقبہ اور میں گھر لوٹ رہے تھے۔ راقبہ اس دن مجھے لینے جلدی آ گئی تھی کیونکہ گھر میں کوئی کام تھا جس میں وہ میری مدد چاہتی تھی۔ ہم کارونیشن اسٹریٹ میں مڑے ہی تھے کہ سامنے سے ہم نے تواڑی کے دروازے کو تیزی سے آتے ہوئے دیکھا۔ اس کی پیشانی پر خون کی دھبے دار پٹی بندھی تھی اور چہرہ خوف و دہشت سے غیر انسانی لگتا تھا۔ ہم ڈر گئے۔ کوئی خوفناک واقعہ پیش آیا تھا۔ کبھی کبھی وہ پوری آنکھوں سے پیچھے بھی جھانکتا معلوم ہوتا۔ اس آدمی کی طرح جسے شک ہو کہ اس کا تعاقب کیا جا رہا ہے۔ راقبہ نے گدھوں کی باتیں کھینچ کر گاڑی کو ٹھہرا لیا اور ہم مبہوت اس عجیب سایہ زدہ شخص کو دیکھنے لگے۔ پھر ایک عجیب بات ہوئی۔ وہ ایک چیخ مار کر تیزی سے نکل بھاگا، جھاڑی میں سے ایک خرگوش کی مانند۔ وہ ہمارے پاس سے گذرا، دونوں بازو اٹھا کر ایک گھوڑا گاڑی کو آواز دیتا ہوا جو مین اسٹریٹ میں ٹرام کے پیچھے سے ادھر گذر رہی تھی۔ اسے ڈر تھا کہ اس کے گاڑی تک پہنچنے سے پہلے وہ چیز جو اس کا تعاقب کر رہی تھی، اسے آ لے گی۔ ہم نے اسے گھوڑا گاڑی میں چھلانگتے ہوئے اور مجنونانہ ہاتھ ہلاتے ہوئے دیکھا اور گاڑی اسے لے کر غائب ہو گئی۔

ہر کوئی یہ جانتا ہے کہ جب کوئی میمن یا بوہرہ ٹرام میں چڑھنے کی بجائے ٹیکسی یا گھوڑا گاڑی میں سفر کرتا ہے تو یا تو اسے بے اندازہ جلدی ہوتی ہے یا اس کا دماغ بالکل چل چکا ہوتا ہے۔

راقبہ نے اور میں نے حیرت اور خوف کی نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا اور آگے بڑھے۔ دکان کے سامنے فٹ پاتھ پر پانچ چھ آدمیوں کا مجمع اکٹھا تھا۔ سوائے چکنے اور مونچھیلے پرویز علی کے، باقی سب مزدور طبقے کے افراد تھے۔ چگی ڈاڑھی والا بڑھئی کان میں پنسل اٹکائے، ایک ہاتھ میں رول اور ہتھوڑی پکڑے، ایک خبیث بھتنا سا بنا ہوا بار بار قسمیں کھا رہا تھا۔ اس کے باوجود ڈرا ہوا تھا۔ ہم نے دیکھا کہ ہتھوڑی کے سرے پر تھوڑی سی سرخی ہے۔

"میں نے دو دن ہوئے،" بڑھئی کہہ رہا تھا، "سیٹھ کو کہہ دیا تھا کہ اس جگہ ایک بھوت ہے۔ کل بیسیوں دفعہ میرے اوزار غائب ہوتے رہے اور پھر خود بخود مل جاتے رہے۔ کل میں الماری کے قبضے کو فٹ کرنے کے لیے دو گھنٹے ڈھونڈتا رہا۔ آخر وہ مجھے آری کے نیچے دبکا ہوا ملا حالانکہ میں نے اسے وہاں نہیں رکھا تھا۔"

ایک اور مزدور نے، جس کی سکھ سردار کی طرح الجھی ہوئی ڈاڑھی مونچھیں تھیں اور سینے پر

بہت سے بال تھے، کہا "میں نے کسی سے بات نہیں کی۔ میں نے سوچا کہ میں نے بات کی تو سب مجھے پاگل بنائیں گے۔ پر دیکھا میں نے بھی اس کو ہے۔ میں پرسوں اس کوٹھڑی کے اندر کام کر رہا تھا۔ اس وقت میں اکیلا ہی تھا۔ میرا ساتھی نور محمد روٹی لینے گیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ مشرقی دروازے کے پاس ایک آدمی میری طرف پیٹھ کر کے بیٹھا ہے اور آگ سلگا رہا ہے۔ اس وقت میں نے زیادہ دھیان نہ دیا اور سمجھا کہ کوئی اور مزدور ہوگا۔"

"اس کی داڑھی تھی؟ اس کا حلیہ کیا تھا؟" میں نے پوچھا۔

"یہ تو میں نے نہیں دیکھا۔ اس کی پیٹھ میری طرف تھی۔"

ہم پرویز علی کے ساتھ اس کے ریستوران میں آ گئے اور کہانی جو اس نے سنائی وہ اس قسم کی تھی: تنوارڑی کے لڑکے نے بھوت دیکھا تھا۔ وہ دکان میں بیٹھا بیڑی پی رہا تھا کہ پرلے کونے سے کوئی چیز اس کی طرف بڑھی۔ اس نے چیخ ماری اور بیہوش ہو کر زمین پر گر پڑا۔ بڑھئی جو اس وقت الماری کے تختے ٹھونک رہا تھا، چیخ کی آواز سن کر بڑبڑا اٹھا اور ہتھوڑی اس کے ہاتھ سے چھوٹ کر تنوارڑی کے بیٹے کے سر پر گری۔ زخم زیادہ گہرا نہیں تھا کیونکہ ہتھوڑی ہلکی تھی اور کم بلندی سے گری تھی۔ بڑھئی نے فوراً پٹی باندھی۔ سیٹھ کے بیٹے پر کچھ دیر ہذیان کی کیفیت طاری رہی۔ اس کے بعد منہ پر پانی کے چھینٹے مارے گئے۔ پرویز علی نے فوراً ایک پیالی چائے اپنے ریستوران سے لا کر اسے پلائی (پتہ نہیں وہ پیالی سنگل تھی یا ڈبل)۔ جب اسے ہوش آیا تو اس نے بھاگنا شروع کر دیا جیسے کوئی اسے پکڑنے آتا ہو۔

وہاں سے روانہ ہوتے وقت میرے دل میں ڈاکٹر غریب محمد کے لیے تشکر اور ممنونیت کے جذبات تھے۔ وہ میری امداد کو یقیناً آ پہنچا تھا۔ اگرچہ بھوت کے حلیے پر کوئی روشنی نہ پڑ سکی تھی لیکن مجھے کامل یقین تھا کہ وہ آدمی جو چھوٹے سیٹھ نے دیکھا تھا، یقیناً ڈاکٹر غریب محمد ہی تھا۔

صبح اٹھا تو میں اس تشکر کے احساس کے ساتھ ایک بے اطمینانی اور خوف سے بھی دوچار تھا۔ میرے خیال میں ڈاکٹر غریب محمد کا خود اس دنیا میں آ کر میری مدد کرنا مناسب نہ تھا اور نہ ہی اس کی ضرورت تھی۔ روحوں کو چاہیے کہ جو امداد وہ ہم فانی آدمیوں کی کرنا چاہتی ہیں عالم بالا ہی سے کریں اور خود آنے کی تکلیف نہ فرمائیں۔

میں نے راقیہ سے کہا "میرا خیال ہے ڈاکٹر غریب محمد اس اپنی دکان پر لوٹ آیا ہے۔" یہ میں نے اسے مذاق میں کہا تھا۔ پھر ہم دونوں ہنسے، لیکن ہماری ہنسی پھیکی اور کھوکھلی تھی اور غیر آسودہ بھی!

تین چار دن تک دکان پر کوئی کام نہ ہوا۔ چھوٹا سیٹھ تنوارڑی اس مدت میں غائب رہا۔ مزدور

لوگ سب کام چھوڑ کر بھاگ گئے تھے اور یہ خبر کہ یہ دکان آسیب زدہ ہے، چاکیواڑہ گزٹ میں جلی سرخی کے ساتھ چھپی۔ پرویز علی نے مجھے بتایا کہ بڑا سیٹھ تواری ایک دو بار اس کے ریستوران میں سنگل چائے پینے کے لیے آیا تھا۔ اس کا ارادہ اب اس دکان کو کرائے پر دینے کا ہے۔ تواری پرویز علی سے بھی پوچھ گچھ کرتا رہا کہ اس دکان میں پہلے کون لوگ تھے اور ڈاکٹر غریب محمد کس وضع قطع اور چال چلن کا شخص تھا۔ تواری نے پرویز علی سے یہ بھی کہا کہ وہ آدمی جسے اس کے بیٹے نے گوشے سے برآمد ہوتے دیکھا، متوسط قد کا تھا، اس کی چھوٹی نوکیلی داڑھی تھی اور سر پر لنگی باندھے تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں جراحوں کا نشتر تھا اور وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے بیٹے کی طرف آیا تھا۔ بعد میں اس نے اس کے بیٹے کا پیچھا بھی کیا۔ چھوٹا سیٹھ تواری اب ایک دماغی ہسپتال میں تھا، ایک ماہر نفسیات کے زیر علاج۔

اس واقعے کے چوتھے یا پانچویں دن میری خود سیٹھ تواری سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ وہ اس طرح کہ میں شام کو ادھر سے گھر کے لیے کوئی سودا لے کر گزر رہا تھا اور وہ ٹھیک اس وقت اپنی دکان میں قفل لگا رہا تھا۔

"السلام علیکم سیٹھ!" میں نے کہا۔ "مجھے پہچانا تم نے؟"

اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ "ہاں بابا، پہچانے گا کیسے نہیں۔ یہ دکان آپ کے پاس سے ہم لوگ نے لیا۔ ہم کسی مسلمان بھائی کا دل دکھا کر راضی نہیں ہوتا۔ ہم نے قانونی طور پر اس کو لیا۔ آپ سے ہم کو کوئی دشمنی نہیں۔"

"ہاں بالکل قانونی!" میں نے کہا۔ "وہ پچھلے بارہ مہینے کرائے کی ادائیگی کی رسید جو تم نے حاصل کی اور جس سے یہ ثبوت بہم پہنچا کہ یہ دکان اتنے مہینے تمھارے قبضے میں رہی ہے، اس کو تم قانونی طریقہ سمجھتے ہو؟"

"دیکھو بابا، غصہ نہ کرو۔ ہم تم کو اب پھر یہ دکان دینے کے لیے تیار ہے۔ ہم بھائی بھائی ہیں۔ پگڑی بھی ہم نہیں لے گا۔ صرف بائیس روپیہ ہم کو کرایہ دو۔ بولو، ٹھیک ہے؟"

"وہ اس لیے کہ تم چھوڑ رہے ہو... یہ آسیب زدہ ہے۔"

"آسیب زدہ،" وہ ہنسا۔ "واہ بھئی واہ! یہ سب واہمہ ہے۔ ہم اس بھوت ووت میں یقین نہیں کرتا۔"

اچانک مجھے اس غیبی مدد کے آنے کا خیال آیا۔ میں نے کہا، "سیٹھ، تمھاری دکان میں میری ایک چیز رہ گئی تھی جو میں اس وقت نہ لے جا سکا۔ کیا تم وہ مجھے اب دے سکتے ہو؟"

"کون سی چیز؟" اس کے پھولے ہوئے چہرے پر ایک بڑی عیاری کی کیفیت جھلکی۔

''یہ ایک چھوٹا سا شیشہ ہے جس کے فریم کے نیچے چار چھوٹی ٹانگیں ہیں۔''

''اوہ!'' اس نے پھر تھوڑے تامل سے کہا ''ہم نے وہ تمھارا چیز سنبھال کر رکھا ہے۔ ہمارے سے کسی کی امانت ادھر اُدھر نہیں ہوتی۔ ہم نے اپنے بیٹے سے بولا تھا، بیٹا، یہ اسپ بھائی کا امانت ہے، اس کو حفاظت سے رکھو۔''

اس نے آہستہ آہستہ اپنی اچکن کے بٹن کھولے اور اندر ہاتھ ڈال کر کسی گوشے سے ایک رومال میں بندھا ہوا غیبی مدد کا آلہ نکالا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ یہ کیا چیز ہے اور شاید یہ سوچتے ہوئے کہ یہ کوئی انوکھی قسم کا حجامت کا شیشہ ہے، اس نے پوچھا بھی نہیں لیکن مجھے کچھ یہ تاثر ہوا کہ وہ اس کو اپنے سے الگ کرنے پر خوش نہیں تھا۔ یہ گویا ایک کھانے کی بات تھی اور اس احساس کا اثر اس کے چہرے پر ظاہر تھا۔

اس نے پھر اصرار کیا کہ میں یہ دکان کرائے پر لے لوں اور ایک دفعہ مجھے دعوت دی کہ میں ریستوران میں چل کر اس کے ساتھ چائے پانی پیوں۔ اس قسم کی دعوتوں کو میں جلدی نہیں ٹھکراتا مگر مجھے اس کی صحبت کی زیادہ تمنا تھی اور بھانپتے ہوئے کہ وہ کس قدر خسیس اور کمینہ آدمی ہے اور اس کی یہ مہربانی مطلب کے بغیر نہیں، میں نے اس سے چھٹکارا حاصل کیا۔

آلے کے پرزوں کو ہاتھ میں لیے میں تیز تیز چل پڑا۔ مجھے دیر ہوگئی تھی اور میں جانتا تھا کہ راقیہ میرا انتظار کر رہی ہوگی اور میرے دیر سے آنے پر غصے ہوگی۔ شام گہری ہو چکی تھی اور کارونیشن اسٹریٹ میں تین چار بجلی کے کھمبوں پر بلب روشن تھے۔ چاکیواڑہ کا یہ ماڈرن رہائشی علاقہ اس وقت ہمیشہ ویران ہو جاتا ہے۔ کارونیشن اسٹریٹ کے آگے بجلی کے کھمبے نہیں جاتے؛ وہاں گلیوں کی نکڑ پر تیل کی لالٹینیں بھڑکتی اور ٹمٹماتی ہیں۔ میں نے ایک کوچے کو عبور کیا اور اس کے موڑ پر مجھے ایک غیر مرئی سا احساس ہوا، جیسا کبھی کبھی بچپن میں ہوتا تھا، کہ کوئی میرا تعاقب کر رہا ہے۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ میرا پیچھا کرتے ہوئے قدم بھی تیز ہو گئے۔ پختہ گلی میں بوٹوں کی چرچراہٹ واضح تھی۔ پسینہ میری پیشانی پر آ گیا۔ پھر میں رک گیا اور میں نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ خالی دھندلی گلی میرے سامنے پڑی تھی۔ ایک مریل کتا گلی پار کر رہا تھا لیکن وہ بہت دور تھا۔ اب قدموں کی آواز ختم ہو گئی۔ میں نے پھر چلنا شروع کیا۔ دیر تک تو ان پیچھا کرتے ہوئے قدموں کی چاپ سنائی نہ دی لیکن اچانک پھر آواز آنی شروع ہو گئی، پہلے مدھم، اور پھر جیسے کہ آنے والا نزدیک آتا جا رہا ہو، زیادہ تیز اور واضح۔ میں نے اب پیچھے نہ دیکھا، اپنے قدم تیز کر دیے۔ مجھے کچھ کچھ توقع تھی کہ ابھی میرا پیچھا کرنے والا اپنا سرد ہاتھ میرے کندھے پر رکھ دے گا اور اس خیال سے ہی ایک

جھرجھری میرے رگ و ریشے میں تیر گئی۔ ایک جھونکا سا میرے پاس سے سرسراتا ہوا گذرا۔ میں نے ایک جھٹکا سا محسوس کیا۔ قدموں کی آواز اب بھی تھی لیکن میرے پیچھے نہیں، مجھ سے آگے، اور ہر لحظہ آہستہ آہستہ ہوتی جارہی تھی۔ میں پسینے میں تربتر ہوگیا۔

پھر میں رک گیا۔ اگلے نکڑ پر جہاں ایک تیل کی لالٹین ٹنگی تھی، لنگی پہنے ایک پستہ قد شخص گلی کے دوسری طرف کراس کر رہا تھا۔ اس نے گھیر دار شلوار پہنی ہوئی تھی۔ میں خوف سے تھرتھرا کر اسے دیکھنے لگا۔ یہ ڈاکٹر غریب محمد تھا یا کوئی اس جیسا۔ وہ کچھ فاصلے پر تھا اور لالٹین کی روشنی بہت دھیمی تھی، اس لیے میں یہ نہ دیکھ سکا کہ اس آدمی کی داڑھی تھی یا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ڈاکٹر غریب محمد کی روح تھی جو میرے معاملات کی درستی کرنے میں میری مدد کے لیے آئی تھی۔

اچانک میں نے اپنے آپ کو ایک آہنی پھاٹک کے باہر کھڑے پایا۔ اندر ایک وسیع احاطہ تھا اور بھینسوں کی مدھم شکلیں دکھائی دے رہی تھیں۔ یہاں سے گوبر اور مویشیوں کی تیز بو باہر آرہی تھی۔

میں اس جگہ سے کئی بار گذرا تھا لیکن کبھی اس طرف دھیان نہ دیا تھا۔ چھ مہینے پہلے یہ طویلہ یہاں نہ تھا۔ میں نہیں جانتا کہ کیسے میری نگاہ پھاٹک کے باہر چھوٹی سی تختی پر جا پہنچی۔ مدھم سفید رنگ کی تختی پر یہ لفظ لکھے تھے: ''تواززی ڈیری فارم۔''

تواززی۔۔۔ ہر جگہ تواززی ہی تواززی تھا۔ جلدی میں میں نے آدھے وظیفہ سا پھاٹک کے اندر جا کر پھینک دیا۔ مجھے اب اس سے ڈر لگنے لگا تھا۔ میں اسے اپنے ہمراہ گھر نہیں لے جانا چاہتا تھا اور اس سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لیے تواززی کے ڈیری فارم سے مناسب اور کوئی جگہ نہ ہوسکتی تھی۔

دو فرلانگ آگے ہی کھلے ڈیوا اسٹریٹ تھی جس میں ہم رہتے تھے۔ چنانچہ میں وہاں بغیر کسی مزید حادثے کے پہنچ گیا۔ لیکن میرا چہرہ یقیناً بڑا عجیب ہوگا کیونکہ راقبہ نے مجھے دیکھتے ہی پوچھا، ''کیوں، خیریت تو ہے، تم اتنے زرد کیوں ہو؟'' حالانکہ میں اپنی طرف سے اپنے چہرے سے اپنے حالیہ تجربے کے سارے اثرات مٹا کر گھر میں داخل ہوا تھا۔

۳

چاکیواڑہ میں اگر کوئی سکون اور عافیت کا گوشہ ہے تو وہ لیاری سے ادھر میمن اسٹریٹ میں غریب النواز ہوٹل ہے۔ جب میں اللہ توکل بیکری میں کام کرتا تھا اور میری شادی نہ ہوئی تھی تو میں اکثر شام کو وہاں جایا کرتا تھا۔ ڈاکٹر غریب محمد کی دکان اور طبابت کا وارث ہونے کے بعد اور خصوصاً شادی کے بعد سے میں معاش اور گھریلو ذمے داریوں کے جھنجھٹ میں اس قدر پھنس گیا تھا کہ کئی کئی دن وہاں جانے کا اتفاق نہیں ہوتا تھا۔ یہ بات بھی ہے کہ اپنی بیوی راقبہ کی رفاقت نے مجھے اپنے

دوستوں سے کافی حد تک بے نیاز کر دیا ہے —پھر بھی میں انجمن اہالیان چاکیواڑہ کے ہفتہ وار اجلاس میں شرکت کو اپنے پر فرض سمجھتا ہوں۔ یہ اجلاس ہر سنیچر کو غریب النواز ہوٹل میں منعقد ہوتے ہیں۔ (میں محمد دین امپ اس انجمن کا سیکرٹری ہوں۔)

اوپر درج کیے ہوئے واقعے کے تین چار روز بعد میں انجمن کے اجلاس میں شریک ہونے کے لیے غریب النواز گیا۔ سب دوست احباب موجود تھے۔ بھلے ڈینو بھی اپنے گنٹھیا کے باوجود آ پہنچا تھا۔ سائیں اللہ لوک سنیاسی منگھوپیر میں اپنے چالیس روزہ چلّے کے بعد پہلی بار اجلاس میں شامل ہوئے تھے اور ہمیشہ کی طرح سرخ و سپید اور چاق و چوبند لگ رہے تھے۔ چلّے کے دوران میں انھیں جو روحانی فیض اور کرامات حاصل ہوئے تھے۔ ان کے سنانے میں سائیں صاحب نے اتنا وقت لے لیا کہ انجمن کی اصل کارروائی کم ہی ہو سکی۔

میں سن کر بہت حیران ہوا کہ چھوٹے تنواڑی کے بھوت کو دیکھنے اور گھوڑا گاڑی میں چڑھ کر فرار ہونے کی کہانی یہاں ہر ایک کو معلوم تھی۔ یار لوگوں نے اس پر اور رنگ چڑھا لیا تھا۔ وہ یہ کہ ڈاکٹر غریب محمد کے بھوت نے نہ صرف بڑھئی کے ہاتھ سے ہتھوڑی چھین کر چھوٹے تنواڑی کے سر پر ضرب لگائی تھی بلکہ اس کا تعاقب کرکے اس کے ساتھ گھوڑا گاڑی میں سوار ہو کر جونا مارکیٹ میں اس کے مکان تک گیا تھا۔ جب چھوٹا تنواڑی گھوڑا گاڑی سے نیچے اترنے لگا تو ڈاکٹر غریب محمد نے اسے دھکا دیا جس سے وہ گلی میں گر پڑا۔

احباب نے مجھے کریدنے کی کوشش کی لیکن میں نے چپ رہنا مناسب سمجھا۔ سائیں اللہ لوک سے ان معاملات پر اتھارٹی کی حیثیت سے پوچھا گیا تو انھوں نے فقط اتنا کہا کہ بعض ارواح دنیا میں اکثر اپنے اعزا کی مدد کے لیے آتی رہتی ہیں اور اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں۔ ایسی ارواح سے مدد طلب کرنا مکروہ ہے اور اس کے نتائج مفید نہیں ہوتے۔ سائیں اللہ لوک لوگوں کے دلوں کا حال پڑھ لیتے ہیں۔ یہ میرا ذاتی تجربہ ہے۔

ایک دفعہ میں نے کہا یہ سیٹھ تنواڑی بڑا ہوشیار آدمی ہے۔ مجھے پچھلے دنوں یہ پتہ چلا کہ اس نے یہاں ایک ڈیری فارم کا دھندا بھی چلا رکھا ہے۔ یہ لوگ چاکیواڑہ پر مالی لحاظ سے قبضہ کر رہے ہیں۔ انجمن کو اس کا بروقت سدباب کرنا چاہیے۔

''لی مارکیٹ سے اس طرف ان کا آنا ممنوع قرار دیا جائے،'' فضل علی ناولسٹ نے تجویز پیش کی۔

ایک ادھیڑ عمر کا آدمی ہمارے قریب آ بیٹھا تھا، وہ ہماری باتیں بغور سن رہا تھا۔ ''میری بھی

ایک عرض ہے۔" اس آدمی نے کہا۔ اس کے لہجے میں بڑی اداسی تھی۔ "آپ پڑھے لکھے آدمی ہو۔"
میں اور فضل علی ناواست اس کی اس بات پر اس کے گرویدہ ہو گئے۔

"یہ تواڑی کے ڈیری فارم کا آپ نے ذکر کیا ہے۔ میں وہاں بھینسوں کی خدمت پر نوکر ہوں۔ ہم گوڑگاواں کے ہیں۔ گیارہ اور بھی آدمی گوڑگاواں کے ہیں۔ سیٹھ نے ہم کو ساٹھ روپے ماہوار دینا طے کیا تھا لیکن چار مہینے ہونے کو آئے، اس نے ہمیں تنخواہ کا ایک پیسہ نہیں دیا۔ ہم اس سے مطالبہ کرتے ہیں تو وہ ہنس کر ٹال جاتا ہے۔"

"آپ لوگ اسٹرائیک کیوں نہیں کرتے؟" فضل علی ناواست نے کہا جو میونسٹ خیالات کا ہے۔

"ہم کیا اسٹرائیک کریں گے! ہم غریب آدمی ہیں۔ سیٹھ بڑا کمینہ اور چالاک شخص ہے۔ اس نے ہمارے ساتھ تنخواہ کی کوئی لکھت پڑھت بھی نہیں کی۔" پھر وہ ہنسا۔ "ان بھینسوں نے اسٹرائیک کر دی ہے۔"

"بھینسوں نے؟" میں نے کہا۔

"ہاں، پچھلے دو دن سے بھینسیں دودھ نہیں دے رہیں، جیسے دودھ ان کے تھنوں میں خشک ہو گیا ہے۔ بڑی عجیب بات ہے۔ ایک دو نہیں، سب بھینسوں کا۔ کسی نے کچھ پڑھ دیا ہے۔ سیٹھ ہم پر غصہ ہوتا ہے کہ ہم نے شرارت کی ہے۔"

پچھلے دو دن سے میرا ماتھا ٹھنکا۔ نبی مدد کے آسے کو تواڑی ڈیری فارم میں پھینکے مجھے دو دن ہی تو ہوئے تھے۔ ڈاکٹر غریب محمد چپکے چپکے اپنا کام کر رہا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ زندگی میں بھی مرحوم کو ایک لمحہ نچلا بیٹھنے کی عادت نہ تھی۔

فضل علی نے کہا، "آپ اس کے خلاف درخواست دیں۔ اتنا بڑا سیٹھ ہو کر بڑا خبیث آدمی ہے۔"

اس آدمی نے کہا، "آپ کو کل کا واقعہ سناتا ہوں۔ صبح آیا تو ہماری کوٹھری میں چلا گیا۔ وہاں میرا ایک شیشہ سا پڑا تھا جو مجھے پھاٹک کے پیچھے پڑا ہوا ملا تھا اور میں نے اسے جھاڑ پونچھ کر اپنے صندوق پر رکھ چھوڑا تھا۔ سیٹھ کی نظر اس پر جا پڑی۔ کہنے لگا کہ یہ کدھر سے آیا؟ میں نے صاف صاف کہہ دیا، جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی کیا تھی، کہ یہ پھاٹک کے ساتھ پڑا تھا۔ اس نے کہا یہ میرا شیشہ ہے اور میری جیب سے کہیں گر گیا تھا۔ اس نے بڑی ڈھٹائی سے اٹھا کر اپنی جیب میں ڈال لیا — اتنا خسیس آدمی ہے۔"

میں اچھل پڑا۔ "تو وہ شیشہ سیٹھ تواڑی لے گیا؟"

''ہاں، منشی صاحب، صاف لے گیا۔ اور ہمارے منھ پر جھوٹ بولا کہ اس کا ہے۔ بڑے چھوٹے دل کا آدمی ہے۔''

میرا دل عجیب بدشگونیوں سے بھر گیا۔ یہ محض اتفاق نہیں ہوسکتا تھا کہ میں ایک دن شیشے و پھاٹک کے پاس پھینکوں اور تیسرے دن وہ پھر سیٹھ تنوازی کی جیب میں ہو۔ مجھے ایسا لگا جیسے یہ غیبی مدد کا آلہ سیٹھ کے تعاقب میں ہو اور اس کا ساتھ نہ چھوڑنا چاہتا ہو۔ میں جانتا تھا کہ اس کے نتائج تنوازی کے حق میں خوش آئند نہ ہوں گے ... میں خائف تھا۔

ہم نے سیٹھ کے ملازم کو اطمینان دلایا کہ ہم کل ڈیری فارم میں آ کر ان کی شکایات کی عرضی قلمبند کریں گے۔ پہلے تو سیٹھ سے مل کر ہی کوشش کریں گے کہ وہ سیدھے ہاتھ سے اپنے ملازمین کو ان کی پچھلی تنخواہیں ادا کردے۔ اگر اس نے ٹال مٹول کی تو انجمن کی طرف سے لیبر منسٹر کی خدمت میں درخواست بھیجی جائے گی اور تنوازی کے ظلم کا کچا چٹھا کھولا جائے گا۔

معمر گوالا بہت خوش ہوا۔ اس کی بے نور آنکھیں چمکنے لگیں، جیسے کہ تنخواہ کے روپے اس کی ہتھیلی پر دھر دیے گئے ہوں۔ اس نے جاتے ہوئے ہمارے گھٹنوں کو دبایا، ''خدا آپ دونوں کو زیادہ ترقی دے۔''

۴

اگلے دن ہم تنوازی ڈیری فارم میں صبح ہی صبح جا پہنچے۔ یہ ایک بڑی وسیع جگہ ہے۔ اوپر ٹین کی چادروں کا مضبوط شیڈ اینٹوں کے ستونوں پر کھڑا ہے۔ فرش سیمنٹ کا پکا ہے اور اس کے دوطرف بھینسوں کے لیے تھان اور کھرلیاں بنی ہیں۔ فرش وسط کی طرف ڈھلانی ہے، جہاں ایک بڑی نالی کھدی ہے اور بھینسوں کا بول و براز اس میں جمع ہوتا ہے۔ بھوسے، گوبر اور پیشاب کی بو فضا میں سلط تھی۔ پھر بھی جگہ اتنی زیادہ گندی نہ تھی۔

سب گوالے ہمارے گرد جمع ہوگئے اور لگے سیٹھ کی برائیاں کرنے۔ لیکن ان کی شکایتوں میں مایوسی زیادہ تھی اور غصہ کم۔ بے کسی اور بیچارگی ان کے لٹے ہوئے چہروں پر چھپی ہوئی تھی۔ بعض وقت ہم ان کی آنکھوں میں اس شدید نفرت کی دمک دیکھتے جو انھیں اپنے مالک کے خلاف تھی، اور جو بڑے عاجز اور مارے ہوئے انسانوں میں خطرناک ہوسکتی ہے۔ وہ فارسی کا کیا مصرع ہے:

بہ بیند کہ گر گربہ عاجز شود

شیخ فضل علی نے ایک فل اسکیپ پر ان کی درخواست لیبر منسٹر کے نام قلمبند کی جو فصاحت اور بلاغت کا شاہکار تھی۔ فضل علی اس قسم کی چیزوں میں قدرے اچھا ہے اور اگر وہ ناولسٹ بننے کے درپے نہ

ہوتا تو غالباً ایک قابل فخر عرضی نویس کی حیثیت سے بڑا نام پیدا کرتا۔ جھوٹوں مرنے اور ادھار مانگنے کی بجائے چار پیسے اس کے پاس ہوتے اور اس کے عشق سو فیصدی ناکامیاب ہونے کے بجائے کم از کم ستر اسی فیصدی بامراد ہوتے۔ یہ ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے کہ فی زمانہ غریب آدمی کا عشق نہیں پنپ سکتا۔

ہم نے درخواست کے نیچے ان کے نام ولدیت وغیرہ لکھ کر ان کے انگوٹھے لگوائے۔ ہمارا ارادہ یہ تھا کہ پہلے سیٹھ تنواڑی سے بات چیت کریں گے اور جب دیکھیں گے کہ ان تلوں میں تیل نہیں، تو پھر کچھ اور کریں گے۔ ان گوالوں میں سے کسی کو سیٹھ کے گھر کا پتہ معلوم نہ تھا۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ کھوڑی گارڈن میں غالباً سیٹھ تنواڑی کا ایک ہوٹل ہے۔ شاید سیٹھ ہمیں وہاں مل جائے۔ ہم نے اس کا ہوٹل میں پتہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ مین اسٹریٹ پر پہنچ کر ہم نے بندر روڈ کی سمت جاتی ہوئی ایک ٹرام پکڑی اور فٹ بورڈ پر سفر کرتے ہوئے کارپوریشن کی بلڈنگ کے سامنے جا اترے۔ کنڈکٹر عثمان اپنے پڑوس میں رہنے والا تھا اور راقم کے سگے ماموں کے داماد کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس نے ہم سے ٹکٹ نہ پوچھے۔ ویسے بھی خدا کے فضل و کرم سے میری چاکیواڑہ کے ٹرام ڈرائیوروں اور کنڈکٹروں سے اتنی راہ و رسم ہے کہ وہ لحاظ کرتے ہیں۔ یہاں سے ہم پوچھتے ہوئے کھوڑی گارڈن پہنچے۔ یہ خشک سوکھی گھاس اور مرجھائے ہوئے پودوں کا ایک چوکور قطعہ ہے جس کے چاروں طرف سڑک کے پار سہ منزلہ اور چار منزلہ کثیف عمارتیں ہیں۔ چند میمن بچے ایک ہی سا پر کھیل رہے تھے اور تین چار زرد، پتلی عورتیں، لال پیلے کپڑوں میں ملبوس، زیورات سے لدی پھندی، انھیں بے جان نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ سیاہ کوٹ میں ایک کھچڑی داڑھی والا بوڑھا اپنی سوٹی زور زور سے ہلاتا اور اپنے آپ سے باتیں کرتا فوارے کے پاس چل پھر رہا تھا۔ ہم نے باغیچے کے گرد چکر کاٹا۔ دو تین ہوٹل شرقی سمت کی عمارتوں کی قطار میں ہم نے دیکھے لیکن تنواڑی کا ہوٹل ان میں ہمیں نظر نہ آیا۔ ہم نے ایک میمن سیٹھ سے تنواڑی کے ہوٹل کا پوچھا۔ اس نے کچھ حیران ہو کر ہمیں دیکھا جیسے کہ اسے یقین نہ آ رہا ہو کہ ہم ایسی شہرۂ آفاق جگہ کو نہیں جانتے۔ اس نے اپنی سوٹی سے گارڈن کے ایک کونے کی طرف اشارہ کیا، ''وہ اُدھر تنواڑی ہوٹل ہے۔ اُدھر سنگل چائے دو پیسے میں ملتا ہے۔ آپ کو کس سے ملنا ہے؟'' ہم نے اس کی بات کا جواب نہ دیا اور شکریہ ادا کر کے بتائی ہوئی سمت کی طرف چل دیے۔

یقیناً وہاں ایک ہوٹل تھا، سڑک پر کھڑی عمارتوں میں نہیں بلکہ میمن باغیچے کے اندر۔ یہ ہوٹل قناتوں کی چار دیواری میں تھا۔ ایک شامیانہ اوپر تنا ہوا تھا — یہ گویا ایک کارنیوال یا نمائشی میلے کا

ہوٹل تھا۔ داخلے پر لکڑی کے جنگلے پر ایک تختی لگی تھی: ''تواڑی ریستوران''۔ ہم اندر گئے۔ جگہ تر تر کرتے اور چہچہاتے میمن بیوپاریوں سے بھری ہوئی تھی۔ ہم نے وہاں خود کو اجنبی محسوس کیا۔ لوگ آڑی ترچھی پڑی بنچوں پر بیٹھے ہوئے سنگل چائے پی رہے تھے اور بے بازار اور نرخوں کی باتیں کر رہے تھے۔ تواڑی ریستوران میں میزیں نہ تھیں (حالانکہ میزیں غریب النواز میں بھی نہیں)۔ بڑا ہوشیار آدمی تھا۔ تواڑی نے یہ بھانپ لیا تھا کہ اس کے ہم قوموں کو فی الحقیقت میزوں کی ضرورت نہیں۔ چائے سنگل کے دو پیسے کردو اور وہ ٹوٹ کر یہاں گریں گے۔

ہم دونوں کافی معزز لگ رہے تھے۔ میں نے نائی سوٹ پہن رکھا تھا جو میں نے اس وقت جب میں اللہ توکل بیکری میں کام کرتا تھا، عجائب لانڈری ورکس سے ادھار لیا تھا اور پھر واپس نہیں کیا تھا۔ اسے میں خاص الخاص موقعوں کے لیے استعمال کرتا ہوں۔ یہ قدرے چھوٹا ہے اور کمر کے پاس سے کسا ہوا ہے مگر پتلون کو تھوڑا نیچے کرکے باندھتا ہوں۔ میرے پاس ایک اسٹرا ہیٹ بھی ہے جسے میں نے سفید چاک کے رنگ سے رنگوالیا ہے۔ شیخ فضل علی اپنی تنگ موریوں کی پتلون اور یونیورسٹی کے گاؤن میں کچھ کچھ مڈل ایسٹ کے سفیر کی جھلک دیتا تھا۔

ہم نے کاؤنٹر پر بیٹھے ہوئے ایک پیلے سے چشمہ لگے نوجوان سے سیٹھ تواڑی کا اتہ پتہ پوچھا۔ وہ ہم سے متاثر ہوکر کھڑا ہوگیا۔ شاید اس نے سمجھا کہ ہم انکم ٹیکس یا گورنمنٹ کے کسی اور محکمے کے آدمی ہیں جو سیٹھ سے کچھ لین دین کے سلسلے میں آئے ہیں۔ اس نے کہا کہ سیٹھ ابھی نہیں آیا، ہم تھوڑی دیر بیٹھ جائیں، وہ آتا ہی ہوگا۔

ہم ایک بنچ پر بیٹھ گئے۔ ایک لنگڑا آدمی ہمارے لیے دو پانی کے گلاس اور دو سنگل چائے لے آیا۔ میں نے اسے پیسے دینے چاہے لیکن پیلے کلرک نے ٹیبل والے کو اشارہ کیا کہ ہم سے کچھ نہیں لینا۔ وہ ہم سے مہمانوں کا سلوک کرنے پر مصر تھا۔ ہم نے آدھا گھنٹہ وہاں سیٹھ تواڑی کا انتظار کیا اور اس اثنا میں تین سنگل اور پیے۔ لنگڑا ٹیبل والا بیڑیوں کا آدھا پیکٹ بھی لے آیا۔ ہم نے تین چار بیڑیاں پیں اور بقیہ شیخ فضل علی نے اپنی جیب میں ڈال لیں۔

جب سیٹھ نہ آیا تو ہم اٹھ کر کلرک کے پاس گئے۔ اس نے کہا کہ وہ خود حیران ہے کہ سیٹھ کیوں نہیں آیا۔ کوئی خاص بات ہوگئی ہوگی۔ اس نے ہم سے کہا کہ ہم اپنے نام اسے لکھوادیں، وہ سیٹھ کے آنے پر اسے اطلاع کردے گا۔ میں نے کہا کہ ہمارا اس سے ملنا بہت ضروری ہے اس لیے وہ ہمیں اس کے گھر کا پتہ بتادے۔ کلرک نے اپنا سر نفی میں ہلایا۔ ''سیٹھ اس وقت آپ کو گھر پر نہیں ملے گا۔''

سونے کے دانتوں والے ایک تنگ اور استخوانی میمن نے، جو ہماری گفتگو سن رہا تھا، کہا،
''ارے سیٹھ تواری کو پوچھتا ہے تو ایک گھنٹہ پہلے ہم اسے غلے کے سٹہ گھر میں دیکھا تھا۔'' اس نے ہمیں نہ صرف غلے کے سٹے گھر کا پتہ بتایا بلکہ سیٹھ کے مکان کا بھی، جو جونا مارکیٹ میں حاجی اسٹریٹ میں تھا۔ اس نے ہمیں بیڑیاں پیش کیں۔ کلرک کو شاید کچھ ہدایات تھیں۔ مجھے کچھ ایسا لگا کہ اس نے استخوانی میمن کے ہمیں تواری کے گھر کا پتہ بتانے کو پسند نہیں کیا اور ہمارے وہاں سے جانے کے بعد ان دونوں میں کچھ تو تو میں میں ہوئی۔

سڑک پر آئے تو ہمیں خوش قسمتی سے سیٹھ ایوب کے بیٹے کی کار نظر آ گئی۔ اس کا ڈرائیور راقبہ کے بھائی کا دوست ہے۔ سیٹھ ایوب کا بیٹا اوپر کسی سے ملنے گیا ہوا تھا۔ میں نے اسے کہا کہ ہمیں فریئر روڈ پر چھوڑ آئے۔ وہ ہمیں بھگت اسٹریٹ سے فریئر روڈ پر مسجد مینشن کے سامنے لے آیا۔ ہم اترے اور سٹے گھر میں داخل ہوئے۔ یہ سٹہ گھر بھی بڑی عجیب و غریب چیز ہے۔ ایک چھوٹی سی کوٹھری میں بہت سے ڈبے اور موٹے میمن اور دوسرے بیوپاری جمع تھے۔ ان کی آنکھوں میں جواریوں کی چمک اور بخار کی کیفیت تھی اور بہت سی بیناؤں کی مسلسل آوازوں کا شور کمرے میں پھیلا ہوا تھا۔ میں نے پہلے سمجھا کہ وہ سب پاگل ہیں۔ کوٹھری کے وسط میں ایک ذرا اونچی جگہ پر ایک لکڑی کا چوکور جنگلہ تھا، جس کے اندر دلال کھڑے تھے، دیوؤں کی طرح کالے کوٹ میں۔ لاکھوں روپے کا سٹہ یہاں کھیلا جاتا ہے۔ گورنمنٹ اتنے وسیع پیمانے پر جوے کی اجازت خدا جانے کیونکر دے دیتی ہے۔ جب کوئی بری چیز بڑے طریقے پر امیر آدمی کریں تو وہ باعزت ہو جاتی ہے ... سیٹھ تواری ہمیں کہیں نظر نہ آیا۔ میں نے ایک آدمی سے پوچھا ''سیٹھ تواری تو یہاں نہیں آیا؟'' اس کا سر گنجا تھا اور اس کے دو دانت سونے سے بھرے ہوئے تھے۔ وہ ہمیں سٹہ گھر سے باہر فٹ پاتھ پر لے آیا۔

''کس کا پوچھتے ہو؟''

''سیٹھ تواری...''

''او سیٹھ تواری!'' اس نے کہا، ''وہ ابھی تھا، ادھر تھا، اس پر بڑا ظلم ہوا۔ بڑا بول گیا۔ ہم نے اس سے بولا کہ بھئی مت خریدو، بھاؤ گرتا ہے۔ اس نے ہمارا بات نہ سنا۔ بھاؤ کے معاملے میں ہم نے اسے کبھی ایسا غلطی کرتے نہیں دیکھا۔ دس لاکھ کا گھاٹا اس کو ہو گیا۔ ہم نے بڑا اس کو منع کیا۔ ہم اور وہ آپس میں بھائی بھائی ہے اور ایک کچھ ہے — آپ سیٹھ سے کیوں ملتے ہو؟ لو بیڑی پیو۔''

لیکن میں اب جلدی میں تھا اور رکنا نہ چاہتا تھا۔ میرے دل نے کہا کہ اس کی تباہی میں ڈاکٹر غریب محمد کی نیبی آلے کا ہاتھ ہے جو اس سے چپکا ہوا ہے۔ اس آلے کو اس سے الگ نہ کیا گیا تو خدا جانے اس پر اور کون سی اس سے بھی بڑی مصیبتیں ٹوٹیں۔ میری، محمد دین اسپ کی عادت ہے کہ میں اپنے بدترین دشمن کی ذلت بھی دل سے نہیں چاہتا۔ جہاں تک میرا تعلق تھا، میں ڈاکٹر غریب محمد سے مزید مدد کا طلبگار نہ تھا۔ جو مدد مرحوم نے کی تھی وہ میرے دل کو ٹھنڈک پہنچانے کے لیے کافی تھی۔ اگرچہ اس سے مجھے فائدہ نہیں پہنچا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ ڈاکٹر مرحوم کو مزید مدد سے ہاتھ اٹھانے کے لیے کیسے اکسایا جائے۔

ہم وڈ اسٹریٹ سے ہوتے بندر روڈ پر آئے۔ ٹریفک کا لامتناہی سلسلہ رواں تھا اور ہمیں رکنا پڑا۔ سڑک کے پار نگز کے بک اسٹال کے سامنے ایک چھوٹا سا مجمع اکٹھا ہو رہا تھا اور چار پانچ ٹرامیں آ کر ایک دوسرے کے پیچھے رک گئی تھیں۔ سوٹ ٹوپی میں ایک صاحب لوگوں کو ہٹانے کی کوشش کر رہا تھا۔

ہم پار گئے۔ کوئی حادثہ ہو گیا تھا۔ ایک چھتری والے آدمی نے مجمعے سے ہٹتے ہوئے گویا ہمیں مخاطب کرتے ہوئے کہا: ''قسمت سے بچے گا۔'' مجمعے کے اوپر سے اس آدمی کو دیکھنے کی کوشش کی جو حادثے کا شکار ہوا تھا۔ بہت سے خون کی جھلک آئی۔ اس کی گول ٹوپی اور سوٹی ایک طرف پڑے تھے۔ منہ اور ناک سے خون فواروں میں چھوٹ رہا تھا، اور وہ آدمی کچھ بڑبڑا رہا تھا — یہ کچھ وقفے کے بعد تھا کہ مجھ پر کھلا کہ یہ آدمی تو وہ تھا، اور کسی چیز نے مجھے حلق سے آلیا۔ یہ سیٹھ تواڑی تھا۔

میں وہاں سے فوراً مڑا۔ مجھے ایسا احساس تھا جیسے کہ میں نے اسے قتل کیا ہے اور یہ چیز میری پیشانی پر اتنی صاف لکھی ہے کہ کوئی اسے پڑھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ پسینہ میری بغلوں سے چھوٹا اور میں ایک بک اسٹال پر آ کر کھڑا ہو گیا۔ بک اسٹال والا مجھے جانتا تھا اور اس نے مجھ سے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ تمھاری ہوائیاں اڑ رہی ہیں۔ میں اس کی آنکھ میں آنکھ ملا کر نہ دیکھ سکا۔

میں وہاں دس منٹ کھڑا رہا۔ اس عرصے میں ایمبولینس آئی اور میں آنکھ کے گوشے سے دیکھا کہ وہ سیٹھ تواڑی کے جسم کو اس کے اندر داخل کر رہے ہیں۔ دو تین پولیس مین بھی اس کے بعد اندر جا بیٹھے اور ایمبولینس روانہ ہو گئی۔

اتنے میں شیخ فضل علی ناولسٹ نے، جسے میں بھول گیا تھا، میرے کندھے پر ہاتھ رکھا، ''چلو اب چلیں۔ یہ میمن مشکل ہی سے بچے گا۔ اس کی جیب کے اندر شیشہ، غالباً حجامت کا شیشہ تھا،

گرنے سے وہ ٹوٹ گیا اور اس کے ٹکڑے اس کی چھاتی میں گھس گئے ہیں۔ نیم برق بڑا سخت ہو رہا ہے۔"

میں نے اسے خالی نظروں سے دیکھا۔ اس نے مجھے بازو سے سہارا دیا اور ہم فٹ پاتھ پر چلنے لگے۔ مجھے علم نہیں کہ وہ کیا کچھ کہتا رہا۔

یہ اس خوفناک آسیب کا خاتمہ نہیں تھا۔ نہ ہی ڈاکٹر غریب محمد کا۔ اس نے ابھی بہت کچھ اور فساد کرنا تھا، اور ڈاکٹر غریب محمد کا بھوت اور کئی دن چیختا رہا اور گلیوں میں آوارہ پھرا۔ یہ ایک اور کہانی ہے جو میں آپ کو پھر کبھی بتاؤں گا۔

محمد خالد اختر (۱۹۲۰ – ۲۰۰۲) نے اردو کے ایک منفرد اور صاحب اسلوب ادیب کے طور پر ایک طویل تخلیقی عمر پائی اور افسانے، ناول، سفر نامے، مزاح، تنقید، تبصرے، پیروڈی، خطوط، یادداشتوں اور ترجمے کے میدانوں میں اپنا جوہر دکھایا۔ آکسفرڈ یونیورسٹی پریس کے زیر اہتمام محمد خالد اختر کی تحریروں کو ان اصناف ادب کے لحاظ سے الگ الگ جلدوں میں پیش کیا جا رہا ہے۔ زیرِ نظر جلد میں ان کی اکتیس کہانیاں پیش کی جا رہی ہیں جو اردو کے ممتاز جریدوں فنون، سویرا، ادب لطیف اور افکار وغیرہ میں شائع ہوئیں۔

اجمل کمال ایک مدیر اور مترجم ہیں۔ ان کی ادارت میں بین الاقوامی ادب اور فکر کا سہ ماہی جریدہ آج کراچی سے ۱۹۸۹ سے شائع ہو رہا ہے۔

مجموعہ محمد خالد اختر (جلد سوم)

• اس جلد میں شامل افسانے:

ننھا مانجھی

جوزی اور میں

زندگی کی کہانی

کھویا ہوا افق

فورتھ ڈائمنشن

کاریز

مٹھی کا لائسنشیئٹ

چچیز

لالٹین

آخری دن

سہ پہر اور شام

فرشی

دو آرٹسٹ — بلکہ تین

موسیقاروں کے درمیان

احمق کی غیر اہم سوانح عمری

ہونے والا بادشاہ

فلاریزل

کراچی ہاربر

ایک جنازے پر

مقیاس المحبت

سیٹھ تواری کی تباہی

OXFORD
UNIVERSITY PRESS

www.oup.com
www.oup.com/pk

ISBN 978-0-19-906101-3

RS 795